جلد ۲۴   جنوری ۴۴ء   نمبر ۱

اُردُو

انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:— عبدُالحق

×

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) دہلی

اُردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے۔
۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ۔
۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔
۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۰۱، دریا گنج۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے۔

المشتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

نرخ نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ	۸ روپے	۳۰ روپے
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۴ روپے	۱۵ روپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ روپے ۴ آنے	۸ روپے

جو اشتہارات چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے ان کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے، البتہ جو اشتہارات چار یا چار سے زیادہ بار چھپوائے جائیں گے ان کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد۔ منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے۔

المشتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

اُردو

جلد ۲۴ | جنوری سنہ ۱۹۴۴ء | نمبر ۱

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

کا

سہ ماہی رسالہ

مقامِ اشاعت :- دہلی

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلی ماران دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

اُردُو

جلد ۲۴ — جنوری سنہ ۱۹۴۴ء — نمبر ۱

فہرستِ مضامین

ایک قدیم اُردو شاعر راجارام

(از جناب سید ظہیر الدین صاحب مدنی اُستاد گورنمنٹ کالج، احمد آباد)

ہندستان کے مسلمان سیاسی فاتحوں سے پہلے روحانی فاتح شمالی دکن میں مورچے باندھ چکے تھے انھیں عوام کے دلوں پر فتح حاصل کرنی تھی اس لیے ان دانش مندوں نے تیر و تبر سے کام نہیں لیا بلکہ تیغِ زبان سے عوام کو رام کیا۔ چوں کہ دِل کی ترجمان زبان ہو لہذا ان بزرگانِ دین کو پہلے عوام کی زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی لیکن اس بازاری زبان میں ابھی اتنی قدرت نہیں تھی کہ ہر خیال کی ترجمانی کی غرض پوری کر سکے جس سے مبلغین کا مقصد بر آئے لہٰذا ان مبلغین نے اپنی ضروریات کے مطابق زبان کو ڈھالنا شروع کیا اور قلیل عرصے میں اُردو اس قابل ہوگئی کہ اس کے سر پر نظم و نثر کا بار ڈال دیا گیا۔ اس طرح اُردو کی ادبی تشکیل ہوئی اور اس امر میں خصوصاً گجرات میں باجن، گام دھنی، خوب محمد چشتی، محمود دریائی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ الغرض صوفیائے کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ ادبِ اُردو کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں جب ولی گجراتی نے ہوش سنبھالا تو انھوں نے خانقاہوں کی اس پروردہ حسینہ میں کچھ ایسے معشوقانہ انداز پائے کہ اس پر ڈورے ڈالے اور آخر اس کو لباسِ ریختہ میں ملبوس کرکے کچھ اس طرح پیش کیا کہ اس پر ہزاروں نظریں اُٹھنے لگیں۔ ہر صاحبِ ذوق اسے اپنا معشوق سمجھ کر سینے سے لگانے لگا، شعر و سخن کی مجلسیں گرم ہونے لگیں اور شعرائے ریختہ گو میں مقابلے بھی شروع ہوگئے۔ یہ دور عموماً ولی و اشرف کا دور کہلاتا ہو اس میں گجرات و دکن میں متعدد شاعر گزرے ہیں جن میں سے راقم، گجرات

کے ایک شاعر گمنام راجارام کو پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہو۔

عرصۂ دراز سے بزرگوں کی زبانی سُنا کرتا تھا کہ آج سے دو ڈھائی سو سال قبل سورت (گجرات) میں دو ہندو ریختہ گو شاعر راجارام اور بینی پرشاد گزرے ہیں جن کا کلام نایاب ہو اور راجارام کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ مشرف بہ اسلام ہوا مگر ظاہرداری ہندوؤں کی سی رکھتا تھا اور اسی کے ساتھ ایک واقعہ بیان کیا جاتا تھا کہ جب راجارام کا انتقال ہوگیا تو اس کے واقف راز دو مسلمان دوست (جو شاعر تھے) اس کی لاش کو اس کے مکان سے لے آئے اور تجہیز و تکفین کے بعد خواجہ سید جمال الدین قدس سرہٗ کی خانقاہ میں کسی جگہ دفن کردیا۔

مذکورہ بالا بیان سُننے کے بعد یہ سب کچھ مبالغہ ہی مبالغہ معلوم ہوتا تھا۔ دل میں ہزار خیال گزرتے تھے کہ ہندوؤں نے اس کی لاش مسلمانوں کو لینے کیسے دی؟ ممکن ہو اس کے عزیز و اقربا نہ ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہو کہ ہندو اس کے اسلام سے واقف ہوں بہرحال دل میں شبہات پیدا ہوتے تھے مگر مجھے شاعر کے کلام سے کام تھا لہذا اس کی کھوج میں لگا رہا۔ اتفاق سے ایک روز ایک دوست کے کتب خانے میں سورت کے ایک ان پڑھ شاعر کا کلام ڈھونڈھ رہا تھا کہ قضارا چند اوراقِ پارینہ ہاتھ لگ گئے ان اوراق کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد مسرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہ راجارام کا مجموعۂ کلام تھا۔

یہ نسخہ ایک مختصر مجموعۂ کلام ہو اس کے ابتدائی اوراق یعنی باب الراے تک اور درمیان میں سے بھی چند اوراق گم ہیں اسی طرح آخر کے چند اوراق کم ہیں۔ مجموعے میں صرف پچیس غزلیں پائی جاتی ہیں اور ہر غزل سات یا نو شعر سے زیادہ کی نہیں ہو۔ ایک ترجیع بند بھی ہو اس میں سات بند ہیں اور یہ مکمل ہو۔ اکثر کتابت کی غلطیاں ملتی ہیں جیسے مضبوط کو مزبوت لکھا ہو ممکن ہو اس زمانے کے رواج کے مطابق ایسا لکھا ہو جیسے وؔلی اور اس سے پہلے نفع کو نفا اور منع کو منا لکھتے تھے۔ اکثر مصرعے ساکت ہیں جو کتابت ہی کی غلطی معلوم ہوتی ہو۔ خط بہت خراب ہو۔ معلوم ہوتا ہو کسی نے اصل سے نقل کیا ہو۔

ہم یہ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس کا نام راجارام تھا کیوں کہ ایسے نام ہندوؤں میں عام ہیں اور یہ کوئی تخلص نہیں ہوسکتا۔ یہ صاف ظاہر ہو کہ شاعر نے کوئی اور تخلص، اختیار کرنے کے بجائے اپنا نام ہی تخلص میں استعمال کیا ہو۔ ہمیں اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہوسکتا ہو وہ صرف ایک مختصر سے مجموعۂ کلام

سے۔ اس کے وطن کے متعلق کلام میں کچھ پتا نہیں چلتا ہاں زبانی روایات کی بنا پر جب تک دوسری تحقیقات ہو، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجارام سورت کا رہنے والا تھا۔

راجارام کے کلام میں زبان کی خصوصیات عام طور پر وہی ہیں جو ولی کے دور میں پائی جاتی ہیں۔ کلام میں ولی کے دور کے مروج الفاظ و محاورے بے شمار ہیں جیسے سجن، تجھ سرن، ہور بمعنی اور، کنے بمعنی پاس، چرن، پون بمعنی ہوا، سیس، ٹُک بمعنی ادا، دستا (دکھتا)، سیتیں (سے)، کتئیں، کوں، سیں، بچن، دوجا، انجھو (آنسو) اتھا (تھا)، نپٹ، سوں، موہن، دلدار، سریجن، بلہار، درس، جگ، نین، گگن (آسمان)، پھاندا، لگ وغیرہ ؎

نین دستے ہیں اس کے سبز خط میں　　　　کہ جوں سبزی میں دستے ہیں ہرن سبز

تصوّر بیچ اوس رشکِ چمن کے　　　　مجھے دستا زمیں سے تا گگن سبز

جب ستی راجا سجن مجکوں دکھایا ہے درس　　　　ہفت فلک کے اوپر تب سیتیں ہے میرا دماغ

خاص کہتے ہیں بھیج کر صلوات　　　　جگ میں دوجا نہیں مثالِ گل

ہوا ہے سبز اب باغِ محبت　　　　میرے انجھو کے پانی کی تری سوں

وہ نبی محبت کے پھاندے میں ایچ[1]　　　　میرے دل کے تئیں کر گیا ہے شکار

تذکیر و تانیث کا بھی وہی حال ہے جو ولی کے دور میں تھا ؎

دیکھ کر شمع رو کا آرایش　　　　آتشِ عشق کوں ہے افزایش

جس مجالس میں ماہ رو آوے　　　　شمع کا وہاں نہیں ہے گنجایش

مجھے سیرِ گلشن خوش آتا نہیں　　　　جُدا ہوگیا جب سے گل پیرہن

لفظ ساکن کو متحرک بنادینا بھی ولی کے زمانے کی ایک خصوصیت ہے جو راجارام کے کلام میں عام طور پر پائی جاتی ہے جیسے ؎

جوشِ حیا کا مکھ پہ ترے دیکھ کر عرق　　　　شبنم میں گل خجل ہو سراپا ہوا غرق

فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں ؎

---

[1] ایچ بمعنی کھینچ

شاخ گل پُر ہوئے غنچے ہیں نجان اے بوالہوس　　نوعروسی بُلبلوں کے تئیں دکھاتی ہے بہار

اس شعر میں غم پر سے غنچے کی ترکیب باجن و کلام دکنی کے دوَر کی خصوصیت ہے ؎

سخن دریائے وحدت کا ہے گوہر　　سجن میرے سخن کوں رکھ در گوش

پڑے کیوں کل مجھے پٹو کے بغیر از　　کیا ہے عشق اس کا دل کوں بے کل

مت رقیباں کے ساتھ بل گل رو　　آخرش گل کوں خار ہے منقاص

ولی کے دوَر کی ایک اور خصوصیت مندرجۂ ذیل اشعار میں پائی جاتی ہے ؎

شمع رو کی شب کو محفل میں جھلک دکھلا گیا　　اب تلک آیا نہیں وہ انتظاری ہے ہنوز

مہرباں ہوکر اسے راجارام ساقی نے مجھے　　ایک دن بوسہ دیا وہ خماری ہے ہنوز

دیکھ کر آئینے میں منھ اپنا　　مت غروری سے خودنمائی کر

واحد و جمع میں وہی قدیم قاعدہ برتا ہے ؎

بھنواں = محراب دیکھ تیری بھنواں کی اے قبلہ رو

فرشاں = باہر وہ آتا ہے سُن فرشاں بچھاتی ہے بہار

دو چار جگہ فارسی اضافت کو ہندی الفاظ کے ساتھ استعمال کیا ہے ؎

گزر گلشن میں اے گل پیرہن کر　　ہر ایک گل پر ترا نقشِ چرن کر

گزر ایک دن کیا سو اس کی بزم میں　　ہوا ہے تب ستی رنگِ پون سبز

راجارام کے کلام میں رعایتِ لفظی کی صنعت عموماً قدما کے طرز پر پائی جاتی ہے ؎

برہمنا ہو کے بیں عشقِ صنم میں　　یہ کعبہ دل کا بُت خانہ کیا ہوں

اے شکر لب توں ترش کر کر بات　　کنی[1] مٹھائی میں مت کھٹائی کر

---

[1] کنی بہ معنی کہیں

سجیلا دیکھ اوس کے سبز خط کوں　　غلامی خط دیا ہی لکھ کے سنبل

حُسن کے بحر سے لے آبِ وصل　　آتشِ ہجر کوں بجھایا کر

عشق کے پھاندے میں کھینچا حسن کے صیاد نے　　رکھ توں اپنے پاس گل رو بلبلِ دل کا قفس

تشبیہ و استعارہ میں بھی کوئی جدّت نہیں پائی جاتی۔ سیدھے سادے استعارے اور صاف تشبیہیں استعمال کی ہیں :۔

دو زلفاں رُخ پہ اُس کے یوں سہاوے　　کتابِ حُسن کوں گویا ہی جدول

نین دستے ہیں اُس کے سبز خط میں　　کہ جوں سبزی میں دستے ہیں ہرن سبز

خالِ سیہ، مُنھ پر ترے سے دستا ہی یوں　　حُسن کے گلشن میں جوں سیر کوں اُترا ہی زاغ

مُکھ پہ محبوب کے نہیں ہی خال　　حُسن کے شہر کا ہی وہ کُتوال

کلام میں صاف اشعار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں :۔

پیے جو مے خودی کے جام اُس کی چشمِ مرگوں سے　　شرابِ عشق سے ہر دم ہیں ہم سرشار ای واعظ

پرتوِ حُسن سے شمع رو کے　　جلوہ گر عاشقوں کی ہی محفل

ای راجارام اُس کے عشق میں یہ دل پریشاں ہی　　کہ جس کی زلف کا ہر مو ہوا ہی دام سنبل کوں

عشق میں گل بدن کے راجارام　　عندلیبِ ریاضِ وحدت ہوں

ولی و اشرف کی طرح راجارام نے بھی مشکل زمینوں اور قافیہ ردیف میں اکثر غزلیں کہی ہیں ایک غزل میں پیرہن سبز چمن سبز وغیرہ باندھا ہی :۔

وہ گل رو جب سے پہنا پیرہن سبز　　ہوا ہی اُس کے پرتو سے چمن سبز

گزر یک دن کیا سو اُس کے بر میں　　ہوا ہی تب ستی رنگِ پون سبز

ای راجا ظلم سیں اوس سبز خط کے　　کیے سارے شہید اپنا کفن سبز

ایک غزل میں فراغ، لاغ وغیرہ کو قافیہ ردیف قرار دیا ہو سے

اب کہو! یارو ہمارا کیوں ہوے خاطر فراغ دل ربا کرتا ہو گستاخی کتنیں ہو کر طفاغ

قول جو اوّل کیا ہو یار یاری کوں نبھا کذبؔ یہلك حدیث ہو ہم سے کیوں ہوتا ہو لاغ

لشکر خوباں میں راجارام ہشیاری ہو خوب گرچہ راعی سو رہے تو شیر ہوتا ہو شغاغ

اسی طرح ایک غزل میں گل زار کا تغمص دیدار کا تغمص وغیرہ باندھا ہو تو ایک جگہ تجنیس، تلبیس، بلقیس جیسے قافیے انتخاب کیے ہیں۔

زبانی روایتوں پر اعتبار کرکے کوئی شخص راجارام کے مسلمان ہونے پر کوئی حکم نہیں لگا سکتا اور اکثر ایسی روایتیں مذہبی قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں مگر جب راجارام کے کلام کو دیکھتے ہیں تو قدم قدم پر اس روایت کی صداقت پائی جاتی ہو کہ راجارام نے اس راز کو مخفی رکھنا چاہا۔ ایک جگہ لکھتا ہو سے

اے راجارام مت کر راز فاحش ہو بے شک وہ بہشتی مردِ خامش

دل کا چور زبان پر آیا مگر اس طرح سے

حُسن ہو یار کوں خدا کا فیض عشق ہو مجھ کوں مصطفےٰ کا فیض

ایک اور جگہ ہو سے

مجھے کیا خوف راجا عاقبت کا محمد کا وسیلہ کوں لیا ہوں

حشر کا غم نہ کر توں راجارام شافع حشر ہو نبی کی آل

مذکورہ بالا اشعار کو دیکھتے ہوئے بھی ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان تھا۔ کیوں کہ اکثر ہندو شعرا کے قلم سے ایسے اشعار نکلے ہیں جو ہندو مسلمانوں کی یگانگی اور اتحاد کا ثبوت دیتے ہیں۔ پنڈت دیاشنکر نسیم اپنی مثنوی گلزارِ نسیم میں لکھتے ہیں سے

کرتا ہو یہ در زباں سے یک سر حمدِ حق و مدحتِ پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہو یعنی کہ مطیعِ پنجتن ہو

لیکن راجارام اپنے جذبۂ عقیدت سے مجبور ہوکر اس کا صاف صاف اظہار کیے دیتا ہو۔ ایک جگہ

وحدت پرستی کا اس طرح اظہار کرتا ہو ؎

وہ گلِ نو بہارِ احدیت حُسن تیرا رنگیں دیکھا ہم کوں
عشق میں گل بدن کے راجا رام عندلیبِ ریاضِ وحدت ہوں

ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

اگر تجھ کوں ملے مرشدِ خاص خدا اور مصطفےٰ بس مت جُدا کر
ای راجارام کر ترک دوئی کو توں دینِ مصطفےٰ کوں رہنما کر

ایک ترجیع بند عشقِ الٰہی میں لکھا ہو اس کا بھی آخری بند سُن لیجیے ؎

گزر کر اسے دلدار میری طرف مرے عقل اور ہوش ہیں برطرف
سپر کو میرے دل کی پُرزے کیا نگاہ تیری گویا ہو تیرِ ہدف
عجب تیرے غم کا ہو گوہر صنم ہو سینہ میرا چاک شکلِ صدف
مری عرض سُن حُسن کے پادشاہ ترے سے دو عالم نے پایا شرف
تری یاد میں رام راجا ہو یار مگر جانتے ہیں وہ شاہِ نجف
ترے ہجر میں یار کب لگ رہوں مری اضطرابی یہ کس کو کہوں

مذکورہ بالا شہادتیں دیکھنے کے بعد ہمیں یقین ہوتا ہو کہ راجارام مشرف بہ اسلام تھا۔
راجارام کا کلام تصوف سے مملو ہو وہ فنا فی اللہ ہو چکا تھا اس کو ہر شئے میں ذاتِ حق کا مظہر نظر آتا تھا ؎

الحے راجارام سے مخفی رہا نہیں ہو سجن ہرگز اوسے ہر شئے میں دستا ہو آپیں اظہار ای واحد

خودی کو مٹا کر خدا کو حاصل کرنا چاہتا ہو ؎

اوّل عارف توں ہستی کو مٹا کر تصور دِل اوپر نقشِ بقا کر
کہاں ہو غیر جو کہنا اوسے غیر خیالِ غیر سے دل کو صفا کر
بغیر اوس کے ہر ایک شئ کو توں مت دیکھ خودی کو چھوڑ دے حاصل خدا کر

یار مجھ میں ہے محیط ہو کر نہاں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب تک دور ہوں
راز انا الحق حسن کا پایا سو میں ۔ چڑھ کے سولی عشق کی منصور ہوں
درحقیقت دیکھ راجارام میں ۔ گوہرِ اسرار کا گنجور ہوں

راجارام نے اپنی شاعری پر تو فخر نہیں کیا لیکن اپنے کلام کے صوفیانہ ہونے پر فخر کیا ہے۔ صرف دو مقطعے ایسے ملتے ہیں جن میں شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتی ہے ؎

راجا تیرے شعر کے معنے اگر سننے ۔ آویں ملک فلک سیتی لینے کتئیں سبق

گرچہ پاوے مغز راجارام تیرے شعر کا ۔ عارفاں بولیں گے سن کر ہے عبث نوع و حرف
طفلِ مکتب کیا سمجھتے ہیں اے راجا مغزِ خاص ۔ شعرِ تیرا جا سنا کئی صاحبِ عرفاں کوں

راجارام کے کلام کی خصوصیات کو غور سے دیکھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجارام ولی کے دور کا شاعر ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے کلام میں ولی یا کسی اور شاعر کا ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ راجارام نے شاید شاعری کو فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا مگر اس نے اس کو صرف مذہبی جذبات کا آلۂ اظہار بنایا کیوں کہ کلام میں راجارام اسرار کا گنجور، شرابِ عشق سے مخمور، اپنے معشوق کے ناز و ادا سے مسرور، دیدار کا طلب گار اپنی ایک ہی دھن میں سرگرداں نظر آتا ہے ؎

نمونۂ کلام

عشق میں چھوڑ کے عزیز و خویش ۔ شاہِ خوباں کے پاس ہو درویش
حسن دکھلا کے وہ کمانِ ابرو ۔ عشق کے تیر سے کیا دل ریش
کیوں لگے دل کے تئیں میرے آرام ۔ عقربِ عشق نے لگایا نیش
پارسا کیوں رہے صنم کے پاس ۔ زلف اُس کی ہے کافرِ بدکیش
عشق میں شمع رو کے راجارام ۔ مثلِ پروانہ جل۔ مت اندیش

اے دل شتاب چل توں اب اُس یار کی طرف ۔ خورشیدِ حسن صورتِ انوار کی طرف

ای عندلیبِ دل توں نظارے کوں چل شتاب — گل وہ گیا ہی سیر کوں گل زار کی طرف

ای دل توں گل عذار طرف جھک کہیں نہ جھک — بلبل ہو نوبہار طرف جھک کہیں نہ جھک
تجھ کوں اگر جہاں میں شہیدی کا شوق ہی — ابرو کی ذوالفقار طرف جھک کہیں نہ جھک
رکھتا ہی گرچہ ساغر و صہبا کی آرزو — اُوس چشم پُرخمار طرف جھک کہیں نہ جھک
راجا توں رام ہی تو کہیں گے تجھے ولی — بندہ ہو کردگار طرف جھک کہیں نہ جھک

شمع رد صحن چمن میں چل شبستان سے نکل — بلبلاں پروانہ ہو آئیں گلستاں سے نکل
تجھ لبِ رنگیں کا شہرت سُن کے ای خورشید رو — لعل سب آئے یہاں کانِ بدخشاں سے نکل
شام میں تجھ زلف کے دنداں سُبح کر شب چراغ — ناگ سے آتے ہیں من ملکِ سلیماں سے نکل
سیر کوں جاوے اگر توں باغ میں او گل بدن — پیشوا آویں گے گل اپنے خیاباں سے نکل
خوابِ مخمل مج کوں کیوں خوش آوے راجا رام آج — دل رُبا جاتا رہا ہی دوُر انکھیاں سے نکل

ہمیشہ آفتاب ہوتا ہی قرباں — بندھا سو بار دستارِ زری کوں
ادسی کی چشم میں باغ ارم ہی — جو کوئی[سلہ] دیکھا ہی اُس رشکِ پری کوں

سجن پر دل کوں دیوانہ کیا ہوں — وہ اپنا تھا سو بیگانہ کیا ہوں
صنم کے درد کی سمرن بنانے — ہریک انجو کوں دردانہ کیا ہوں
نیں اس محرابِ ابرو میں ای راجا — دوگانہ کرکے شکرانہ کیا ہوں

کبھو کئی جاکے اوس نورِ بصر سوں — کبھو توں دیکھ الفت کی نظر سوں
چھپا رکھ عاشقوں کا گنجِ اسرار — نہ کر اظہار زاہد بے خبر سوں
ترا مکھ مخزنِ نورِ الٰہی — تری تعریف کیوں ہووے بشر سوں
ای راجا جو موا مرنے کے آگے — وہی ہی بے فکر روزِ حشر سوں

سلہ کوئی

اصفہان کی بعض ادبی انجمنیں اور شعرا

تیرھویں صدی ہجری میں

نوشتہ: آقاے جلال ہمائی ——— ترجمہ: جناب محوی لکھنوی ——— (از مجلہ ’مہر‘ طہران)

بارھویں صدی ہجری کے آخر میں، اصفہان کی بہار آفریں سرزمین، اپنے ادبی اور شعری کارناموں کے لحاظ سے جن شاعروں اور ادیبوں کی رہینِ منت ہے، ان میں مشتاق اصفہانی کی شخصیت بہت ممتاز ہے۔ اس دوراندیش شاعر نے اپنی کوشش سے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی، جس نے فارسی نظم میں بڑا انقلاب کیا۔ دورِ صفویہ میں جو مذاقِ سخن رائج اور عام تھا، اُس کی کایا پلٹ دی، اور قدیم فصحا، مثلاً رودکی، فرخی وغیرہ کے طرز و اسلوب کو تازہ و زندہ کردیا۔ اس انجمن کے پیرو اُسی خط پر چلے جو ان قدیم بزرگوں نے قائم کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس عمل کا اثر پوری طور پر کام یاب ہوکر رہا۔

اس جدید ادبی و شعری رجحانات کے بانی اور اس نئی علمی بیداری کے علم بردار (مشتاق) نے سنہ ۱۱۷۱ھ میں وفات پائی، مگر اطمینان کے ساتھ، کیوں کہ جس تحریک کی مفید و مبارک بنیاد اُس نے ڈالی تھی، زمانے کی چیرہ دستیوں کے باوجود اس کا سلسلہ نہ ٹوٹا۔ مشتاق نے عمرِ طبعی کو پہنچ کر اپنی حیاتِ مستعار کو تو الوداع کہا لیکن اس کی ادبی تربیت کی روح زندہ رہی۔ اس کی فکر و کاوش کے پرورش یافتہ ہونہار شاعر اپنی پوری کوشش اور دل چسپی سے کام میں لگے رہے۔ اور ان میں سے ہر ایک نے ایک گروہ کی تربیت کا ذمہ

لے کر اپنی بہت سی زندہ یادگاریں چھوڑیں۔ ادبی انقلاب کے اس تاب ناک سلسلے میں جسے "بازگشتِ ادبی" کہنا چاہیے، لگاتار کڑیوں سے کڑیاں ملتی اور جڑتی رہیں، یہاں تک کہ اس کا سرا تیرھویں صدی ہجری تک جا پہنچا۔

۱۔ مشتاق کی وفات کے دس سال بعد آقائے محمد (عاشق اصفہانی) نے بھی انتقال کیا۔ جو اپنے استاد کا جانشین اور اس ادبی انجمن کا روحِ رواں تھا۔ اور اُس نے اپنے غزل گو تلامذہ کا ایک ایسا جتھا چھوڑا جو اس کے سبک و دل آویز طرز کا پیرو تھا۔

۲۔ سید محمد (ہاتف اصفہانی) بھی اسی انجمنِ مشتاق کے پیرووں میں تھے۔ انھوں نے سید محمد (سحاب) جیسا فاضل فرزند چھوڑا۔ سحاب نے ۱۲۲۲ھ میں وفات پائی۔

۳۔ لطف علی بیگ (آذر) نے حسن علی بیگ (شرر) جیسا لائق بیٹا دُنیا میں چھوڑا، جو اس تحریک پر چلتا اور چلاتا رہا۔

۴۔ الحاج سلیمان (صباحی) نے فتح علی خاں صبا جیسا قابل اور مایۂ ناز شاگرد پیدا کیا اور اپنی زندہ نامی یادگار چھوڑ کر سدھار گئے۔ صبا ایران کا بزرگ ترین ملک الشعرا ہوا اور اس نے ۱۲۳۸ھ میں دنیا سے کوچ کیا۔ اس طرح سے مشتاق کی تحریک بتدریج بڑھتی اور پھولتی پھلتی رہی۔ آخر تیرھویں صدی ہجری میں پوری طور پر آشکار اور نمایاں ہوگئی۔

ادبیاتِ فارسی کے مختلف اور متعدد دوروں میں تیرھویں صدی ہجری نمایاں اور ممتاز دور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زریں دور میں بہت سے بلند پایہ اساتذہ پیدا اور نمایاں ہوئے۔ ہر اُستاد قدیم فصحا کی طرزوں میں سے کسی ایک طرز و اسلوب کو پیشِ نظر رکھ کر دادِ سخن دیتا رہا۔ ان میں سے کچھ تو محض تقلید ہی پر قانع رہے، اور بعض تازہ اور نئے اسلوب کے موجد ہوئے، اور انھوں نے ایسی طرز کی داغ بیل ڈالی جس کی نظیر ادبیاتِ ایران میں کم یاب بلکہ نایاب تھی۔ اس صدی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایران کے اکثر و بیش تر شہروں میں کہنے اور لکھنے والوں (ادیب و شاعر) نے عرصۂ ہستی میں قدم رکھا۔

ان تمام سخن طرازوں اور انشا پردازوں کے ناموں اور ان کی ادبی و علمی زندگی کی تاریخ بیان

کرنے کے لیے تو درحقیقت ایک مستقل اور مفصل تصنیف کی ضرورت ہو لیکن افسوس! ان میں سے اکثر بچارے گم نام ہوگئے، ان کے آثارِ افکار کو شہرت کی نعمت میسر نہ آئی، یا مشہور تو ہوئے مگر اب اُن کا سرمایۂ افکار باقی نہیں۔ زمانے کے ہاتھوں تلف ہوچکا ہو۔ بہرحال اب ہم اُن انجمنوں کا مختصر ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے اربابِ ذوق و ادب کے ہاتھوں سرزمینِ اصفہان میں تشکیل اور نشوونما پائی۔

تیرھویں صدی ہجری میں جو ادیب و شاعر اصفہان میں گزرے ہیں، ان کی تعداد دو سو سے زیادہ ہو۔ ان میں سے بعض بزرگوں کے نام اور حالات تذکرۂ زینۃ المدائح، انجمن خاقان، مجمع الفصحا جلد دوم، لعد طرائق الحقائق میں آئے ہیں، مگر زیادہ تر ایسے ہیں جن کے ناموں اور حالات کا کسی کتاب میں نام نشان تک نہیں۔

اسی دور میں بہت سی انشاپرداز اور سخن طراز ہستیاں خاکِ اصفہان پر چمکیں اور مشہور ہوئیں، جو حقیقت میں شہرت اور ناموری کی سزاوار بھی تھیں۔ جیسے (۱) ناطق اصفہانی، (۲) سید محمد سحاب (۳) طبیب، (۴) نشاط، (۵) مجمر (۶) سروش۔ (۷) رزگر، (۸) فروغی، (۹) شہاب، (۱۰) قطرہ، (۱۱) محمد سعید ندا (۱۲) عمان سامانی، (۱۳) ہماے شیرازی وغیرہ۔ یہ سب تیرھویں صدی ہجری کے ادب پرور اور سخن گستر حضرات ہیں۔ جو مدّتوں اپنے وطن اصفہان میں دادِ سخن دیتے رہے اور آخرکار اسی سرزمین میں اپنی زندگیوں کو خیرباد کہہ کر پیوندِ خاک ہوگئے۔

اسی صدی میں اصفہان میں بہت سی ادبی انجمنوں کی بنیاد پڑی۔ زبردست اساتذۂ فن نے "نوکاروں" کی ادبی تربیت پر اپنی ہمّت و توجہ صرف کی۔ مختصر یہ کہ اس عصر میں ادبیات اور فنونِ ذوقیہ سے دلچسپی اصفہان کے عام و خاص میں کچھ اس قدر پھیلی اور بڑھی کہ علمائے روحانی میں سے ایک بزرگ ترین ذات، یعنی حاجی سید محمد باقر نے بھی شعرا اور اربابِ ادب کی ایک انجمن تشکیل دی۔ یہ بزرگ اپنے زمانے میں پوری مملکتِ ایران اور تمام شیعہ ممالک کے واحد و یگانہ مرکزِ روحانیت تھے۔ اور ہر ممکن طریقے سے سخن گویوں کی حوصلہ افزائی فرماتے، ذوق بڑھاتے اور شوق دلاتے رہتے تھے۔ زبانی ہی نہیں بلکہ گراں قدر انعام و اکرام اور بیش از بیش صلوں سے بھی شعرا کو اُبھارتے اور نوازتے تھے۔

ایک بڑی اکثریت کا عقیدہ ہو کہ سروش اصفہانی تیرھویں صدی کا سب سے بڑا قصیدہ سرا شاعر تھا۔ لوگ جانتے اور مانتے ہیں کہ وہ قدیم فصحا مثلاً فرخی و رودکی کے شیوۂ سخن کو دوبارہ زندگی دینے والا مسیحا ہو۔ وہ بھی سید صاحب مرحوم ہی کی دستگاہِ بلند پایہ کا پرورش یافتہ تھا۔

کتاب تذکرہ باقریہ کا ایک نایاب قلمی نسخہ ہمارے ایک فاضل دوست کے پاس ہو اور انھی کا ملاحظہ ہو۔ یہ کتاب اُن شعرا کے حالات اور ادبی آثار پر مشتمل ہو، جو سید موصوف کے مدّاح تھے، اور اُن کے خوانِ کرم سے بہرہ مند و فیض یاب ہو چکے ہیں۔

اب ہمیں اس کے علاوہ اور دوسری ادبی انجمنیں، اُن کے تاریخی حالات راقم مضمون نے بڑی تلاش سے اب تک ہم پہنچائے ہیں۔ تفصیل حسبِ ذیل ہو:-

(۱) ۱۳۰۰ھ کے دوران میں بعض اُستادانِ ادب مثلاً ہما شیرازی، تاج الشعرا شہاب اصفہانی کی ہمت و کوشش سے ایک "انجمن سیاری" (گشتی) قائم ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے گہرے دوست، ہم عصر اور ہم صحبت تھے۔ بہت سے شعرائے گرامی جیسے: مسکین، کیوان، سید محمد بقا اور دیگر شعرائے عصر اس کے جلسوں میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ یہ انجمن اپنے ارکان میں سے کسی ایک رُکن کے مکان پر ہفتہ وار منعقد ہوتی تھی۔ مبتدی شعرا بھی اپنے اشعار کی درستی و اصلاح اور اساتذۂ انجمن سے کسب فیض کے لیے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اس طرح یہ انجمن کوئی دو سال تک جاری رہی۔ آخر ہما شیرازی کے بیمار پڑجانے کی وجہ سے بند ہوگئی۔

(۲) اس "انجمنِ سیاری" کے بعد ایک دوسری "انجمنِ ثابت" (غیر گشتی) مرحوم ملا محمد باقر گزی کے دولت کدے میں قائم ہوئی۔ یہ بزرگ ابوالفقرا کے نام سے معروف تھے اور اصفہان کے خوش ذوق، صاحب دل، نیک سیرت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے، فقرا کے ساتھ ان کی اعانت اور درویشوں کے حق میں ان کے حُسن سلوک کی بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ غرض کہ اس انجمن میں بھی بہت سے اساتذۂ وقت اور ہونہار نوجوان شاعر حاضر ہوکر فیض پہنچاتے اور پاتے رہے۔

ان انجمنوں کا طریقہ یا اصولِ کار یہ تھا کہ گزشتہ قدیم اساتذہ میں سے کسی اُستاد کا کوئی مصرع بطورِ

طرح کے دے دیا جاتا، ہونہار شاعر اس پر طبع آزمائی کرکے، غزلیں کہہ کر لاتے اور اساتذۂ سخن ان "نوکاروں" کے کلام کی اصلاح فرماتے تھے۔ اس انجمن میں ہما اور شہاب بہت کم جاتے تھے۔ کیوں کہ نوبتِ شاعری، اب ان سے گزر کر آگے بڑھ چکی تھی۔ اور ان کے دبازمانده، (خلف) تک پہنچ چکی تھی مثلاً: ہما کے بڑے فرزند عنقا اور شہاب کے خلف الصدق ثاقب اب اس کے علم بردار تھے۔ اس ادبی انجمن کی ایک، گراں بہا یادگار، جو خوش نصیبی اور اتفاقِ وقت سے راقم مضمون کو دستیاب ہوئی ہے، یہ چند غزلوں کا مجموعہ ہے۔ سب غزلیں ایک ہی وزن و قافیے میں ہیں، یعنی ہم طرح اور اسی دور کے شعرا کی کہی ہوئی ہیں۔ میرزا عبدالرحیم افسر نے ۱۳۰۵ھ میں اپنے ہاتھ سے مجموعے یا گلدستے کی صورت میں خوش خط لکھی ہیں۔ افسر اپنے وقت کے اچھے شاعر اور مشہور و معروف خوش نویس تھے۔ اتفاق کہ یہ وہی سال ہے جس سال اس انجمن کے بانی نے وفات پائی۔

مرحوم عنقای سامانی نے ایک "قصیدۂ انجمنیہ" کہا ہے۔ اس میں انجمن کی خوبیاں بیان کی ہیں اور ان اساتذہ کے نام لیے ہیں جو انجمن میں شرکت فرماتے تھے۔

یہ اور اس کے علاوہ ایک اور "قصیدۂ انجمنیہ" ہمارے ہاتھ لگا ہے، جو مرحوم پرتو اصفہانی کا کہا ہوا ہے یہ قصیدہ بھی اسی انجمن کے اوصاف میں ہے۔ افسر کے مرتبہ مجموعے سے چند ہم طرح غزلوں کا ایک ایک مطلع بطورِ نمونہ پیش ہے۔

دوش بر گردنِ من سلسلہ از موے تو بود — دلم آشفتہ تر از موے تو بر روے تو بود — (از عبدالرحیم افسر)

از ازل قبلۂ صاحب نظراں روے تو بود — عارفاں را ہمہ محراب دل ابروے تو بود — آشفتہ

ماہِ نو دوش نمایاں ز سرِ کوے " " — لیکن امروز شنیدیم کہ ابروے " " — مسکین

کارِ امروز بس آشفتہ تر از موے " " — درکفم دوش مگر حلقۂ گیسوے " " — الفت

سرو نورستہ شبیہِ قد دل جوے " " — بر سرش ماہے اگر ہم چو مہ روے " " — انجم

اے کہ آشفتگیِ ما ہمہ از موے " " — دلِ ما بود کہ زنجیریِ گیسوے " " — پرتو

سنبلی دوش بہ آغوشِ گل روے " " — دل گماں کرد کہ مشک است دلے موے " " — بقا

ای خوش آں روز کہ منزل گہِ ما کوے تو بود　دیدہ را روشنی از طلعتِ نیکوے تو بود　ناصری

با غسّل گر ہمہٗ عمر چو من خوے　" "　ہم چو موم آہن و فولاد ز بازوے　" "　اشتہا

عمان سامانی کے قصیدے میں ۷۰ شعر ہیں۔ اس کے اعلیٰ معیارِ ادبی سے قطع کر کے دیکھا جائے تب بھی یہ اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ شعرا کے ناموں اور تعریفوں کے بعد امین الدولہ کی مدح پر ختم ہوتا ہے۔ جو محض شعرا کی حوصلہ افزائی اور ان کے شوق کو اُبھارنے کے لیے انجمن کے جلسوں میں کبھی کبھی تشریف لے آتے تھے۔ فارسی کا مذاق چوں کہ ہمارے ملک میں عام طور پر بہت کم ہوگیا ہے، اس لیے ہم اس قصیدے کے صرف پانچ شعر لکھتے ہیں ؎

دیگراں را شوقِ بستاں برسر و سرو چمن　ما و رندانِ غزل خواں و فضاے انجمن

ما ہنر را اختر انیم انجمن ما را سپہر　ما سخن را بلبلانیم انجمن ما را چمن

اندر آ، تا حوزۂ بینی پُر از عقل و رواں　اندر آ، تا روضۂ بینی پُر از سرو و سمن

محفلے، آمادہ وردے، ہم محبت، ہم صفا　مجمعے، آوارہ از دو کر ہم تکلف ہم سخن

یک طرف گرم غزل خوانی حریفانِ جواں　یک طرف مستِ سخن دانی ظریفانِ کہن

عمان نے اپنے اس قصیدے میں، جو اخلاص و محبت کے جذبات سے سرشار ہے، جن گرامی قدر شعرا کا تذکرہ کیا اور اوصاف بیان کیے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: (۱) مسکین، (۲) پرتو، (۳) عنقا، (۴) افسر، (۵) بقا، (۶) سرگشتہ، انھی کا دوسرا تخلص اشتہا تھا۔ (۷) آشفتہ، (۸) فروغ، (۹) ساغر، (۱۰) دہقان، (۱۱) شعری، (۱۲) جوزا، (۱۳) پروین۔[1]

(۳) مرحوم ابوالفقرا کی وفات کے بعد، جو ۱۲۸۶ھ میں ہوئی، اس مفید و نامی انجمنِ ادبی کی رفتار بند ہوگئی۔ اور کچھ عرصے تک بند ہی رہی۔ آخر اُس دور کے شعرا اور اربابِ ذوق نے مرحوم ہما اور مرحوم تاج الشعرا شہاب یس خدمت میں حاضر ہوکر اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ انجمن دوبارہ جاری کی جائے۔

---

[1] ان سب ادب نواز سخن وروں کے حالاتِ زندگی، آقائے جلال ہمائی نے اپنی کتاب "نامۂ دانش مندانِ اصفہان" میں بڑی کاوش اور جستجو سے بہم پہنچا کر تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ محوی

ہما اس وقت بہت بوڑھے جہاندیدہ ہو چکے تھے۔ اور مرحوم شہاب اس زمانے میں صاحب ثروت و دولت تھے کیونکہ وہ ساکن شہر اور حکام وقت سے ان کے مراسم بڑھے ہوئے تھے اکثر و بیشتر ان کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض اور وجوہ سے بھی انھوں نے اس مفید گزارش پر التفات نہ کی۔ مرحوم ہما، جیسا کہ ان کے معاصرین اور تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے، طبعاً ارباب حکومت سے تنگ تنگ رہتے، اور امرا کے ساتھ میل جول رکھنے سے دور بھاگتے تھے۔ وہ صرف ارباب ذوق کے ساتھ گھل مل کر رہنے کو دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ پسند کرتے تھے، خصوصاً علم و ادب کے ہونہار نونہالوں کی تربیت اور فیض رسانی اِن کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ تھا۔ اسی سبب سے وہ اپنی پیرانہ شکستہ دلی اور کہنہ سالی کے باوجود اس انجمن کی تشکیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن اکثر و بیشتر مرحوم ہما ہی کے مکان پر منعقد ہونے لگی۔ اصل میں یہ گشتی انجمن تو نہ تھی، مگر علم و ادب کا چسکا رکھنے والوں میں جو چاہتا اُس کے ارکان کو اپنے یہاں بُلا سکتا تھا، دعوت بخوشی قبول کی جاتی اور انجمن اپنے میزبان کے گھر پر جمتی تھی۔

اس عہد کے بعض سربلند اور امیر لوگ بھی اس قسم کی انجمنوں کو قوم و وطن کے لیے ایک طرح سے مفید ادارہ اور شعر و ادب کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ اور وہ خود بھی کبھی کبھی دعوت دینے میں سبقت فرماتے تھے۔

مرحوم تاج الشعرا شہاب اور مرحوم ہما میں ذاتی دوستانہ مراسم کے علاوہ ہمسائگی کا رشتہ بھی تھا، اسی نظر سے وہ جب کبھی اصفہان میں موجود ہوتے اور انجمن کا جلسہ ہما مرحوم کے دولت کدے پر ہوتا، تو بڑی خوش دلی کے ساتھ شریک ہوتے اور مبتدیوں کو فیض پہنچانے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

شہاب کی ادبی یادگاروں میں چند قصائدِ انجمنیہ بھی ہیں۔ ان میں سے ایک قصیدے کا آغاز اس تشبیب سے ہوتا ہے

بادِ فروردیں در طرف چمن نافہ گشا است — ز نسیمِ گلزار سبزہ نشو و نما است

انجمن کا وصف کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے: " برآں محفل استادِ سخن سنج ہما است "۔ اس قصیدے میں کئی شعرا کا نام الگ الگ شعروں میں لیا ہے مثلاً (۱) مسکین، (۲) پرتو، (۳) بقا، (۴) ساغر، (۵) عمّان

(۶) الفت، (۷) عنقا۔ ان میں ہر ایک کے وصف میں جدا جدا دو دو تین تین شعر ہیں، مثلاً عمان کی نسبت کہتا ہے ؎

وان دگر عمان آن بحرِ فصاحت کہ بہ نظم　　خامہ اش گاہ گہر بخش و گہے گوہر زا است

طبعِ سرشارش دریا و مضامینش گہر　　وین سخن ہست مسلّم کہ گہر زا دریا است

اور چند شاعروں کا اکٹھا ایک ہی شعر میں ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً ؎

یک طرف نامی و آشفتہ و مفتون و شہاب　　یک طرف فرخ و دہقان و نہا و جوزا است

یہ قصیدہ اس موقع پر کہا اور پڑھا گیا ہے، جب کہ انجمن خود مرحوم ہما کے گھر پر ہوئی تھی اور مرحوم شہاب بھی اس میں تشریف فرما تھے۔ اس قسم کی دورنگی تقسیم کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں کہ اگر درجۂ اوّل کے شعرا کو الگ بیان کرنا مقصود تھا اور درجۂ دوم کے سخن وروں کو الگ تو لازم تھا کہ مرحوم شہاب کا نام مفتون اور نامی کے بعد نہ دیا جاتا۔ اس لیے کہ یقیناً وہ اس انجمن بلکہ اُس دور کے درجۂ اوّل کے اساتذہ میں ہیں۔ شاید یہ وجہ ہو کہ شہاب مرحوم انجمن کے مستقل ارکان میں نہ ہوں اور جلسوں میں کم آتے ہوں۔ (؟)

اس انجمن کی تاریخی یادگاروں میں ایک قصیدۂ انجمنیہ اور ہے، اس کا مصنف حاجی محمد کاظم خاموش ہے۔ قصیدے کا آغاز حاجی خاموش نے حافظِ شیرازؒ کے ایک مطلع سے کیا ہے، اور براعۃ استہلال[1] کے طور پر شعرا کے نام لایا ہے۔ مطلع اور چند شعر پیش ہیں ؎

دلا تو تاج وِدیہ شہر بند امکاں باش　　بخواہ تاج زفرِّ ہما و سلطاں باش

بہ بزمِ منعم و مسکیں چو پرتوے فگنی　　تو زیبِ افسرِ رندانِ پاک داماں باش

---

[1] براعۃ استہلال، فنِ بدایع کی ایک صنعت کا نام ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ شاعر یا منشی اپنی کتاب کے ابتدائی خطبے یا قصیدے وغیرہ میں ایسے الفاظ لائے جو موضوعِ تصنیف سے متعلق ہوں مگر یہاں بقیۂ عبارت یا الفاظ کے ساتھ ظاہری مطلب کچھ اور ادا کرتے ہوں اور ساتھ ہی مصنف کے مطالبِ آیندہ و موضوع پر دلالت کرتے ہوں۔ مثلاً ان شعروں میں: ہما، منعم، مسکین، افسر، بے نوا، اشعار کے اور الفاظ سے مل کر ان اشعار کا مطلب ظاہری بتاتے ہیں اور اس پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ قصیدے کا موضوع کیا ہے اور آیندہ اشعار میں شاعر ان سے متعلق کچھ بیان کرنے والا ہے۔ محوی

به بے‌نوایان[۱] ہر دم ز نو نوائے بخش ‏ ‏ برآر سر ز گریباں به فکر ساماں باش

جن الفاظ پر خط ہے یہ شعرا کے تخلص ہیں، اسی ترکیب سے بہت سے دوسرے شعرا کے تخلص آئے ہیں۔ قصیدہ بڑی محنت و کاوش سے کہا ہے اور اس صفت کو بڑی خوبی سے نبھایا اور دکھایا ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس پندرہ شعر پیش کیے جاتے لیکن طولِ کلام کا خوف اور فارسی سے عام بے‌ذوقی مانع ہے۔ بہرحال اس میں حسبِ ذیل نام آئے ہیں: (۱) ہما، (۲) مسکین، (۳) بے‌نوا، (۴) منعم، (۵) پرتو، (۶) افسر، (۷) بقا، (۸) ساغر، (۹) پروین، (۱۰) آشفتہ، (۱۱) پریشان، (۱۲) والہ، (۱۳) مفتون، (۱۴) فرخ، (۱۵) جیحون[۲]، (۱۶) عمان، (۱۷) سہا، (۱۸) عنقا، (۱۹) ناصری، (۲۰) سرگشتہ[۳]، (۲۱) مانی، (۲۲) حیران، (۲۳) شعلہ، (۲۴) ضیا، (۲۵) انجم، (۲۶) ہمت، (۲۷) شہاب، (۲۸) ثاقب، (۲۹) ہلال، (۳۰) بیضا، (۳۱) بہا، (۳۲) رضوان، (۳۳) بے‌دین[۴]، (۳۴) کافر، (۳۵) آصف، (۳۶) خاموش، (۳۷) شعری، (۳۸) جوزا، (۳۹) کیواں۔

۴۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں اس دور کے بزرگ‌ترین شعرا میں سے دو اُستاد ہما اور شہاب انتقال فرماگئے، اس کے علاوہ ۱۲۸۸ھ میں سرزمینِ اصفہان میں ایسا شدید کال پڑا کہ خدا کی پناہ! اس قحط نے اصفہان میں رہنے والوں کو زندہ درگور کردیا۔ جینا عار اور جان بچانا دشوار ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ادبی انجمن بند ہوگئی ان اربابِ نظم کا رشتۂ اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ آخر مدتِ مدید کے بعد مرحوم ہما کے سب سے بڑے فرزند مرحوم میرزا محمد حسین عنقا نے پھر از سرِنو اس انجمن کی تشکیل کے لیے کمرِ ہمت باندھی، اور ایک "انجمنِ ثابت"

---

[۱] مراد ہیں: میرزا حسن، جو پہلے بے‌نوا تخلص کرتے تھے، پھر انھوں نے اپنا تخلص آتش رکھا، یہ بزرگ صائب و کلیم کی طرز میں بہت اچھا کہتے تھے۔

[۲] یعنی جیحون اصفہانی، جو اصفہان کے کریم‌النسب سادات میں سے تھے۔ یہاں جیحون یزدی، مصنف نمک‌دان مراد نہیں ہیں۔

[۳] یعنی مرزا محمد عبداللہ۔ ان کے دو تخلص تھے۔ ایک سرگشتہ، اور دوسرا اشتہا۔ یہ ابواسحاق (دسوق) اطعمہ کی طرز پر شعر کہتے تھے۔ اور اس طرز کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ کسی ہم‌عصر شاعر نے ان کی تاریخ کیا خوب کہی ہے: "ای واے کہ اشتہا نداریم دگر" بواسحٰق اطعمہ پر عالمگیر کے گزشتہ سالانہ نمبر میں ہم مشفقانہ اور مفصل مضمون لکھ چکے ہیں۔ محوی

[۴] یہاں مراد ہیں ملا ہادی جو بہ مصداق "برعکس نہند نام زنگی کافور" بے‌دین تخلص کرتے تھے لیکن اصفہان کے مشاہیر صاحبِ عرفان بزرگوں میں تھے۔

اپنے ہی مکان پر جاری کی۔ لوگ ان کی اُستادی کو جانتے اور مانتے ہی تھے، شاعری کے رموز و نکات معلوم کرنے کے لیے جہاں تک طلبائے فن سے ہوسکا اِس میں حصّہ لینے لگے اور شرکت سے ذرا بھی غفلت نہیں برتتے تھے۔ اِس دور کے کئی اساتذہ مثلاً عمّان، مسکین، کیوان، پرتو وغیرہ بھی اس میں دل چسپی لیتے اور آمد و رفت رکھتے تھے، اور اس نیّت و ارادے سے کہ شعرا کے حوصلے بڑھیں، اربابِ ذوق کا شوق بڑھے نہ پائے، نیز اس خیال سے کہ ان کی دیکھ بھال، غور پرداخت، ذوق و ادب کا پسندیدہ شیوہ بلکہ واجبی فریضہ ہے، وہ پوری طرح سے اس کا ساتھ دیتے، ہر ہفتے حاضرِ جلسہ ہوتے اور خدمت بجا لاتے تھے۔

مرحوم عنقا خصوصاً نوجوان شعرا کا شوق بڑھانے کے علاوہ ان کو شاعری کی باریکیاں سمجھانے میں ذرا بھی کمی نہ کرتے تھے، اور قواعدِ فنی سکھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے، اور جس صورت سے بھی ہوسکتا وہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے عزم و ہمت کو اُبھارتے۔ ان کے دلولوں کو اُکساتے رات دن اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ وہ ہر ہفتے سرکاری عہدہ داروں، شہر کے معزز و ممتاز رئیسوں اور حکّامِ حکومت میں سے بھی کسی نہ کسی کو ہر جلسے میں بُلاتے تھے۔ یہ لوگ بھی اپنی فطری رغبت یا زمانے کے اقتضا سے آتے اور انعام و اکرام سے شعرا کی مزید ہمت افزائی و حوصلہ آفرینی کا فرض ادا کرتے تھے۔ اس انجمن میں بہت سے اساتذہ وقت شرکت فرماتے رہے، مثلاً: عمّان، مسکین، پرتو، افسر، کیوان، منعم، الفت، اختر، سہا وغیرہ بہت سے نوجوان تازہ بہ تازہ عرضِ ہنر کرتے تھے۔ مثلاً رزمی، بزمی، ذوقی وغیرہ۔

اسی زمانے میں مرحوم نثار شیرازی نے اصفہان کا سفر کیا، انجمن عنقا میں بھی حاضر ہوئے اور ایک قصیدہ انجمنِ عنقا کی تعریف میں تیار کیا۔ جس میں اور کئی اساتذہ کا بھی نام لیا اور ذکر کیا ہے۔

عنقا کی یہ ادبی انجمن ۱۳۰۸ھ تک چلتی اور پھولتی پھلتی رہی۔ اسی سال عنقا بیمار ہوئے، بیمار بھی ایسے کہ بستر سے لگ گئے۔ اس وجہ سے پھر اس محفلِ ادب کا رشتۂ نظم درہم و برہم ہوگیا۔

ہاں، یہاں یہ بھی بتادینا ہے کہ نہا اور عنقا کی انجمنوں کے درمیان میں جو خالی زمانہ گزرا ہے، اُس میں ایک چھوٹی سی انجمن چند ماہ تک مرحوم میرزا محمد علی مسکین کے گھر پر چلتی رہی، لیکن یہ ''دولت مستعجل'' تھی۔

عنقا کے بہترین کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ شعرائے انجمن کا سارا کلام خود اپنے خط سے

لکھ کر مرتب اور محفوظ کرتے رہے، جس کا کچھ حصہ دست یاب ہوا ہے۔

مرحوم عنقا کی وفات کے بعد [illegible] تا [illegible] کے درمیان میں یہ ادبی انجمن پھر بند ہوگئی اور ایک عرصے تک اپنی نیست بسانی سے مجبور رہی۔ آخر کار [illegible] کے اثنا میں مرحوم طرب نے جو ہما کے دوسرے بیٹے اور عنقا کے چھوٹے بھائی تھے، پھر کوشش کی کہ جلد انجمن دوبارہ قائم و جاری ہوجائے اور طلبائے فن کو اپنی گزشتہ روایات کے بموجب فائدہ پہنچائے۔ ان کے دوسرے بھائی شہا اور کئی دوسرے اساتذۂ وقت کی ہمت و اعانت اور دوامی شرکت سے یہ سعی بار ور ہوئی۔ مثلاً عمان، افسر، بیضا وغیرہ۔ اب اس کے ہفتے وار جلسے مرحوم طرب ہی کے گھر پر ہوتے تھے اساتذہ اور طلبا بہ کثرت شرکت کرتے تھے۔ یہ انجمن مدت تک جاری اور اپنا کام کرتی رہی۔

طرب کی انجمن کے ارکان کوئی پچاس شعرا سے زیادہ تھے۔ مذکورہ حضرات کے سوا حسبِ ذیل شعرا بھی حاضرِ انجمن ہوتے رہے۔

(۱) دہقان (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) ذوقی (۵) ساکت (۶) آتش (۷) انجم (۸) ثاقب (۹) جلالی (۱۰) شحنہ، وغیرہ

(۶) مرحوم طرب کو اپنی ضرورت سے اصفہان چھوڑ کر طہران جانا پڑا۔ اس سفر کی بدولت انجمن پھر بند ہوگئی۔ تھوڑے دنوں بعد، مرحوم میرزا [illegible] علی نقی خاں "کمان افسر" نے، جو اصفہان کے ممتاز، ادب پرور اور دانش مند سرداروں میں تھے، ایک نئی انجمن قائم کی۔ تقریباً ۴ سال سے زیادہ یہ انجمن کام یابی کے ساتھ اُن کے دولت خانے میں منعقد ہوتی رہی۔ اس میں اصفہان کے شعرا عموماً جاتے اور حصہ لیتے رہے۔

(۷) میرزا علی نقی خاں کی انجمن کے بند ہونے پر، مرحوم سید محمد حقائق شیرازی نے ایک ادبی انجمن کی بنا ڈالی، یہ اپنے زمانے کے ایک روشن خیال فاضل بزرگ تھے۔ انھوں نے اصفہان میں جدید طرز و اسلوب پر ایک مدرسہ بھی جاری کر رکھا تھا، جس کا نام "دبستانِ حقائق" تھا۔ یہ انجمن ہر شبِ جمعہ کو برپا ہوتی تھی۔ اکثر اُدبا اور شعرا تشریف لاتے اور شرکت فرماتے تھے۔

مرحوم فرصت شیرازی ایک بار اصفہان آئے تھے؛ انھوں نے اپنے سفر میں اس انجمن کو بھی

دیکھا۔ اور اپنی تصنیف میں اس کے کئی اساتذہ مثلاً سہا، طرب، منتہم اور بزمی کا تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(۸) انجمن حقائق کے بعد اصفہان میں مدت تک کوئی ایسی انجمن قائم نہ ہوسکی، آخر رسالۂ دانش کدۂ اصفہان کے فاضل مدیر آقاے شیدا نے اس کمی کو محسوس کیا اور ۱۳۱۲ھ کے دوران میں پھر ایک ایسی انجمن بنانے کے لیے سوچ بچار، دوڑ دھوپ اور صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ یہ بزرگ بھی ملک کے فضلا اور دانش مندوں میں شمار کیے جاتے ہیں، آخر انھوں نے اپنی رہنمائی اور حسنِ انتظام سے ادب و شعر کے باقی ماندہ اساتذہ کو دعوتِ ادب دے کر پھر اکٹھا کیا۔ جیسے: آتش، منتہم، غمگین، ساکت، سینا، گلشن، ثاقب، بابری، انصاری (آقاے میرزا موسیٰ)

خدا کے فضل اور آقاے شیدا کی سرگرمی و توجہ سے شمعِ ادب جلتی اور انجمن چلتی رہی، مبتدی نوجوان بہ کثرت اس انجمن سے بہرہ مند اور فیض یاب ہوتے رہے۔ آقاے جلال ہمائی "نامۂ دانش مندانِ اصفہان" لکھتے ہیں کہ:-

"راقم بھی تقریباً اس انجمن کی زندگی بھر اس میں حاضر ہوتا اور فائدہ اٹھاتا رہا۔ حالتِ شوق یہ تھی کہ ہر روز سارے سارے دن جمعے کا منتظر رہتا تھا کہ کب یہ مبارک دن آئے اور استادانِ وقت کے سامنے حاضر ہوکر دانش اندوز ہوں۔"

اس انجمن میں اور بہت سے ہونہار نوآموز شاعر آتے تھے جو رفتہ رفتہ اپنی محنت اور فیضِ اساتذہ سے درجۂ کمال پر پہنچ گئے۔ آج بھی خدا کے فضل سے انجمن کے اکثر و بیشتر اربابِ کمال زندہ و سلامت ہیں، اور اصفہان کی مایۂ ناز و فخرِ روزگار ہستیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(۸) آقاے شیدا کے مکان پر جو شمعِ ادب فروزاں تھی، افسوس کہ بعض ایسے وجوہ سے جن کا بیان کرنا مناسب نہیں، وہ بھی خاموش ہوگئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد پھر ایک نئی انجمن شعرا مرحوم ادیب فرہمند کے دولت خانے پر وجود میں آئی۔ جلال ہمائی موصوف نے اس کے اساتذہ سے بھی بہت کچھ فیض پایا ہے

۱۳۵۰ھ ہجری میں میرزا عبدالحسین خاں ادیب فرہمند دنیا سے سدھارے اور یہ انجمن بھی ختم ہوگئی۔ اب

اصفہان خالی ہے۔ اس کے بعد سے اب تک وہاں کوئی ایسی انجمن موجود نہیں۔ لیکن امید ہے کہ پھر کسی صاحب ہمت، ذوق پرور، ادب نواز ہستی کی مدد اور مساعی سے یہ کمی پوری ہو جائے گی اور ذوق و ادب کی مشعل اس ذوق آفریں سرزمین میں ہمیشہ خاموش نہ رہے گی۔

سرسیّد کے لکچر (یعنی تقریریں)

(مقالہ جناب سید رشید الحسن صاحب ایم اے عثمانیہ)

(۱) تقریر کا موجودہ مفہوم

موجودہ زمانے میں تقریر نے اپنے گزشتہ مفہوم کو بھلا دیا ہے۔ اب تقریر وہی سمجھی جاتی ہے جس کے سامعین کی جماعت عامۃ الناس یعنی عوام و خواص پر مشتمل ہو۔ موضوعات بھی ایسے ہوں جو عام رجحان کو ابھار سکیں یا ملک کے مسائلِ حاضرہ پر روشنی ڈال سکیں۔ تحقیقات سے پایا جاتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر ہی میں اس قسم کی تقاریر کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور ان کی سرحد مذہبی موضوع کو چھوڑ کر علمی اور سیاسی عنوانات تک آ چکی تھی۔ انھی ایام بلکہ ان سے کچھ عرصہ پہلے عرب اور ایران وغیرہ ہر جگہ علمی اور فلسفی مباحثوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ حاجی لطف علی خاں آذر نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ شیراز[ف۱] کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ تھے۔ سعدی شیرازی کے متعلق لکھا ہے کہ

طالب[ف۲] علمی کے زمانے میں ان کے ہم عمر اور ہم سر لوگ ان کی خوش بیانی اور حسنِ تقریر پر رشک کرتے تھے۔

وہ ایک سلجھے ہوئے عالم اور محقق تھے۔ ان کو اکثر موقعوں پر فقہا اور قضاۃ کے مجمعوں میں بحث و مناظرے

ف۱۔ حیاتِ سعدی مرتبہ حالی　　　ف۲۔ حیاتِ سعدی صـ ۱۸

کا اتفاق ہوا ہو

جہاں تک کہ یونان و روما کا تعلق ہو بعثتِ مسیح سے قبل یہاں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے۔ یہ مجلسیں مباحثوں سے محفلیں گرم رہتی تھیں۔ سیاسی تقریروں کا عام رواج تھا۔ بلوٹارک کی مشہور کتاب مشاہیرِ یونان و روما میں اس کی مثالیں کثرت سے درج ہیں۔ چناں چہ جس زمانے میں ایتھنز اور اہلِ میگارا میں جزیرۂ سیلمس کی بابت مدت دراز سے جنگ جاری تھی اور ایتھنز کو بار بار شکستیں ہو رہی تھیں اس وقت ایتھنز کا مشہور مقنن سولن زندہ تھا۔ اس نے اپنی قوم کو غیرت دلانے کے لیے اپنا حال مجنونوں کا سا بنا لیا اور ایک بلندی پر جہاں اکثر فصحا منادی کیا کرتے تھے جاکر کھڑا ہوا اور اپنی عادت کے خلاف اشعار پڑھنے شروع کیے جس میں اپنے مُلک کے باشندوں کو غنیم کے خلاف بہت اُکسایا۔ اس واقعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہو کہ ایتھنز (یونان) میں قدیم ہی سے ایک بلند جگہ مقرر تھی جس پر کھڑے ہوکر اکثر فصحا عوام النّاس کو مخاطب کیا کرتے تھے اور تمام مجمع کے خیالات پر اپنی حکومت کرتے تھے۔

شیکسپیر کے ڈرامے جولیس سیزر میں دکھایا گیا ہو کہ اینٹونی روما کا ایک بڑا سیاس اور زبردست مقرر تھا۔ اس کی وہ تقریر جو اس نے سیزر کے قتل پر کی تھی آج تعلیم یافتہ طبقے کے زبان زد ہو۔ اس کی جادو بیانی کا وہ عالم بتلایا گیا ہو کہ آن کی آن میں سامعین اینٹونی کی تقریر کے سیلاب میں بہ گئے اور اس جوش میں سیزر کے قاتلوں کو قتل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔

عصرِ جدید میں بھی تقریرِ عامہ (Public Speaking) کا بہت رواج ہو اور اب اس کو فنی درجہ بھی دیا گیا ہو۔ خصوصًا لاسلکی کی ایجاد سے تقریرِ عام کو اور اہمیت حاصل ہوگئی ہو۔ اس میں قابل قابل حضرات کی تقریریں آئے دن ہوا کرتی ہیں جن کو عالمگیر حیثیت حاصل ہو۔

(۴) سرسید سے پہلے ہندستان میں تقریر

تقریر کا وہ مفہوم جو دوسرے ممالک میں قدیم زمانے سے رائج تھا ہندستان میں ہندوؤں

کے ہاں بالکل جُداگانہ صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ ان کے ہاں تقریر کی صرف ایک صورت تھی اور وہ صرف مذہبی۔ لیکن اس کو تقریر کہنا تقریر کے مفہوم کو فوت کرنا ہو۔ ان کی تقریریں محض راماین یا مہابھارت کی تلاوت سے آگے نہیں بڑھتی تھیں اور ان کتابوں کے پڑھنے کا مدعا صرف یہ تھا کہ کوئی مذہبی یا اخلاقی نکتہ سامعین کے لیے نمایاں کیا جائے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کے ہاں بھجن کا بھی رواج تھا جس میں ساز بھی ساتھ رکھا جاتا تھا۔ یہ بھجن کسی کھلے میدان میں مقرر کیے جاتے۔ عوام اس کے سُننے کے لیے جوق درجوق آتے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ بعض مخصوص لوگ راماین اور مہابھارت کے اشلوک مع ساز کے گاتے جاتے اور درمیان میں ٹھیر ٹھیر کر ایک شخص ان کی تشریح کیا کرتا۔ یہ مجلسیں بعض وقت ایک ایک ہفتے تک جاری رہتیں۔ بھجن ہوتے تو اشعار تھے لیکن ان میں جو نکات پائے جاتے تھے ان کی تشریح میں بھجن کے پڑھنے والے جن مطالب کو پیش کرتے تھے ان کا بیان تقریر سے کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا۔

ہندستان کے قدیم سادھو اور سنیاسی بھی اپنے چیلوں اور عوام کے سامنے ترکِ دُنیا، بے ثباتیٔ دُنیا اور ناپائداری لذائذِ دوروزہ سے پرہیز کرنے کے بارے میں تقریریں کرتے رہتے تھے۔ یہ گاؤں گاؤں پھر کے مُلک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچتے۔ اور سفر کی ہزارہا مصیبتیں اور کلفتیں اُٹھاکر اپنا بیان عوام کو سُنایا کرتے تھے۔

قدیم ہندو راج دھانیوں میں بھاٹوں[ف] کے نام بھی سُنے گئے ہیں۔ یہ راجاؤں اور مہاراجاؤں کے درباروں میں خاندان در خاندان چلے آتے تھے۔ ان کا کام تھا کہ یہ راجا مہاراجا یا والیٔ ملک کا شجرۂ نسب اور خاندانی کارنامے نہایت جوش و خروش کے ساتھ برسرِ محفل بیان کیا کرتے تھے۔

مسلمانوں کے ہاں تقریر کا رواج بہت قدیم سے ہو۔ عرب، ایران، ترکستان اور مصر تمام بلادِ اسلامی

ف۔ لفظ بھاٹ سنسکرت کے لفظ برد سے نکلا ہو اور یہی لفظ انگریزی میں (Bard) کی شکل میں موجود ہو۔ انگریزی کا (Bard) بھی ایک درباری شاعر کی حیثیت رکھتا تھا اور اپنی شاعری میں بادشاہ یا شہنشاہِ وقت یا اُن کے مشاہیرِ خاندان کے کارنامے نمایاں کر درباروں اور محفلوں میں سُناتا تھا۔

میں اس کا چرچا تھا۔ لیکن ہندستان میں تقریرِ عامہ کا حال کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ لے دے کے یہاں ایک وعظ تھا جو علما اور صوفیا کے ابتدائی زمانے سے اب تک چلا آتا ہے۔ یہ وعظ خالص مسلم اجتماعات میں موقع بہ موقع ہوا کرتے۔ کبھی جمعہ کی نماز کے بعد کبھی گھروں یا کسی کھلے مقام پر اور کبھی عورتوں کی محفل میں۔

جہاں تک مسلمانانِ ہند کا تعلق ہے وعظ کی ہمیشہ ایک معین شکل رہی ہے جس میں علاوہ اخلاقی بیان کے مذہب اسلام کے چار بڑے ارکان نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے فلسفے اور ان کے فوائد پر بحث ہوا کرتی۔ ماسوا اس کے معاشرتِ زندگی پر بھی روشنی ڈالی جاتی۔ مثلاً شادی بیاہ کے مسائل یا عام طرزِ بود و باش۔

---

(۳) سرسید کے معاصرین کی تقاریر

انگریزوں کے دورِ حکومت کے کچھ عرصے بعد ملک میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہوئے جس سے ہندستان میں جا بہ جا مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ بنگال اس بیداری کا پہلا مرکز تھا۔ چناں چہ ۱۸۵۱ء میں بنگال برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام ہوا جو ڈاکٹر راجندر لال متر اور رام گوپال گھوش کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی گئی۔

ان انجمنوں میں تمام کارروائیاں اور مباحثے انگریزی زبان ہی میں ہوا کرتے تھے۔ ہندو ہمیشہ اپنے حاکموں کی زبان سیکھ کر عزت و جاہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے انگریزوں کی حکومت کے قیام کے چند ہی روز میں انگریزی سیکھ لی تھی۔ جس طرح مسلمانوں کے دورِ حکومت میں انھوں نے بہت جلد فارسی اور عربی سیکھ لی اور ان زبانوں کے ماہر ہو گئے تھے۔ ۱۸۲۲ء میں دہلی اور آگرہ کالج کے قیام کے بعد بکثرت ہندو گریجویٹ نکلنے لگے۔ انھوں نے انگریزی لکھنے پڑھنے کے علاوہ انگریزی گفتگو میں بھی مشق بہم پہنچائی تھی۔

سیاسی تحریکوں کے ساتھ ہندوؤں نے ایک قدم اور اٹھایا اور آن کی آن میں سارا ہندستان ان کی مذہبی تحریکوں سے گونجنے لگا۔ کیشب چندر سین نے "برہمو سماج" کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح انند موہن بوس

کی عبادت میں "سادھارن برہمو سماج" کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی۔ ادھر پونا میں مسٹر ایم۔ جی۔ رانڈے کی سرپرستی میں "پرارتھنا سماج" اور شمال میں سوامی دیانند سرسوتی کی "آریا سماج" کی بنیاد پڑی۔

بالآخر[فٹ] دسمبر ۱۸۸۵ء میں انڈین ایسوسی ایشن نے ترقی کرکے انڈین نیشنل کانگرس کی شکل اختیار کی جس کے صدر مسٹر ڈبلیو۔ بونرجی منتخب ہوئے۔ بمبئی کے کانگرس کے پہلے اجلاس میں سر اسمنیا آئر، مسٹر آنند چارلو تلک، دادا بھائی نوروجی، نریندر ناتھ سین، ڈبلیو۔ سی بنرجی، رنگا نائیڈو، فیروز شاہ مہتا، ڈی۔ ایس۔ وائٹ جیسے مشاہیر نے دھنواں دھار تقریریں کیں اور یہ سب تقریریں سیاسیات سے متعلق تھیں۔ ان تمام ابتدائی سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں کے متعلق تواریخ کانگرس میں الگ الگ لکھا ہے کہ یہ اپنے وقت تقریر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے دلائل صاف، پُرزور اور نکتہ چینی سے بالاتر ہوتے تھے۔

پنڈت مدن موہن مالویہ اور لوکمانیہ تلک ہندستان کے بڑے زبردست مقرر مانے جاتے تھے۔ لوکمانیہ[فٹ] تلک تو بلاشبہ مہاراشٹر کے بے تاج کے بادشاہ تھے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں بلا کی گرمی بھری ہوئی تھی۔ ان کی تقریر کی عام خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہایت سلیس اور سادہ ہوا کرتی۔ یہ اپنی تقریر سے ہزاروں آدمیوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھے۔

لالہ لاجپت رائے سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں کانگرس کے چوتھے اجلاس میں نمودار ہوئے۔ لالہ جی ایک اچھے مقرر ہونے کے علاوہ ایک خاص نقطۂ نظر کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے میں کامیاب ہوا کرتے اس لیے کہ وہ اردو[فٹ] میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ ان کی آواز بھی زوردار تھی وہ جس وقت بھی بولنے کھڑے ہوجاتے ان کی آواز برابر ساتھ دیتی۔ ان کی آواز میں کھٹکا تھا۔ جو بات منھ سے نکلتی پُراثر ہوتی۔

لالہ لاجپت رائے کے ذکر میں ایک اور واقعہ قلم بند کرنے کے لائق ہے۔ ان کے باپ کا قیام

فٹ۔ ان سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی نسبت تواریخ کانگرس سے مواد لیا گیا ہے۔
فٹ۔ تواریخ کانگرس۔
فٹ۔ تواریخ کانگرس ص۱۵۱

علی گڑھ میں رہا ہے۔ انھوں نے سرسید کا زمانہ پایا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے خیالات سے بھی مستفید ہوئے سرسید کی صداقت اور محبت کا ان پر ایسا اثر پڑا کہ انھوں نے مشرف بہ اسلام ہونے کا کئی بار ارادہ کیا۔ اس زمانے میں لالہ لاجپت رائے علی گڑھ میں مقیم اور زیر تعلیم تھے۔ باپ نے ہنود اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا کہ وہ تعلیم سے فارغ ہوگئے۔ ان کے عقائد کا رجحان آریہ سماجی تھا یا یہ کہ اس وقت تک آریہ ہو چکے تھے مشہور ہے کہ انھوں نے جب اپنے باپ کے عقائد اور خیالات کا حال معلوم کیا تو انھیں روکا اور اس میں کامیاب ہوئے۔

---

(۴) سرسید کی تقریر کی ابتدا

سرسید کے لڑکپن اور جوانی میں کہیں اس بات کا سراغ نہیں ملتا کہ انھوں نے ان ایام میں کبھی کوئی تقریر کی تھی اور نہ اس بات کا کہ کسی وقت انھیں اس میں لگاؤ یا شغف تھا۔ البتہ ۱۸۳۹ء یعنی بائیس سال کی عمر سے انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام باقاعدہ طور پر شروع کیا تھا۔ چناں چہ[ف۲] سب سے پہلی کتاب "جام جم" لکھی جس میں امیر تیمور سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے تینتالیس[۴۳] بادشاہوں کا حال لکھا۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید جیسی مشہور و معروف کتاب لکھی جس پر وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو بنائے گئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب ملک میں ہر طرف امن و امان ہوا۔ اور کوئین وکٹوریہ نے ۱۸۵۹ء میں ایک اشتہار معافیٔ عام کا شائع کیا تو اس پر سرسید بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنے مستقر بجنور میں مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہونے کو کہا۔ کہا جاتا ہے کہ[ف۳] اس موقع پر پندرہ ہزار مسلمان جمع تھے۔ جن کے سامنے سرسید نے ایک مناجات نہایت درد کے لہجے میں پڑھی۔ سرسید کے لیے سب سے پہلا موقع تھا

ف۱۔ ڈاکٹر سید سجاد نے اس واقعے کا حوالہ دیا ہے۔

ف۲ حیات جاوید۔

ف۳۔ حیات جاوید جلد اوّل۔

کہ وہ اتنے بڑے اور عام مجمع میں اسٹیج پر آئے۔ ہمارے نزدیک ان کی اس مناجات میں بھی تقریر کے بعض عناصر موجود ہیں۔

اکتوبر ۱۸۶۳ء میں سرسید دوسری مرتبہ مجلسِ مذاکرۂ علمیہ کلکتہ کی تقریرگاہ پر کھڑے ہوئے مگر اس موقع پر مناجات سنانے کی بجائے وہ فارسی کی ایک تقریر لکھ کر لائے تھے انھوں نے مجلس کے روبرو پڑھا۔

۱۸۶۴ء میں وکٹوریہ اسکول کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت انھوں نے ایک تقریر غازی پور کے رؤسا اور عوام کی ایک کثیر تعداد کے روبرو کی۔

مجموعۂ لکچرز کے مؤلف مولوی امام الدین صاحب گجراتی نے اس تقریر کو سرسید کی پہلی تقریر قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود اس میں کسی قسم کا سقم نہیں پایا جاتا۔ تقریر کا سانچہ بتاتا ہے کہ یہ کسی کہنہ مشق مقرر کی پیداوار ہے۔ شروع سے آخر تک سلجھی ہوئی اور شستہ ہے۔ بظاہر اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید قومی کاموں کی طرف اس وقت عملی طور پر نہیں بڑھے جب تک کہ انھوں نے اپنے میں وہ تمام قابلیتیں اور صلاحیتیں نہ دیکھ لیں جو ایک لیڈر اور رہنما کے قوم میں ہونی چاہییں۔

(۵) سرسید کی تقاریر پر عام رائے

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ تقریر کی ضرورت آج کل دنیا میں بڑھتی جارہی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کیا سیاست، کیا معاشرت، تجارت، صنعت وحرفت، زراعت غرض ہر جگہ یہ ناگزیر سی ہوگئی ہے۔ مغربی ممالک نے فنِ تقریر میں بہت ترقی کی ہے۔ وہاں اس فن پر کتابیں کثیر تعداد میں لکھی جارہی ہیں۔ سرسید کی تقریر پر قبل اس کے کہ کوئی رائے قائم کریں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے مغربی ممالک کی تقریر اور مقرر کے معیارات کو بیان کریں اور اس کے بعد سرسید کی تقریر کو ان کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں[۲]۔

---

[۱] مجموعۂ لیکچرز سرسید ص۱۷

[۲] اس موضوع پر تمام خیالات اس کتاب سے ماخوذ ہیں۔ Effective Speeches by Dwight E. Watkins, Professor of California University.

مقرر کے لیے ضروری چیزیں

(۱) ایک مقرر کے لیے سب سے پہلی اور ضروری چیز مشاہدہ ہے۔ مشاہدے کے بغیر وہ حقائق کو محسوس طریقے پر اپنے سامعین کے سامنے پیش نہیں کرسکتا۔ وہ ہر چیز کو ایسی باریک نظر سے دیکھے کہ یہ معلوم ہو کہ وہ اس چیز میں سے اس کی روح کو نچوڑ رہا ہے۔ مشاہدے سے انسان میں اُپج پیدا ہوتی ہے۔

(۲) مشاہدے کے بعد مطالعے کی ضرورت بھی ایسی ہی شدید ہے۔ مطالعے کے بغیر خیالات کو مستند طریقے پر بیان کرنا ناممکن ہے۔ مطالعہ ہر قسم کا ہوسکتا ہے۔ ایک بہترین مقرر کے لیے ہر علم و فن سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھنا ازبس ضروری ہے۔ منطق تو تقریر کی جان ہے۔ وہ تقریر کو تازگی اور روح بخشتی ہے۔ قانون سے بھی شناسا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ آج کل حکومت قانون ہے، اور قانون حکومت۔ شہر اور اپنے ملک کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مقرر کو ہر قسم کے ادب کا بھی مطالعہ کرنا [illegible] ہے۔ جدید اور قدیم ادب، دورِ حاضر کی تمام اچھی اور بُری کتابیں، اخبار رسالے، غرض ایک دنیا اس کے زیرِ مطالعہ ہونا چاہیے۔

(۳) تیسری اور آخری اہم چیز مقرر کے لیے یہ ہے کہ اس کا دماغ ہمیشہ ہر قسم کے مواد سے بھرا ہوا ہو۔ جب تک اس کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی ذہنی نقشہ نہ ہو، مقرر تقریر کرنے پر قادر نہیں ہوسکتا اور یہ چیز اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ تبادلۂ خیالات، مطالعہ اور تفکر سے کام نہ لے۔

یہ تینوں چیزیں تقریر کا مواد فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ تبادلۂ خیالات ہماری تمام غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے۔ بشرطیکہ جس سے تبادلہ کیا جائے وہ منتخب، مستند اور بڑی شخصیت کا آدمی ہو۔ اور مطالعہ تو جیسا کہ کہا گیا ہے تقریری معلومات کا سنگِ بنیاد ہے۔ تفکر بھی آدمی کو صحیح راہ پر لا ڈالتا ہے۔ اس سے آدمی میں جدت پیدا ہوتی ہے۔ جب تک مطالعے میں تفکر نہ ہو وہ بے سود ہے۔ اگر کوئی شخص ہزار پانچ سو کتابیں بھی پڑھ لے اور تفکر سے کام نہ لے تو ایسا پڑھنا اور نہ پڑھنا برابر ہے۔

اب تک جو چیزیں بیان کی گئی ہیں وہ بیرونی لواحق ہیں جو ایک شخص کو بہترین مقرر بنانے میں ممد ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ چند داخلی صفات اور خوبیاں بھی ضروری ہیں جن سے انسان کام یاب مقرر

بن جاتا ہے۔

۱۔ اوّل آواز ہے ۔ آواز ایسی بڑی ہو کہ سارے مجمع میں گونجے خواہ وہ مجمع کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ آدمی کے خیالات کتنے ہی بلند اور اچھے ہوں ۔ لیکن اس کی آواز اس کے خیالات کا ساتھ نہ دے تو وہ سامعین کو اپنا پیام سُنانے سے قاصر رہتا ہے۔ آواز کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ یکساں ہو۔ بعض لوگوں کی آواز کبھی پست ہوتی ہے اور کبھی بلند۔ مگر یہ بڑی خرابی ہے۔

۲۔ کام یاب مقرر کی ذات میں ایک اور چیز پوشیدہ ہوتی ہے وہ نہایت لطیف ہے یعنی وہ انسان کے اعلیٰ اخلاق ۔ صاحبِ اخلاق آدمی نڈر رہتا ہے۔ اخلاق جسم اور آواز دونوں کو قوی تر بنا دیتا ہے۔ اس کو کہیں دبنے اور جھجکنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ شخص دلیر ہوتا ہے ۔ اس کا لہجہ صاف ، اس کی آواز میں دریا کی روانی ، اس کا قول قولِ مرداں ، اس کی سچائی اس کے بیان میں خلوص پیدا کرتی ہے اور یہ خلوص لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا ہے۔

۳۔ اگر مقرر اعلیٰ درجے کا ہے تو اس کی شخصیت بھی اعلیٰ ہوتی ہے۔ مقرر کی شخصیت سامعین پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی ۔ پس وجاہت ایسی ہو کہ اس کا رعب مجلس پر کافی طور پر چھا جائے۔ اس کی قامت بلند اور اس کا چہرہ مہرہ درست ہو۔ اس کے چہرے پر وقار ، عظمت اور جاذبیت ہویدا ہونی چاہیے۔ چہرے کی بشاشت بھی شخصیت میں جاذبیت پیدا کرتی ہے اور یہی مقبولیت کا راز ہے۔

۴۔ مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے سامعین کے ساتھ پوری ہمدردی کا جذبہ رکھے۔ اس کو انھی کی طبیعت کے ساتھ ساتھ چل کر اپنے خیال کے موافق بنانا ہے۔ اس کو سامعین کے رنجوں اور خوشیوں سے آگاہ ہونا چاہیے ۔ وہ کبھی ان کے احساسات کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برت سکتا۔ اس کو اس راہ میں احتیاط سے قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔ اسے چاہیے کہ چاہت اور نفرت میں فرق کرے نیز انفرادی اور اجتماعی حالتوں کو پہچان سکے۔ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو اس طرح بیان کرے کہ سامعین کے زاویۂ نگاہ کے مطابق ہوں ۔ ایک خشک مزاج مقرر بہت جلد اپنی دل چسپی کو سامعین کے دلوں سے کھو بیٹھتا ہے۔ مزاح کی بھی گاہے گاہے ضرورت پڑ جاتی ہے۔ لیکن یہ اتنا ہی ہو جتنا کہ آٹے میں نمک ۔ یہ اگر اپنی حد

سے بڑھ کر مذاق یا بدمذاقی تک پہنچ جائے تو بُرے نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

یہ تو وہی وہ حالت جس میں مقرر سامعین کے سامنے اکیلا کھڑا ہوجاتا ہے۔ لیکن مقرر کا موقف اس وقت نہایت نازک ہوجاتا ہے جب وہ بھرے مجمع میں ایک مخالف کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے بہت زبردست امتحان گاہ ہے۔ لیکن یہاں بھی اگر وہ باہمت اور مستقل مزاج ہے، تو ایک آزمودہ کار جرنیل کی طرح محاذ پر ڈٹا رہتا ہے۔ سامعین کا رنگ خلاف ہو تو بھی وہ نہایت زیرکی سے اپنی وجاہت اور قوتِ نطق کو کام میں لاتا ہے۔ وہ مخالف کی بات کا جواب تیز نہیں مخاصمانہ انداز سے پرہیز کرتا ہے۔ اور بالآخر غالب آجاتا ہے۔

سرسید کی تقاریر پر خارجی اثرات

مقرر کے لیے پہلی ضروری چیز ہم نے مشاہدہ بیان کیا تھا چناں چہ سرسید کی سوانح حیات اور بعض تقریروں میں خود ان کی زبان سے منکشف ہوتا ہے کہ سرسید کا مشاہدہ نہایت عمدہ تھا۔ قوم کی اصلاح کا کام شروع کرنے سے پہلے ایک عرصۂ دراز تک قوم کی تباہی کے اسباب اور درستی کے ذرائع پر انھوں نے کامل غور اور مشاہدے سے کام لیا۔

پھر یہ واقعہ ہے کہ وہ محض مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق ایک اسکیم تیار کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ سرسید نے کیمبرج یونی ورسٹی کو خود جاکر نہایت توجہ سے دیکھا اور اس کے تمام جزئی و کلی حالات کا مشاہدہ کرکے ان پر غور کیا اس طرح وہاں کے دوسرے اور حالات کا مشاہدہ کیا۔ پس یہی وجہ تھی کہ سرسید اپنی تقریر میں جو بات کہتے وہ عام طور پر مشاہدے اور عینی شہادت پر مبنی ہوتی تھی۔

خارجی اسباب سے متاثر ہونا

محض مشاہدہ ہی ایک مقرر کے لیے ضروری نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ مشاہدات سے متاثر ہونا بھی ضروری ہے۔ دُنیا میں ہر شخص کی نظر سے کوئی نہ کوئی واقعہ گزرتا ہی رہتا ہے۔ ہر شخص ان واقعات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہی ہوتا ہے جس کی فطرت تجسس اور نتائج اخذ کرنے والی ہو۔ سرسید کا دل ملک و قوم کی پُر درد

ہندوستانی امرا اور غدر کے مسلمان خاندانوں کی تباہی و بربادی دیکھ کر جس جوش کے ساتھ ہمدردی کی

لہر ان کے دل میں اُٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی رودند میں آچکے اور جو خاندان بگڑ چکے ان کو مدد پہنچانی اب امکان سے خارج ہی مگر جو باقی ہیں اور جو ہندستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہی ان کو کسی طرح غدر کے آیندہ خوفناک نتیجوں سے بچایا جائے گورمنٹ تمام ہندستان کے مسلمانوں سے بدگمان ہوگئی ہی۔"

دوسری چیز ایک مقرر کے لیے ہم نے مطالعہ بیان کیا۔ سرسید کی تمام تقریروں کو دیکھنے سے ان کی وسیع معلومات اور مطالعے کا اندازہ ہوسکتا ہی۔ وہ اپنے کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے ہمہ چیز داں تھے۔ حیاتِ جاوید میں حالی لکھتے ہیں کہ سرسید کے

"مطالعے کی عادت ابتدا سے ان کی رفیق رہی۔ سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اُٹھانے کے لیے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے۔ بلکہ ان کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا۔"

سرسید کی ہر قسم کی تقریروں مثلاً مذہبی، تعلیمی، تحقیقی و تنقیدی سب میں وسعتِ مطالعہ پایا جاتا ہی۔ اکثر جگہ وہ مختلف مصنفین کے اقتباسات لاتے ہیں۔ ان کی تقریروں میں جو "شائستگی اور تہذیب" اور "رسم و رواج" پر ہوئیں، اس قسم کی بیش تر مثالیں پائی جاتی ہیں جن کو ہم آیندہ پیش کریں گے۔

سرسید نے گو تعلیم اعلیٰ پیمانے پر حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کے مطالعے نے ان کو تاریخ، فلسفۂ قدیم و جدید اور منطق وغیرہ سے اچھی واقفیت عطا کی تھی۔ چوں کہ سرکاری ملازم تھے۔ منصفی کرچکے تھے اور کونسل کے ممبر بھی تھے اس لیے ان کو قانون اور سیاسیات سے بھی گہرا تعلق تھا۔ ادبِ قدیم و جدید کے متعلق وہ اعلیٰ قسم کی معلومات رکھتے تھے اس وجہ سے وہ اُردو زبان اور ادب کے معمارِ اوّل شمار کیے جاتے ہیں۔

ہماری بحثِ بالا میں تیسری چیز یہ تھی کہ مقرر کا دماغ ہر قسم کے مواد سے بھرا ہوا ہو۔ سرسید خود ایک بہت بڑے مفکر تھے۔ ان کے مطالعے نے ان میں ہمہ رنگی پیدا کردی۔ لوگ ان سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ خود تصنیف و تالیف کی عادت نے بھی ان کے دماغ کو ہمہ قسم کے مواد سے پُر کردیا تھا۔

کی مختلف قسم کی تقریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ ان کی طبیعت کس قدر ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت ہر قسم کی تقریر کر سکتے تھے۔ ان کی اکثر تقریریں فی البدیہ ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ ان میں نہایت جوش و خروش اور اصلیت پائی جاتی ہو۔ ان کے معلومات میں اتنی پختگی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ خود تقریروں کو لکھ کر پڑھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اکثر فرمایا کرتے کہ لکھ کر پڑھنے سے طبیعت میں آمد باقی نہیں رہتی۔ وہ جس وقت جس قسم کی تقریر کرنے کھڑے ہوتے ان کے سامنے اس کا مواد فوراً آتا چلا جاتا تھا۔

بیرونی واقعات کو بیان کرنے کے بعد سرسید کے ان داخلی صفات اور خوبیوں کو بیان کریں گے جو ان کو ایک بہترین مقرر بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

سرسید کی سب سے بڑی صفت ان کی ضمیر کی پاکی اور طبیعت کی نیکی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود شدید مخالفتوں کے سرسید اپنے ہر مقصد میں کام یاب ہوئے۔ سرسید نے تقریباً ساٹھ برس پبلک زندگی میں بسر کیے۔ آخر زمانے میں ہر شخص ان کی عیب جوئی کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آجائے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے لیکن کسی کو ایسا موقع نہیں ملا جو ان کے کردار پر کوئی معقول گرفت کرتا۔ سوائے اس کے کہ ان کو کافر و ملحد کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا۔ اگر مقرر کا ضمیر صاف نہ ہو تو مجمع عام کے سامنے نہیں آسکتا۔ وہ شرمائے گا، جھجکے گا۔ مگر سرسید کی حالت یہ تھی کہ وہ مجمع کے سامنے ڈٹے رہتے اور وہی چیز کہتے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی۔ گو مخالفین کی کثرت تھی لیکن مخالفت ان کے ضمیر کی طاقت کے مقابلے میں کم زور تھی۔ خود سرسید کا قول ہو۔

"ہر کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کرتے ہو یا کہتے ہو تمھارا دل اس کو سچ جانتا ہو یا نہیں۔ اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمان داری کے کام کیا۔"

بہ حیثیت مقرر سرسید کی آواز بھی نہایت موزوں تھی۔ حالی نے لکھا ہو کہ سرسید کی آواز سے سارا ہال گونج اٹھتا تھا اور ان کے جوش و خروش کے عالم کا کرنل گریہم نے یہ نقشہ دکھایا ہو :-

"جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرزِ تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہو۔ اس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے

ہیں۔ آواز دردناک ہوجاتی ہے اور چہرہ متغیر ہوجاتا ہے۔ اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں ان کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں "

سرسید کی تمام تقریروں کا حال یہی تھا۔ بعض وقت خاص خاص تقریروں میں جوش و خروش اور آواز کی بلندی معمول سے زیادہ ہوا کرتی۔

" آواز کی گونج جس میں جوش کے وقت شیر کی سی گرج محسوس ہوتی تھی یہ دو بڑے معادن ان کے بیان کی تاثیر کے تھے "

جو حال ہم آج کل ہٹلر کے سامعین کا سُنتے ہیں تقریباً یہی حالت مولانا حالیؔ نے بھی ایک جگہ بیان کی ہے کہتے ہیں :-

" ۲۹ر دسمبر کو جو لکچر کہ سرسید نے راجا دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں جہاں کئی ہزار کا مجمع تھا دیا اس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتے کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو "

سرسید کے اخلاق بھی نہایت اعلیٰ و ارفع تھے۔ ان کے اخلاق کا اثر ہمیشہ ان کے ہم نشینوں اور جلیسوں پر پڑتا رہتا تھا۔ سرسید بڑے راست باز تھے۔ جب کبھی کوئی بات خلافِ سچائی ان کے کسی دوست سے سرزد ہوتی تو ان کو نہایت رنج ہوتا تھا۔ اور اکثر وہ اس کو متنبہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ وہ ہر کام خواہ قومی و مذہبی ہو یا سرکاری ملازمت کا ہو نہایت صداقت سے کیا کرتے اور ذرا بھی جھوٹ اور عیاری کو کسی معاملے میں پسند نہ کرتے۔ ان کا دل بھی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ عزیز و اقارب۔ رشتے دار، دوست یہاں تک کہ نوکروں سے بھی مہر و محبت سے پیش آتے۔ جس شخص کے قدم ان کے ہاں جم گئے پھر نہ وہ اس کو اپنے پاس سے جُدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ ان سے جُدا ہونا چاہتا تھا۔

" سیر چشمی اور فراخ حوصلگی بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھیں۔ انھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لیے کوئی جایداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اس کو یا تو اپنی آسایش اور سچی عزت اور نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا یا کُنبے کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد

اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اٹھایا۔"

سرسید میں انتقام کا بُرا جذبہ بھی نہ تھا۔ مخالفین نے انھیں خوب بُرا بھلا کہا مگر سید نے کبھی ان کی بُرائی کا بدلہ لینے کا خیال تک نہیں کیا۔

سرسید میں [illegible] کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسلام کو دُنیا کا سچّا مذہب خیال کرتے تھے لیکن تعجب کی بات [illegible] ان میں تعصب نام کو نہ تھا۔ وہ ہر قوم اور ہر فرقے اور ہر مذہب کے آدمی سے محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ وہ ہر وقت ہندو مسلمان کے اتّحاد و خیرخواہی کی نصیحت کیا کرتے تھے۔

سرسید کی شخصیت نہایت اعلیٰ قسم کی تھی۔ ان کے چہرے پر ایسا رعب و داب تھا کہ دیسی تو دیسی انگریزوں کو بھی ان کے سامنے آنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا اور جب یہ لوگ انھیں دیکھتے تو نہایت حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے۔ حالی لکھتے ہیں:

"سرسید جب نینی تال گئے ہیں تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ جس وقت جہاں ہوٹل میں پہنچا اکثر مسافر انگریز جو ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے اپنے اپنے کمرے سے ان کے دیکھنے کو باہر نکل آئے اور جب تک [illegible] اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے نہایت تعجب سے ان کو برابر دیکھتے رہے۔"

کرنل گریہم نے ان کے چہرے کو شیرِ ببر سے مشابہ لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید طویل قامت اور قوی ہیکل آدمی تھے۔ ناک نقشہ درست اور جاذبِ نظر۔ وہ عظمت و وقار کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

"اگرچہ سرسید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عبوس اور ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا مگر بقول کرنل گریہم گفتگو کے وقت اس سے مسرّت اور زندہ دلی اور گرم جوشی ٹپکتی تھی۔"

سرسید کی سوانح حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے اپنی عمر میں کبھی کسی شخص کو رنجیدہ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں کبھی لوگوں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگائی۔ چناں چہ تہذیب الاخلاق کے پرچوں میں انھوں نے جو بات لکھی نہایت نرمی اور سنجیدگی سے لکھی۔ انھوں نے اس دل آزار طریقے کو ترک کیا جو اس زمانے میں مجادلوں اور مناظروں میں جاری تھا۔ ان کا روئے سخن

کسی شخص کی طرف نہیں ہوا کرتا۔ اس طرح وہ اپنی تمام تقریروں میں کسی وقت بھی لوگوں کے احساسات سے نہیں کھیلتے۔ وہ قوم کو اس کی بُری حالت پر بھی متنبہ کرتے تو دل سوزی کے پیرایے میں۔ ان کی باتیں اس قدر ہمدردانہ ہوا کرتیں کہ ہر فرقے اور ہر مذہب کا آدمی۔ کیا دوست کیا دشمن سب ہی کو اُن سے خلوص تھا۔

ظرافت اور خوش طبعی سرسید کی جبلت میں داخل تھی۔ تحریر تقریر یا بات چیت کسی وقت بھی کوئی لطیفہ یا شوخی سوجھ جاتی تو کہے بغیر نہیں رہتے تھے لیکن کوئی بات ایسی نہ کہتے جو تہذیب کی حد سے باہر ہو۔

---

(۶) سرسید کی تقریروں کی عام زبان

اُردو نثر کے جدید اسلوب کے بانی مبانی سرسید ہی تھے۔ قوم کی تعمیر و اصلاح میں جہاں انھوں نے اور بہت سے کام کیے وہاں قومی زبان کی درستی اور اس کو جدید طریقے پر استعمال کرنے کا سہرا بھی انھی کے سر ہے۔ ان کی نثر کی قوت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں سرجیمس لائل نے لکھا ہے :-

"سرسید کی اُردو جدید خیالات کی اشاعت کا آلہ ہے۔ اس سے انھوں نے اس وقت کام لیا جب کہ نثر موجود نہ تھی اور اسے اس طرح بنایا اور بنھایا ہے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ان کی تحریکات نے اُردو زبان میں نہایت اعلیٰ درجے کا لٹریچر پیدا کر دیا۔"

زبان کے متعلق وہ اپنی ایک مستقل رائے رکھتے تھے۔

خود سرسید کی گراں بہا تصانیف اور ان کا اسلوبِ بیان اُردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ ہم مولوی حالی کے اس خیال سے متفق ہیں کہ سرسید کو اگر فادر آف دی اُردو لٹریچر[1] کہا جائے تو بہتر ہے۔ نیز وہ اُردو کو ہندستان کی عام زبان قرار دیتے ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں :-

"میں[2] نے جو ہر مقام پر "اپنی زبان" کے لفظ کا استعمال کیا ہے تو اپنی زبان سے میری مراد کیا ہے؟

---

[1] حیاتِ جاوید۔ [2] مجموعۂ لکچرز سرسید ص۱۴۵۔

نیں "اپنی زبان" سے وہ مُراد لیتا ہوں جو کسی ملک میں اس طرح پر مستعمل ہو کہ ہر شخص اس کو سمجھتا ہو اور وہ اس میں بات چیت کرتا ہو خواہ وہ اس ملک کی اصلی زبان ہو یا نہ ہو۔"

اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ اردو زبان میں ہر قسم کے علوم و فنون منتقل ہوں۔ ان کی قائم کردہ "سائنٹیفک سوسائٹی" اس مقصد کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ تھی۔ چناں چہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اسی کی تتبع میں اس زمانے میں اشاعتِ اردو کا کام کر رہے ہیں۔ اور اسی کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔

سرسید کو چوں کہ ساری قوم کے سامنے اپنے نئے خیالات کا اظہار کر کے اس کو پستی، جہالت اور نکبت سے نکالنا تھا اس لیے انھوں نے پیرایۂ بیان نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم اختیار کیا تھا۔ وہ جو کچھ بولتے وہی لکھتے اور جو کچھ لکھتے وہی بولتے تھے۔ اس لیے ہم کو ان کی تقریروں اور تحریروں کی زبان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ مولوی حالی فرماتے ہیں:-

"وہ (سرسید) ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے۔"

سرسید کی زبان تصنع سے خالی اور عام فہم ہے۔ عالمانہ اور فلسفیانہ تقاریر میں بھی وہی سادگی اور پرکاری ہے۔ زبان کی روانی مثل ایک دریا کے ہے کہ کہیں نہیں رکتی۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ سرسید اس روانی میں الفاظ اور قواعد کی اتنی پابندی نہیں کرتے تھے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ زبان اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے۔ اگر کوئی شخص درست زبان اور درست الفاظ اور زبان کے قواعد نہ استعمال کرے تو اس کی تقریر روکھی پھیکی کہلائے گی۔ سرسید کی تاثیر اور لذتِ گویائی کے کیا کہنے وہ اپنے جذبات اور خیالات کو صحیح زبان میں بلا روک ٹوک ظاہر کرتے تھے۔

گو سرسید سلیس اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں لیکن وہ ایسی نہیں کہ ہر جگہ روکھی پھیکی ہو۔ کہیں کہیں ہلکی سی رنگ آمیزی بھی کر دیتے ہیں جو عجیب لطف دیتی ہے وہ اکثر جگہ تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ تمثیل اور اس کا طرزِ ادا دلوں پر چوٹ کا کام کر جاتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

۱۔ "ہندستان ایک دلھن کے مانند ہے جس کی خوب صورت اور رسیلی آنکھیں ہندو و مسلمان ہیں۔"

میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا دیکھوں۔ ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی پھیلے کہ سورج، چاند اور ستارے سب اس کے آگے ماند ہو جائیں۔"

ایک اور تمثیل اس طرح کی ملاحظہ ہو۔ خیال تو ایک ہی ہے لیکن زبان کا چٹخارا ایسا موجود ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

"میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصے کی جو نیلا نیلا سیاہ رو ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوب صورتی حاصل ہوئی ہے۔"

اس آخری ٹکڑے میں استعارہ بھی ہے تشبیہ بھی ہے اور رنگینی بھی۔ مگر موٹے اور مغلق الفاظ کہیں نہیں ہیں۔ سچ پوچھیے تو سادگی یہی ہے۔

سرسید کی زبان برمحل اور بے ساختہ ہونے کے علاوہ بامحاورہ بھی ہے۔ زبان میں محاورے ہی سے جان پڑتی ہے۔ زبان کا صحیح ہونا الگ ہے اور بامحاورہ ہونا دوسری چیز ہے۔ ایک ہندستانی بہتر سے بہتر اور صحیح انگریزی بولتا ہے لیکن پھر بھی ایک انگریز کی بامحاورہ زبان کو نہیں پا سکتا۔ زبان قاعدے و قواعد کے مطابق ہو لیکن اگر اس میں محاورہ نہ ہو تو وہ مادری زبان کس طرح کہلائے گی۔ غرض سرسید کی تقریروں کی زبان محاوروں کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم ان کے لکچروں سے جستہ جستہ مقامات نقل کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت ہو کہ سرسید زبان کو ٹھیٹ محاورے کے اسلوب پر استعمال کرتے تھے۔

۱۔" اے صاحبو! یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم بی۔ اے یا ایم۔ اے تک پڑھا لیں گے اور وہ قابل بھی ہو جائیں گے۔ کمہار کے آوے میں سے سب برتن پکے نہیں نکلتے۔"

۲۔" جو لوگ اپنی کوشش اعلیٰ درجے کی تعلیم پر متوجہ نہیں کرتے اور ادنیٰ درجے پر مصروف کرتے ہیں وہ اُلٹی گنگا بہاتے ہیں۔"

۴- "اس کلاس کے طالب علموں کی مثال، بہ لحاظ درجۂ تعلیم کے اس بچے کے مانند ہو جس کے منھ سے ابھی دودھ کی بو نہ گئی ہو۔"

۵- "وہی مثل صادق آئی کہ بیت میں پانی ڈالا نہ آسمان کا رہا نہ زمین کا۔"

سرسید کی تقریروں میں کہیں کہیں مزاح اور اکثر جگہ طنز بھی پایا جاتا ہو۔ سرسید کے دل میں اتنا خلوص بھرا ہوا تھا کہ وہ کہہ تو جاتے تھے کڑوی بات لیکن لوگ اس کو امرت کی طرح قبول کرتے۔ ان کی خفگی میں دل سوزی پنہاں اور ان کی تنبیہ میں فائدہ مضمر تھا۔

"ہمارے مذہب کے ایک بڈھے مولوی نے اپنی کتاب گلستان میں خوب کہا ہو ؎

حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار۔"

"کیا اسلام ایسا ہو کہ ایک چیتھڑا چیرکر آگے لٹکانے سے قائم رہتا ہو اور اگر اس میں بٹن لگا دیے جائیں تو جاتا رہتا ہو۔"

"اس کی کھودی ہوئی بنیادیں قوم کا منھ تکتی ہیں کہ کب ہمارا پیٹ بھر دیا جائے گا۔ اس کی ناتمام عمارتیں خدا سے دعا کرتی ہیں کہ کب ہم کو پورا کرنے کی قوم کو توفیق دے گا۔ اس کے طالب علم چھپر میں اور درختوں کے سایے تلے نماز پڑھتے ہیں کہ ہماری قوم دنیا میں زندہ ہو یا خدا کے ہاں چل بسی۔ وضو کے عوض منھ میں خاک بھری ہوئی ہو۔ قوم کا کوئی شخص اس کو پانی چڑھانے والا نہیں۔"

"روپیہ فراہم کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کیوں کہ روپے کی امداد کے بغیر اس کا پورا ہونا محالات سے تھا۔ اس لیے ہم نے دستِ گداگری ہر امیر و غریب کے سامنے دراز کیا اور اس عار کو اپنے پر گوارا کیا جس کی نسبت کہا گیا ہو کہ ؎

بہ دست آہک تفتہ کردن خمیر بہ از دستِ دریوزہ پیشِ امیر

اگر جناب صدر انجمن! ہم نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قیامت کا عذاب اپنی گردن پر لیا۔ کالج کی تکمیل کے لیے ..... نہیں نہیں۔ قومی ترقی کا سامان مہیا کرنے کے لیے لاٹری ڈالی۔ جُوا کھیلا۔ اس پر بھی بس نہیں کیا اس شعر پر عمل کیا ؎

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا گنج زر از کہتر و مہتر بستانی

سوانگ بھرا، اسٹیج پر کھڑے ہوئے۔ دوستوں نے فقیروں کا بھیس بدلا۔ بدّو بن کر اور مینڈسا بغل میں داب کر خدا کے لیے مانگا۔ مگر قوم نے کچھ نہ سمجھا۔ اور مقصد پُورا نہ ہُوا۔"

غرض اس طرح کے بہت سے طنزیہ جملے یعنی امرت آمیز زہر کے گھونٹ ہر جگہ پلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں قوم کو ہر وقت ٹوکنے اور ہر انسان کی آنکھ کھولنے کی ضرورت تھی اس لیے وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔

الفاظ میں سرسید نے ہندی الفاظ سے جو اُردو زبان میں گھل مل چکے ہیں کبھی پرہیز نہیں کیا۔ یہی رنگ مولانا حالی، نذیر احمد وغیرہ نے بھی اختیار کیا۔ عربی و فارسی الفاظ بھی استعمال کرجاتے ہیں۔ مگر ایسے نہیں کہ ادق اور ناقابلِ فہم ہوں۔ مذہبی اور خالص مسلمانوں کے جلسے میں عربی آیات اور مقولے کثرت سے لاتے ہیں۔ لودھیانہ میں "قومی تعلیم ..." اور جالندھر اور لاہور میں "اسلام" پر جو تقریریں انھوں نے کی ہیں ان میں آیاتِ قرآنی کی بھرمار ہے۔ گو ساتھ ان کے تشریح بھی کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح سرسید فارسی اشعار بھی کبھی کبھی پڑھ جاتے ہیں۔ قرآن شریف کی آیات کا بار بار آجانا اس لیے فطری تھا کہ وہ ان دنوں قرآن کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ فارسی زبان کو بھی وہ نہایت عزیز رکھتے تھے اس کی شیرینی سے محظوظ ہُوا کرتے تھے۔ اور یوں بھی ان کے زمانے میں فارسی اور عربی دانی ایک تعلیم یافتہ کے لیے لازم چیز تھی۔

بعض الفاظ یا الفاظ کی تذکیر و تانیث کچھ ایسی ہے جو آج کل غالباً متروک ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

" باوجود کہ بہت سی باتوں میں میری طرف نئے خیالات منسوب ہوتے ہیں لیکن عورات کی تعلیم کی نسبت میرے وہی خیالات ہیں جو ہمارے قدیم بزرگوں کے ہیں۔"

" اس وقت کی یادگاری ہیں۔"

معیار، غور اور اڈریس وغیرہ کو مونث استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ آویں گے، جاویں گے، آؤں، جاؤں، مرجاوے، کھاجاوے اور بہت سے اس قسم کے الفاظ نظر آجاتے ہیں۔ ایک آدھ جگہ فارسی عبارت اور قافیہ کسی قدر ثقیل طریقے پر لاتے ہیں مثلاً :-

"ان تمام واقعاتِ واقعی اور اموراتِ حالی اور حالاتِ وجدانی نے مجھ کو آمادہ کیا۔"

سرسید گو انگریزی زبان سے ناواقف تھے لیکن وہ انگریزی الفاظ بےشمار استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی اور علمی مصطلحات انگریزی بہت آئی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ کے خیالات اہلِ ملک کے لیے انتہا درجہ جدید تھے اور ان کے ادا کرنے کے لیے جب تک کہ انگریزی الفاظ کو استعمال نہ کیا جاتا ان کا ادا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں انگریزی کے الفاظ اگرچہ وہ نامانوس تھے مگر ان کے استعمال کے بغیر چارہ نہ تھا۔ ورنہ اگر یہ مطالب ہماری زبان کے الفاظ کے ذریعے سے ادا ہو سکتے تو سرسید اور ان کا طبقہ سب سے پہلے اپنی زبان کے الفاظ استعمال کرتا۔ فرض کیجیے کہ ان کے لیے فارسی یا عربی کی اصطلاحات وضع کرکے استعمال کی جاتیں تو یہ طریقہ اس زمانے میں کارآمد نہ ہوتا۔ یہ لوگ حقیقت میں تنگ نظر بھی نہ تھے۔ چناں چہ سرسید کے معاصرین اور پیرو حالی، نذیراحمد وغیرہ انگریزی الفاظ اپنی تصانیف میں جا بہ جا لکھ جاتے ہیں۔ آج کل لوگ سرسید یا حالی پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں انگریزی الفاظ کی افراط کو جائز رکھا ہے۔ اور اپنے اس اعتراض سے شاید یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انھیں ان بزرگوں کے مقابلے میں اُردو زبان سے زیادہ محبت ہے لیکن حقیقت میں ایک دھوکا ہے جس میں یہ حضرات مبتلا ہوگئے ہیں۔ سرسید اور حالی سے زیادہ اُردو زبان اور اُس کے ادب سے کس کو محبت ہوسکتی ہے۔ ہم ذیل میں سرسید کے بعض ایسے اقتباسات درج کرتے ہیں جن میں انگریزی الفاظ کی بہتات ہے:-

"اس قوم کے آگے جو چیرمن کے اس پاس بیٹھی ہے اور جو بالکل سویلیزڈ اور جنٹلمین ہے۔"

"مگر ہندستان کے کالج اور ہماری یونی ورسٹیاں ہم کو کچھ کچھ سکھلاتی ہیں اور کسی ایک میں کامل

نہیں کرتیں۔ ہم کو ہندستان کے کالجوں سے خواہ وہ گورمنٹ کے کالج ہوں یا پرائیویٹ جو شکایت ہو وہ ہائی ایجوکیشن کے نہ ہونے کی ہو۔"

"اُن کے خیالات ریڈیکل لوگوں کے سے تھے۔ اس وقت لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ کا قانون پیش تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ سب لوگ الکشن سے ممبر مقرر ہوں۔ اے صاحبو! میں کنسرویٹو نہیں ہوں میں بڑا لبرل ہوں۔"

ایک اور دل چسپ چیز یہ ہو کہ سرسید بعض وقت انگریزی اور اُردو الفاظ کو باہم ترکیب دے کر استعمال کرتے ہیں مثلاً ٹکنکل تعلیم۔ ڈورمن کاریگر، لٹریری تعلیم، تین چیئرز، وغیرہ۔ ایک جگہ لفظ (**Pronounce**) سے اُردو کے مرکب فعل کو بنایا ہو۔ مثلاً

"میں اس ریزولیوشن کو جس کو ہمارے معزز پریسیڈنٹ نے پرونونس کیا ہو۔"

ایک اور دل چسپ مثال لیجیے :۔

اول میں اپنے ملک کے یونی ورسٹی کے طالب علموں کو گنوں گا کہ کس قدر طالب علم اے کورس میں تعلیم پاتے ہیں اور کس قدر بی کورس میں۔ اگر میرا اندازہ صحیح نہ ہو تو پانچ پرسنٹ سے زیادہ بی کورس میں پڑھنے والے نہ نکلیں گے اور اس کے مقابلے میں پچانوے پرسنٹ اے کورس پڑھنے والے ہوں گے اور یہ نہایت روشن دلیل ہو کہ ٹکنیکل ایجوکیشن کی وانٹ ملک میں نہیں ہو۔"

انگریزی کے وہ الفاظ جو سرسید نے جا بہ جا اپنے لکچروں میں استعمال کیے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ ایسے الفاظ تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اب استعمال نہیں ہوتے۔ دوسرے وہ جن کا اب ترجمہ ہوچکا ہو اور اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی ان میں ہم ایسے طبقے کے الفاظ کو بھی رکھتے ہیں جن میں اصل اور ترجمہ دونوں یک ساں طور پر مستعمل ہیں۔ تیسرے وہ جو بجنسہٖ بولے جاتے ہیں اور اب تک ان کا ترجمہ نہیں ہوا ہو یا اگر ہوا ہو تو ابھی اتنا رائج نہیں ہوا ہو کہ اصل کی جگہ کام لینے لگیں۔ ذیل میں ہم تینوں قسم کے الفاظ درج کرتے ہیں :۔

(۱) متروک انگریزی الفاظ

میوٹنی میڈل	(Mutiny medal)	ویکسی نیشن	(Vexination)
سلف ہلپ	(Self help)	محمڈن	(Mahommadan)
گورمنٹ ایڈ	(Govt. aid.)	انگلش لینگویج	(English Language)
پولائیٹ اولڈ فیشن	(Polite old fashion)	کانشنس	(Conscience)
ورک آف گاڈ	Work of God)	ورڈ آف گارڈ	Word of God)
ان اکوئینٹیڈ	(Unaquainted.)	وانٹ	(Want)
پرونونس	(Pronounce)	اسٹانڈنگ کمیٹی	(Standing Committee)
کیپٹل فنڈ	(Capital fund)	کالج اکسپنز فنڈ	(College expenses Fund)
انڈراس منٹ	(Endorsement)	یوٹیلیٹی	(Utility)

ویلیو (Value) کاٹن (Cotton) بینی فیکٹر (Bene fector)

ارتھمیٹک (Arithmetic) لاجک (Logic) یوروپین سینس (European sense)

(۲) انگریزی الفاظ جن کی بجائے اب اُردو مرادف رائج ہوگئے ہیں

سویلیزیشن ، پریسیڈنٹ ، جوڈیشل ، پولٹیکل ، پنل کوڈ ، ریمارک ، ریپریزنٹیشن ، سوشل ، لیجس لیشن ، مارل سائنس ، ہائی ایجوکیشن ، پرائیویٹ انسٹی ٹیوشن ، کالج لائیف ، کاپی رائیٹ ، سنٹرل ، نیشنل ، ایکٹ ، ہیڈکوارٹر ، بلڈنگ ، لیگل ایڈوائزر ، ڈپارٹ منٹ ، کلاسکل لینگویج ، کلاسکس ، لیٹن ، گریک ، آرین اسٹاک ، سیمٹک اسٹاک ، سیکنڈ لینگویج ، فیکلٹی ، گرامر ، سبجکٹ ، فیکلٹی آف آرٹس ، میٹنگ ، فزکس ، اسپشل سبجکٹ ، پرسنٹ ، سکشن ، سلف رسپکٹ ، میڈل ، جائنٹ سیکرٹری ، پیٹرن ۔

وہ انگریزی الفاظ جو اب تک مستعمل ہیں

ممبر، کمیٹی، پارلیمنٹ، گورمنٹ، کلب، سوسائٹی، سینٹ ہاؤس، یونی ورسٹی، کالج، پبلک سٹیٹ، آفٹ، ایڈریس، مجسٹریٹ، مشنری اسکول، ہیڈ ماسٹر، فرنچ، پالسی، لٹریس، کابینیٹ، پرائمری، اپر پرائمری، ڈیوک، ارل، مائی لارڈ، کنزرویٹیو، لبرل، ٹرسٹی، ٹکل، بجٹ، ٹیکس، فنڈ، بورڈنگ، ووٹ، یورپ شیمن، یوروپین پارٹی، یوروپین اسٹاف، لیڈیز اینڈ جنٹلمین، رجسٹری، ڈاکٹری، انجینیرنگ، میکرنیکل ڈرائنگ، فوٹو ٹائپ، فوٹو لیتھوگراف، فیلنگ۔

تفصیلی تبصرہ

"مجموعہ لکچرز سرسید" جو ہمارے مقالے کا موضوع ہے اس کو ایک صاحب مولوی محمد امام الدین گجراتی نے سرسید کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۰۰ء میں طبع کروایا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے سرسید مرحوم کے لکچروں کا صرف یہی ایک مجموعہ ایک ہی دفعہ شائع ہوا ہے۔ اس کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ مرتب نے ان لکچروں کو تاریخ وار ترتیب دیا ہے اور جیسا کہ کتاب کے سرورق پر درج ہے ان کا زمانہ ۱۸۶۳ء سے شروع ہوکر ۱۸۹۸ء تک پہنچتا ہے۔

لکچروں کے مطالب پر بحث کرنے کی بنا پر ہم نے اپنے مقالے کے اوراق میں تاریخ کی ترتیب کو اختیار نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے ہم نے لکچروں کو ان کے عنوانوں کے لحاظ سے علاحدہ علاحدہ گروہ میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً سرسید نے تعلیم کے موضوع پر مختلف اوقات میں مختلف تقریریں کی ہیں۔ اس اعتبار سے اس ایک قسم کی تقاریر کی متعدد اور ایک دوسرے سے جدا جدا ملتی ہیں مگر ہم نے تعلیم کے عنوان کے لکچروں کو ایک جگہ ہمیشہ کو ان پر مسلسل بحث کی ہے جس سے سہولت ہوگی کہ حضرت سید نے ایک ہی عنوان کے خیالات کو مختلف مواقع پر کس کس طرح پیش کیا ہے اور آیا وہ ہر جگہ اپنے نظریوں اور

زاویۂ نگاہ پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔ اگر قائم رہتے ہیں تو پھر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے اسے کہاں تک نبھایا ہے اور اگر قائم نہیں رہ سکے تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ غرض یہ طریقۂ تقسیم سرسید کے مختلف زاویہ ہائے نگاہ کو ایک ہی سلسلے میں جانچنے کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

تقاریر کی یہ تقسیم محض ایک پہلو ہے جو سرسید کی قابلیتوں اور ان کے نقطۂ خیال کے سمجھنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے ورنہ اُن کی تمام تقریریں صرف ایک مقصد کی حامل ہیں وہ محض قوم کی بھلائی ہے۔ بہ قول مولوی حالی سرسید وقت کی ایک راگنی کے سوا کوئی راگ نہیں جانتے تھے۔ اس مجموعے کی کوئی تقریر ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے قوم کے ادبار، قوم کی مفلسی، قوم کی جہالت اور تعلیمی پستی کا ذکر نہ کیا ہو۔ باوجود اس کے ہر تقریر اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور اپنے مطالب کے لحاظ سے اپنے عنوان کا اتباع کرتی ہے گو ان کی تقریر گوناگوں خیالات کا مجموعہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتی تھی۔ ان کی تقریریں کانچ کے فانوس کی ان سفید تراشوں کی طرح ہیں جن کے ہلنے سے قوسِ قزح کے مختلف رنگ جھلکتے ہیں۔

۱۔ ہماری اقسام کی تعداد سات ہے اور ہم نے ان میں سب سے پہلے سرسید کی قومی و مذہبی تقاریر کے مجموعے کو جگہ دی ہے۔ اس مجموعے میں اس بات کی تحقیق کریں گے کہ قومیت کا تخیل ان کے ذہن میں کیا تھا۔ قوم کے متعلق وہ کس قسم کے خیالات رکھتے تھے وغیرہ۔ قومی تقریروں میں مذہبی تقریروں کو ملاکر ایک کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سرسید نے قوم اور مذہب کو الگ الگ نہیں سمجھا تھا۔

۲۔ ہماری دوسری قسم تعلیمی ہے۔ قوم کی پستی اور تنزل کا سب سے بڑا سبب سرسید نے قوم کی جہالت اور کم علمی گردانا تھا۔ پس اس ذلت سے قوم کو نکالنے کے لیے انھوں نے مسئلۂ تعلیم پر زور دیا اور اس اہم موضوع پر تقاریر کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۳۔ قوم کی تعلیمی حالت سمجھنے کے بعد سرسید نے ان کی معاشری اور تمدنی حالت پر بھی نظر ڈالی اور اس کے استحکام رفع کرنے کو اپنا فرض تصور کیا۔ چناں چہ قوم کی معاشرت پر بھی ان کی متعدد تقریریں موجود

گیا - علم معلومات کو ایک ضمن میں رکھا ہی اور یہ ہماری قسم ثالث ہی۔

۴۔ مقالات کا چوتھا گروہ علمی، تنقیدی اور تحقیقی مسائل سے متعلق ہی۔ سرسید نے قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ زبان کی اصلاح کا فریضہ بھی اپنے ذمے لیا تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع، ان کی تنقیدیں بلند پایہ اور ان کی تحقیق حیرت انگیز تھی۔

۵۔ پانچویں قسم سیاسی تقریروں کی ہی۔ سرسید نے بہت کم سیاسی تقریریں کی ہیں۔ صرف دو تین تقریریں سیاسی ملتی ہیں جو محض شدید ضرورت کی بنا پر کی گئیں۔ وہ ایک تو اس لیے کہ قوم کو ان کا سیاسی موقف بتلائیں اور اس کے سامنے ایک طریقۂ کار پیش کریں۔ اور ایک آدھ تقریر کانگرس کی مخالفت میں ہی۔

۶۔ سیاسی تقاریر کے بعد ہی قانونی تقریروں کا نمبر آتا ہی۔ اور یہ تقریریں وہی ہیں جو انھوں نے کونسل میں کی تھیں۔

۷۔ سب سے آخر میں چند متفرق تقریریں درج ہیں۔ اس مجموعے میں خالص سرسید کی تقریریں نہیں ہیں بلکہ وہ ایڈریس بھی ہیں جنھیں اہلِ ملک نے سرسید کی خدمت میں پیش کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کے جوابات بھی ہیں جو سرسید نے ادا کیے۔ ان ایڈریسوں میں قوم نے سرسید کی قومی خدمات کا اعتراف کیا ہی جس کو انھوں نے ہر جگہ قبول کیا۔ لیکن ساتھ ہی ہر وقت یہی کہا کہ میں نے جو کچھ کیا ہی وہ کسی ذاتی منفعت یا شہرت کی خاطر نہیں بلکہ صرف قوم کے فائدے کے لیے۔

---

(۱) سرسید کی قومی و مذہبی تقریریں

قومیت کا تخیل | قوم اور قومیت کے تخیل میں سرسید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہی ان سے یہ پایا جاتا ہی کہ اوّل تو انھوں نے تمام بنی نوعِ انسان کو ایک ہی جنس اور ایک ہی قوم کے افراد شمار کیا ہی اور "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کے قدیم مقولے کی تشریح کی

ہو۔ اس تخیل کے لیے ہمارے زمانے میں (Humanity) کا لفظ پایا جاتا ہو Humanity کی تعریف کو قوم کی تعریف کے برابر سمجھا جاتا ہو۔ چناں چہ سرسید کی Humanity کی مثالیں درج ذیل ہیں :-

”ہندستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمانوں کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندستان کے لیے یہ قومیں اعضائے رئیسہ کے مانند ہیں۔ کسی نے کہا ہو کہ انسان کے دو حصّے ہیں۔ ایک اس کے دل کا خیال یعنی عقیدہ۔ یہ خدا کا حصّہ ہو۔ دوسرا اس کا اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہمدردی یہ اس کے ابنائے جنس کا حصّہ ہو۔ پس خدا کے حصّے کو خدا پر چھوڑو اور جو تمھارا حصّہ ہو اس سے مطلب رکھو۔“

”قوم سے میرا مطلب صرف مسلمان ہی نہیں ہو۔ میری رائے ہو کہ تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں قوم کی خصوصیات کے واسطے مذہب اور فرقے اور گروہ نہیں پسند کرتا۔ میں کالے سے کالے رنگ کے انسان اور گورے سے گورے رنگ کے انسان کو جو اعلیٰ درجے کی شائستگی میں زندگی گزار رہے ہیں ... وہ جو جنگلوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں سب کو اپنا بھائی اور ایک قوم تصوّر کرتا ہوں۔“

ہندستان کے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لیے کہ وہ سب ایک حقیقی قوم کے افراد ہیں اور یہ کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ کامل ہمدردی رکھنی چاہیے۔ اور ان کی فلاح و بہبود کا خواستگار ہونا چاہیے۔ انھوں نے (Pan-Islamism) (وحدتِ اسلامیہ) کی تمثیل کو پیش کیا ہو۔ اور اسلام کے اس قدیم خیال کو جا بہ جا لائے ہیں جس کی بنا پر تمام دُنیا کے مسلمان ایک واحد قوم کے تحت میں آتے ہیں۔ چناں چہ مثالیں ملاحظہ ہوں :-

”آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تفرقۂ قومی کو مٹایا، تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہوگئے۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک، وہ افریقہ کا رہنے والا ہو کہ عرب کا، وہ چین کا باشندہ ہو یا ماچین کا۔ وہ پنجاب میں پیدا ہوا کہ ہندستان میں، وہ کالے رنگ کا ہو کہ گورے رنگ کا۔ انّما المؤمنون اخوۃ

فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ۔"

" ہر ایک ایک شخص جو اسلام میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے ۔ جب تک کہ
وہ اپنے عزیز مذہب کے پابند ہیں تب تک وہ قوم ہیں ۔"

" اسلام کو قائم رکھنے سے ہماری قوم زندہ رہ سکتی ہے ۔ اگر کوئی آسمان کا تارا ہوجائے مگر مسلمان
نہ رہے تو ہم کو کیا ، وہ تو ہماری قوم ہی میں نہ رہا ۔"

" اسلام کی رُو سے قوم کا لفظ نسل کے متحد ہونے پر نہیں بولا جاتا بلکہ جس نے کلمہ پڑھا اور
اسلام لایا گو وہ بہ اعتبارِ نسل کوئی ہو وہ سب ہمارے بھائی اور ہماری قوم میں داخل ہیں ۔ اسلام کی
رُو سے اخوت اور اتحادِ قومی صرف اسلام پر منحصر ہے ۔"

سرسید کے تخیلِ قومی کی تیسری شکل یہ ہے کہ وہ ہندستان کے تمام باشندوں کو خواہ وہ ہندو ہوں،
مسلمان ہوں یا عیسائی سب کو ہندستان کی ایک ہی قوم کے اجزا قرار دیتے ہیں مثلاً :۔

"جس طرح ہندو آئے اسی طرح مسلمان بھی ہندستان آئے اور آباد ہوئے ۔ ملک کی آب و ہوا کی وجہ
سے دونوں کا خون ایک ہوا ۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوئیں ، صورتیں ایک دوسرے کی مشابہ ۔
مسلمانوں نے سیکڑوں ہندوؤں کی رسمیں لیں ، ہندوؤں نے مسلمانوں کی ہزاروں عادتیں لیں ۔ یہ دونوں
آپس میں ملیں یہاں تک کہ دونوں کے اختلاط کی وجہ سے ایک نئی زبان اُردو کا وجود عمل میں آیا ۔"
" درحقیقت ہندستان میں یہ دونوں بہ اعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں ۔"

" تاریخوں میں دیکھا ہوگا کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے ۔ افغانستان کے
مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں ، ایران کے ایرانی ، یوروپین مختلف خیالات اور مختلف
مذاہب کے ہیں ، مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں ۔ ہندو مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ
ہندو ، مسلمان ، عیسائی اسی ملک میں رہتے ہیں ۔ اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں ۔"

سرسید کے قوم یا قومیت کے چوتھے تخیل کا تعلق خالص طور پر ہندستان کے مسلمانوں سے ہے ۔
سرسید کے زمانے میں بالخصوص ہندستان کے مسلمان متعدد فرقوں میں منقسم تھے ۔ اگرچہ فرقے آج کل بھی

موجود ہیں بلکہ آج کل تو ان کے زمانے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں جیسے فرقۂ اہلِ قرآن یا قادیانی، مگر ان کے زمانے میں اس زمانے سے زیادہ فرقہ بندی کی گرفت مضبوط تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کی جان لینے تک میں دریغ نہ کرتے۔ ان کے زمانے میں فرقہ بندی کا جو شدید احساس تھا اس نے مسلمانوں کو سخت گروہوں میں بانٹ رکھا تھا مثلاً وہابیوں کا فرقہ، حنفیوں کا اور حنفیوں میں درگاہ پرستوں کا اور اہلِ تشیع کی زبردست جماعت۔ غرض تمام تحریکات ایک دوسرے کے خلاف بلند ہوا کرتی تھیں۔ سرسید ان تمام کو ایک دوسرے سے جکڑ دینا چاہتے تھے۔

سرسید کا مذہبی تخیل

سرسید مذہب پر یقینِ کامل رکھتے تھے۔ وہ کہا کرتے کہ "مذہب انسان کے لیے بنایا گیا ہے اور اگر اس کو اُلٹ دو اور یوں کہو کہ انسان مذہب کے لیے بنایا گیا ہے تو بھی متحد نتیجہ پیدا ہوتا ہے" مذہب کی سچائی کے متعلق وہ جس اصول کے پابند تھے وہ یہی تھا کہ مذہب وہی سچا ہے جو فطرت کے موافق ہو۔ اسلام میں اُنھوں نے دیکھا "اسلام هوالفطرت والفطرت هوالاسلام" اور اس پر دل سے ایمان لائے۔ اسلام کی تعریف انھوں نے اس طرح کی کہ "خدا کو واحد مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا، نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین ہونا اسلام ہے اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے"۔ یہی اسلام کا رکنِ اعظم ہے اور اسی کو توحید کہتے ہیں اور خدا کی وحدانیت پر اس وقت تک یقین نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ذات و صفات اور اس کے مستحقِ عبادت پر پورا پورا یقین نہ ہو۔ وحدانیت کے بعد اعترافِ نبوت اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ نبی جو خدا کا فرستادہ ہوتا ہے اس پر ایمان لانا اور اس کو برحق جاننا بھی ضروری ہے کیوں کہ اس نے ہم کو توحید کی نعمت عطا کی ہے۔

وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے بعد نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ فرائض کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان فرائض کو سرسید اس حد تک قابلِ عمل سمجھتے تھے جہاں تک خدا اور رسول نے حکم دیا ہے۔ "پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اس کی تابع داری کو باعثِ نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے۔ جس کو نہیں

شرک فی النبوت سے تعبیر کرتا ہوں۔" گو سرسید آئمۂ اربعہ کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کے مقلدین نے ان کی تقلید میں اتنا جو غلو کیا اور جس کی وجہ سے اسلام میں تفرقہ پیدا ہوگئی ہو اور باہم عداوت و بغض اور کینہ کی وسیع خلیج حائل ہوگئی اور اسلام کی قوت میں ضعف پیدا ہونے لگا تو سرسید نے اسلامیانِ ہند کی اس خرابی اور کمزوری کو بہ غور دیکھا اور ان سے کہا " حقیقت میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور اس پر دل سے یقین رکھنا اور سب کلمہ گووں کو بھائی سمجھنا ہی اسلام ہے۔" مجتہدین اپنے عقلی اور نقلی دلائل سے خواہ کیسا ہی عمدہ نظریہ یا خیال پیش کریں ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ فطرت کے موافق ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس قرآن ہے جو انسان کی سب سے اچھی رہبری کرتا ہے۔ سرسید قرآن کا معجزہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی پیش کردہ ہدایتوں کا مقابلہ دُنیا کی کوئی ہدایت نہیں کرسکتی۔ قرآن ہی ایک ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے کہ " ایک جاہل بدو یا مقلد مولوی اس کے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہے ویسا ہی ایک فلاسفر انھی الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفے سے برخلاف نہیں پاتا۔"

سرسید ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو مذہب کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور ایک مذہبی مسئلے کو اس لیے تسلیم کرلیتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی یا بڑے امام نے لکھا ہے۔ انھوں نے اسلام کے بڑے بڑے آئمہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں بعض کے اصول ایک دوسرے سے اس قدر متغائر تھے کہ ایک طرف کفر اور دوسری طرف اسلام تک پہنچاتے تھے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں " ایک فرقہ خدا کی رویت کا قائل ہے۔ اہلِ سنت والجماعت ہی کا ایک فرقہ خدا کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک کا قائل ہے اور اس کے عرش پر متمکن ہونے کا یقین رکھتا ہے اور اس کو محسوس جانتا ہے۔ دوسرا گروہ اس کے برخلاف ہے اور اس کو کفر سمجھتا ہے۔ جب کہ قدیم سے اصولی مسائل میں قدیم علما نے اس قدر اختلاف کیا ہے تو میرا کیا گناہ ہے اگر میں ان قدیم علما کے مقرر کردہ مسائل سے اختلاف کروں۔ وہ بھی آخر انسان تھے اور معصوم اور محفوظ عن الخطا نہ تھے۔" سرسید قرآن کو دل سے معجزہ جانتے تھے اس لیے انھوں نے بغیر اس کا خیال کیے کہ وہ اگلوں کی مخالفت کر رہے ہیں یا علمائے زمانہ انھیں کفر کا فتویٰ دیں گے بے دھڑک ہوکر کہا کہ علما

کی فلسفیانہ کتابوں کو چھوڑ دو اور قرآن کو لو کیوں کہ قرآن اور اسلام دونوں یکساں انسان کی فطرت کے مطابق ہیں۔

۱۸۸۴ء میں "اسلام کی گزشتہ، موجودہ اور آیندہ حالت" پر تقریر کرتے وقت سرسید نے اسلام کے متعلق جن سچے جذبات کو ظاہر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کتنے سچے مسلمان تھے۔ کہتے ہیں کہ اسلام "تمام دُنیا کے لیے روشنی تھا اور روشنی ہے اور روشنی رہے گا۔ ہر ایک مسلمان کے سینے میں وہی نور ہے۔ اس میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اختلافِ فرق سے جو مذاہب اسلام میں دکھائی دیتے ہیں اس نور میں نقصان نہیں آتا۔ تھوڑی دیر کے لیے اسلام کے تمام فرقوں کا تصور کرو اور تمام باتوں یا مسئلوں کو حذف کرتے جاؤ۔ حذف کرتے کرتے بہت کچھ رہ جائے گا، جس پر سب فرقے متحد ہوں گے پس وہی نورِ اسلام ہے جو باوصف اختلافات کے سب میں بلا نقصان کے منوّر ہے۔"

سرسید کہتے ہیں کہ جہاں تک نجاتِ عقبیٰ کا سوال ہے گزشتہ موجودہ اور آنے والے سب برابر ہیں لیکن جہاں تمدنی حالت پر غور کیا جاتا ہے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ موجودہ لوگ اپنے بزرگوں سے پیچھے ہیں۔ گزشتہ عہد کے لوگوں نے اپنے تئیں مجسّم نیکی بناکر اسلام کو اس کی خوبیوں کو مجسّم کر دکھایا اور آج وہ ہماری قوم کا باعثِ افتخار ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے کے لوگ دنیاوی زندگی میں ذلیل و خوار ہوگئے ہیں جس سے اسلام کی بھی ذلت ہوتی ہے۔ غرض ہم کو دُنیاوی حالت کے درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپنی دُنیا کو درست کرنا گویا دین کو درست کرنا ہے اور یہ جو کچھ کریں گے اپنے لیے نہیں بلکہ خدا اور اس کی رضا کے مطابق ہوگا۔ "جو شخص خدا کی خوشنودی چاہتا ہے، جو شخص ثوابِ آخرت کا طالب ہے۔ جو شخص بہشت میں اپنے لیے ایک موتی کا محل بنانا چاہتا ہے۔ جو شخص قوم کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ اپنی قوم کو اس ذلیل حالت سے نکالنے میں کوشش کرے۔"

[illegible] میں سرسید نے انسان کے دو حصے قرار دیے ہیں۔ ایک حصہ خدا کا اور دوسرا اس کے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل اور اس کا اعتقاد خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے نہ بیٹا۔ نہ دوست نہ آشنا۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر اس کی ذات تک محدود ہے کچھ تعلق نہ

رکھنا چاہیے۔ کسی شخص سے محض اس خیال کی بنا پر کہ وہ شیعہ ہو یا سنی، وہابی ہو یا بدعتی، کسی قسم کی عداوت اور دشمنی رکھنا عقل مندی کے خلاف ہو۔ بلکہ ہم کو چاہیے کہ ہم اس کو بھائی اور کلمے کا شریک تصور کریں محض اس وجہ سے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول کو برحق جانتا ہو اور ہم کو آپس میں خدا کا قائم کردہ وہ رشتۂ اخوت برقرار رکھنا چاہیے جس میں اس نے ہم کو ہماری پیدایش کے وقت جوڑ دیا تھا۔"

اس بیان سے سرسید کا مدعا صرف یہ تھا کہ عقائد کی دنیا سے علاوہ بھی ایک دنیا اور ہو۔ عقائد کو قائم رکھنا چاہیے یا اس میں ترمیم و اضافہ کیا جائے یہ ایک شخص کا شخصی فعل ہو۔ اور اس کا اثر اس کی ذات تک محدود رہتا ہو۔ لیکن اغراض قومی عقائد سے الگ چیز نہیں ہیں۔ ان میں اتحاد و اشتراک کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہو تاکہ پوری قوم ایک نقطے پر جمع ہوکر قومی مقاصد اور بین الاسلامی فرائض کو انجام دے سکے۔ ہمارے نزدیک پان اسلام زم کا تخیل جو آج کل بہت کچھ روشن اور نمایاں ہوچکا ہو وہ سرسید کے ذہن میں بہت پہلے آچکا تھا اور یہ وہی مسئلہ ہو جسے قدیم اسلام میں لوگوں نے اخوتِ اسلامی سے تعبیر کیا تھا۔

---

(۲) سرسیّد کی تعلیمی تقریریں

قومی تعلیم کا تخیل

اگر قومی تعلیم کچھ ہوسکتی ہو تو ایک قوم کے ادب اور تاریخ سے ہوسکتی ہو۔ ادب قوم کے معاشری حالات اور تمدنی کیفیات کو ظاہر کرتا ہو اور تاریخ اس کے اعمال کا صحیفہ ہو یعنی اس کے عروج و زوال کے وجوہات اور اس کے مد و جزر کے اسباب ظاہر کرتی ہو۔

قومی تعلیم کا تعلق قوم کے مذہب سے بھی بہت گہرا ہوتا ہو۔ مذہب ہی قوم میں ایک خاص قسم کی روح پھونکتا ہو۔ وہ اس کی تمام زندگی میں اس کی رہبری کرتا ہو۔ ہماری تاریخ یا کردار کے اوراق کا آغاز مذہبی تعلیم سے ہوتا ہو۔

سرسید کے نظریۂ تعلیم میں یہ جملہ مظہر موجود تھے مگر ان کو بڑی دشواری درپیش تھی۔ وہ یہ کہ

ان کی قوم تعلیم کے نئے نظام سے آگاہ نہ تھی۔ اسکول اور کالج کا جدید نظام انگریزوں کے ساتھ ہندستان میں آیا اور یہاں کے لوگ یک بہ یک اس کی ترکیب و شکل کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس کے علاوہ سرسید ہندستان کے اس قدیم تعلیمی تخیل کو مسلمانوں کے دماغ سے نکالنا چاہتے تھے جو ان کے انحطاط اور زوال کا باعث ہو چکا تھا چناں چہ وہ خود اس زمانے کے تعلیمی حالات کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

> "امیروں کے لڑکوں کو پڑھنے لکھنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ بھی لکھنے پڑھنے کو کوئی عمدہ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ بجز سپاہی پیشہ ہونے کے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ معدودے چند خاندان تھے جن کے ہاں مثل اور پیشوں کے پڑھنے لکھنے کا پیشہ ہوتا آتا تھا۔ وہ لوگ محتاج طالب علموں کو اپنے ہاں جمع کرکے پڑھاتے تھے اور امرا ان کو محتاج سمجھ کر ان کے مدرسے کو یا خانقاہوں میں جہاں یہ جمع ہوتے کچھ روپیہ بطور خیرات کے دے کر ثواب کا سامان کرتے۔ اس کے سوا ہمارے ہاں قومی تعلیم کا کبھی تخیل نہیں پیدا ہوا۔"

سرسید مسلمانوں کی پستی اور نکبت کا بڑا سبب ان کی جہالت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک قوم زیورِ علم سے آراستہ اور پیراستہ نہ ہو جائے وہ دُنیا کی اور ترقی یافتہ قوموں کے صف بہ صف نہیں کھڑی ہو سکتی اور بہ حالتِ موجودہ قوم کو بجز تعلیمی ترقی کے کسی اور چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ غرض جب سرسید نے اس نکتے کو سمجھ لیا تو انھوں نے اپنی ساری زندگی تعلیم کے لیے وقف کردی۔ قوم کی تعلیم کے عمدہ سامان مہیا کرنے کے لیے وہ سب سے پہلے یورپ گئے اور وہاں کے قومی اداروں کا بہ غور مطالعہ کرکے ہندستان کے لیے ایک خاکہ تیار کرکے لائے۔ سرسید نے اس خصوص میں زیادہ تر مغربی نظریۂ تعلیم کو دلیلِ راہ بنایا کیوں کہ وہ انھی اصول اور نقوش پر چل کر اپنی قوم کو ان کے مقابل کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ علی گڑھ یونی ورسٹی کا جو نقشۂ تعلیم ہو وہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونی ورسٹی کا چربہ ہو۔ یہاں تک کہ کالج کی عمارتیں بھی اسی نمونے پر تیار کی گئی ہیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ سرسید کے لیے وہی ایک مکمل اور بنا بنایا نظامِ تعلیم تھا جو فوری ضرورت کے وقت ہاتھ آگیا۔

سرسید کے زمانے میں گو ہندستان میں سرکاری مدرسے اور اعلیٰ تعلیم گاہیں موجود تھیں لیکن سرسید سمجھتے تھے کہ :۔

"گورنمنٹ ہماری مذہبی تعلیم کی پوری پوری طرح کفیل نہیں ہوسکتی اس لیے کہ ہندستان میں مختلف مذاہب رہتے ہیں۔ ہر مذہب کے لیے خاطرخواہ انتظام کرنا حکومت کے لیے دشوار ہے۔"

اس کے علاوہ سرسید کا یہ خیال تھا کہ

"گورنمنٹ کے مدارس اور کالجوں میں ہمارے بچوں کی قومی فیلنگ اور اسپرٹ کے مرجانے کا اندیشہ ہے اس لیے ہم کو اپنے قومی مدرسوں کی ضرورت ہے۔"

چناں چہ مغربی ممالک میں بھی جتنی قومی یونی ورسٹیاں ہیں وہ کبھی گورنمنٹ سے کسی قسم کی امداد تک حاصل کرنا پسند نہیں کرتیں کیوں کہ گورنمنٹ کی امداد ان کو اس کے تابع کردیتی ہے اور آزادیٔ خیال اور آزادیٔ عمل باقی نہیں رہ سکتی۔

تعلیم کا تخیل

قدما کے پیشِ نظر علم کا صرف ایک رُخ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ علم ایک شئے عقلی ہے جو خیال اور حافظے میں رہتی ہے اس سے نفس کو حظ اور روح کو تازگی پہنچتی ہے۔ مگر سرسید کے ذہن میں زمانۂ حاضرہ کا مفہوم جاگزیں تھا اور اصلی علم ان کے نزدیک وہی تھا جو دیکھنے اور تجربے میں آئے اور انسان کے جملہ کاموں میں مفید ثابت ہو۔

یہی وجہ ہے کہ سرسید علم کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں میں رائج کرنا چاہتے تھے تاکہ قوم کے افراد علم کے ہر شعبے میں داخل ہوکر عزتِ قومی حاصل کریں اور دُنیا میں ممتاز رہیں۔ وہ ادنیٰ تعلیم ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اعلیٰ تعلیم کے حامی تھے۔

"جب تک اعلیٰ درجے کی تعلیم ملک میں موجود نہیں ہوتی ادنیٰ درجے کی تعلیم کا پھیلنا ناممکن ہے۔ دُنیا کے کسی حصۂ ملک کی تاریخ سے ثابت نہیں ہوا کہ بدون اعلیٰ درجے کی تعلیم کے شائع کیے ادنیٰ درجے کی تعلیم پھیلی ہو۔ قدرت کا قاعدہ ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ کی پیروی کرتا ہے کبھی اعلیٰ ادنیٰ کی پیروی نہیں کرتا۔"

ملک میں معدودے چند کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرلینا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ گروہ در گروہ علم سے شُدبُد واقف ہوجائیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ قوم کے لیے مفید اور اس کے لیے باعثِ افتخار ثابت ہوتے ہیں

اس لیے

«چھوٹے اسکول ادنیٰ تعلیم کے لیے قائم کرنا پیاسی اور بھوکی قوم کو صرف روٹی دینی ہے۔ قوم کو نہایت ٹھنڈے پانی یعنی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے جب اس کا بندوبست نہ کریں تو لازماً قوم پیاس کے مارے مرجائے گی۔»

انسان کی اعلیٰ تعلیمی حالت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر فن میں کچھ نہ کچھ جانتا ہو اور کسی ایک میں کامل ہو۔ اکثر لوگ اعلیٰ تعلیم کا یہی مطلب لیتے ہیں کہ بی۔ اے یا ایم۔ اے پاس کرلیں اور نوکری کریں لیکن یہ غلط ہے۔ اعلیٰ تعلیم ہماری نظروں میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم آج کل دنیا کے ہر کام کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے مثلاً تجارت فی زمانہ اعلیٰ تعلیم کے بغیر بےکار ہے۔ اسی کی بدولت تجارت کو آج وہ رتبہ حاصل ہوگیا کہ اس کی حیثیت بین الاقوامی ہوگئی ہے۔ جہالت اور کم علمی کی وجہ سے ہندستانیوں نے تجارت کو محض اس قدر سمجھ رکھا ہے کہ کچھ مال خریدیں اور نفع سے بیچیں۔ اسی طرح زراعت بھی اعلیٰ تعلیم کی محتاج ہے۔ زمانۂ سلف کے لوگ اپنی قدیم ڈگر پر چل رہے ہیں لیکن علم کی دنیا میں جدید آلات کی مدد سے غلے کی پیداوار اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ہزاروں لاکھوں روپے کا غلہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاتا ہے اور اس طرح دنیا کی دولت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

سرسید ہندستان کے باشندوں کی ترقی کے لیے مشرقی علوم پر مغربی علوم کو ترجیح دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مغربی علوم اتنی ترقی کرگئے ہیں کہ اب وہی تمدن کی ترقی کا ذریعہ ہوگئے ہیں۔ ہندستانیوں کو چاہیے کہ وہ تمام اجنبی قوموں کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کرلیں۔ علم تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اگلے زمانے کی قوموں نے بھی تحقیقات اور واقفیت کے لیے ترقی یافتہ اجنبی قوموں کے علوم کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔

قدیم یونانیوں نے فینیقیوں اور مصریوں سے علم حاصل کیا۔ مسلمانوں نے بہت سے علوم یونانی زبان سے اخذ کیے۔ خلیفہ منصور نے یونانی زبان کے مترجموں کو بڑے بڑے انعام دیے۔ خلیفہ مامون نے روم و یونان اور مصر سے یونانی کتابیں منگوا کر اپنی زبان میں ترجمہ کرائیں۔ اہلِ فرنگ گیارھویں صدی

میں اسپین گئے اور عربی سیکھ کر بہت سی کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ روس میں ترقی علوم کے لیے سب سے پہلے پیٹر اعظم نے اجنبی مصنفوں کی عمدہ تصنیفات کے ترجمے کرواکے چھپوائے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی انہی خیالات کی پیداوار تھی۔ انھوں نے بہت سی انگریزی کی بڑی بڑی اور عمدہ کتابیں اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ انگریزی علوم کو جو انھوں نے لائقِ ترجیح سمجھا اس کی وجوہات انہی کی زبان سے سُنیے :۔

"ترکی و عرب و فارس ہماری طرح ذلّت و خواری میں پڑے ہوئے ہیں۔ افریقہ ہمیشہ وحشی رہا۔ مصر اگلے زمانے میں سب سے پہلے نامور تھا اب وہ کچھ کررہا ہے لیکن وہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔ ہماری سرحد کی قومیں برما، بھوٹان اور افغانستان کی قومیں جاہلِ محض ہیں۔ اب علم و ہنر اور قومی شائستگی کی ترقی کا دار مدار یورپ اور امریکہ پر ہے۔ امریکہ اور یورپ کے بہت سے ملک ہماری دسترس سے باہر ہیں البتہ انگلستان کے علم کے خزانوں پر ہماری دسترس ممکن ہے۔ اس سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں"

ہندُستان میں انگریزی زبان کی اشاعتِ عام کا سہرا سرسید کے سر ہے۔ ورنہ سرسید سے پہلے ہندُستان میں انگریزی زبان سے ہندو خاص کر بنگالی واقف ہوئے تھے۔ وہ انگریزی زبان کو اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ ہماری حاکم قوم کی زبان ہے۔ دُنیا کی ہر حکومت میں سرکاری زبان وجہِ امتیاز رہتی ہے۔ خلافتِ بنی عباسیہ اور امیہ اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک عربی زبان دُنیائے اسلام میں عروج پذیر تھی۔ ترکوں اور مغلوں کے زمانے میں ہندُستان میں فارسی زبان کی ترویج ہوئی کیوں کہ فارسی درباری زبان تھی۔ اور تمام کاروبار فارسی ہی میں ہُوا کرتے تھے۔ زمانۂ موجودہ میں انگریز ہم پر حکومت کررہے ہیں۔ تمام علوم و فنون انگریزی میں منتقل ہوگئے ہیں۔ سرکاری اور کاروباری زبان انگریزی قرار پائی ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو انگریزی زبان کے سوا چارہ نہیں ہے۔

سرسید اپنی قوم کو انگریزی کے ساتھ ساتھ دُنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانیں، جرمن، فرانسیسی، عربی، فارسی وغیرہ کو حاصل کرنے کی بھی ہدایت کرتے ہیں کیوں کہ یہ زبانیں اعلیٰ قسم کے ادب کے علاوہ بےشمار علوم و فنون سے مالامال ہیں۔ جرمن زبان اور فرانسیسی میں مغرب کے نئے علوم مدوّن ہورہے ہیں۔ عربی زبان

قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہو ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کی زبان ہو اور یہ قطعاً علمی زبان کے دائرے سے خارج نہیں کی جاسکتی۔ اگر مذہبی خدمت کا بھی لحاظ ہو تو انگریزی کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقفیت پیدا کرنی لازمی ہو۔ اسی طرح وہ کہا کرتے تھے کہ

"فارسی کو بھی ہم نہیں چھوڑ سکتے جس کا تعلق بہت کچھ مسلمانوں کی تربیت اور مذاق کے ساتھ ہوگیا ہو اور وہ فی نفسہٖ خود بھی نہایت لطیف و بامذاق زبان ہو اور مسلمانوں کے علوم اور تواریخ کا اس قدر سرمایہ اس میں موجود ہو جس سے مسلمان قطع نظر نہیں کر سکتے۔"

مذہبی تعلیم | سرسید نے مغربی علوم اور انگریزی زبان کو رائج کرنے کی کوشش میں اپنی ساری عمر صرف کردی۔ لیکن انھوں نے مذہبی تعلیم کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اکثر تقریروں میں اس خیال کو ظاہر کیا ہو کہ

"مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دینا بھی ادنیٰ درجے کی یا اوسط درجے کی یا اعلیٰ درجے کی، ہم پر فرض ہو کیونکہ مختلف اقوام کو جس چیز نے ایک قوم بنادیا ہو وہ صرف اسلام ہو۔ اگر ہم اس کی فکر نہ رکھیں تو قومیت قائم نہیں رکھ سکتے۔ کم سے کم یہ ہو کہ مسلمانوں کو ضروری عقائدِ مذہبی اور احکامِ مذہبی کی تعلیم دیں جس کو ہم نے ادنیٰ تعلیم سے تعبیر کیا ہو۔"

سرسید کو انگریزی خوان حضرات سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ دن بدن مذہب سے دوری اختیار کرتے جارہے ہیں اور الحاد اور زندقے کی تاریک گھاٹیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وہ علما سے ہر وقت خطاب کرکے کہا کرتے کہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے خلافتِ عباسیہ اور امیّہ میں فلسفۂ یونان کی توڑ پر علمِ کلام ایجاد کیا اسی طرح موجودہ علما کا بھی فرض ہو کہ وہ ان علومِ جدیدہ کی رد میں جن سے مسلمان نوجوانوں کے مذہبی عقائد خراب ہونے کا اندیشہ ہو کوئی ایسا علم ایجاد کریں جس سے ان کی رہبری ہو اور مذہب کی روگردانی سے بچیں اور دوسری طرف نوجوانوں میں سے ایسے شخص کے پیدا کرنے کی سعی کریں۔

"جو انگریزی لٹریچر میں کامل ہو اور وہ ایسی کتابیں انگریزی میں تصنیف کرے جو بہ اعتبارِ عمدگی اور لٹریچر اور خوبیٔ مضامین کے مدرسوں اور کالجوں کے درس میں داخل کرنے کے لائق ہوں۔ بالفعل ہم کو

وہ یہی وہی کتابیں پڑھی جاتی ہیں جو انگریزوں نے لکھی ہیں جن کے مصنف متعصب وغیر متعصب سب قسم کے ہیں۔ باوجود اس کے کہ کورس کے انتخاب میں احتیاط برتی جاتی ہو کوئی نہ کوئی صفحہ یا فقرہ ایسا نکل آتا ہو جس کو مسلمان مذہب اسلام کی نسبت حملے یا مذہب کی اہانت سمجھتے ہیں۔"

دینی تعلیم کے اتنے سخت طرف دار ہونے کے باوجود سرسید مذہبی اوہام اور تعصبات کو بھی مسلمانوں میں سے مٹتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ مذہبی تعلیم کے ضمن میں انھوں نے ہر وقت اس بات کی کوشش کی کہ کوئی پند متعصب قسم کی نہ ہو بلکہ ایسی ہو کہ تحقیق و تفتیش سے کام لے۔ اچھی چیزوں کو اختیار کرے اور بری چیزوں کو ترک۔

تعلیم نسواں سرسید نے مردوں کو جہاں جدید علوم اور انگریزی طریقۂ تعلیم کی طرف مائل کیا۔ وہاں وہ عورتوں کی تعلیم کے لیے مغربی اصول ناپسند کرتے تھے اور تعلیم نسواں کے متعلق سرسید کے وہی خیالات تھے جو ہمارے قدیم بزرگوں کے چلے آتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا ہندستان کی موجودہ حالت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔

سرسید کا عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کرنے کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مردوں کی تعلیم کو عورتوں کے مقابلے میں افضل سمجھتے تھے اور اپنے اس خیال کی تائید میں کہا کرتے تھے کہ

"اس وقت ہم تمام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہوسکتیں۔"

ان کے نزدیک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مردوں ہی کو عورتوں کا ذریعۂ تعلیم تصوّر کرتے تھے یعنی یہ کہ عورتیں مردوں ہی کے ہاتھ سے تعلیم پاسکتیں اور استانیاں بھی اسی صورت میں بہم پہنچ سکتی ہیں۔

جب خلّاقِ عالم نے عورت اور مرد کو عالمِ وجود میں بھیجا تو اس نے ہر دو صنف کے مختلف کام تفویض کیے۔ مرد جنگ و جدال کرتا ہو۔ عورت امن و آشتی قائم کرتی ہو۔ مرد ملکوں کو فتح کرتا ہو اور اس پر حکومت کرنے کے لیے عورت اس کا ساتھ دیتی ہو۔ مرد خود کے لیے اور اس کے لیے

معاش پیدا کرنے گھر کے باہر ہر قسم کی تکالیف برداشت کرتا ہے اور عورت گھر میں اس کے جسم و روح کا آرام بہم پہنچاتی ہے۔ ان متغائر کاموں کی بنا پر یہ کیسے ممکن ہے کہ عورت کو وہی تعلیم دی جائے جو مرد کی ہے اور اس کے لیے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے اور ایک ایسی تربیت دی جائے جو اس کی اپنی فطرت کے خلاف ہو۔ سرسید فرماتے ہیں :-

"میں نہیں سمجھتا کہ عورتوں کو افریقہ اور امریکہ کا جغرافیہ سکھانے ، الجبرا اور ٹرگنامیٹری کے قواعد بتلانے اور احمد شاہ اور مرہٹوں اور روہیلوں کی لڑائیوں کے قصے پڑھانے سے کیا نتیجہ ہے"

اور یہ درست ہے۔ عورت کو یہ ضرور جاننا چاہیے کہ افریقہ اور امریکہ دُنیا کے قطعۂ ارضی ہیں لیکن اس کو یہ معلوم کرنے کی کیا ضرورت کہ افریقہ اور امریکہ کے طولِ بلد اور عرضِ بلد کیا ہیں۔ بلاشبہ وہ اولوالعزم بادشاہوں سے واقف رہے لیکن اس کو اس سے کیا مطلب کہ کون سی لڑائی کب لڑی گئی۔

عورت نیکی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس کی فطرت اور رجحان کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو تعلیم وہی دی جائے جس سے اس کے

"دل میں نیکی اور خدا ترسی ، رحم اور محبت اور اخلاق پیدا ہوں اور یہی تعلیم اس کے دین اور دُنیا دونوں کی بھلائی کے لیے کافی ہے"

اسی خیال کی بنا پر سرسید مسلمان عورتوں کے لیے اسی تعلیم اور تربیت کے قائل تھے جو ان کے خاندان کی عورتوں اور دلّی میں عام طور پر رائج تھی۔ تعلیم نسواں پر لاہور میں جو تقریر انھوں نے کی تھی اس میں نہایت تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح ان کے خاندان کی لڑکیاں کسی ایک آسودہ گھر میں جمع ہوا کرتیں اور اس گھر کی بزرگ عورتیں خود یا ان کی نگرانی میں نوکر اُستانیاں ان لڑکیوں کو تعلیم دیا کرتیں۔ یہ بزرگ عورتیں نہ صرف ان کی ضرورت کے لائق تعلیم دیا کرتیں بلکہ ان کی تربیت کا ذمہ بھی لیتیں اور ان کو گھریلو زندگی اور سلیقے سے بھی اچھی طرح واقف کراتیں۔

سرسید عورتوں کی تعلیم کے لیے وہی کتابیں پسند کرتے تھے جو مذہب سے متعلق ہیں اور ان کا خیال تھا کہ

جو جو علوم اس زمانے میں عورتوں کے لیے مفید تھے وہی اس زمانے میں بھی مفید ہیں اور وہ علوم صرف دینیات اور اخلاق کے تھے۔ اس زمانے کی لڑکیاں قرآن شریف پڑھتی تھیں۔ اس کا ترجمہ پڑھتی تھیں۔ نماز روزے کے مسائل کی کتابیں پڑھتی تھیں۔ جس نے زیادہ تعلیم میں ترقی کی اور فارسی سیکھ لی اس کو قصص الانبیا اور حکایات اولیا اور اسی قسم کی اخلاق کی کتابیں اور بعض حکایات مثنوی مولانا روم کی پڑھائی جاتی تھیں۔

تربیت

سرسید نے تعلیم کے ساتھ تربیت کو کبھی علاحدہ نہیں کیا۔ تربیت کے بغیر محض تعلیم کو ایک بے قاعدہ چیز خیال کرتے تھے۔

"یونی ورسٹی کی تعلیم ایسی ہو کہ ایک ان گھڑ پتھر کو لے کر مورت کے ڈول میں بنا دے مگر اس پر پالش یا چمک دمک چاہتے ہیں جس سے لوگ اس کو پسند کریں یا اس کے خواہاں ہوں تو وہ صرف تربیت سے ہوتی ہے"

سرسید کے پورے تعلیمی کاموں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرسید نے مسلمانوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا بیڑا اٹھایا تھا جہاں تک ذہنی اور دینی اصلاح کا تعلق تھا وہ علوم جدیدہ اور انگریزی تعلیم کو مناسب تصور کرتے تھے اور جہاں تک اخلاقی درستی کی نسبت تھی وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمان بچے گروہ در گروہ ایک جگہ جمع ہوکر قومی تعلیم حاصل کریں تاکہ ان میں قومی اسپرٹ پیدا ہو۔

مسلمانوں کی تربیت میں سرسید نے بہت سی چیزیں داخل کی تھیں۔ سب سے پہلے ان کا یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں میں قومیت قائم رہے جس کے لیے انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم دینی چاہیے۔ عقائد مذہبی سکھائیں اور ممکنہ طور پر مذہب کا پابند بنائیں۔ مسلمانوں کو اخوتِ اسلامی کا درس دیں اور اس طرح ان سب کو ایک رشتے میں جوڑیں کہ ان میں قومی ہمدردی کا جذبہ پیدا کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ ایک جگہ رہیں، ایک جگہ پڑھیں لکھیں اور ایک ہی جگہ کھیلیں کودیں۔ تاکہ ان میں زندہ دلی قائم رہے اور ان کی امنگیں اور حوصلے بڑھیں۔ سب سے ضروری چیز مسلمان بچوں میں ان کے اخلاق کی درستی ہے۔ تربیت اس قسم کی ہو کہ ان میں نیکی، راست بازی، سچائی اور انسانی ہمدردی

کا جذبہ پیدا ہو۔ سرسید بچوں کی تربیت کے لیے نصیحت سے زیادہ عمدہ ماحول کو پسند کرتے تھے چنانچہ ان کا قول ہے:-

"اس مقصد کے لیے ہم کو نصیحت سے زیادہ ان کے لیے ایسے اسباب پیدا کرنے ہیں اور ان کے لیے ایسے بزرگ و نیک بزرگوں کا جمع کرنا ہے جن کے سبب سے اور جن کی صحبت سے ان کی طبیعت نیکی اور نیک دلی کی طرف مائل ہو اور گویا اخلاقِ حمیدہ ان کی طبیعتِ ثانی ہو جائے۔"

سرسید بچوں کے اس ادب کے مخالف تھے کہ

"لڑکا اپنے بزرگوں کے ڈر کے مارے سچی بات زبان سے نکال نہ سکے۔ جھجک جھجک کے بلا ضرورت سلام پہ سلام کرے۔"

اس قسم کے ادب سے بچوں کا دل جوش مرجاتا ہے۔ ان کی جرات، دلیری اور شرافت کھو جاتی ہے۔ تربیت بُری باتوں سے بچنے کی ہونی چاہیے نہ کہ اندرونی قوتی کے مارنے کی۔

سرسید ہر وقت اس بات کی کوشش کرتے کہ بچوں میں سچی آزادی کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کھانے پینے، رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے غرض ہر جگہ آزاد رہیں لیکن سرسید اس آزادی کے خلاف تھے جو کالج کے لڑکے حکومت کے خلاف بغاوت میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"یہ نوجوان انگریزی خوان ایک ہلدی کی گرہ پاکر پنساری ہونے کے مدّعی ہیں۔ نہ پالٹیکس کے اصول سے واقف ہیں اور نہ اس پر غور کیا ہے۔ نہ دوسرے ملکوں کے حالات سے واقف ہیں نہ ان کو کبھی دیکھا ہے۔ اور بے سروپا باتوں اور گورمنٹ کی نکتہ چینی میں سرگرم ہوگئے ہیں۔"

ہماری رائے میں سرسید کا یہ نظریہ ان کے زمانے میں بھی درست تھا اور اب بھی معقول ہے۔ سرسید کے زمانے میں ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلمانوں میں کوئی اعلیٰ قسم کی سیاسی جماعت نہ تھی جو اس وقت کے نوآموز و نوجوانوں کی صحیح رہبری کرتی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کو بجائے اس کے کہ کسی سیاسی خلفشار میں مبتلا کیا جائے پہلے ان کو متحد کرنے کی ضرورت تھی۔

"اُردو کے نشوونما میں میرٹھ کا حصہ"[1]

(از جناب حسن یحییٰ صاحب عندلیب ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی علیگ)

غدر سے قبل شہر میرٹھ نے اُردو کے نشوو ارتقا میں کیا حصہ لیا اور اس سرزمین نے کیا کیا جواہر ریزے اُگلے مرورِ ایام نے آج ہماری نظروں سے اوجھل کردیے ہیں۔ سرِدست اس مضمون میں ہم غدر کے بعد کے عہد سے بحث کریں گے، لیکن اگر زمانے کی کش مکش نے فرصت دی تو کیا عجب ہے کہ یہ خاکسار وہ اَن مول موتی بھی پردۂ خفا سے باہر لاکر آپ کی خدمت میں پیش کرسکے جن کی چمک دمک دیکھنے سے فی الحال ہم کلی طور پر قاصر ہیں۔

عیسائی مشنریوں کا سب سے پہلا قدم مدراس میں آیا اور حکومتِ مدراس نے ۱۷۶۱ء میں ویپری پاڈیچری مشن کو پریس کے استعمال کی اجازت دی۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں پریس کھُل گیا اور یہاں سے ڈاکٹر گل کرائسٹ اور اُن کے دوسرے رفقائے کار کی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اِس کے بعد ہندستان کی مختلف زبانوں میں اخبارات نکلنے لگے۔ چناں چہ اُردو کا سب سے پہلا اخبار علّامہ آزاد کے والدِ ماجد مرزا محمد باقر کی ادارت میں دہلی سے ۱۸۳۶ء میں جاری ہوا، اور پھر مختلف مقامات سے اُردو میں اخبارات شائع ہونے لگے۔ میرٹھ سے بھی پہلی مرتبہ ایک اخبار جامِ جہاں نما شائع ہونا شروع ہوا جس کا ذکر اخبار کوہِ نور لاہور کی جلد ۱۸۵۱ء میں حوالے کے طور پر موجود ہے۔

۱۸۶۲ء میں منشی محمد وجاہت علی خاں کے زیرِ ادارت ایک ہفتے وار اخبار عالم نکلا۔ اس زمانے

---

[1] یہ مضمون انجمنِ ترقیِ اُردو (میرٹھ) کے جلسۂ منعقدہ ۱۴ر اپریل ۱۹۴۳ء میں پڑھا گیا تھا۔

میں اڈیٹر مہتمم کہلاتا تھا اور اکثر و بیشتر وہی مالک بھی ہوتا تھا۔ اخبار عالم کی خصوصیت یہ تھی کہ میرٹھ کی مقامی خبریں نظم میں درج ہوتی تھیں۔ مقامی خبروں کے علاوہ مختلف علمی، ادبی اور سماجی مباحث پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ مثلاً ۱۸۶۵ء کی ایک اشاعت میں "تعلیم عورات" پر ایک مضمون درج ہو۔ نمونے[1] کے طور پر ایک آدھ فقرہ اس مضمون سے اقتباس کرکے ذیل میں درج کیا جاتا ہو:-

"از روئے شرع شریف و دھرم شاستر کے پڑھنا لکھنا عورتوں کا جائز ہو بلکہ مذہب اسلام میں جیسا پڑھنا لکھنا مردوں پر فرض ہو اسی قدر عورتوں کو ہو۔"

یہ اخبار عرصۂ دراز تک جاری رہا۔ عمدہ اور بڑے سائز کے کاغذ پر چھپتا تھا۔ منشی محمد وجاہت علی خاں کی وفات کے بعد حکیم مقرب حسین صاحب اس کو نکالتے رہے۔

تیسرا اخبار میرٹھ سے نجم الاخبار کے نام سے ۱۸۶۳ء میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کے اڈیٹر مولوی محمد حیات مرحوم تھے۔

۱۸۶۴ء میں سید جمیل الدین ہجر نے لارنس گزٹ جاری کیا۔ ہجر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بڑے لائق اڈیٹروں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے یہ اخبار لارڈ لارنس کے نام پر جاری کیا تھا۔ نمونہ حسب ذیل ہو[2]:-

"نوساری کی پارسی عورتوں میں دفعتاً شہرت ہوئی کہ بمبئی سے کل کا کتا ہوا سوت آیا ہو جس سے پاک ڈورا جنیو کا پارسیوں کے لیے تیار ہوگا۔ یہ سنتے ہی تمام عورتیں غضب ناک ہوکر اوّل برجورجی نوروزجی سردار قوم پارسی کے پاس جاکر فریادی ہوئیں کہ سوت جو کل سے تیار ہوکر آیا ہو اس سے ہماری سوداگری کو نقصان پہنچے گا۔

لکھا ہو کہ جب سردار مذکور سے اور پارسی دستور سے حسب منشا جواب نہ ملا تو وہ عورتیں زنانہ اسکول میں گھس آئیں جہاں انھوں نے اُستادوں اور شاگردوں کو ڈرایا۔ انجام کار رفع نزاع کی نظر سے وہ سوت جو آدھا پونڈ تھا ان بہادر عورتوں کے حوالے کردیا جسے انھوں نے وہیں تار تار کردیا اور اسکول سے اپنی

---

[1] و [2] یہ اقتباسات وہ ہیں جو پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے مضمون "اردو اخبار" شائع شدہ رسالہ "اردو" بابت اپریل ۱۹۲۵ء سے نقل کیے گئے ہیں۔

لڑکیوں کو جن کی تعداد تیس تھی وہ اٹھا کر لے گئیں ۔" (مورخہ ۲۴ر اپریل [illegible]ء)

[illegible]ء میں مولوی احمد حسن شوکت (مجدد السنۂ مشرقیہ) نے شحنۂ ہند ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو [illegible]ء تک برابر نکلتا رہا۔ اس میں علمی، ادبی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے اور مقامی و ملکی خبریں چھپتی تھیں۔

اسی زمانے میں حضرت بیاںؔ و یزدانیؔ نے رسالہ لسان الملک نکالا۔ یہ رسالہ ماہوار شائع ہوتا تھا اور غزلوں کے علاوہ نثر کے مضامین جو ادبی اور سیاسی مباحث کے متعلق ہوتے تھے چھاپے جاتے تھے۔

۱۸۸۵ء میں بیاںؔ مرحوم نے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا اور طوطیٔ ہند اس کا نام رکھا جو ۱۸۹۴ء تک جاری رہا۔ اس میں علمی ادبی سیاسی سب طرح کے مضامین چھپتے تھے۔ ملکی اور مقامی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ جناب بیان میرٹھ پنچ کے نام سے بطور ضمیمے کے چند صفحات ہر ماہ اپنے اس اخبار میں شامل کرتے تھے جس میں اپنے معاصرین پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات تو گالی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ طوطیٔ ہند میں وقتاً فوقتاً داغؔ، امیرؔ، مولوی نذیر احمد اور دوسرے مشاہیر کی غزلیں اور نظمیں چھپتی رہتی تھیں۔ حضرت بیان کے بعد یہ اخبار سید سجاد حسین ریحانی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا اور آخر میں مولانا شوکت (مجدد السنۂ مشرقیہ) نے اِس کو خرید لیا اور وہ اسے نکالتے رہے۔ قریب قریب انھی دنوں ایک اخبار انجمن ہند جاری ہوا۔ طوطیٔ ہند کا نمونہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے:-

آنریبل سر سید بہ القابہ اور سفرِ پنجاب

"اس پیرانہ سالی میں، اس گرمی کے زمانے میں، اس ضعیفی میں اور ایسے زمانے میں کہ پسر جوان کا داغ سر سید کے جگر پر بیٹھا ہوا ہے، آج کل میں آپ سفرِ پنجاب مع اپنے خالص احباب اور دوستوں اور حواریوں کے اختیار کرتے ہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں ؎

بہ سفر رفتنت مبارک باد　　　بہ سلامت روی و باز آئی

پنجاب میں طبقۂ اراکین و عمائدین میں آنریبل سر سید کا بڑا رسوخ ہے اور ان کی لیاقت اور عزت کا سکہ ان کے قلب پر جما ہوا ہے۔ ہرچند مخالف جوانب دکھائے جاتے ہیں جن میں چندے کا دیا جانا زیادہ محمود ہے،

تاہم اُس قدرتی انفلوئنس سے جو آنریبل سرسید نے بقولِ خود زندہ دلانِ پنجاب پر حاصل کیا ہو اس سفر کا نتیجہ کامیابی کی خبر دیتا ہو۔ سرسید اہالیانِ پنجاب کے لیے زندہ دل کی صفت مزدور استعمال کرتے ہیں مگر کسی نے مصطلحاتِ وارستہ یا بہارِ عجم منشی ٹیک چند کو دیکھا ہو وہ اس کے معنی سمجھ سکتا ہو اور ہم کو کسی قدر حیرت ہو زمانے کی ترقی، علومِ مختلفہ کے رواج اور طبیعت کی آزادی اور تیزی نے باشندگانِ پنجاب کو اس لفظ کے معنی نہیں سمجھائے۔ کیا اور ممالک کے باشندے سب مردہ دل ہیں؟ کیا زندہ دلی یعنی تمسخر و حماقت و ظرافت صرف اصحابِ پنجاب ہی میں کوٹ کوٹ کر بھردی ہو؟ کسی صحبت میں جب کہ تعریفوں کی بھرمار سے سرسید کو اس سفر نے ہمہ تن تصویرِ خوشی بنادیا ہو، اس زندہ دلی کے معنی بھی ان سے پوچھنے چاہییں۔ ہم کو حیرت ہو کیوں اس لفظ کا مکرر و سہ کرر استعمال کیا جاتا ہو۔ اگر حقیقتاً پنجاب والے اس سے خوش ہوتے ہیں، ہم بھی سرسید کی تقلید میں اپنے اخبار کے خریدارانِ پنجاب کی ہر طباق پر زندہ دل لکھوادیا کریں جس سے اُن کی طبیعت خوش ہوجایا کرے ؎

زندگی زندہ دلی کا ہو نام مُردہ دِل خاک جیا کرتے ہیں

پنجاب کی آب وہوا محمڈن کالج کے لیے موافق پائی جاتی ہو۔ وہاں کے طالب علم بھی کالج میں زیادہ ہیں۔ وہاں کے لوگ سرسید کے عقائد پر چنداں نکتہ چینی نہیں کرتے اور اگر کوئی بگڑا ہوا... نکتہ چینی کرتا ہو تو زمانہ اس کو خود مسل دیتا ہو۔ دراصل خود سرسید بھی تو پنجابی ہیں۔ اُن کے دعوے پنجاب پر، اور پنجاب کے اُن پر لاریب درست ہیں، یعنی کشمیر سرحدِ پنجاب اور دہلی انتہاے پنجاب داخل صوبۂ پنجاب ....." (ماخوذ از اخبار طوطیٔ ہند مطبوعہ ۸ر اپریل ۱۸۹۴ء)

ایک اور اقتباس طوطیٔ ہند کی جلد ۱۸۹۴ء سے نقل کیا جاتا ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ مرزا غالب کی سادہ نثر کے باوجود مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرزِ انشا ہی کو تقلید کے لیے نمونہ رکھا جاتا تھا:۔

"علی گڑھ کی نمایش اور مسٹر ہریسن

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رُخ کے ظہور کی

علی گڑھ کی نمایش کیا ہو، عرضِ متاعِ بیش بہا ہو۔ نمایش کی نمایش، تماشے کا تماشا۔ سبحان اللہ صلِ علیٰ وماشا۔ علی گڑھ کی نمایش ہو یا طلسم کدۂ ناز۔ فرطِ انبساط سے ہر غنچۂ دل مثلِ گل باز۔ سامانِ طرب کو بہ کو۔ نغمہ سنجیٔ مطربانِ جادو نوا وحُسن فروشانِ نازک ادا چار سو۔ رونق، شان، سامان، انتظام

سب سے نظیر، بے مثل، بے انتہا۔ لاکلام نمایش ہے کہ سراسر مجموعۂ انبساط و شادمانی۔ نہ کہیں حسرت نہ پشیمانی۔ عالی شان رؤسا کے گروہ غٹ غٹ۔ جو ارشاد کیجیے اس کی تعمیل جھٹ پٹ ...... نمایش کیا ہے سامانِ بلا کا نمونہ اور رخسارِ عیش کا گلگونہ۔ خالِ رُخِ عروسِ بہار۔ جمالِ بُتانِ گل عذار۔ آرزوئے عشاق، تماشائے مشتاق .... وغیرہ"

سنہ [illegible] میں احمد حسین صاحب نے ایک اخبار مذاق جاری کیا جس کی عبارت ظریفانہ ہوتی تھی گویا اخبار مذکور اسم بامسمیٰ تھا۔

سنہ [illegible] میں شیخ حبیب احمد کے زیرِ ادارت اخبار پولیس نیوز کا اجرا ہوا۔ اس میں محکمۂ پولیس کی خبریں شائع ہوتی تھیں اور پولیس کے ملازمین ہی زیادہ تر اس کو پڑھتے تھے۔

حضرتِ شوکت (مجددِ السنۂ مشرقیہ) نے ایک رسالہ پروانہ اسی زمانے کے قریب نکالا جو عرصے تک جاری رہا۔ اس میں فارسی اور اُردو کے مشکل اشعار کی شرح درج ہوتی تھی۔ کہیں کہیں حضرتِ مجدد نامور فارسی اور اُردو شعرا کے اشعار پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ چناں چہ خاقانی، نظیری، عرفی، غالب، اور مومن جیسے اساتذہ بھی اُن کے سیفِ قلم کے زخم خوردہ ہیں۔

سنہ ۱۹۰۸ء یا سنہ ۱۹۰۹ء میں خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے، ایل ایل۔ بی وکیل میرٹھ نے ایک ماہواری رسالہ بہ نام عصرِ جدید نکالنا شروع کیا جو تقریباً ۴۴ صفحات کے حجم پر مشتمل ہوتا تھا۔ جس کے اجرا کا مقصد اصلاحِ تمدن تھا۔ چناں چہ اکثر و بیشتر مضامین اسی موضوع پر نکلتے تھے۔ علمی اور ادبی مضامین بہت کم جگہ پاتے تھے۔ جس زمانے میں خواجہ صاحب مرحوم میرٹھ چھوڑ کر لکھنؤ میں وکالت کرنے لگے یہ رسالہ وہاں سے بھی بدستور شائع ہوتا رہا۔ اڈیٹر کی عبارت کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

ایک بدنما مثال کے تحت میں لکھتے ہیں:-

"حال ہی میں ایک نہایت لائق اور نیک نفس تعلقہ دارِ اودھ نے جو دیگر لحاظ سے امرا کے لیے نمونہ ہیں انھوں نے بھی اپنی غیر ضروری رسمِ گدی نشینی میں ایک لاکھ سے زیادہ اور دو لاکھ سے کم روپیہ خرچ کر دیا۔ ہم کو یقین ہے کہ راجا صاحب معاف فرمائیں گے اگر ہم بہ ادب عرض کریں کہ مسلمانوں کی اس خستہ حالت میں، قحط کے زمانے میں، رؤسا کی مقروضی کی حالت میں یہ خرچ ذرا غیر ضروری تھا۔

جب اسے تعلیم یافتہ روشن ضمیر رؤسا قائم نہ کریں تو کس سے امید ہو سکتی ہے ؎

ہر غنچہ بہ شگفت الا دلِ من اے وا دلِ من! اسے وا دلِ من

دوسری جگہ "بے سمجھی کا الزام" کے تحت میں رقم طراز ہیں :۔

"بعض اخبار نویس بغیر واقعات کو تحقیق کیے الزام دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ آج ہمارے پاس "ریاض الاخبار" مورخہ یکم فروری ۱۹۰۶ء موصول ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ شمس العلما مولانا حالی نے اپنے منصب کا خیال نہ کیا اور درخواستیں دے کر شعرا کے زمرے میں حیدرآباد گئے۔ یہ خیال محض غلط ہے۔ مولانا کا تعلق حیدرآباد سے سترہ اٹھارہ برس سے ہے اور ان کو بہ ذریعہ مراسلہ و تار، سرکاری طور پر طلب کیا گیا تھا۔ باوجود علالت محض اس وجہ سے کہ ریاست کے احسان اُن پر ہیں وہ تشریف لے گئے۔ نہ اُنھوں نے درخواست دی، نہ شعرا میں شریک ہونے کی کوشش کی۔ اُن کے احباب نے زور دیا کہ حضور نظام کے جلسۂ جوبلی میں جانے سے پہلوتہی کسی طرح مناسب نہیں۔ مولانا نے اس کو منظور کیا۔ بھلا اس واقعے اور ریاض الاخبار کے متذکرہ واقعے میں کتنا فرق ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ ہمارا معاصر اس بیان کی تردید کر دے گا۔"

غالباً ۱۹۱۳ء میں جناب شعیب احمد ندرت نے ایک ماہانہ رسالہ عندلیب نامی جاری کیا۔ اس رسالے میں علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ نظمیں اور غزلیں بھی درج کی جاتی تھیں۔ اسی زمانے میں مولانا ندرت کے برادرِ بزرگ جناب عزیز احمد رفعت نے ایک پرچہ ناصر الاخبار نکالا۔ چوں کہ یہ پرچہ تصوف کے متعلق تھا اس لیے صوفیا کے حلقے میں کافی مقبول تھا۔ نظارہ بھی جو ایک ماہواری علمی و ادبی مجلّہ تھا اسی عہد میں جاری ہوا۔ اس کے مالک عبدالحمید حمید تھے۔

۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں دو رسالے طالبِ دیدار اور جلوۂ یار کے نام سے شائع ہوئے۔ اول الذکر کو شمس الدین شمس نکالتے تھے اور دوسرے کو شریف خاں صاحب، لیکن دونوں پرچوں کی حیثیت غزلوں کے گل دستوں سے زیادہ نہیں تھی۔ غزلوں کے علاوہ نثر کے مضامین ان میں بالکل نہ چھپتے تھے۔

مولوی ابو رحمت حسن نے النظیر کے نام سے ایک پرچہ ۱۹۱۸ء میں نکالا۔ اس میں صرف مذہبی

مناظروں کے متعلق مضامین درج ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں اخبار چھتری کا اجرا ہوا جو آج سے دو تین سال پہلے تک میرٹھ سے برابر نکلتا رہا۔ یہ اخبار قوم چھتری کا تھا۔ چار پانچ برس بعد ۱۹۲۲-۲۳ء میں مولانا جوہر بریلوی نے ملت نامی ایک اخبار جاری کیا۔ اسی زمانے میں بیرہند کے نام سے ایک اخبار نکالا گیا لیکن یہ پرچہ آج کل کے اخبار پرتاپ لاہور کی طرح نہایت متعصب اور دریدہ دہن تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ گزٹ اور قوم اخبار جاری ہوا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ گزٹ ماہواری نکلتا تھا۔ اور اس میں صرف ڈسٹرکٹ بورڈ کے جلسوں کی روئداد ہوتی تھی۔ قوم کے اڈیٹر آں جہانی پنڈت پیارے لال شرما، ایم اے، ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ میرٹھ وسابق وزیر تعلیم صوبۂ متحدہ تھے۔ اس میں مقامی و ملکی سب خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ادارے میں جناب سید محمد یحیٰی میرٹھی، پنڈت گوپی ناتھ سنہا اور مولانا ندرت وغیرہ کام کر چکے ہیں۔ پنڈت پیارے لال شرما کے بعد کچھ عرصے ایک شخص مسمّیٰ انبا پرشاد متوطن منظفرنگر بھی قوم کو شائع کرتے رہے ہیں۔ بہ قول مولانا ندرت بہ اعتبارِ زبان اور بہ لحاظِ لب و لہجہ میرٹھ سے نکلنے والے اردو کے ہندو اخبارات میں یہ اخبار سب سے بہتر تھا۔

۱۹۲۳ء ہی میں مولانا ندرت نے اپنے اخبار آئینہ کا اجرا کیا۔ یہ اخبار آج تک جاری ہے اور اپنے مقررہ وقت پر شائع ہوتا ہے۔ اس میں علاوہ ملکی و غیرملکی اور میرٹھ کی مقامی خبروں کے مختلف انجمنوں کی روئدادیں شائع ہوتی ہیں۔ حضرت ندرت اور دوسرے شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں الخلیل نامی ایک ہفتے وار اخبار یہاں سے نکلتا تھا۔ شروع میں یہ اخبار بجنور سے شائع ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کا دفتر میرٹھ منتقل کر دیا گیا۔ یہ اخبار باتصویر تھا۔ الخلیل کا قیام میرٹھ میں بہت تھوڑے عرصے رہا ہے۔ بعد میں یہ اخبار دہلی سے نکالا جانے لگا۔ قیام میرٹھ کے زمانے میں جناب حامد اللہ افسر میرٹھی بھی اس کے ادارے میں رہ چکے ہیں۔

۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں حور میرٹھی نے عورتوں کا ایک ماہ نامہ خاتونِ مشرق کے نام سے نکالا۔ اس میں زیادہ تر عورتوں کے مضامین چھپتے تھے۔ ۱۹۳۴ء سے قاضی محی الدین یمنی اخبار چنچل نکال رہے ہیں۔ یہ باتصویر پرچہ ہے اور ہفتے وار شائع ہوتا ہے۔ اس میں مقامی خبریں، افسانے، ترجمے اور سینما

کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے حالاتِ زندگی سب چھپتے رہتے ہیں۔

غالباً ۱۹۳۳ء میں حضرت ساغر میرٹھ آئے اور ۱۹۳۵ء میں انھوں نے ایک علمی، اَدبی اور سیاسی ماہ نامہ ایشیا کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ ۱۹۳۷ء میں اس کو سہ ماہی کردیا گیا لیکن ۱۹۴۰ء میں پھر ماہ واری کردیا گیا۔ اپنے صوری اوصاف کے علاوہ بہ اعتبار مضامین بھی یہ رسالہ ملک کے عمدہ پرچوں میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ ایشیا آج تک بہ دستور جاری ہے لیکن حال ہی میں ساغر صاحب نے اس کو پونا سے نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایشیا کے ساتھ ہی ایک پرچہ پیمانہ کے نام سے حضرت ساغر کی نگرانی میں ان کے چھوٹے بھائی اسدیار خاں نکالتے تھے۔ یہ چھوٹی تقطیع کا پرچہ تھا جس کی اشاعت پچھلے دو تین سال سے بند ہے۔

۱۹۳۶ء کے شروع میں جناب پنڈت گوپی ناتھ سنہا بی۔ اے، ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ میرٹھ نے اپنا اخبار آفتاب نامی جاری کیا۔ اس ہفتے وار اخبار میں مقامی خبریں درج کی جاتی تھیں۔ میرٹھ میونسپل بورڈ کے اجلاس کی رودادیں وغیرہ بھی شائع ہوتی تھیں۔ سنہا صاحب مقامی کوائف پر نہایت عمدہ تبصرہ کرتے تھے۔ طرزِ تحریر ان کا کافی دل کش ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے پیشے کی مصروفیتوں اور دیگر چند وجوہ سے یہ اخبار جلد بند ہوگیا۔

۱۹۳۶ء ہی میں کام دار المدنی نے رفیق نامی ایک اَدبی رسالہ شائع کیا لیکن اس کے دو تین نمبر ہی نکلے ہوں گے کہ رسالہ بند کردیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں حامدیار خاں تبسم نظامی نے اپنے اخبار دورِ جدید کا دفتر جھانسی سے میرٹھ منتقل کیا اور یہاں سے اس پندرہ روزہ اخبار کو شائع کرنا شروع کیا۔ یہ اخبار ہندستان کی ریاستوں کی خبریں دیتا تھا۔ کبھی کوئی افسانہ یا اَدبی مضمون بھی درج ہوجاتا تھا۔ شعرا کی نظمیں اور غزلیں بھی چھپتی تھیں۔

پچھلے چند برس سے انجمنِ اصلاح المسلمین میرٹھ اپنا ایک ماہ واری رسالہ اصلاح نامی شائع کررہی ہے۔ اس رسالے کا مقصد سیاسیاتِ حاضرہ سے علیحدہ رہ کر مسلمانوں کی مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ چناں چہ بعض نہایت مفید اور اہم مضامین مختلف موضوع پر چھپتے رہتے ہیں۔

گزشتہ دو ایک سال سے جناب عقیل ہمدانی ایک رسالہ عرفان شائع کرتے ہیں۔ یہ رسالہ بھی بیش تر

میں مضامین درج کرتا ہے۔ کبھی ایک آدھ نظم بھی شائع ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اخبار خادم کے نام سے لال کرتی بازار سے شائع ہوتا ہے۔

یہاں تک اخبارات و رسائل کا ذکر کیا گیا لیکن میرٹھ کی سرزمین سے اُٹھنے والے شعرا کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ صنفِ نظم میں یہاں سے کافی باکمال ہستیاں پیدا ہوئیں۔ سرفہرست حکیم مولا بخش قلق کا نام نامی نظر آتا ہے۔ آپ حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے اور جیسا کہ ان کے دیوان کے دیباچہ نگار نے تحریر کیا ہے، ان پر حضرتِ مومن کی خاص توجہ تھی۔ قلق نے رنگِ مومن کچھ ایسا اپنا لیا ہے کہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ شعر قلق کا ہے، پڑھنے والا برابر مومن ہی کا سمجھتا رہے گا، اسی وجہ سے اُستاد اور شاگرد کے کلام میں امتیاز کرنا بہت دُشوار ہے۔ ترکیبوں کی برجستگی، نازک خیالی، مضمون آفرینی، شوخی اور ندرت آپ کے کلام کا خاص وصف ہے۔ کلام مشکل نہیں لیکن بعض مقامات پر اشعار دماغ پر زور دیے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔ مولانا حالی اُن کے متعلق رقم طراز ہیں :-

”در اندک فرصت سخن ایشان برنسق خامۂ استادِ خویش کمال پختگی پیدا کردہ ہرجا کہ بزم مشاعرہ انعقاد می یافت با اُستادانِ دیگر ہم طرح شدہ دادِ غزل سرائی می دادند و حاضرین تعجب بر تعجب و حیرت بالائے حیرت می افزودند۔“

چند شعر سنیے ؎

(نازک خیالی) رکھتا ہے حسرتوں کو دلِ بے خبر عزیز — ناکامیوں سے رہتا ہے ناکام، کام یاب

(شوخی) جییں گے اس طرح کب تک کہ غیرت آہی جاتی ہے — ہر اک سے اب وہ کہتے ہیں کہ لو ہم پر یہ مرتے ہیں

(غالب کے انداز میں) رُسوائے بزمِ ناز کسی نازنیں کے ساتھ — اے چرخ! تو نے کیا نہ کیا پر نہیں کیا

بے اعتباریوں کے بڑے اعتبار ہیں — نالہ کیا نہیں کہ وہ بے اختیار ہیں

قلق کے بعد ہماری نظر حکیم فصیح الدین رنج پر پڑتی ہے۔ حکیم صاحب موصوف کا شمار اطبائے باکمال میں ہے۔ طب کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی کافی ذوق رکھتے تھے۔ بہارستانِ ناز جو شاعرات کا تذکرہ ہے، آپ سے یادگار ہے۔ علاوہ ازیں اُردو غزلوں کا ایک دیوان بھی شائع ہوچکا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خاصا اچھا شعر کہہ لیتے تھے۔ اندازِ سخن وہی داغ کا ہے جو ہر شاعر پر اس زمانے میں چھایا ہوا تھا۔

ذیل کے چند شعر میرے اس دعوے کی دلیل ہیں ؎

کہ آشنا بھی ہو شاعر بھی ہو طبیب بھی ہو | نکالنے دیکھے گا پہلو سے رنج کو اپنے
جھوٹی پھر کس کی قسم کھائیے گا ؟ | سر مرا کاٹ کے پچھتائیے گا !
پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا | مجھ سے کہتے ہو کہ جا، جاتا ہوں

اسی دور کی یادگار مولانا فرقانی تھے ۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں آپ کا کلام موجود ہو۔ اُردو میں تخلص شاکی تھا، فارسی میں فرقانی ۔ غزلوں کے علاوہ مولانا نے مراثی اور سلام بھی کہے ہیں ۔ دیوان آپ کا چھپ گیا ہو۔

مولانا فرقانی کے شاگرد سید محمد مرتضیٰ داغ و امیر کے ہم عصر تھے اور محلہ چار دروازے میں رہتے تھے ۔ اُردو میں بیاں تخلص کرتے تھے اور فارسی میں یزدانی ۔ عربی فارسی کی عمدہ استعداد تھی ۔ سنہ۱۹۱۵ء میں ۷۰ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ اُردو میں اُن کا کلام زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہو لیکن چند نظمیں بھی اُن کے قلم سے یادگار ہیں۔ نہایت پُرگو شاعر تھے لیکن اکثر اچھا شعر کہتے تھے ۔ افسوس ہو کہ ان کا کلام آج تک طبع نہیں ہو سکا۔

حضرت بیاں علاوہ ممتاز شاعر ہونے کے ایک زبردست نثار بھی تھے ۔ چناں چہ اڈیٹر اودھ پنچ اور اس کے رفقائے کار کے مقابلے میں جو تحریرات اس زمانے میں شائع ہوئیں اس کا لُطف کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے اِن تحریرات کو دیکھا ہو۔ ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہو کہ مرحوم کا قلم نہ صرف شاعری میں بلکہ نثر کے میدان میں بھی وہ وہ جولانیاں دکھاتا ہو کہ باید و شاید۔

مولوی احمد حسین شوکت اپنے زمانے کے بڑے عالم فاضل بزرگ تھے ۔ مولانا ندرت میرٹھی آپ ہی کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ شوکت مرحوم نظم و نثر دونوں پر یک ساں قدرت رکھتے تھے جس کی بیّن دلیل ان کا اخبار شحنۂ ہند ہو ۔ شحنۂ ہند کے علاوہ دو ایک پرچے اور بھی آپ کی ادارت میں نکلے ہیں جن کا تذکرہ صفحاتِ ماسبق میں آچکا ہو۔ شعر و سخن کا عمدہ مذاق رکھتے تھے اور خود بھی اچھا خاصا شعر کہہ لیتے تھے۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ طبیعت کسی قدر دُشوار پسند پائی تھی ۔ اُن کی علمیت میں کوئی شبہ نہیں لیکن دوسروں

کے کلام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے حدِ اعتدال سے گزر جاتے تھے۔

یہاں کے ایک اور بزرگ امداد حسین صاحب متخلص بہ ظہور تھے جو اپنے نعتیہ کلام کے لیے مشہور ہیں۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور عرفانی تخلص کرتے تھے۔ فارسی اشعار کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اندازِ گفتگو بالکل ایرانی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کا دیوان شائع نہیں ہوا ہے۔ البتہ چند رسالہ جات انھوں نے چھپائے تھے جن میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعت مختلف بحروں اور زمینوں میں نہایت خوب لکھی ہے۔

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اُردو ادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔ ہر وہ بچہ جس نے ان کی اُردو ریڈریں پڑھی ہیں ان کے نام سے واقف ہے۔ مولوی صاحب نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ شعرگوئی کا شوق ابتدا سے تھا جو دورانِ ملازمت میں بھی ترک نہ ہوسکا۔ مصنفِ گلِ رعنا کا خیال ہے کہ "مولانا اُردو زبان کی نظم و نثر میں خواہ وہ عاشقانہ رنگ میں ہو یا تمدنی و اخلاقی و سیاسی ہو، قدیم و جدید ہر طرز میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ مولانا نے داغ کا ہم عصر ہوتے ہوئے بھی داغ کا رنگِ تغزل اختیار نہیں کیا اور غالب و مومن کی تقلید کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا۔ مثنوی، خاص کر بچوں کی نظمیں لکھنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ نظموں کا رنگ وہی ہے جو حالی کا ہے۔ نیچرل شاعری کے علم برداروں میں اگر حالی کے ساتھ آزاد کا نام لیا جاسکتا ہے تو مولوی صاحب کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آج کل کے بعض نوجوان اپنی کم علمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ نظمِ غیر مقفّٰی کا رواج موجودہ زمانے کی ایجاد ہے، حالاں کہ ان لوگوں سے بہت پہلے مولوی صاحب چند غیر مقفّٰی نظمیں لکھ چکے تھے جو کافی مقبول ہوئیں۔ شاعر ہونے کے علاوہ مولوی صاحب کی اُردو نثر بھی اچھی تُلی ہوتی ہے۔ اُن کی جو کتابیں کورس میں داخل تھیں میری اس رائے پر شاہدِ عادل ہیں۔

مولانا کے چند شعر ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں :-

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں — ہے یہ تیری ہی صدا، غیر کی آواز نہیں

فکرِ افشائے راز کیوں نہ کروں — کیا حیا خیز ہے نظر دیکھو

بلبل کے دل میں داغِ وداعِ بہار ہے — یارب! کوئی فریفتۂ رنگ و بو نہ ہو

جس کو سُن کر زہرۂ سنگ آب ہو — آہ! وہ غم گیں فسانہ اور ہو

تیرے سوا اُسے نظر آتا نہیں کوئی — حاصل جہان میں جسے عین الیقین ہو

تو اور عذرِ طعنِ رقیباں غضب ہُوا — دل پارہ پارہ جب نہ ہُوا تھا تو اب ہُوا

مولوی عبدالحکیم جوشؔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب موصوف کے بڑے بھائی تھے ۔ شعر کہتے تھے لیکن رنگ تغزل وہی پرانا تھا، البتہ فنِ شعر کے ماہر تصوّر کیے جاتے تھے ۔ کبھی کبھی نظم بھی لکھ لیتے تھے ۔ مولوی اسمٰعیل صاحب نے ان کی ایک آدھ نظم اپنی کسی ریڈر میں بھی انتخاب کی ہو ۔ تاریخ بھی اچھی نکالتے تھے ۔

اسی زمانے میں نواب اشارت علی صدقؔ موجود تھے جن کو تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا ۔ چناں چہ آپ کی بہت سی تاریخیں میرٹھ میں زبان زدِ خاص و عام ہیں ۔ ہردوار سے جب وہ نہر گنگ نکالی گئی جو ڑڑکی ضلع سہارن پور سے ہوکر گزرتی ہو تو مسٹر کاٹ لی اُس کے انجنیر تھے ۔ آپ نے تاریخ کہی ؎

کاٹ لی صاحب نے گنگا کاٹ لی

سیّد محمد حسین صاحب شوقؔ اصل میں سہارن پور کے رہنے والے تھے اور عہدۂ ڈپٹی مجسٹریٹ نہر پر مامور تھے ۔ ملازمت سے سبک دوش ہوجانے پر میرٹھ میں بود و باش اختیار کرلی تھی اور اپنے صاحب زادے سید محمد مستحسن زیدی مرحوم بیرسٹرایٹ لا میرٹھ کے ساتھ خیر نگر دروازے میں رہا کرتے تھے ۔ بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے ۔ مجھ پر بھی شفقت فرماتے تھے ۔ ۱۹۲۷ء میں یہیں انتقال فرمایا ۔ مرحوم نے مدّتِ مدید تک وقفِ منصبیہ میرٹھ کی تولیت کے فرائض انجام دیے ۔ اس وقف کے متعلق ایک سالانہ رپوٹ شائع فرماتے تھے جو بہت دل چسپ ہوتی تھی ۔ شعر کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور خود بھی اچھا شعر کہ لیتے تھے ۔ مثالاً چند شعر لکھتا ہوں ؎

آستاں بوس تھے جس در کے، وہ در چھوڑ دیا — بھاری پتھر تھا، فقط چوم ہی کر چھوڑ دیا

مرغِ گلشن سے یہ پر کاٹ کے بولا صیاد — لے، کیا رحم کہ ٹوٹا ہُوا پر چھوڑ دیا

اُڑ بھاگے ہم صفیر قفس توڑ توڑ کر — میں ناتواں بلا میں گرفتار ہی رہا

تسکیں ہوئی نہ کشمکشِ غم سے چھوٹ کر
دلِ مبتلا نے لذّتِ آزار ہی رہا

واں نقدِ جاں بھی نذر، نہ وہ مرحبا کہیں
دل کس حساب میں ہے، جگر کس شمار میں

دیکھو حنا کے شوق کو پچھتاؤ گے بہت
شیدا نہ اس سا ایک ملے گا ہزار میں

مولانا شبیب احمد ندرت عصرِ حاضر کے مشہور شعرا میں ہیں اور خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں۔ مزاج سیدھا سادہ اور خاک سارانہ ہے۔ خونِ نابۂ دل کے نام سے آپ کا دیوانِ غزلیات تین چار برس ہوئے شائع ہو چکا ہے۔ فنِ شعر اور الفاظ کے محلِ استعمال کے متعلق وسیع نظر رکھتے ہیں۔ کلام کا رنگ یہ ہے ؎

بگولے اس لیے منڈلا رہے ہیں میرے مدفن پر
کہ یہ دھبّہ بھی کیوں باقی رہے صحرا کے دامن پر

نیستی مضمر مری ہستی کی بنیادوں میں تھی
یہ مری بربادیاں ہی حاصلِ تعمیر ہیں

ہزاروں آرزوئیں دل میں بھردیں بھرنے والے نے
مزا یہ ہے کہ پھر گنجائشِ دردِ نہاں رکھ دی

مولوی محمود علی گرامی پروفیسر میرٹھ کالج بھی یہاں کی ایک ممتاز ہستی تھے۔ شعر و سخن میں حضرتِ بیان سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے کلام کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن تیس برس کی محنتِ شاقہ کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا یہاں تک کہ خود اُن کے لیے بھی پیغامِ اجل آ پہنچا۔ اکثر جلسوں میں نظمیں پڑھتے تھے۔ ضلع جگت کا بہت شوق تھا۔

ضیاء الاسلام عیاں یہاں کے نوجوان شعرا میں تھے۔ افسوس ہے کہ دستِ اجل نے ان کو ہم سے بہت جلد جُدا کر دیا۔ حضرتِ بیان کے بھتیجے تھے اور وکالت کرتے تھے۔ شعر و سخن میں ان کا پایہ اعلیٰ درجے کا ہے۔ اندازِ بیان میں ایک بات ہوتی تھی۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خود ان کا اپنا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا کلام ہنوز پردۂ کتم میں ہے۔ دیکھیے کب تک زیورِ طبع سے آراستہ ہوتا ہے۔ بہرحال چند مشہور شعر لکھتا ہوں ؎

سلامت واپس آجانے کی خجلت اے معاذاللہ!
لپیٹے منھ پڑی ہیں کشتیاں دامانِ ساحل سے

خدا جانے وطن سے اس کو کیا ایذائیں پہنچی تھیں
کہ جس نے چین پایا غربتِ شامِ غریباں میں

تعیّن کا جنوں دشمن ، سلاسل مانعِ جنبش ! | نہ رہ سکتا ہوں زنداں میں نہ جاسکتا ہوں زنداں سے
عنادل: اس قدر کم زور بنیادِ مکاں کیوں ہو ؟ | ہوا سے بھی ہلے جو شاخ اس پر آشیاں کیوں ہو
ضبط ہم سے مشکل تھا ، ہوگئی خطا آخر | اس قدر حسیں چہرہ ، اس قدر قریں چہرہ
رونقِ خانۂ دل آپ کے دم تک ہی حضور | آگ اس گھر کو لگالوں تو چلے جائیے گا

حامد اللہ افسر یہ اسی محلہ مفتی واڑے کے رہنے والے ہیں ۔ آج کل جوبلی کالج لکھنؤ میں پروفیسر ہیں۔ نظمیں اچھی لکھتے ہیں ۔ ان کی نظموں کا مجموعہ عرصہ ہوا چھپ چکا ہے ۔ مرحوم آنریبل ڈاکٹر سرشاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ نے آپ کے مجموعۂ کلام پر دیباچہ تحریر فرمایا تھا ۔ نثر میں بھی ایک کتاب نقد الادب کے نام سے فنِ تنقید پر آپ کی تصنیف ہے ۔

حضرت ساغر اگرچہ علی گڑھ کے رہنے والے ہیں لیکن ۱۹۳۲ء سے برابر میرٹھ میں سکونت پذیر ہیں ۔ شعر و شاعری میں جناب سیماب اکبر آبادی کے شاگردِ رشید ہیں ۔ شعر اچھا کہتے ہیں ۔ پڑھنے کا انداز سامعہ نواز ہے ۔ کم از کم ۱۹۳۰ء سے اُن کی شاعری میں نیا باب کھل گیا ہے اور وہ ترقی پذیر ہے ۔ غزلیں بھی کہتے ہیں لیکن اصل رجحانِ طبیعت نظموں کی طرف ہے جو کافی جاذبِ توجہ ہوتی ہیں ۔ ایک مجموعۂ کلام بادۂ مشرق کے نام سے ۱۹۳۵ء میں چھپا تھا ۔ دوسرا مجموعہ رنگ محل کے نام سے حال ہی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے ۔

پنڈت اندرجیت شرما اچھرہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں ۔ حضرتِ ندرت میرٹھی سے تلمذ ہے ۔ نظمیں اچھی کہتے ہیں اور ملک کے مختلف رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے جو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے ۔

ہشیار میرٹھی بھی اپنے کثیر التعداد تلامذہ کی وجہ سے قابلِ الذکر ہیں ۔ مجموعۂ نغز مصنفہ حکیم قدرت اللہ قاسم دہلوی سے پایا جاتا ہے کہ میر اور اُن کے قریب کے زمانے میں دہلی میں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا ۔ چناں چہ انھوں نے اکثر ایسے شعرا کے نام شمار کرائے ہیں جن کے باعث عوام سے لے کر بڑے بڑے نوابوں تک کوئی شخص اس شوق سے خالی نہیں رہا ۔ اگر یہی بات میرٹھ میں دیکھی جائے تو ماننا پڑے گا کہ محض حضرتِ ہشیار میرٹھی کی بدولت عوام میں اس کا شوق دائم و قائم ہے ۔

جنابہ حور صاحبہ یہاں کے ایک کنبہ خاندان کی فرد ہیں ۔ شعر گوئی سے اُن کو کافی شغف ہو ۔ اُن کی بہن حیا صاحبہ بھی شعر کہتی ہیں ۔

تھوڑی دیر کے لیے اب عنانِ توجہ شاعری کے میدان سے ہٹا کر نثارانِ میرٹھ کی طرف مبذول فرمائی جائے تو پتا چلے گا کہ یہاں کی سرزمین سے کیسے کیسے نام ور ادیب پیدا ہوئے ہیں ۔

سب سے پہلا نام جو اس سلسلے میں لیا جاسکتا ہو وہ حکیم مقرب حسین کا ہو ۔ جس زمانے میں آپ اخبار عالم نکال رہے تھے ، اسی کے قریب قریب آپ نے اپنی توجہ بوستانِ خیال کی پانچویں اور چھٹی جلد کے ترجمے کی طرف منعطف کی ۔ چناں چہ آپ نے اِن دو جلدوں کا ترجمہ کیا ۔ اگرچہ پرانا قصہ اور پُرانی بات ہو لیکن اس ترجمے سے ظاہر ہوتا ہو کہ حکیم صاحب کی استعدادِ علمی عربی اور فارسی میں نہایت عمدہ تھی ۔ عبارت میں رنگینی اور قافیہ بندی ضرور پائی جاتی ہو لیکن اس زمانے کا طرزِ تحریر ہی یہ تھا ۔

منشی ممتاز علی یہاں کے دوسرے علم دوست گزرے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہو کہ مرزا غالب سے ان کو کافی عقیدت تھی اور وہ غالب کے مداحین میں سے تھے ۔ چناں چہ رقعاتِ غالب کا مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے پہلی بار یہیں چھپا اور منشی صاحب موصوف اُس کے ناشر تھے ۔ خطوط جس محنت سے جمع کیے گئے تھے ، اس سے اُن کی کاوش و جستجو اور اُردو نثر سے دل چسپی اور سخن شناسی کا اندازہ ہوسکتا ہو ۔

یہاں کی خاکِ پاک سے ایک صاحب مرزا رحیم بیگ نابینا بھی اُٹھے تھے ۔ ان کی علمی استعداد میں کسی کو کوئی کلام نہیں لیکن افسوس ہو کہ وہ بصارت کے ساتھ بصیرت سے بھی محروم تھے ۔ انھوں نے مرزا غالب کی کتابِ لغت قاطعِ برہان کے جواب میں ساطعِ برہان شائع کی ۔ غالبًا مولوی امام بخش صہبائی کے ارشد تلامذہ میں تھے ۔ اس لیے غالب نے جب مرزا رحیم بیگ صاحب مرحوم کو ایک رقعہ لکھا جو عودِ ہندی میں موجود ہو تو لکھا کہ

"...... یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب دیا ہو ، کتنے محققین نے آپ کو (یعنی مولوی امام بخش کو) اپنا امام مان لیا ہو .... اگر حضرت (یعنی رحیم بیگ) بہ فتح قاف ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققین کہتے تو ایک ماموم (یعنی پیرو امام) آپ اور نراین داس تنبولی دوسرا ہوتا ...."

جناب حافظ محمد اکبر صاحب جو ہمارے لائق و محترم دوست مولوی محمد اسمٰعیل حنیفی بی۔اے؛ ایل ایل بی اسسٹنٹ گورنمنٹ پلیڈر میرٹھ کے نانا ہوتے تھے دیوانِ شاہ نصیر کی ترتیب کے باعث مشہور ہیں۔ گزری بازار کے اُس طرف جو ایک چھتّہ ہے جس کا نام باپ اعلیٰ ہے انھی کے بھائی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگرچہ شاہ نصیر کا مکمل دیوان نہیں ہے تیّن دو تین ہزار اشعار کا یہ مجموعہ بھی آج کل قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہے کیوں کہ شاہ نصیر کا کلام کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ دیوانِ مذکور کی ترتیب سے اُن کا ذوقِ ادب ظاہر ہوتا ہے۔

ایک بزرگ مولوی زین العابدین فرجاد بھی یہاں کی خاکِ پاک سے اپنی بہار دکھاکر ہماری نظروں سے مستور ہوگئے ہیں۔ وہ فارسی نظم و نثر پر ایک وسیع نظر رکھتے تھے اور مولوی ابوالکلام آزاد جیسے ثقہ عالم بھی اُن کے مدّاح و معترف ہیں۔ فارسی میں اشعار بڑی روانی کے ساتھ کہتے چلے جاتے تھے اور نثر مقفیٰ و مسجع لکھتے تھے۔ ایک قواعد اُردو بھی اُن سے یادگار ہے۔ میرے حال پر عنایتِ بے غایت فرماتے تھے اور اسی سبب سے مجھے فارسی کے متعلق اُن سے امداد لینے کا افتخار حاصل ہے۔ اُن کے فرزندانِ رشید بھی ادبی ذوق رکھتے ہیں اور ممکن ہے کہ جوہر صاحب اُن کے فرزندِ ارجمند کسی روز افقِ ادب سے طلوع ہوکر آفتاب نصف النہار بن جائیں۔

عصرِ حاضر کی وہ ہستی جو چہار دانگِ ہند میں مشہور ہے یعنی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بھی اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ کیوں کہ مولوی صاحب خاص میرٹھ میں نہ سہی نواحِ میرٹھ یعنی قصبہ ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے اور دکن میں آفتاب ہوکر چمکے۔ اُن کی سعیٔ پیہم اور عقلی دست رس سے انجمنِ ترقیٔ اُردو کا بول بالا ہوگیا۔ ان کی تحریرات سادہ، متین اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ طرزِ حالی کے مقلّد ہیں اور اپنا خاص رنگ رکھتے ہیں۔ روانی اور صفائی بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اُن کی تصنیفات قواعدِ اُردو سے لے کر اُن کے مقالات تک سب دل کش ہیں۔ ان کا نام عصرِ حاضر کے ادیبوں اور مصنّفین میں سرِ فہرست ہے۔

مولوی خلیل الرحمٰن کا وطنِ مالوف اور مولد قصبہ سرادہ ضلع میرٹھ ہے اگرچہ آپ کی بیشتر زندگی لاہور اور دوسرے مقامات پر گزری ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کو مضمون نگاری کا شوق ۱۸۶۳ء سے ہوگیا تھا۔ غالباً ۱۸۶۴ء میں سید ممتاز علی صاحب کے بلانے پر لاہور تشریف لے گئے تھے۔ جہاں چیف کورٹ میں ملازم

تھے۔ لاہور میں علامہ آزاد سے فیضِ صحبت حاصل کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے شوق دلانے پر ترجمے کی طرف توجہ فرمائی۔ چناں چہ اس سلسلے میں سب سے پہلی مشق آپ کی مشہور کتاب عذرا ہے۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد حافظ سیوطی کی کتاب تاریخ الخلفا کا ترجمہ کیا۔ نفح الطیب کی تلخیص کی۔ لیکن مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اخبار الاندلس کا ترجمہ ہے جس پر پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو ایک ہزار روپیہ انعام ملا اور پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ [illegible] میں لاہور سے پنشن پانے کے بعد اپنے صاحب زادے پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب الہ آباد یونی ورسٹی کے پاس رہنے لگے۔ پچھلے دو تین سال ہوئے غالباً الہ آباد ہی میں آپ نے وفات پائی۔

راقم الحروف کے والدِ ماجد مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے، ایل ایل۔ بی کا وطن میرٹھ نہیں ہے لیکن نشوونما یہیں پائی ہے۔ بی۔ اے، ایل ایل۔ بی کا امتحان میرٹھ کالج سے پاس کیا ہے۔ پچھلے نو دس سال سے غازی آباد کے بعد یہیں وکالت کرتے ہیں۔ اپنی متعدد تصنیفات کی وجہ سے دُنیائے ادب میں کافی مشہور ہیں۔ سیر المصنفین [illegible] جلدوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تاریخ مغربی یورپ اور تاریخ امریکہ سے آپ کے [illegible] تاریخ نویسی کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعرانہ خیالات اور خیالاتِ ارونگ ادبی ذوق کا پتا دیتی ہیں۔ ایک تذکرۃ الشعرا جو ہزار بارہ سو صفحات کی کتاب ہے مکمل کر چکے ہیں لیکن کاغذ کی نایابی سے ابھی تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ سیر المصنفین کی تیسری جلد بھی جس میں عصرِ حاضر کے اُدبا و نثاران کا ذکرِ خیر ہے، زیرِ ترتیب ہے۔ شعر و سخن کا کافی ذوق رکھتے ہیں۔ زیادہ تر نظموں کی طرف میلان ہے۔ غزل گوئی کے خلاف ہیں۔ نمونتاً ایک نظم پیش کی جاتی ہے ؎

«الخلافت فی الارض»

[illegible] ہوگئی، ارض و سما کو زیب ہے ‏ ‏ رنگِ شفق نے کردیا شام و سحر کو لالہ زار

چشمۂ آفتاب سے، پھول کھلے زمین پر ‏ ‏ ہوگئیں سبز کھیتیاں، باغ میں آئے برگ و بار

بحرِ عمیق سے اُٹھا ابرِ سیاہ مست گام ‏ ‏ چھا گیا آسمان پر دوشِ صبا پہ ہو سوار

ابرِ سیہ کی چال میں مستی و سرخوشی وہ تھی ‏ ‏ ہوگیا جھوم جھوم کر روئے زمیں پہ خود نثار

قوسِ قزح کو دیکھ کر اہلِ زمیں تھے دل میں خوش | رات کو آسمان پر انجم و مہ کی تھی بہار
ارض و سما و قلزم و انجم و ماہ و آفتاب | سبزہ و گل، شجر، صبا، وادی و دشت و کوہسار
اپنی روش پہ ہیں رواں، قدرتِ حق کے ہیں مطیع | ایک مگر یہ آدمی، دیکھنے میں نحیف و زار
عقل سے اپنی حکمراں ہو گیا کائنات پر | اور خدا نے دے دیے اس کو بہت سے اختیار
تازہ بہ تازہ نو بہ نو اس کی تراش اور خراش | کیوں نہ ہو؟ بات بات میں ایک اُپج ہو آشکار
اس کا "خلیفۂ خدا" روزِ ازل سے ہو خطاب | کوئی مَلک بھی آج تک پا نہ سکا یہ اقتدار

سب حب فہم ہی مگر رکھتے ہیں امتیاز کچھ
ورنہ بنیٔ نوع میں سب کو نہیں یہ افتخار

شاید بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مُلک کے مشہور ناول نگار مسٹر ظفر عمر بی۔اے بھی اسی سرزمین سے متعلق ہیں۔ ظفر عمر صاحب بڑوت ضلع میرٹھ کے باشندے ہیں لیکن جب سے علی گڑھ میں انھوں نے اپنی کوٹھی نیلی چھتری بنائی ہو زیادہ تر علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ مسٹر ظفر عمر کی ادبی زندگی کا آغاز پروفیسر ڈیمبری کی کتاب WESTERN CULTURE IN EASTERN LANDS کے ترجمے موسوم بہ مستقبلِ اسلام سے ہوتا ہو جو غالباً ۱۹۱۰ء میں شائع ہُوا تھا۔ اس کے بعد متعدد ناول بہرام کی گرفتاری، نیلی چھتری، لال کنھور، چوروں کا کلب وغیرہ شائع ہوئے۔ نیلی چھتری خصوصیت کے ساتھ مقبول ہوئی اور معلوم ہوا ہو کہ اُن کی کوٹھی نیلی چھتری کی تمام لاگت اسی کتاب کے زرِ منفعت سے حاصل کی گئی ہو۔ جناب ظفر عمر صاحب کا یہ بڑا کارنامہ ہو کہ جاسوسی ناول نگاری کو اُردو میں، اُنھی نے روشناس کرایا ہو۔

مولوی آفتاب عمر صاحب بی۔اے، ایل ایل۔بی وکیل میرٹھ ظفر عمر صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ غالباً ۱۹۱۲ء میں آپ نے رنج و راحت ایک ناول شائع کیا تھا جس میں غدر کے زمانے کا قصّہ ہو۔ کتاب کافی دل چسپ ہو لیکن اب بازار میں دست یاب نہیں ہوتی اور دوسرا ایڈیشن آج تک نہیں چھپا۔ آفتاب عمر صاحب کو اوائل عمر سے سائنس کے مضمون سے دل چسپی رہی ہو اور مختلف اوقات میں مختلف چیزوں کے متعلق اپنے گھر پر تجربات کرتے رہے ہیں۔ اسی دل چسپی کا یہ نتیجہ ہو کہ آپ نے ۱۹۳۰ء

میں واعظین کے متعلق صدائے برق کے نام سے کتاب شائع کی ۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل نئی تھی ۔ چناں چہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس کتاب پر لائق مصنف کو مبلغ پانسو روپے انعام عطا فرمایا۔ مولوی صاحب موصوف نہایت سادگی پسند اور ذہین انسان ہیں ۔ طبیعت بڑی بے نیاز واقع ہوئی ہے۔ بعض اوقات بڑی محبت اور تواضع سے پیش آتے ہیں لیکن دوسرے وقت اپنے انہماک کی وجہ سے انھیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کون چلا گیا ۔ راقم آثم پر بڑا کرم فرماتے ہیں ۔

مولوی عبدالباری آسی اُلدن ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں، اگرچہ آج کل لکھنؤ میں قیام پزیر ہیں۔ آپ ہندستان کے مشہور ادیب ہیں ۔ تذکرۂ خندۂ گل مولوی صاحب کی مشہور کتاب ہے جس میں اُردو اور فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات اور منتخب کلام درج ہے ۔ اس قسم کا تذکرہ اُردو زبان میں سب سے پہلی اور نئی چیز ہے ۔ مولوی صاحب موصوف کی دوسری کتاب تذکرۂ معرکۂ سخن بھی اسی قدر دل چسپ تصنیف ہے۔ اس میں شعرا کی باہم نوک جھونک، علمی مباحث، مختلف اساتذۂ سخن کا انتخاب سب کچھ ملے گا ۔ آپ کبھی کبھی شعر بھی کہ لیتے ہیں لیکن آپ کی شہرت زیادہ تر متذکرۂ بالا تذکروں پر مبنی ہے۔

ماسٹر پیارے لال شاکر بھی ایک مشہور و معروف ہستی ہیں ۔ نظموں کے علاوہ اُن کے مضامین ہندستان کے بہترین رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ایک زمانے میں رسالۂ ادیب الہ آباد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں ۔

قاضی منیرالدین احمد صاحب نے بھی ایک رسالہ فنِ خیاطی پر ۱۹۱۱ء میں تصنیف کیا تھا اور اسی عنوان پر ایک اور کتاب شائع کر چکے ہیں لیکن میری نظر سے نہیں گزری ۔ اس فن کے متعلق غالباً قاضی صاحب کے علاوہ کوئی اور تصنیف اُردو میں مشکل سے ملے گی ۔

مفتی شوکت علی فہمی جو دُنیائے ادب میں دین و دُنیا دہلی کے اڈیٹر ہونے کی حیثیت سے مشہور ہیں ابھی خاکِ پاک کے محلِ نورس ہیں ۔ اپنی مدد آپ کرنے کا مادہ ان میں پایا جاتا ہے اور یہ کچھ کم قابلِ تعریف نہیں ہے۔ اکتسابِ علم کا شوق جوانی میں پیدا ہوا اور اب کہ بڑھاپے کے قریب آتے جاتے ہیں ان کی عبارت میں پختگی ترقی پزیر ہے ۔

مولوی قاضی زین العابدین صاحب سجّاد ادبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ ایک زمانے میں ادبی دنیا ہور کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں اور اگرچہ آج کل گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں اُستاد ہیں لیکن ذوقِ ادب برابر نشوونما پا رہا ہے۔ چوں کہ مولوی صاحب فاضلِ دیوبند ہیں اس لیے قدرتاً آپ کو عربی ادب سے زیادہ لگاؤ ہے اور آپ کی برابر کوشش رہتی ہے کہ عربی ادب میں جو کچھ عمدہ چیزیں ہیں کسی طرح اُردو میں منتقل ہو جائیں۔ چناں چہ آپ نے مصر کے مشہور ادیب سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے ان چند افسانوں کا ترجمہ ملک کے سامنے پیش کیا ہے جو العبرات کے نام سے مشہور ہے اور مصنف کی نادرِ روزگار تصنیف سمجھی گئی ہے۔ قاضی زین العابدین صاحب سجّاد نے اپنے مترجمہ افسانوں کا نام "مصری افسانے" رکھا ہے۔ صحاح ستہ کے انتخاب اور اس کے ترجمے کے ذمّے دار بھی قاضی صاحب موصوف ہیں۔ علاوہ ازیں مفتاح العربیہ المعروف بہ کلامِ عربی بھی آپ کی تصنیف ہے جس میں عربی زبان سِکھانے کا نہایت آسان طریقہ ہے اور جو مبتدیوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ یہ کتاب مولوی صاحب موصوف نے مجھے ازراہِ عنایت عطا فرمائی تھی اور میں نے اس سے کافی مدد لی۔

ایک صاحب سید مظہر حسین بھی یہاں کے ان لوگوں میں تھے جو ادب کے شیدا کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن مضمون نگاری برابر کرتے رہتے تھے۔ افسوس بہ مرضِ سرطان ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا احسان الحق صاحب کا ذکر اگرچہ آخر میں کیا جا رہا ہے لیکن وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی دوررس نگاہ ادبِ اُردو کی نگہبانی کرتی رہتی ہے اور ان کے مختلف مضامین اُن کی وسعتِ نظر کا پتا دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ بہ ظاہر کسی کتاب کے مصنف نہیں ہیں، لیکن خواجہ حسن نظامی کو اخبار نکالنے کے لیے آمادہ کر کے میرٹھ سے توحید نامی ایک اخبار اُن سے انھی نے نکلوایا تھا۔ بعد ازاں یہ دہلی چلے گئے اور اب وہیں قیام پزیر ہیں۔ ادبی ذوق و شوق رکھتے ہیں اور اپنے محدود دائرے میں اپنے بعض دوستوں کی اس بارے میں مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی ان کے بڑے مدّاح ہیں اور خواجہ صاحب کی کتاب آپ بیتی سے اُن کے مشوروں کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

صوفی سید محمد یحییٰ صاحب بھی میرٹھ کے اچھے مضمون نگاروں میں ہیں اور کافی عمدہ ذوقِ ادب رکھتے ہیں مگر بہ قول سیاغر صاحب ایک مضمون لکھنے کے لیے سالہا سال تک ضمیر کی آواز کے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے شہر میرٹھ میں ایک جماعتِ کثیر نوخیز شعرا اور اُدبا کی پیدا ہو گئی ہے جن کے آیندہ کارناموں سے پتا چلے گا کہ میرٹھ نے اپنا فرض جو اس پر قربِ دہلی کی وجہ سے عائد ہوتا تھا بہت اچھی طرح سے ادا کیا ہے اور ادا کرتا رہے گا۔

*

خطبۂ صدارت کُل ہند انجمنِ ترقّیِ اُردوُ کانفرنس، ناگ پوُر

(نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان شروانی صاحب)

حضرات! آپ نے مجھے اس ادبی و علمی مجلس کی صدارت کا جو اعزاز عطا فرمایا ہے اُس کے لیے میں دل سے آپ کا سپاس گزار ہوں۔ مجھ کو آغازِ کار سے اب تک انجمن ترقیٔ اردو سے دلچسپی رہی ہے اور میں نے اُس کی خدمات انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

انجمنِ ترقیٔ اردو کس طرح وجود میں آئی؟ اس موقع پر اس کا مختصر تذکرہ غالباً بے موقع نہ ہوگا۔ چالیس برس سے بھی زیادہ زمانہ گزرا کہ ۱۹۰۳ء میں ملکِ معظم کی تاج پوشی کے سلسلے میں ایک شان دار تاریخی دربار دہلی میں منعقد ہوا، علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد خصوصاً صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے جو کانفرنس کے آنریری جائنٹ سکریٹری تھے یہ مناسب سمجھا کہ اس تاریخی موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی دہلی میں منعقد کیا جائے، چناں چہ کانفرنس کا سولھواں اجلاس زیرِ صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں بہ القابہ نہایت شان و شوکت سے دہلی میں منعقد ہوا، جس میں ہندستان اور انگلستان کے بہت سے مشہور و نام ور اصحاب اور بعض والیانِ ملک و ارکانِ حکومت نے شرکت فرمائی، اسی تاریخی اجلاس میں ایک رزولیوشن کی بِنا پر کانفرنس کا ایک لٹریری سکشن یا شعبۂ ترقیٔ اردو قائم ہوا، اور اس شعبے کے معتمدِ اعزازی (آنریری سکریٹری) شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے۔ یہ تھا آپ کی انجمن کا مبارک آغاز۔

یہ بھی ایک عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ شعبۂ ترقیٔ اردو کا سنگِ بنیاد دہلی میں رکھا گیا جو اردو کا مولد و مرکز مانا گیا ہے دوسرا حُسنِ اتفاق یہ ہے کہ یہ انجمن کم و بیش ایک تہائی صدی کے بعد اپنے دورِ عروج و شباب

ہیں بہت سے کارنامے انجام دینے اور خسروِ دکن خلداللہ ملکہ' کے الطافِ شاہانہ سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد پھر اُسی دہلی میں آگئی جہاں اِس صدی کے آغاز میں اُسے حیاتِ اوّلیں حاصل ہوئی تھی۔

"حضرات! شعبۂ ترقی اردو نے وجود میں آنے کے بعد باوجود ناسازگار حالات کچھ نہ کچھ کام شروع کر دیا تھا، اور ایجوکیشنل کانفرنس بقدرِ گنجایش اس شعبے کی مالی امداد کر رہی تھی کہ شعبے کے معتمدِ اعزازی مولانا شبلی نعمانی نے ۱۹۰۵ء تک کام کرنے کے بعد کثرتِ مشاغل کی وجہ سے استعفا دے دیا اور یہ خدمت کانفرنس کی طرف سے میرے سپرد کی گئی، اس کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم نے اس کام کو سنبھالا، مگر اُن کی افسوس ناک وفات نے ساری امیدوں کا جو ان کی ذات سے وابستہ تھیں، خاتمہ کر دیا۔

آخرکار ۱۹۱۲ء میں قرعۂ فال مولوی عبدالحق صاحب کے نام نکلا جو آپ کی انجمن کے چوتھے معتمدِ اعزازی ہیں، انھوں نے اس شعبے کو ہاتھ میں لے کر بتدریج ایسے مرتبے پر پہنچایا کہ چار دانگِ ہند میں اُسے شہرت حاصل ہوگئی اور وہ ایجوکیشنل کانفرنس کی مالی سرپرستی سے بے نیاز ہوکر ہندستان کا ایک مشہور و مستقل ادارہ بن گئی۔

حضرات! ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی محنت و کوشش سے انجمن ترقی اردو کو جس درجے تک پہنچایا، اُس کا مجھے ابتدا ہی سے اعتراف ہے۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایم اے او کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا، میں نے بہ حیثیت آنریری سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس اس اجلاس میں جو رپورٹ پڑھی اس میں یہ عرض کیا تھا:۔

"انجمن کی موجودہ ترقی و کامیابی نتیجہ ہے مولوی عبدالحق صاحب بی اے کی سعی و ہمت کا جو بڑے مستقل مزاج، پختہ کار اور مسلسل کام کرنے والے شخص ہیں اور عملاً انھوں نے اپنی زندگی اردو کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہے جس میں وہ خاموشی کے ساتھ سالہا سال سے مصروف ہیں۔"

اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر بھی میں نے اپنی رپورٹ میں کانفرنس کی "تاریخِ ماضی" کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کس طرح کانفرنس کے شعبۂ ترقی اردو نے ترقی کر کے موجودہ "انجمن ترقی اردو" کی صورت اختیار کی جو آج ایک مستقل انجمن کی حیثیت سے اپنے مستعد و قابل سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کے زیرِ نگرانی علم و ادب کی ترقی میں مصروف ہے۔

حضرات! یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ باوجود ملک میں جدید تعلیم پھیل جانے کے ہمیں ایسے

لائق و بلند ہمت کارکن میسر نہیں آسکتے جو ہمارے قومی اداروں کو صحیح طریقے پر خوش اسلوبی سے چلاکر ملک و قوم کے لیے مفید و سود مند بنا سکیں۔ اِن حالات میں یقیناً یہ انجمن کی خوش نصیبی ہو کہ اُسے ایک ایسا معتمد (سکرٹری) میسر آگیا جو بغیر کسی معاوضے یا صلے کی توقع کے محض اپنے ذاتی ذوق و شوق سے ہماری زبان کی خدمت میں مصروف ہو۔ ایسی کارپرداز ہستی کی خدمات کا اعتراف ہمارا اخلاقی فرض ہو۔

حضرات! آج اُردو کانفرنس کے اجلاس ناگ پور میں زندگی کے جو آثار مجھے نظر آرہے ہیں میں اس پر اظہارِ مسرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا، کیا بعید ہو کہ یہ اجلاس، انجمن کے لیے ایک جدید دورِ ترقی کے آغاز کا باعث ہو۔ یہ حُسنِ ظن اس لیے ہو کہ اب سے پہلے بھی ناگ پور کا ایک قومی اجتماع مسلمانانِ ہند کی تعلیمی زندگی میں ایک جدید دور اور مبارک انقلاب کا باعث ہوا تھا۔

یہ اجتماع جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا، جو سنہ ۱۹۱۰ء میں ناگ پور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے متعلق ایک رزولیوشن منظور ہوا، اور اجلاس کے فوراً بعد اس تحریک کے متعلق عملی جدوجہد شروع ہوگئی جو آخرکار کامیاب ہوکر مسلم یونی ورسٹی کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

مسلم یونی ورسٹی کے قیام کی تحریک سرسید کی رحلت کے بعد ہی مُلک کے سامنے آگئی تھی اور کانفرنس کے اجلاس میں سال بہ سال اس کے متعلق رزولیوشن پاس ہوتا اور پُرزور تقریریں کی جاتی تھیں، لیکن یہ سعادت ناگ پور ہی کے لیے مُقدر تھی کہ یہاں جو رزولیوشن سنہ ۱۹۱۰ء میں منظور ہوا، جنوری سنہ ۱۹۱۱ء سے نہایت سرگرمی سے اس کی تعمیل شروع ہوگئی، اس اجلاس میں ہزہائی نس سر آغا خاں خاص اسی مقصد سے تشریف لائے تھے کہ مسلم یونی ورسٹی کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کریں۔

یہ واقعہ جو بہ ظاہر کسی قدر غیر متعلق ہو اس لیے عرض کیا گیا کہ ناگ پور کا یہ ”کارنامہ“ ہمارے دِلوں میں تازہ ہوجائے کہ اب سے پہلے بھی یہاں کا ایک اجتماع ہماری حیاتِ قومی کے لیے نتیجہ خیز و بارآور ثابت ہوچکا ہو۔ یہ امر باعثِ صد مسرت ہو کہ اگرچہ سی پی میں اہلِ اُردو کی آبادی نہایت قلیل ہو اور اُن کی اقتصادی حالت بھی لائقِ اطمینان نہیں، لیکن اس پر بھی وہ اپنی مستقل ہستی قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے کاموں کو اولوالعزمی سے انجام دیتے ہیں، جس کا ایک زبردست ثبوت یہ اُردو کانفرنس ہو جو نہایت شان و شوکت سے منعقد ہورہی ہو۔

حضرات! صوبۂ متوسط کے اربابِ ادب نے ناگ پور میں اُردو کانفرنس کو دعوتِ تازہ دے کر درحقیقت اپنی علمی و ادبی خدمت کا ثبوت دیا ہو۔ مُلکی و مادری زبان کی حفاظت اور ترقی کے لیے کوشش

کرنا ہر محبِ وطن اور بلند نظر ہندوستانی کا اوّلین فرض ہو اس لیے کوئی شخص اُردو ادب کی خدمت والوں کو اس پر ملامت نہیں کرسکتا کہ وہ اُردو زبان کے تحفظ و ترقّی کے لیے کوشش کر رہے ہیں ۔ اُردو کو کسی قسم کی مذہبی عظمت حاصل نہیں ہو اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو کی جو حمایت کی جارہی ہو اس میں کوئی مذہبی جذبہ کارفرما ہو۔ البتہ اُردو کو ایک خاص تاریخی عظمت ضرور حاصل ہو یعنی وہ اس عہدِ زرّیں کی یادگار ہو جب اس مُلک کی پُرامن فضا میں ہندو مسلمان برادرانہ محبت کے ساتھ علم و ادب کی خدمت میں مصروف تھے، اور اُردو ہندی کا مسئلہ جو زمانۂ حاضرہ کی زہریلی سیاست کی پیداوار ہو مُلک میں موجود نہ تھا۔ یہی زبان جسے اب ہم " اُردو " کہتے ہیں "ہندی" کے نام سے موسوم تھی یعنی وہ اہلِ ہند کی "مشترک مُلکی زبان" سمجھی جاتی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان !

مغربی تعلیم کے اثرات نے ہماری ملکی و قومی خصوصیتوں کو ایک ایک کرکے فنا کردیا ہو، یہاں تک کہ ہم اپنی ہستی کو بھی بھول گئے۔ اب اگر اس شان دار ماضی کی کوئی زندہ یادگار اس ملک میں باقی رہ گئی ہو تو وہ یہی زبان ہو جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور کسی زمانے میں انگریز بھی اس کے سیکھنے اور سمجھنے بلکہ ترقّی دینے کی کوشش کرتے تھے ۔

حضرات ! اُردو کی ابتدائی تاریخ ، تدریجی ترقّی ، اور نشو و نما کے متعلق کافی بحث ہوچکی ہو جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں، لیکن اس قدر عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ جس شخص نے بھی اُردو زبان کی تاریخِ ماضی کا مطالعہ کیا ہو وہ اس حقیقت سے بےخبر نہیں رہ سکتا کہ اُردو کسی زمانے میں بھی کسی کی مخصوص زبان نہ تھی ، یہی وجہ ہو کہ ہماری ادبی صحبتوں اور مشاعروں میں ہندو مُسلمان یک ساں ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جن اسباب نے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو نہ صرف خوش گوار بلکہ مستحکم و استوار بنادیا تھا اُن میں اُردو ادب بھی تھا۔ ان ادبی صحبتوں میں شریک ہوکر ہندو مسلمان دونوں یہ بھول جاتے تھے کہ وہ کون ہیں، مُشترک ذوق نے دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیا تھا۔ جس کا اخلاقی اثر ہماری ساری زندگی پر پڑتا تھا ؛ اگر ہندو مسلمان رواداری سے کام لیں تو آج بھی وہ زمانہ واپس آسکتا ہو۔

حضرات ! جب ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقیٔ اُردو کی ایک کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ تو میں نے اس موقع پر بھی اُردو زبان کی اس حیثیت کو واضح کیا تھا کہ وہ ہندو مسلمانوں کا ایک

مشترک سرمایہ ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان خیالات کا اس موقع پر اعادہ کیا جائے۔
میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہندستان میں مشترک قومی زبان کی اہمیت یوں اور مسلم ہے کہ ہماری تمدنی زندگی میں دوسرے مشترک عناصر کی کمی ہے۔ خوش قسمتی سے زبان کے معاملے میں ہمارے قوم کے دونوں اہم حصوں یعنی ہندو مسلمانوں نے صدیوں کے تعاون سے ایک زبان اور ایک ادب کی پرورش کی ہے جو ہرچند ابھی نوخیز ہے تاہم اپنے امکاناتِ ترقی کے اعتبار سے کسی سے پیچھے نہیں ہے اور یہ بات اس لیے اور زیادہ اہم ہے کہ اس کے صالح اثرات سے دوسری کمیوں کی تلافی کی امید کی جاسکتی ہے۔ زبان کے الفاظ کا سرمایہ قوم کی ذہنی کیفیات اور تصورات کا خزانہ ہوتا ہے اس خزانے کے مشترک ہونے سے قوم کے رجحانات اور اُن کے عزائم میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس مشترک تمدنی قوت کو ترقی دینا ہر سچے ہندستانی کا فرض ہونا چاہیے اور وہ کوشش جو اس مشترک قومی سرمایے کو منتشر کرنا یا غیر موثر بنانا چاہے اس کا سدِّباب قومی فرض ہے۔
ہماری بدنصیبی ہے کہ لوگ اس مشترک قومی سرمایے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات جو ملک کے نمایندے ہیں باہمی سمجھوتے سے ایسی تدابیر اختیار کریں گے جس سے تنگ نظری اور فرقہ پروری کا سدِّباب ہوجائے گا اور ہمارا یہ سرمایۂ قومی بربادی سے محفوظ رہ جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا یہ مقصد بھی ہونا چاہیے کہ اس کے مفید اثرات کو تعلیم یافتہ لوگوں کے محدود حلقے سے نکال کر قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع دیں۔
حضرات! مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ملک میں ایک ایسی انجمن یا مستقل ادارے کا قیام ناگزیر تھا جو نہ صرف ہماری ملکی و مادری زبان کے تحفظ کی خدمت انجام دے بلکہ اس کی ترقی اور حلقۂ اثر کو وسعت دینے کے لیے بھی زبردست وسائل اختیار کرے، اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی کرے کہ اردو کو ہندستان میں وہ درجہ حاصل ہوجائے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔
یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ انجمن ترقیٔ اردو اس خدمت کو انجام دینے کی کوشش میں سرگرم ہے۔ اس لیے ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اپنی مالی و اخلاقی امداد سے اس ادارے کی بنیادیں جس قدر مستحکم و

استوار کردیں کہ وہ زیادہ جرأت و حوصلہ مندی سے ہماری زبان کی خدمت انجام دے سکے ۔ اگرچہ اب تک مختلف طریقوں سے انجمن نے اُردو کی بہت کچھ خدمت کی ہو اور علمی و ادبی تالیفات و تراجم کے ذریعے سے ہماری زبان کے ذخیرۂ علم و ادب میں گراں بہا اضافہ کیا ہو، لیکن ابھی بہت کچھ کام کرنے کے لیے باقی ہو جو بہرصورت ہمیں انجام دینا ہو، اُردو پر اب بھی زبردست حملے ہورہے ہیں اور وہ گوناگوں خطرات میں گھری ہوئی ہو اس لیے ہماری زراسی بھی غفلت یا بےخبری اُردو کے لیے مہلک ہوگی ۔

گزشتہ بیس برس میں مُلک میں نئی نئی تحریکات نیز مختلف سیاسی نظریات و افکار نے جو بے چینی پیدا کردی ہو ۔ اس کے تیز و تند جھونکوں نے علمی زاویوں اور ادبی گوشوں میں بھی ہنگامہ پیدا کردیا ہو۔ اسی مقام پر جہاں آج ہم اُردو زبان کے ساتھ اپنی شیفتگی اور وابستگی کا مظاہرہ کرنے اور اُس کی آیندہ ترقی و فلاح کے مسائل پر غور و بحث کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں چند ہی سال پہلے اُس کی مخالفت بلکہ ہلاکت کی وہ تجویز مرتب کی گئی تھی جس کی ہمہ گیری و فتنہ آفرینی کے مقابلے میں سر انٹونی میکڈانلڈ (سابق لفٹنٹ گورنر یوپی) کی ساری اُردو دُشمنی بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی تھی ۔

عملی زندگی میں ہر مُلک میں زبان کا معاملہ زیادہ تر تعلیم و عدالت کے محکموں سے تعلق رکھتا ہو۔ جدید سیاسی دستور میں یہ محکمے تمام تر صوبوں کی حکومت کے سپرد کردیے گئے تھے اور پنجاب و بنگال کے علاوہ باقی صوبوں کی حکومتیں نیشنل کانگرس کے زیرِ اقتدار تھیں اور کانگرس کا سب سے بڑا رہنما ایک نئی مفروضہ زبان کو مُلک میں رائج کرنے کا خواہاں تھا ۔

اُن حریفانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اُردو یا ہندُستانی کی ترقی تو ایک طرف خود اس کی زندگی معرضِ خطر میں پڑگئی تھی ۔ یہ حالات تھے جنھوں نے مولوی عبدالحق صاحب جیسے زاویہ نشین کو میدان میں آکر مدافعانہ جد و جہد پر مجبور کیا اور اُن کی سعی و تدبیر سے جو کام انجام پایا وہ آپ حضرات کے سامنے ہو۔

حضرات! صوبۂ متوسط اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ اس شہر ناگ پور نے مولوی صاحب

موصوف کی مدافعانہ جنگ میں جو حصّہ لیا وہ زبانِ اُردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ کہا جا سکتا ہو کہ مولوی صاحب نے اُردو کی حمایت میں جو کوشش کی وہ بہ حیثیت معتمد انجمن ترقیٔ اردو اُن کا فرض تھا۔ لیکن سوال یہ ہو کہ ہماری قوم میں ایسے کتنے آدمی ہیں جنھیں اپنے فرض کا احساس ہو اور وہ اُسے انجام دینا چاہتے ہیں حالاں کہ وقت کا شدید مطالبہ ہو کہ ہم سب اپنا فرض انجام دیں۔

بے شبہ یہ امر باعثِ مسرت ہو کہ "انجمن ترقیٔ اردو" جو پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت رکھتی تھی اب ترقی کر کے ایک وسیع الاثر علمی و ادبی انجمن کے درجے پر پہنچ گئی لیکن یہ ترقی کی آخری حد نہیں ہو بلکہ جیسا مَیں نے اوپر عرض کیا ہو ابھی بہت سا کام ہمارے کرنے کے لیے موجود ہو کیوں کہ اُردو کی مخالفت مُلک میں اب بھی جاری ہو بلکہ اس میں روز بہ روز شدّت پیدا ہو رہی ہو اور اس ناکردہ گناہ زبان کے مٹانے کے لیے نئی نئی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں اس لیے ہمارا کام پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہو جو ہمیں بہ ہر صورت انجام دینا ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہو کہ اس قسم کے کام وسیع الاثر قومی اداروں کے ذریعے سے انجام پاتے ہیں، لہٰذا اس کی شدید ضرورت ہو کہ انجمن کے دائرۂ اثر کو وسعت دی جائے اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ انجمن کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہو جائے۔ واقعہ یہ ہو کہ اب تک بہی خواہانِ اُردو نے انجمن کی کوئی قابلِ ذکر مالی امداد نہیں کی بلکہ جیسا کہ باخبر اصحاب کو معلوم ہو اِس وقت تک انجمن کے سب کام دولتِ آصفیہ کی مالی فیاضی یا مولوی عبدالحق صاحب اور اُن کے مخصوص احباب کی اعانت سے ہوتے رہے ہیں۔ قومی حیثیت سے ابھی تک انجمن کے لیے کوئی سرمایہ نہیں فراہم کیا گیا۔ دولتِ آصفیہ کی بروقت اور گراں قدر امداد شکریے سے بالاتر ہو بہی خواہانِ اُردو اس کا جس قدر احسان مانیں وہ کم ہو لیکن ظاہر ہو کہ باوجود اس شاہانہ اعانت کے خود قوم میں امداد کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے، اور اجتماعی قوت سے اپنے قومی اداروں کو چلانا چاہیے۔

اگر آپ اُردو کو دُنیا کی بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں کی مانند ایک علمی و تعلیمی زبان بنانے کے آرزومند ہیں اور اس غرض سے انجمن ترقیٔ اُردو کے علمی مساعی کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے ہیں تو

لازمی طور پر آپ کو اُس کے مصارف کا بار برداشت کرنا چاہیے۔ یہ ممکن ہو کہ آیندہ انجمن کی مطبوعات کا کاروبار اس حد تک ترقی کر جائے کہ اُسے بیرونی امداد و عطایا سے بے نیاز کر دے لیکن بالفعل اُسے آپ کی مالی امداد کی سخت ضرورت ہو۔

حضرات! اس وقت انجمن کی سب سے بڑی ضرورت جو بلا تاخیر توجہ کی محتاج ہو یہ ہو کہ اس کے لیے ایک مستقل مکان و مُستقر حسبِ ضرورت تعمیر کیا جائے۔ مجھے معلوم ہؤا ہو کہ نئی دہلی میں ایک وسیع قطعۂ زمین کا ملنا اب یقینی ہوگیا ہو اور انجمن کی مجوزہ عمارتوں کے لیے تین سال سے کچھ سرمایہ بھی جمع کیا جارہا ہو لیکن ابھی مالی امداد کی رفتار بہت سست ہو اس کے علاوہ یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہو کہ اگر جنگ ختم ہونے کے بعد بھی عمارتی سامان کی یہی گرانی رہی تو تعمیر کا پہلا سرسری تخمینہ جو دو لاکھ رُپے کیا گیا تھا، ہرگز کافی نہ ہوگا۔ مجھے امید ہو کہ آنریری سکرٹری صاحب اس بارے میں آپ کو تفصیلی حالات بتائیں گے، میرا مقصد صرف یاد دلانا تھا کہ ایک مستقل و موزوں عمارت کی تعمیر انجمن کی سب سے مقدم و ناگزیر ضرورت ہو، جس کے لیے ابھی سے سرمایہ جمع ہونا چاہیے تاکہ مناسب وقت آنے اور حالات سازگار ہونے پر بلا تاخیر تعمیری کام شروع کر دیا جائے۔

حضرات! اب میں ایک اور مسئلے پر آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہو، وہ اُردو کے تحفظِ حقوق کا مسئلہ ہو۔ واقعہ یہ ہو کہ موجودہ زمانے میں کوئی مسئلہ خواہ وہ خالص تعلیمی معاملات سے تعلق رکھتا ہو یا زبان اور مذہب سے، مُلکی سیاست سے جُدا نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو لیجیے جیسا کہ اس کے نام اور اساسی مقاصد سے ظاہر ہو وہ ایک خالص تعلیمی انجمن ہو اس لیے اس کے سالانہ اجلاس میں ہمیشہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مشکلات پر بحث کی جاتی ہو لیکن ان میں سے اکثر مسائل خصوصاً جو حکومت کے تعلیمی احکام یا سررشتۂ تعلیمات سے تعلق رکھتے ہیں کسی نہ کسی طرح سیاست [illegible] میں آجاتے ہیں۔ کانفرنس کے ہر سالانہ اجلاس میں جو رزولیوشن پاس ہوتے ہیں اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہر شخص یہ اندازہ کرسکتا ہو کہ اِن میں سے اکثر رزولیوشن ایسے ہیں جو باوجود تعلیم سے متعلق ہونے کے

ملکی سیاست کے دائرے میں شامل ہیں۔

یہی کیفیت اُن مسائل کی ہے جو اُردو کے تحفظ و ترقی یا اُردو ہندی کے قضیۂ نامرضیہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ خالص لسانی و ادبی مباحث ہیں لیکن آپ روزمرہ دیکھتے ہیں کہ ہندستان کے بہت سے ممتاز و مشہور سیاسی لیڈر جن میں اکثر غالباً ذوقِ ادب سے عاری ہیں ان لسانی مسائل سے کس قدر دل چسپی رکھتے ہیں ، ظاہر ہے کہ اُن کی یہ دل چسپی محض سیاسی نقطۂ نظر سے ہے۔

ان تصریحات سے میرا مقصد یہ ہے کہ چوں کہ بہ حالتِ موجودہ کوئی مسئلہ بھی یکسر سیاست سے جدا نہیں ہوسکتا لہٰذا زبانِ اُردو کے تحفظ و ترقی کے سلسلے میں بھی ایسے مسائل پیش آسکتے ہیں جو سیاسی نقطۂ نظر سے بھی لائقِ بحث و گفتگو ہوں گے ، اور ان کے حل کرنے کے لیے آئینی جدوجہد یا ایجی ٹیشن اور ملک کی عام رائے کو تیار کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اب سوال یہ ہے کہ یہ جدوجہد کس جماعت یا قومی ادارے کا کام ہونا چاہیے ؟ میرا خیال ہے کہ یہ کام انجمنِ ترقیٔ اُردو کو انجام دینا چاہیے۔ یعنی جس طرح مسلمانانِ ہند کے تعلیمی معاملات کے متعلق آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مُسلّمہ طور پر ایک ذمّے دار مرکزی جماعت ہے یا سیاسی معاملات کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ جدوجہد کرتی ہے ، اسی طرح جو مسائل زبانِ اُردو سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے لیے انجمنِ ترقیٔ اُردو کو ایک مرکزی جماعت ہونا چاہیے جو اس سلسلے میں ذمّے دارانہ حیثیت سے ہر قسم کی جدوجہد کرتی رہے۔ اُردو کے تحفظ و ترقی میں جو کام سیاسی نوعیت رکھتا ہے اس میں انجمن کی مرکزی حیثیت تسلیم کی جائے اور دوسرے علمی و ادبی ادارے جو زبان کی خدمت کررہے ہیں اِس معاملے میں انجمن سے تعاون کریں۔

اس تحریک کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہندستان کے دوسرے علمی یا ادبی ادارے جو اپنی اپنی جگہ مفید کام کررہے ہیں ، انجمن ترقیٔ اُردو کے ماتحت ہوجائیں ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ انجمن کی آواز کو علمی و لسانی اعتبار سے [illegible] اعتبار سے ہندستان بھر کی اُردو دُنیا کی آواز تسلیم کیا جائے تاکہ انجمن قوم کی تائید و [illegible] حاصل کرکے زیادہ جرأت و استقامت سے اپنا فرض

انجام دے سکے۔ مَیں نے اجمالاً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، انجمن کے اربابِ حل وعقد غور و بحث کے بعد تفصیلات طے کرسکتے ہیں۔ انجمن کو یہ حیثیت دینے کے لیے اگر اُس کے قانونِ اساسی اور ہیئتِ ترکیبی میں اصلاح یا ترمیم کی ضرورت پیش آئے تو اس میں بھی تامّل نہیں کرنا چاہیے۔ اُردو کانفرنس کے عام اجلاس میں بھی اس قسم کی تجاویز پیش کرکے اُن پر بحث کی جاسکتی ہے۔

بے شبہ تالیف وتصنیف کے ذریعے سے اُردو کے علمی و ادبی خزانے میں اضافہ کرنا بھی زبان کی ایک گراں قدر خدمت ہے لیکن اُردو جن خطرات میں گھری ہوئی ہے اُن کا تقاضا یہ ہے کہ اب اس دائرے کے باہر بھی قدم بڑھایا جائے اور مُلک کے تمام علمی و ادبی اداروں کا تعاون حاصل کرکے اُردو کے تحفّظ و ترقّی کے لیے دوسری عملی تدابیر بھی اختیار کی جائیں۔

اِسی سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ آیندہ انجمن کو عام اُردو بولنے والوں کی انجمن بنایا جائے تاکہ عوام یہ محسوس کریں کہ وہ صرف علما یا مُصنّفین کی کوئی جماعت نہیں ہے۔ طریقۂ عمل کی اس تبدیلی سے عوام کی دِل چسپی انجمن کے ساتھ بڑھ جائے گی جو انجمن کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ انجمن کی ممبری کے قواعد میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ ہر اُردو خواں کم از کم اُس کا معمولی ممبر بن سکے۔

انجمن کا صدر دفتر اگرچہ دہلی میں ہے لیکن انجمن کا دائرۂ عمل چوں کہ دہلی تک محدود نہیں اس لیے انجمن کا یہ فرض ہے کہ ہندستان کے مختلف صوبوں اور بڑی ریاستوں میں اُردو کے سلسلے میں جو حالات پیش آئیں اُن سے باخبر رہے اور اُن کے متعلق ضروری تدابیر اختیار کرنے کی غرض سے ہر ایسے علاقے میں ایک نمایندہ انجمن یا جماعت قائم کردے جو صوبے یا ریاست کے ایسے معاملات میں جو اُردو سے تعلق رکھتے ہیں مرکزی انجمن سے امداد و مشورہ حاصل کرکے حسبِ ضرورت کام کرتی رہے اور جو معاملات سارے ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں مرکزی انجمن کی تائید و ہم آہنگی کا کام انجام دے البتہ اگر صوبوں یا ریاستوں میں کوئی نمایندہ جماعت قائم نہ ہوسکے تو مرکزی انجمن کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ وہ ہر صوبے یا بڑی ریاست کے صدر مقام پر خود ہی کوئی اپنا نمایندہ مُقرّر کردے

یہ مختلف مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم کرنے کے علاوہ اُردو زبان کے متعلق ضروری معلومات انجمن کو فراہم کرتا ہے۔

حضرات! ہمارا ایک فرض یہ بھی ہے کہ اِن سب اَدبی اداروں کی خدمات کا اعتراف کریں جو کسی نہ کسی طور پر زبانِ اُردو کی خدمت میں مصروف ہیں، اِسی سلسلے میں ہم سب کو خصوصیت کے ساتھ خسرو دکن و برار اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہٗ کا بھی شکرگزار ہونا چاہیے جن کی شاہانہ فیاضی و معارف نوازی کی بدولت جامعہ عثمانیہ وجود میں آئی اور جامعہ عثمانیہ کے لیے "دارالترجمہ" قائم ہوا جس کی وجہ سے مختلف علوم و فنون کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ علوم جدیدہ کے متعلق اعلیٰ تعلیم، مفید و بلند پایہ تصنیفات و تراجم کا اُردو زبان میں بیش بہا اضافہ ہوگیا۔

اسی طرح اعظم گڑھ کا مشہور و معروف علمی و اَدبی ادارہ دارالمصنفین بھی ہمارے شکریے کا مستحق ہے جس نے اسلامی تاریخ اور اَدب وغیرہ کے متعلق بہت سی معیاری کتابیں شائع کرکے ہمارے لٹریچر کا درجہ بہت بلند کردیا ہے۔

ایم اے او کالج کے بانی سر سیّد مرحوم اور اُن کے رُفقا اور جانشینوں نے اُردو کی جو خدمت کی ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، آج بھی مسلم یونی ورسٹی میں اُردو کا شعبہ قائم ہے جو مفید و لائقِ قدر خدماتِ اَدبی انجام دے رہا ہے، اس شعبے کے صدر ہندستان کے علمی و اَدبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتے ہیں شعبے کے دوسرے اُستاد بھی علاوہ اپنے تعلیمی فرائض انجام دینے کے تالیف و تصنیف کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔

حضرات! اب آخر میں مکرّر میں آپ سب صاحبوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صوبۂ متوسط و برار کے حامیانِ اُردو کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کی حوصلہ مندی و اولوالعزمی کی وجہ سے اُردو کانفرنس کا یہ شان دار اجلاس ناگ پور میں منعقد ہوا۔ مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ یہ اجلاس انجمنِ ترقّیٔ اُردو میں ایک حیاتِ تازہ پیدا کرنے کا باعث ہوگا اور اُس کی عملی قوّتوں کو تیز کردے گا۔

میں آپ سب حضرات کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے صبر کے ساتھ میری تقریر کو سُنا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

سکرٹری کا بیان

جناب صدر اور معزز حاضرین ۔

مجھے اس موقع پر انجمن کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ۔ جو اصحاب یہاں تشریف رکھتے ہیں وہ کم وبیش اس کے حالات سے واقف ہیں ۔ اِس وقت صرف مختصر کیفیت اُس کارگزاری کی عرض کروں گا جو انجمن نے گزشتہ چند سال میں انجام دی ہی ۔

آخر دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب اوّل اوّل اس کی بُنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد ادَبی اور علمی قرار دیا گیا تھا ۔ یعنی ترجمے ، ترتیب وتالیف کے ذریعے اُردو زبان کے ادَبی وعلمی سرمایے میں اضافہ کرنا ۔ اس مقصد کی ۱۹۳۶ء تک پوری پوری پابندی کی گئی ۔ انجمن اُس وقت تک کبھی کسی موقع پر اختلافی بحثوں میں نہیں پڑی تھی ، حالاں کہ اُس دَورانِ مدّت میں اُردو پر بارہا سخت اور تُند حملے ہوے ، اور باوجود اشتعال انگیز تحریروں ، دِل آزار تقریروں اور ناروا اور نازیبا پروپگنڈے کے انجمن نے ہرگز اپنی حد سے قدم باہر نہ رکھا اور اپنی بساط کے مطابق جہاں تک سرمایے نے مساعدت کی ، کتابیں لکھنے لکھانے اور شایع کرنے میں لگی رہی ۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ۔ انجمن کی زندگی میں یہ بڑا انقلاب تھا ۔ یہ انقلاب اِسی شورانگیز اور شوربخت سرزمین میں رونما ہوا ۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد (سُبحان اللہ کیا پیارا نام ہی) کے بھرے اجلاس میں جو ناگ پور یونی ورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا ، گاندھی جی سے اُردو ہندی کے متعلق گفتگو اور بحث ہوئی ۔ اور اس کا جو انجام ہوا وہ آپ سب کو معلوم ہی ۔ پرشد کے فیصلے اور گاندھی جی اور ان کے رُفقا کے

اِس اعلان نے کہ وہ ہندی کو ہندستان کی عام زبان بناکر رہیں گے، ہمیں خوابِ خرگوش سے بیدار کیا۔ اُس وقت ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم سمجھے کہ کمروں میں بیٹھ کر کاغذ سیاہ کرنے اور قلم گھسنے سے کیا حاصل، اور یہ سب کچھ کس دن کے لیے اور کس کے لیے۔ آخر ہمیں انجمن کے اغراض و مقاصد میں ایک مقصد اور بڑھانا پڑا، اور وہ تھا "اُردو زبان کی اشاعت و حفاظت" انجمن اب میدان میں آئی۔ پہلی مہم کا آغاز اسی شہر سے ہوا جسے میں نے اس کے بعد سے جاگ پور کا نام دیا کیوں کہ اسی نے ہمیں اور آپ کو جگایا تھا۔ ہم نے یہاں انجمن کی شاخ قائم کی، کانگرس گورنمنٹ کے وزیروں سے خط و کتابت کی، ملاقات کی، وفد لے کر گئے، اپنے مطالبے پیش کیے، اُردو کی حمایت میں جلسے کیے۔ وِدیا مندر کی اسکیم سے سب سے پہلے انجمن نے اختلاف کیا، اس بارے میں وزیرِ تعلیم سے ملاقات کی اور مراسلت بھی کی، گاندھی جی کو کھلی چٹھی لکھی۔ اس کے بعد یہ بحث کُل ہند مسئلہ بن گئی۔ انجمن کے مستعد کارکن سید علی شبّر نے اپنے رفیقوں کے ساتھ اس صوبے کا دورہ کیا اور شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں انجمن کے مقاصد کی تبلیغ کی اور انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ غرض جو جو ممکن طریقے ہوسکتے تھے عمل میں لائے گئے۔ اور اس کے بعض سرگرم ارکان خصوصاً حکیم اسرار احمد صاحب اور ابراہیم خاں صاحب، نواب صدیق علی خاں صاحب، نواب محی الدین خاں صاحب، مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب نے جس جاں فشانی، بے جگری اور ایثار سے کام کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب یہاں اُردو کا عام رواج ہو رہا ہے۔ اُردو جسے یہاں کوئی مُنھ نہیں لگاتا تھا آج گھروں میں، بازاروں اور جلسوں میں اسی کا بول بالا ہے۔ اِنھی کوششوں کا یہ اثر ہے کہ یہاں کے کالجوں میں جہاں اُردو کی پُرسش نہ تھی اب اُردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر کالج میں بزمِ اُردو ہے اور ان کے علاوہ یونی ورسٹی اُردو لٹریری سوسائٹی الگ ہے جو اُردو کی خدمت انجام دیتی ہے۔ خاص کر خواتین نے اس بارے میں جو کام کیا ہے اور کر رہی ہیں وہ بہت قابلِ تحسین ہے۔ اس بنا پر اِس صوبے کا انجمن پر اور انجمن کا اس صوبے پر بہت بڑا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے علی گڑھ اور دلّی کے بعد تیسری کُل ہند اُردو کانفرنس کا اجلاس یہاں منعقد کیا ہے۔ انجمن سے اس صوبے کا تعلق اِتنا قوی ہوگیا جو

کبھی لوٹ نہیں سکتا۔

انجمن کے سکرٹری کی حیثیت سے یہاں تو خیر میں بار بار آیا لیکن ہندستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی اِسی غرض سے دورے کیے۔ بنگال، بہار، یوپی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی (چھوٹا ناگ پور)، جنوبی ہند میں مدراس، اندھرا، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ملیبار، تامل ناڈ، ٹراونکور تک گیا اور راس کماری پر جاکر دم لیا۔ لوگ مبالغے سے "کشمیر سے راس کماری تک" کا فقرہ کہا کرتے ہیں لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی ہو اور آپ کو یہ سُن کر حیرت اور خوشی ہوگی کہ مجھے راس کماری میں بھی اُردو بولنے والے ملے۔ ان مقامات میں جگہ جگہ تقریریں کیں، اُردو مدرسے دیکھے، لوگوں کو اُردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا، انجمن کی شاخیں قائم کیں، مدرسے کھولے، معترضین کے جواب دیے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور غلط بیانیوں کی تردید۔ جہاں جہاں اُردو پر آنچ آئی سینہ سپر ہوکر لڑے۔ کہیں کام یابی ہوئی کہیں ناکامی۔ کام یابی سے پھول کر غافل نہ ہوئے اور ناکامی سے ہماری آس نہ ٹوٹی۔ ہم برابر کام میں لگے رہے اور یہی ہماری زندگی کا مشن ہو۔

اس جلسے میں انجمن کی گزشتہ چند سالہ کارگزاریوں کا تفصیل سے تو کیا اجمال سے بھی بیان کرنے کا نہ تو کافی وقت ہو اور نہ سُننے والوں میں اتنا صبر۔ لہٰذا نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند باتیں عرض کرتا ہوں :۔

(۱) پنجاب یونی ورسٹی میں اُردو ادب کے امتحانات تو ہوتے ہیں لیکن ان کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اکثر طلبہ ناکام رہتے ہیں اور جو کام یاب ہوجاتے ہیں اُن میں اُردو زبان و ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ امیدواروں کی عام خواہش اور ضرورت کی بنا پر انجمن نے اس غرض کے لیے دہلی میں اُردو کالج قائم کیا۔ جس میں ادیب، ادیبِ عالم، ادیبِ فاضل کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہو۔ اس کے نتائج نہایت اچھے رہے۔ اس میں پڑھانے والے سب عالم فاضل اور مخلص حضرات ہیں۔ علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اس کے پرنسپل ہیں۔

اور تعریف کی بات یہ ہو کہ سب کے سب اعزازی طور پر کام کرتے ہیں ۔

(۲) یورپین اور اینگلو انڈین جماعت میں اُردو کو مقبول بنانے اور اُن کے مدارس میں اُردو کی تعلیم اور اصلاحِ نصاب کا مسئلہ بھی میرے زیرِ غور تھا ۔ اس کے متعلق بعض یورپین مدارس کے پرنسپلوں سے مراسلت بھی کی ۔ آخر اینگلو انڈین فرقے کے لیڈر سر ہنری گڈنی آں جہانی سے مل کر اس بارے میں گفتگو کی ۔ اُنھوں نے میرے اس خیال کی پُرزور تائید کی ۔ میری اُن کی مراسلت شائع ہو چکی ہو ۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یوپی کے یورپین اور اینگلو انڈین اصحاب نے اپنی کمیٹی میں کافی غور اور بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اُن کے مدارس میں اُردو دوسری لازمی زبان ہوگی اور اُس کا بدل کوئی دوسری ہندستانی زبان نہیں ہو سکتی ۔ اور ہندی وہ اپنے مدارس میں نہیں پڑھائیں گے ۔ علاوہ یوپی کے دوسرے صوبوں کے یورپین اور اینگلو انڈین مدارس میں بھی اُردو پڑھائی جاتی ہو ۔ تعلیمی امور کا فیصلہ اُن کی مقتدر اور با اثر مجلس بنام " انٹر پراونشل بورڈ فار اینگلو انڈین اور یورپین ایجوکیشن " میں ہوتا ہو ۔ اس بورڈ میں مجھے اُنھوں نے اپنی لینگویج کمیٹی کا ممبر بنا لیا ہو ۔ اس کمیٹی کا ایک اجلاس گزشتہ سال دہلی میں ہُوا اور دوسرا شملہ میں ۔ مجلس کے فیصلے کے مطابق ان مدارس کے لیے اُردو ریڈریں اور کتابیں مرتب کرانے کا کام میرے تفویض کیا گیا ہو ۔

(۳) بریلی اور آگرہ کے کالجوں میں اُردو ایم ۔ اے کی جماعتیں نہ تھیں ۔ کئی بار تحریک ہوئی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ معاملہ التوا میں رہا ۔ اب ان کالجوں میں ایم ۔ اے کی جماعتیں کھل گئی ہیں ۔ اس میں انجمن کی کوشش اور امداد کو بھی دخل ہو ۔

(۴) سب سے عجیب اور حیرت کی بات یہ ہو کہ دہلی یونی ورسٹی میں سرے سے اُردو تھی ہی نہیں ۔ یہ کیسی ستم ظریفی کی بات ہو کہ مدراس اور ناگ پور کی یونی ورسٹیوں میں تو اُردو ہو اور نہ ہو تو دہلی یونی ورسٹی میں ۔ اس غرض سے انجمن کا ایک وفد دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہُوا ۔ ہم نے اپنے مطالبے پیش کیے اور دیر تک گفتگو رہی ۔ ہمارے مطالبے قلم بند کر لیے گئے ۔ اور وعدہ کیا گیا کہ عنقریب یونی ورسٹی کا نظامِ تعلیم تغیر و تبدل ہونے والا ہو اُس وقت ان امور کو پیشِ نظر رکھا جائے گا ۔

خدا خدا کرکے اب اُردو کو دہلی یونی ورسٹی میں باریابی کا موقع ملا ہے۔

(۵) انجمن نے ۱۹۳۸ء میں ایک نئے کام کا آغاز کیا یعنی چھوٹا ناگ پور کے لیے رانچی میں اُردو مرکز قائم کیا۔ چھوٹا ناگ پور میں ہندستان کی سب سے قدیم اقوام آباد ہیں، آریوں اور دراوڑیوں سے بھی قدیم۔ وہاں رومن کیتھلک مشنریوں کا راج ہے، آج سے نہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے۔ پہلے تو مشنری ہم سے بدظن رہے لیکن جب اُنھیں اطمینان ہوگیا کہ ہم مذہب کی تبلیغ کرنے نہیں آئے تو بہ خوشی ہم سے تعاون کیا۔ اب اُن کے تقریباً تمام مدارس میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ باوجود نامساعد حالات کے ہم اب تک کم و بیش ڈیڑھ ہزار اشخاص کو اُردو پڑھا چکے ہیں اور اس وقت تقریباً ۷۰۰ زیرِ تعلیم ہیں جن میں سے ساڑھے چار سو مختلف مشنوں کے عیسائی ہیں۔ ان کے مدرسوں کے ساتھ ہم نے شبینہ مدرسے بھی جاری کیے ہیں۔ اور رانچی کے علاوہ دیہات میں بھی مدرسے کھولے ہیں۔ دیہات کے یہ مدرسے پادریوں نے اپنی نگرانی میں لے لیے ہیں۔ مسلمان بچوں کے مدرسے الگ ہیں۔ مثلاً موضع اربا مسلمانوں کا گانو ہے وہاں ایک مدت سے لوئر پرائمری مدرسہ تھا لیکن لوئر پرائمری کے بعد ان بچوں کا تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ یا تو وہ اپر پرائمری میں جاکر ہندی پڑھتے یا تعلیم ترک کردیتے تھے۔ موضع والوں نے ہمارے مرکز سے رجوع کیا اور مدرسہ انجمن کی نگرانی میں دے دیا۔ اب یہ مدرسہ اپر پرائمری بنادیا گیا ہے اور امید ہے کہ آئندہ مڈل تک پہنچ جائے گا۔ رومن کیتھلک مشنری بڑی مستعدی سے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں اور اپنے اسکولوں میں اُردو رائج کررہے ہیں۔ ان کی ننیں (Nuns) اور سسٹریں (Sisters) بڑے شوق سے اُردو پڑھ رہی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ عیسائی مردوں اور لڑکوں سے زیادہ عورتیں اور لڑکیاں شوق سے اُردو سیکھتی ہیں۔ ان کے املا کی کاپیاں میرے پاس آتی ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ چند مہینے میں وہ اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ جاتی ہیں اور خط تو ان کا ایسا اچھا ہے کہ ہمارے گریجوایٹوں کو بھی رشک آئے۔ آخر ۱۹۴۲ء میں ہم نے لارڈ بشپ رانچی کی خدمت میں ایک طویل خط لکھا جس میں اُردو زبان اور اس کی تعلیم کی اہمیت اور خصوصیت کے ساتھ عیسائی حلقوں میں اس کی ضرورت

کو چلایا تھا۔ اس کے ساتھ اُردو تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں ایک مختصر سی اسکیم بھی پیش کی گئی تھی۔ ہزگریس نے ہمارے خیالات سے پورا اتفاق کیا، ہمارے مقصد سے ہمدردی ظاہر کی اور ہماری پیش کردہ اسکیم کو منظور کیا۔ یعنی رومن کیتھولک کے دو ٹریننگ اسکولوں میں اُردو کا جاری کرنا منظور فرمایا اور جنوری ۱۹۵۱ء سے ایک ٹریننگ اسکول میں جو اُستانیوں کا ہے اُردو تعلیم شروع کر دی گئی چناں چہ ۲۴ لڑکیاں اور وہاں کی مدر اور سسٹریں اُردو کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اُستادوں کے مدرسے میں فی الحال اس لیے انتظام نہ ہو سکا کہ جنگ کی وجہ سے رانچی سے مشن کے مختلف شعبے ایسے چھوٹے مقامات پر بھیج دیے گئے ہیں جہاں مدرس کے رہنے کے لیے جگہ نہیں مل سکی۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ دشواری کسی طرح رفع ہو تاکہ مردوں کے ٹریننگ اسکول میں بھی اُردو تعلیم جاری ہو جائے۔ رومن کیتھلک پادریوں میں اُردو کا کافی شوق پیدا ہو گیا ہے۔ چناں چہ ایک جیسواٹ پادری فادر کرتوا نے خاص طور پر اُردو زبان کی تحصیل کے لیے لکھنؤ اور دلی کا سفر کیا۔ دلی میں تقریباً دو ماہ تک وہ میرا مہمان رہا اور تمام وقت اُردو زبان کے پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کرتا تھا۔ ایک دوسرا پادری (فادر فان اکسم) جس نے ہمارے مرکز میں اُردو پڑھی لکھنؤ پہنچ گئے ہیں اور اب جلد دلی آنے والے ہیں۔ اب ہماری نظر سنتھال پرگنہ اور کرسیانگ پر ہے اور اس بارے میں وہاں کے مشنریوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ کل ہی اطلاع پہنچی ہے کہ کرسیانگ کے دس پادریوں نے اُردو پڑھنی شروع کر دی ہے اور بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ چھوٹا ناگ پور اُردو مرکز کے مہتمم سہیل عظیم آبادی صاحب نے جس خلوص اور سرگرمی سے کام کیا ہے وہ نہایت قابلِ تعریف ہے۔ جمشید پور کا اُردو کریمیہ اسکول بھی ہمارے مرکز کی نگرانی میں آگیا ہے۔

(۶) کشمیر میں ہندی کو بڑی ہوشیاری اور عجیب ڈھنگ سے نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا ہے۔ ہندی نہ وہاں کی زبان ہے اور نہ اہلِ کشمیر کی طرف سے اس کا مطالبہ تھا لیکن بعض بیرونی اثرات کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا جس کے نتائج بہت ناگوار اور مضر ہوں گے۔ حکومت نے تعلیمی تنظیم کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اور اس کے ارکان بھی حکومت ہی نے انتخاب کیے تھے۔

کمیٹی نے کامل غور اور بحث کے بعد متفقہ طور پر یہ طے کیا تھا کہ جو طریقہ اس وقت رائج ہے وہی مناسب ہے۔ لیکن حکومت نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ انجمن نے اس پر احتجاج کیا اور اپنے اخبار میں متعدد مضامین لکھے اور آخرکار میں خود وہاں گیا اور ڈیڑھ مہینے تک برابر کوشش کرتا رہا۔ چوں کہ اس کے متعلق کانفرنس میں رزولیوشن پیش ہونے والا ہے لہٰذا یہاں تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۷) جے پور میں اُردو کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے اس کا حال آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے اور انجمن نے اس باب میں جو سعیٔ بلیغ کی وہ بھی آپ پر روشن ہے۔ اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جے پور کے مدبرِ اعظم نے جس بے دردی اور بھونڈے پن سے اس کام کو کیا وہ نہایت قابلِ افسوس ہے۔

(۸) آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ کابل کے ٹرینگ کالج میں اُردو زبان کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ اس میں انجمن کی کوشش کو بھی دخل ہے۔ انجمن نے اس بارے میں افغانستان کے وزیرِ اعظم سردار محمد ہاشم خاں صاحب سے مراسلت کی اور نواب صدر یار جنگ بہادر اور مولانا محمد سلیمان ندوی صاحب سے بھی وزیرِ اعظم کے نام خط لے کر بھجوائے۔ شکر ہے کہ انجمن کی کوشش ٹھکانے لگی۔

(۹) ایک دوسری خوش خبری انجمن کی کامیابی کی یہ ہے آپ کو یہ سُناتا ہوں کہ اس مہینے کے شروع میں جنرل سکرٹری ادی باسی مہاسبھا چھوٹا ناگ پور کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ سبھا نے اپنے اسکول میں اُردو کی پڑھائی لازمی کر دی ہے۔ ادی باسی سے مُراد ہندستان کی قدیم ترین اقوام ہیں۔

---

(۱۰) لیکن اس نئے مقصد کے پیچھے ہم نے اپنے پہلے مقصد کو نہیں بھلایا۔ بلکہ اس کے بعد سے ہماری مطبوعات کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوگئی اور ہم نے گزشتہ تین سال میں ۸۳ کتابیں طبع کر کے شائع کیں۔ انجمن نے اپنی تجویز کے مطابق جس کا خاکہ بیس سال ہوئے تیار کیا تھا، ایسے قدیم تذکرے جن کے نام کتابوں میں کہیں کہیں ملتے تھے مگر ان کا وجود ناپید تھا، بڑی جستجو اور صرفِ کثیر

سے بہم پہنچائے۔ ان میں سے بعض کا دُنیا میں صرف ایک ہی نسخہ تھا اور بعض کے دو ایک سے زیادہ نہ تھے۔ یہ تذکرے ہمارے قدیم شعرا کی سیرت، ان کے طرزِ خیال اور طرزِ بیان اور اُس زمانے کی معاشرت و تمدن کے سمجھنے اور صحیح تاریخِ ادب لکھنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ انجمن نے ان سب کو صحت و احتیاط کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا۔ نیز انجمن نے اُردو زبان کی قدیم کتابوں کی اشاعت یا اُن پر تنقیدی تبصرے لکھ کر ملک کو اُردوے قدیم سے روشناس کیا اور اُردو زبان کی تاریخِ ادب میں ایک انقلاب پیدا کردیا، جس سے بہ قول ایک فاضل نقاد کے اُردو کی عمر میں دو سو سال کا اضافہ ہوگیا۔ ان کتابوں سے ابتدائی زبان کی کیفیت اور ارتقائی نشو و نما کی حالت معلوم ہوتی ہے اور زبان و ادب کے مورخ کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان میں سے اکثر وہ کتابیں ہیں جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ یہ کام انجمن نے کئی سال پہلے سے شروع کر رکھے تھے اور اب بھی جاری ہیں۔

انجمن نے مختلف قسم کی لغات کا سلسلہ شائع کرنا شروع کیا تھا۔ جن میں سے بعض مثلاً انگریزی اُردو کی جامع لغات، فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ تین جلدوں میں، فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وراں چھ جلدوں میں شائع ہوچکی ہیں۔ عربی اُردو اور ہندی اُردو کی لغات زیرِ ترتیب و تالیف ہیں۔

اس کے علاوہ دُنیا کی متعدد اُمہاتِ کتب کے ترجمے شائع کیے۔ ان میں عربی، سنسکرت، فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ نیز سائنس کی مختلف شاخوں، فلسفہ، تعلیم، تاریخ، سوانح، حفظانِ صحت، معاشیات، تنقید اور دیگر علوم پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ یہ ایک بیش بہا خزانہ ہے جو انجمن کی بدولت اُردو ادب کو حاصل ہوا ہے۔ کسی ادارے نے اُردو داں طبقے کے لیے علمی اور ادبی معلومات کا ایسا ذخیرہ بہم نہیں پہنچایا۔

(۱۱) گزشتہ سال مولوی سید ہاشمی صاحب نے اصلاحِ رسمِ خط کے متعلق ایک تجویز پیش کی جو خاص خاص اصحاب کی خدمت میں رائے کے لیے بھیجی گئی۔ پھر ایک کمیٹی میں جس کے صدر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب ہیں اس پر غور کیا گیا اور جو اُمور طے ہوئے اس کی رپوٹ ہماری زبان میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد مزید رائیں وصول ہوئیں۔ کل اصلاحِ رسمِ خط کی کمیٹی میں یہ مسئلہ پیش ہوگا۔ اور اس میں جو

اصلاحیں منظور ہوں گی اُن پر عمل درآمد کی کوشش کی جائے گی۔

(۱۲) گزشتہ نومبر میں ہماری سائنس کمیٹی نے سائنس کی مختلف شاخوں پر کتابیں تالیف کرنے کا ایک سہ سالہ پروگرام بنایا۔ جس میں صراحت کے ساتھ یہ طے کر دیا ہے کہ ہر کتاب کا کیا موضوع ہوگا، کس قدر حجم ہوگا اور کون لکھے گا۔ اس سال سے کام شروع ہوگیا ہے۔ اس میں نیز رسالۂ سائنس کی ترتیب میں جامعہ عثمانیہ کے سائنس کے پروفیسروں نے جو قابلِ قدر امداد دی ہے وہ بہت قابلِ شکرگزاری ہے۔

(۱۳) انجمن کے دو رسالے یعنی اُردو اور سائنس پہلے سے جاری تھے دونوں سہ ماہی تھے۔ سائنس اب ماہانہ ہوگیا ہے۔ یہ رسالے جس پایے کے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور سائنس تو اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک کمی تھی جو ہماری زبان" کے اجرا سے پوری ہوگئی۔ یہ پندرہ روزہ اخبار بہت مقبول ہوتا جاتا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی اشاعت کثرت سے ہو تاکہ پڑھنے والے اپنی زبان کے موافق و مخالف حالات سے باخبر رہیں۔ باخبر رہنا زندگی کا لازمہ اور کامیابی کا پہلا قدم ہے۔

یہ پچھلے تین سال کی مختصر سی روداد ہے۔ ہندستان بھر میں انجمنِ ترقیِ اُردو ہند ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو منظم طور پر تمام ہندستان میں اُردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور مختلف مقامات پر اس کی شاخیں اسی اصول پر کام کر رہی ہیں۔ شاخوں کی اب ہم ازسرِ نو تنظیم کر رہے ہیں۔ انجمن کی ترقی اور قوت باہمی تعاون اور یک جہتی پر ہے۔ اگر ہم نے اپنی کوتہ اندیشی یا کم بینی یا کسی لالچ سے اس اتحاد میں رخنہ پیدا کر دیا تو یاد رکھیے ہماری ساری قوت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر پاش پاش ہوجائے گی۔ اس کے بعد دوبارہ اس قوت کو واپس لانا ناممکن ہوجائے گا۔ اس معاملے میں انجمن اشاعتِ اُردو ناگ پور کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے کہ اس نے ملک کے حالات اور انجام پر نظر رکھ کر بڑے ایثار سے کام لیا اور اپنی ہستی کو انجمن ترقیِ اُردو ہند میں ضم کر کے اتحاد و تعاون کی بے نظیر مثال پیش کی ہے۔ پھوٹ نے بہت سے گھر گھالے ہیں، عظیم الشان اور جلیل القدر سلطنتوں اور ہونہار اور باکار اداروں کو آن کی آن میں بٹھا دیا ہے۔ ہمیں اس سے خبردار رہنا چاہیے۔ کیوں کہ حریف ہماری تاک میں ہے۔ اگر ہم نے باہمی اتحاد اور کامل جذبے سے یک دل و یک جان، ایک رنگ و یک خیال ہو کر اس کام کی بنیادیں مضبوط کر دیں تو یقین جانیے ہندستان کی مشترکہ زبان اُردو ہی ہو کے رہے گی۔

عبدالحق

———— (*) ————

اِصلاحِ رسمُ الخط

(مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی)

اِس میں تو مُطلق شبہ نہیں کہ ہندستان کے ہر حصّے میں اُردوٗ زبان نہ صِرف سمجھی جاتی ہو بلکہ بولی بھی جاتی ہو اور ہندستان کے باہر جہاں کہیں اہلِ ہند کاروبار کی ضرورتوں سے جاکر بسے ہیں، وہ اِسی زبان سے کام لیتے ہیں۔ لیکن تقریر سے بڑھ کر اب زمانہ تحریر کا اور عام تعلیم کا آگیا ہو اور اِس بات کی سخت ضرورت ہو کہ ہم اُردوٗ کی تعلیم و تعلّم اور اُس کی طباعت میں ایسی آسانیاں پیدا کریں کہ غیرزبان والوں میں بھی اِسے خوب رواج دیا جاسکے۔ اُردوٗ کے دوسرے بہی خواہوں کی طرح انجمنِ ترقیِّ اُردوٗ اِن مسائل پر ایک مدت سے غور و بحث کرتی رہی ہو اور اس نے طرزِ تعلیم و تحریر میں بعض اِصلاحات بھی کی ہیں جن کو عموماً پسند کیا گیا۔ لیکن یہ جُزوی اصلاحات ہیں اور جو حضرات، اُردوٗ کو لوہے کے ٹائپ میں چھاپنے کے شدومد سے حامی ہیں، وہ ہمارے رسمِ خط میں اور زیادہ تبدیلیوں کا تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ انھی تقاضوں کی بِنا پر کاتبُ الحروف نے گزشتہ سال چند تجاویز مرتّب کی تھیں جن کو چھاپ کر خاص خاص اہلُ الراے کی خدمت میں بھیجا گیا اور انجمن کے دفتر دہلی میں اسی مجلسِ ماہرین کا ایک جلسہ بہ تاریخ ۲۲ر مارچ ۱۹۴۳ء منعقد ہوا۔ ذیل میں پہلے ابتدائی تجاویز کی نقل پھر مجلس کی روٗداد پیش کی جاتی ہو اور آخر میں وہ قراردادیں درج ہیں جو آل ہند اردوٗ کانفرنس، ناگ پور میں مجلس اصلاحِ رسمِ خط نے منظور کیں۔

ناظرینِ رسالہ اُردو سے درخواست ہی کہ وہ اس تمام کارروائی کو بغور مطالعہ فرمائیں اور مناسب ہو تو اپنی رائے اور مشورے سے استفادے کا موقع دیں۔ یہ مسئلہ زبانِ اُردو کی ترویج و اشاعت کے حق میں بڑی اہمیت رکھتا ہی۔ انجمنِ ترقیٔ اُردو چاہتی ہی کہ منظور شدہ اصلاحات کو اپنی مطبوعات میں اختیار کرلے اور ملک میں عام طور پر انھیں رواج دینے کی کوشش کرے۔

ا۔ ابتدائی تجاویز

رسمِ خط کے متعلّق چند تجاویز

(ا)

ا۔ ہماری تحریر میں بعض حروف منفصل اور بعض متّصل ہیں۔ لہٰذا تحریر یکساں قاعدے کے تحت میں نہیں ہوتی۔ حرفِ منفصل کے بیچ میں آجانے سے لفظ ٹوٹ جاتا ہی اور بعض صورتوں میں :۔

(۱) ایک رکن کے حرف اپنے اصلی جوڑ سے جُدا بلکہ دوسرے رکن سے مل کر آتے ہیں، جیسے:۔ کریم، قرینہ، کھرچنا، کہ ان تینوں میں وسطی رکن کا ایک حرف ایک طرف، اور دوسرا دوسرے رکن کے ساتھ لکھا جاتا ہی۔

(۲) اس خلطِ مبحث کی سب سے بدتر صورت وہاں پیدا ہوتی ہی جب کہ حروفِ منفصل مخلوط بھی ہوں یعنی

دھ، ڈھ، ڑھ اور الفاظ کے بیچ میں آئیں جیسے :۔ سدھنا، پڑھنا وغیرہ جن میں دوچشمی ہ نہ صرف اپنے رکن بلکہ اصل حرف سے جُدا لکھی جاتی ہی۔

۲۔ علاماتِ مصدر، مفعول و مستقبل وغیرہ مِلاکر لکھا جاتا ہی اور حروف متّصل ہوں تو مرکب الفاظ بھی ملاکر لکھ دیے جاتے ہیں جیسے :۔ جھینکنا، پٹیلنا، چھپلتا، سمجھیگا اور (ب) ستونتی، رہبر، بیصبر، ہمعصر وغیرہ۔

(ا) ـــــ ہم آواز حروفِ عربی عام ہندی تلفظ میں ادا نہیں ہوتے اور ان کے لکھنے میں اکثر غلطیاں ہوتی ہیں۔

(ب) عربی کے بعض مرکب الفاظ خصوصًا حروفِ شمسی کا الف لام لکھا جاتا ہو مگر تلفظ میں نہیں آتا اور معمولی خواندہ لوگ ان کے پڑھنے میں غلطی کرتے ہیں۔

(ج) 'ی' اور 'و' کی تین آوازیں آتی ہیں مگر ان کے اعراب ابھی مسلّم نہیں ہوئے ہیں۔

(د) بعض اور مخلوط حروف بھی زبان میں آتے ہیں جن کی تحریر کے لیے کوئی عام قاعدہ نہیں بنا ہو۔

---

(۲)

صحتِ تحریر نیز ٹائپ بنانے کی سہولت کے لحاظ سے میری تجویز یہ ہو کہ اوّل تو

(ا) خواندگی کی ابتدائی کتابوں میں لفظ کے ہر رُکن کو علاحدہ لکھا جائے اور

(ب) دوسرے یہ ہو کہ حروفِ متصل کو بے قیدِ تعداد ملاکر نہ لکھا جائے بلکہ اس عمل کو چار حروف تک محدود کردیا جائے یعنی کسی ایک لفظ میں چار سے زیادہ حروف ملاکر نہ لکھے جائیں (مگر مشدد اور غنّہ یا مخلوط ہای آواز والے ایک حرف شمار ہوں گے)

اس تجویز کے مطابق ابتدائی کتابوں میں مثالاً لفظ 'مصیبت' کی املا 'مُ صی بت' اور عام تحریر میں 'مُصی بت' ہوگی۔

(۲) دوسرا ایک ضروری قاعدہ یہ بنانا چاہیے کہ کسی رُکن کا ایک حرف لفظ کے ایک جز میں اور دوسرا جداگانہ دوسرے جز میں ملاکر نہ لکھا جائے جیسے:۔ آجکل، گھرکنا، قرینہ وغیرہ الفاظ میں ملادیا جاتا ہو۔ اگرچہ ہم اس کے عادی ہوگئے ہیں لیکن حقیقت میں یہ بالکل بے اصولی کی بات ہو اور مبتدی اور کم علم لوگوں کو اردو عبارت کے صحیح پڑھنے میں اس سے بڑی دشواری پیش آتی ہو۔ میں تو یہاں تک سفارش کرتا کہ ایک رُکن کے حروف کو دوسرے رُکن کے ساتھ بالکل نہ ملایا جائے لیکن چوں کہ ہم کسی بڑے تغیّر سے بھی بچنا چاہتے ہیں لہٰذا اس تجویز پر قناعت

کی کہ ایک رُکن سے حرفوں کو دو مختلف رُکنوں کے ساتھ الگ الگ نہ ملایا جائے، صرف ایک اور رُکن کے ساتھ ملاکر لکھنا جائز رکھا جائے یعنی گھرکنا اور قرینہ کو موجودہ اِملا کی بجائے اس طرح لکھا جائے :- 'گھرک نا'، 'قری نہ'

(ب) جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، مخلوط حروف ہائی دھ، ڈھ، ڑھ کے لکھنے میں اور بھی قباحت یہ پیش آتی ہے کہ خود حرف کا ایک جُز (یعنی دوچشمی ہ) اپنے اصل سے جُدا لکھا جاتا ہے۔ لیکن دوچشمی ہ سے مخلوط حروف بنانے کا طریقہ اب اتنا عام ہوگیا ہے کہ اسے ترک کرنا دشوار ہوگا۔ البتہ میرے خیال میں یہ مناسب ہے کہ ہم اِن تین مخلوط حروف کے لکھنے میں تھوڑی سی تبدیلی کردیں اور ان حروف میں بھی دوچشمی ہ کو اصل حرف سے ملاکر اِس طرح تحریر کیا جائے :-

ڑھ ، دھ ، ڈھ

خوش نویسی میں یہ صورت نئی نہیں ہے۔ دوسرے جب ہم نے مان لیا ہے کہ یہ جُداگانہ مخلوط آواز کے حرف ہیں تو ان کی تحریر میں عربی فارسی قواعد کی پابندی لازمی نہیں سمجھنی چاہیے۔ ہم نے اپنی ضرورت سے ب، پ سے بھ، پھ کی شکلیں ایجاد کرلی ہیں تو منفصل حروف مخلوط کی شکلوں میں بھی حسبِ ضرورت تصرّف کرسکتے ہیں۔

۴ــــ علاماتِ مصدر وغیرہ ہر قسم کے لاحقے اور سابقے جو اصل مادّے میں یعنی عموماً صیغۂ امر پر اضافہ کیے جاتے ہیں ان کو ملاکر نہ لکھا جائے بلکہ جُدا تحریر کیا جائے جیسے :- لکھ نا، سنبھل نا، بیٹھ کر وغیرہ۔

(ب) مرکّب الفاظ کے اجزائے ترکیبی کو لازماً علاحدہ علاحدہ لکھا جائے جیسے :-

بل ونت ، کن کٹا ، بے دِل وغیرہ

ضروری تاکید جب کہ ہم بعض صورتوں میں متّصل حروف کو بھی الگ الگ لکھنے کی سفارش کررہے ہیں، الفاظ کو جگہ چھوڑ چھوڑ کر لکھنا پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہوجائے گا۔ اس وقت بھی جو لوگ لفظوں کے درمیان کافی فصل نہیں چھوڑتے وہ

غلطی کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے یہاں لفظ کے ختم ہونے کی کوئی علامت مروّج نہیں ہو اور نہ اُسے
ایجاد کرنے کی اب سفارش کی جاتی ہو۔ لیکن قلمی تحریر میں ہر لفظ کو دوسرے سے الگ کرکے
لکھنا چاہیے اور پتھر کے چھاپے میں پنجاب کی درسیات یعنی چارخانے کا مسطر اور الفاظ کے
درمیان لازماً ایک خانہ چھوڑنے کا طریقہ اختیار کرنا مناسب ہوگا۔ ٹائپ میں ہر لفظ کو فصل دے کر
لکھنا نسبتہً سہل ہو اور اس پر عموماً عمل بھی کیا جاتا ہو۔

۵ ـــ ہم آواز عربی حروف کی پانچ قسمیں ہیں :-

ا ۔ ع

ت ۔ ط

ث ۔ س ۔ ص

ح ۔ ہ

ز ۔ ذ ۔ ض ۔ ظ

ہندی لوگوں کا ان آوازوں کو الگ الگ ادا کرنا تکلف سے خالی نہیں۔ خصوصاً تیسری قسم کی
تین اور آخری قسم کی چار آوازوں کا علاحدہ تلفظ کوئی نہیں کرتا اور ان کی اِملا میں بھی غلطیاں واقع
ہوتی ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہو کہ ان حروف کے بہ کثرت الفاظ ہماری زبان میں رائج ہوچکے
ہیں اور ان میں کوئی انقلابی اصلاح کی جائے تو ہمارے طلبہ کو پچھلی کتابوں سے استفادہ کرنا
مشکل ہوجائے گا اور عربی فارسی تحریر سے دوری بھی اہلِ اُردو خصوصاً مسلمانوں میں مقبول نہ ہوگی۔
اِن تمام مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھ کر میری تجویز یہ ہو کہ اُردو میں اِن پانچ قسموں کے صرف دو دو
حرف سے کام لینا جائز قرار دیا جائے اور حروف ص ، ز ، ض کو قاعدہ ابتدائی کے آخر
میں بچوں کو پڑھا دیا جائے کہ وہ ان کی شکلوں سے ناآشنا نہ رہیں۔

(ب) اُردو کی اِملا میں ص ، ض اور ز کو ترک کرکے ص کی بجائے س اور ز اور ض
کی بجائے ذ اور ظ سے کام لیں ، ان کو موردِ اعتراض نہ بنایا جائے۔

ف ۱۔ ہم نے ژ کو ترک کرنا اس لیے جائز قرار دیا ہو کہ اس شکل کے اُردو میں چار حرف موجود ہیں اور ض کا صحیح تلفظ تو اُردو داں کیا عربی داں حضرات میں بھی محلِّ مناقشہ بنا ہوا ہو۔ پھر، اگر ہم ض کو چھوڑیں تو اس کی بہن ص کی بجائے بھی س سے کام لے سکتے ہیں۔

ف ۲۔ اگرچہ صحیح مخرج کے اعتبار سے ز کی بجائے ظ اور ض کی بجائے ذ کا استعمال بہتر ہوتا۔ لیکن صورت کی مناسبت سے لوگ غالباً ز کو ذ اور ض کو ظ سے بدلنا پسند کریں گے۔

ف ۳۔ واضح رہے کہ ہم اس تبدیلی کو صرف جائز قرار دینے کی سفارش کرتے ہیں۔ لازم کردینے پر مصر نہیں ہیں۔

۶۔۔۔۔ عربی حروفِ شمسی و قمری کا اُردو میں فرق اُٹھا دیا جائے اور مرکب الفاظ میں جب پہلے لفظ کے آخر فتحہ ہو تو الف لام کو ساکت نہ کیا جائے بلکہ جس طرح وہ قمری حروف سے مل کر ادا ہوتا ہو، اسی طرح جملہ حروف سے مل کر ملفوظ ہو۔ یعنی جس طرح اہل القمر میں بولا جاتا ہو اسی طرح اہل الشمس، اہل الدین وغیرہ شمسی حروف سے مِلا کر بھی بولا جائے۔ یعنی (قاعدۂ عربی کے مطابق) ا، ل کو چھوڑ کر ملنے والے حرف کو مشدد نہ کیا جائے۔

اکثر مستشرقینِ یورپ اسی قاعدے پر عمل کرتے ہیں تاکہ جو حروف تحریر میں آئیں وہ زبان سے بھی ادا ہوں۔

(ب) جب پہلے ترکیبی لفظ کے آخر میں فتحہ یا کسرہ ہو اور اسے دوسرے جُز کے لام سے مِلا کر پڑھا جائے اور الف ساکت ہو جیسے :- ابن اللہ، بالفعل، بالکل، وغیرہ میں تو الف پر گول جزم بنا دیا جائے اور ایسے جزم کو ہر جگہ حرف کے غیر ملفوظ ہونے کی علامت قرار دیا جائے۔

واضح رہے کہ عربی تحریر میں حرف پر اعراب نہ ہونا اس کے ساکت ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہو لیکن اُردو میں بِلا اعراب کا حرف مفتوح قرار دیا گیا ہو لہٰذا ہمیں ساکت حرف کے لیے الگ علامت بنانی چاہیے جیسا کہ اوپر تجویز کی گئی۔

۷۔۔۔۔ و اور ی کی تین آوازوں کو ادا کرنے کی انجمن ترقیِ اُردو نے علامتیں تجویز کی ہیں۔ لیکن

میرے خیال میں ماقبل مفتوح اور معروف لکھنے کے جو قاعدے عربی اور فارسی اور اُردو میں اب تک رائج ہیں ان کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ہمیں مجہول آواز کے لیے جو ہندی لب ولہجے کی خصوصیت ہے، جُداگانہ علامت بنالینی چاہیے۔ اس کے لیے ہم اُلٹا جزم مقرر کرسکتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوگا کہ یہاں یہ حرف اپنی پوری آواز نہیں دیتا۔ جیسے :- ہو، لو، کو۔ اور لئے، دے وغیرہ میں۔ غالبًا اس علامت کا مطلب ناواقف لوگ بھی آسانی سے سمجھ لیں گے۔

(ب) و اور ی مجہول کی یکساں علامت قرار دینے کے بعد ہم و کی طرح ی کی بھی صرف ایک شکل سے ہر جگہ کام لے سکیں گے۔ چھوٹی اور بڑی ے کا فرق کرنے اور بچوں کو الگ الگ پڑھانے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

۸۔ ا اور و کی مخلوط آواز جو فارسی اور انگریزی الفاظ میں اکثر آتی ہے۔ جیسے :- خواہر، Lord - Ball - Hall. وغیرہ میں۔

(ب) ہندی الفاظ میں یاے مخلوط کی آواز جیسے :- کیا، پیار وغیرہ میں۔

(ج) ہندی یا غیر زبانوں میں دو حرفوں کی مخلوط آواز جیسے :- تسانگ، کرشن وغیرہ میں۔

اِن سب صورتوں کے واسطے میرے خیال میں مخلوط حروف کے نیچے خط کھینچ دینے کا طریقہ عام طور پر مسلّم اور مروّج کرلیا جائے، یا اور کوئی امتیازی علامت مقرر کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے رسمُ الخط کا امتیازی وصف حروف کو مِلاکر لکھنا ہے اور اس میں وقت اور جگہ دونوں کی کفایت ہوتی ہے لیکن اوّل تو حروفِ منفصل کی موجودگی سے یہ خصوصیت جُملہ الفاظ میں قائم نہیں رہتی۔ دوسرے بڑے بڑے لفظ اور علمی اصطلاحات یا غیر زبانوں کے اعلام و اسما کا صحتِ اعراب کے ساتھ لکھنا پڑھنا دِقت سے خالی نہیں ہوتا۔ اب جب کہ ہماری زبان کا دائرہ وسیع ہورہا ہے اور وہ محض بول چال اور شعر شاعری ہی کی نہیں، بلکہ درسی اور علمی زبان بن گئی ہے، ہمیں صحتِ تحریر اور پڑھنے پڑھانے کی سہولت نیز ٹائپ بنانے کی آسانیاں

دیکھ کر اتصالی حروف کے رواج کو محدود اور خاص خاص اصول کا پابند بنانا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ جو اصلاحی تجویزیں اس وقت پیش کی گئی ہیں ان میں یہ مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ موجودہ رسم الخط میں کوئی انقلابی یا اساسی تغیر نہ کیا جائے جسے قبول کرنا لوگوں کو دشوار ہو یا جس سے ہماری طرزِ تحریر بالکل بدل جائے۔

۲۔ رُوداد مجلس منعقدہ ۲۲ر مارچ سنہ ۴۳ء

کمیٹی اصلاحِ رسمِ خط

(مرتبہ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی)

[اس رُوداد کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ دُوسرے حضرات بھی زیرِ بحث مسائل پر غور فرمائیں اور اگر چاہیں تو اپنی رائے یا کسی تجویز سے اطلاع دیں تاکہ انجمن کو آخری فیصلہ کرتے وقت زیادہ سے زیادہ آرا سے استفادے کا موقع ملے۔] (سکرٹری انجمنِ ترقّیِ اُردو)

اُردو رسمِ خط کے متعلق چند تجویزوں پر غور کرنے کے لیے انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) کے دفتر واقع دریا گنج، دہلی، میں کمیٹی کا اجلاس ۲۲ر مارچ ۱۹۴۳ء کو ۱۱ بجے صبح منعقد ہُوا جو اُسی دن تیسرے پہر برخاست ہُوا۔

حسبِ ذیل صاحبوں نے شرکت کی:۔

۱۔ مولوی سیّد ہاشمی صاحب فریدآبادی۔
۲۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفیؔ دہلوی۔
۳۔ مولوی وہاج الدین صاحب کنتوری۔
۴۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔

۵ - ڈاکٹر مولوی عبدالحق (داعی)

حسبِ ذیل تجویزیں منظور کی گئیں :-

۱- سفارش کی جاتی ہے کہ اردو کی کتابت اور خاص کر چھاپے میں اِن امور کی پابندی کی جائے۔

(الف) دو لفظوں کے درمیان واضح فاصلہ رکھا جائے اور یہ فاصلہ یکساں ہو نیز یہ فاصلہ اس فاصلے سے زیادہ ہو جو ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں رکھا جائے۔

(ب) ایک لفظ کے اوپر دوسرا لفظ یا ایک حرف کے اوپر دوسرا حرف کسی حالت میں نہ لکھا جائے؛ یعنی "سرفراز" لکھا جائے نہ کہ "سرفراز"، "درد" لکھا جائے؛ نہ کہ "درد"، "گھبراہٹ" نہ کہ "گھبراہٹ"۔

(ج) مرکب لفظ، جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنے ہوں، آپس میں ملا کر نہ لکھے جاویں، بل کہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جاویں؛ البتہ ان کے درمیان میں فاصلہ صرف اُتنا ہو جتنا ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں، جیسا کہ اِن مثالوں سے واضح ہوگا :- جیسے آج کل - بن مانس - پن ڈبی - کل جگ - کل مُنہا - کل دار - شاہ نامہ - شاہ جہاں آباد - شاہ جہاں پور - جے پور - اُدے پور - فرخ نگر - ناگ پور - کان پور - دل لگی - گل کاری - پھل کاری -

(د) بعض مفرد لفظ دو طرح لکھے جاتے ہیں: بی بی اور بیبی، ڈل ڈل اور دلدل ان کی منفصل لکھاوٹ اختیار کی جائے اس طرح :-

کھل بلی - جھٹ پٹا - جھن جھنا - گن گنا - بل بل - گل گلا - رس گلا - لس لسا - کھٹ کھٹانا - کھٹ کھٹاہٹ - کھن کھنانا - کھن کھناہٹ - دانتا کل کل - جھن جھٹ -

(ہ) ہمزہ جب کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو بالکل جُدا لکھا جاوے، اس طرح پر کہ اس کے لیے کوئی شوشہ نہ ہو اور نہ ہمزہ کسی حرف کے اوپر لکھا جائے، بل کہ یوں ہو :-

آئی آئے آئیں بھائی نائی ملائی بھلائی بُرائی رُوئی اُوئی سوئی سوئیاں دھوئیں ڈوئیں ڈوئیاں آؤ جاؤ شناؤ کھاؤ ترش رُوئی بدخوئی عیب جوئی یوسف زئی زائل قائل

طاءِر ماءِل گھاءِل ساءِل زاءِد قاءِدہ قاءِم داءِم داءِر ساءِر لاطاءِل ضاءِع شاءِع جراءِم وظاءِف تاءِید ساءِیں رءِیس عزراءِیل میکاءِیل [خود عربی میں اِن لفظوں کی لکھاوٹ کو دیکھیو:- مِراءۃ قراءۃ سموءِل]

(و) فارسی لفظ بہ، نہ، چہ، کہ، بےوغیرہ جو خود فارسی میں بھی کبھی دوسرے لفظ سے مِلاکر اور کبھی الگ لکھے جاتے ہیں، اُردو عبارت میں الگ لکھے جاءیں، جیسے

بہ خوبی، بہ ہر حال، بہ کمالِ شفقت، بہ دولت، نہ خورد، نہ گفت، چہ کنم، چہ می گوءی، چہ می گوءیاں، حال آں کہ، بل کہ، چوں کہ، چناں چہ، غرض کہ، تاوقتیکہ، بہ شرطیکہ، بے شک، بے تحاشا بے محابا، وغیرہ۔

لمبی ے کو جو خاص کر ٹاءپ میں دِقّتیں پیدا کرتی ہے اور اکثر بہت بدنُما ہوتی ہے، قطعاً ترک کردینا چاہیے۔ اس کی جگہ آدھے داءرے والی ے سے کام لیا جاءے اور جب ے سے پہلے مفتوح حرف ہو، تو بھی ے آدھے داءرے کی ہو مگر اِس پر جزم ضرور ہو، جیسے جےٗ شےٗ مےٗ نےٗ ہےٗ۔

دھ ڈھ رھ ڑھ لکھنے میں دو دو حرف ہیں۔ حال آں کہ ایک ہی ایک آواز کو ادا کرتے ہیں۔ ان کو مِلاکر لکھنا چاہیے اور مُنفصِل حرف قرار دینا چاہیے۔ یعنی کسی حال میں اگلے حرف سے نہ ملیں۔ اس طرح ان کی شکلیں یہ قرار پاتی ہیں:-

ھ (یا دھ)، ڈھ (یا ڈھ)، ڑھ (یا ڑھ)

مثالیں:- دھن (بہ جاے دُھن) ادھورا (بہ جاے ادھُورا) اسی طرح دھان، دھرتی، دھرم، دھوبی، ڈھولی، ڈھانپ، کاڑھنا، کڑھاءی، ڈیڑھ وغیرہ۔

نون غُنّہ ہمیشہ مُنفصِل لکھا جاءے اور شکل اس کی یہ ہو: ں۔

مثالیں: باںس، پھاںس، پھںس، کھوںس، ہںس، وہ یہ سُن کر ہںس دے گا، سں گھاڑی کیہاں بِکتے نہیں؟

۵۔ عربی لفظوں کی کتابت کے متعلق سفارش کی جاتی ہے کہ

(ل) اِن ، عَن ، مِن ، فی (جو خود عربی میں الگ لکھے جاتے ہیں) اُردو میں بھی دوسرے لفظ سے ملاکر نہ لکھے جائیں، بل کہ یوں لکھنا چاہیے: اِن شاء اللہ، عن قریب، من جانب، فی صد، فی کس وغیرہ[1]

البتہ جب ایسے کسی لفظ کے بعد عربی کی ضمیر آئے تو وہ ملاکر لکھی جائے جیسے عنہم، عنہُ، مِنہُ، منہُم، فیہا۔

(ب) عربی کے حرفِ تعریف (ال) کی کتابت کے متعلق طے ہوا کہ:-

(۱) ال کے بعد کا لفظ اگر قمری حرف (یعنی ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، ہ، و، ی میں سے کسی حرف) سے شروع ہوتا ہو، اور ال سے پہلے بھی کوئی لفظ آکر اس سے مرکب ہوا ہو تو ال کی صرف الف پر گول جزم (بطور سکون کی علامت کے) ہو؛ اس طرح: بالکل، بالفعل عبدالجبار، عبدالقادر

(۲) ال کے بعد کا لفظ اگر شمسی حرف (یعنی ت، ث، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ل، ن، میں سے کسی حرف) سے شروع ہوتا ہو تو ال کی ل پر سکون کی علامت ہو (الف پر ضرورت نہیں)؛ لیکن اگر ال سے پہلے کوئی عربی لفظ آکر اُس سے مرکب ہوا ہو، تو الف اور ل دونوں پر (اسی طرح سے: اْلْ) سکون کی علامت ہو، جیسے "السّلام علیکم"، مگر "علیکم السّلام"۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ الف پر سکون کی علامت ہو، ل خالی رہے مگر شمسی حرف پر تشدید ضرور لگائی جائے۔ اس صورت میں سیکھنے والے کو یہ بتایا جائے کہ اگر ل کے بعد والے حرف پر تشدید ہو، تو ل تلفظ میں نہ آئے گا۔

(ج) وہ عربی لفظ (یا نام) جو خود عربی میں دو طرح لکھے جاتے ہیں اُن کی اُس لکھاوٹ کو اختیار کرنا چاہیے جو اُردو لکھاوٹ کے مطابق یا اُس سے قریب ہے اور ان کی تفصیل یہ ہے:-

---

[1] فارسی والوں نے انھیں ملاکر لکھنے پر اصرار کیا مگر یہ سراسر بے جا اور غلط ہے۔

(۱)	ابرٰهیم	ابراهیم	اُردو میں صرف دوسری طرح لکھے جاتے ہیں یعنی ابراہیم، سلیمان، لقمان، شیطان اور اسی طرح لکھنا چاہیے۔
	سُلیمٰن	سُلیمان	
	لُقمٰن	لُقمان	
	شیطٰن	شیطان	
(۲)	اسمٰعیل	اسماعیل	اُردو میں بھی دونوں طرح؛ مگر ان کو بھی صرف دوسری طرح (اسماعیل، رحمان) لکھنا چاہیے۔
	رحمٰن	رحمان	
(۳)	حیوٰة	حیاة	اُردو میں حیات، نجات، ربا، منات لکھتے ہیں اور اسی طرح لکھنا چاہیے۔
	نجوٰة	نجاة	
	ربٰو	ربا	
	منوٰة	مناة	
(۴)	زکوٰة	زکاة	اُردو میں زکات، صلات، مشکات لکھنا چاہیے۔
	صلوٰة	صلاة	
	مشکوٰة	مشکاة	

فائدہ۔ عربی میں اِن لفظوں کی پہلی لکھاوٹ بہت پُرانی ہے اور جب قرآن کا متن پہلے پہل لکھا گیا تو یہ لکھاوٹ اختیار کی گئی۔ اس کے بعد اس کو بدلنا پسند نہیں کیا گیا اور اب تک ہر حرف اُسی پُرانی صورت اور ہیئت میں موجود ہے۔ مگر جب عربی میں کتابت کے اصول مقرر کیے گئے تو یہ لفظ پورے الف سے لکھے گئے اور ماسوا قرآن کے عربی کتابوں میں اکثر و بیش تر پورے الف والی لکھاوٹ پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ بڑی مستند کتابوں میں جب قرآن کی آیتیں نقل ہوئی ہیں اور ان میں ایسے لفظ آگئے ہیں تو بھی پورے الف سے لکھے گئے ہیں۔

(۵) عربی کی ۃ کو اُردو میں ہمیشہ ت لکھنا چاہیے۔

وہ عربی لفظ، جن میں الف مقصورہ لکھنا غلط ہے، مگر لوگ نادانستہ ان میں بھی مقصورالف

لکھ دیتے ہیں جیسے اِستیعفٰی، اِرتضٰی، اِجتبٰی، اِصطفٰی، صحیح طریقے سے لکھے جاویں یعنی یوں اِستعفا، اِرتضا، اِجتبا، اِصطفا۔

(د) عربی میں جو لفظ الف مقصورہ سے لکھے جاتے ہیں اُردو میں وہ معمولی الف سے لکھے جاویں اور ان کی تفصیل یہ ہے:۔

اعلیٰ، ادنیٰ، اوّلیٰ، علیٰ حالہ، علیٰ حدہ، مولیٰ، مولٰنا، مُعلّٰی، مُصلّٰی، مُعمّٰی، مجلّٰی، مربّٰی، مُعرّٰی، مدّعٰی علیہ وغیرہ۔ ان میں بہت سے لفظ اُردو (اور فارسی) میں معمولی الف سے لکھے جاتے ہیں، جیسے مُربّا، مُعرّا، مُصلّا، مُعمّا، مُنقّا، تقاضا، تماشا، تمنّا، تبرّا، تولّا۔ کچھ لفظ دونوں طرح لکھے جاتے ہیں، جیسے مولا (یا مولیٰ) مولانا (یا مولینا)، مُعلّا، مُدّعا علیہ۔ کچھ ایسے ہیں کہ ایک زمانے میں سیدھے الف سے لکھے جاتے تھے مگر لوگوں نے رجعت کی اور وہ پھر الف مقصورہ سے لکھے جانے لگے جیسے اعلا، ادنا، اولا[1] "علیٰ حِدَہ" دو لفظ ہیں (اور عربی میں کبھی ملا کر نہیں لکھے جاتے) مگر اردو والے ان کو ملا کر لکھتے ہیں "علٰحدہ" یا "علیحدہ" بہتر ہے کہ "علاحدہ" لکھا جائے ان سب لفظوں کو یوں لکھنا چاہیے: ادنا، اعلا، اوّلا، اوّلا، مولا، مولانا، مدعاعلیہ، مُتوفّا، مستثنا، صلِ علا، مجلّا، مُعمّا، مُربّا، علاحدہ۔ ناموں کو بھی یوں لکھ سکتے ہیں: جیسا موسٰی، مصطفا، مرتضا، کِسرا، صُغرا، کُبرا وغیرہ۔

۶۔ فارسی اور عربی کے سوا کسی غیر زبان کا لفظ اُردو میں لکھا جائے تو اس کے صوتی ٹکڑوں کو، جہاں تک ہو سکے، الگ الگ کر کے لکھنا چاہیے؛ جیسے (انگریزی):۔ اِن فارمل، اِنس پک ٹر، مس ٹر، ہم سٹر، ڈاک ٹر، ک لک ٹر، اوورسی ور، سوپرواہ زر، اِنس ٹی ٹیوٹ، کانگ رس، کان فرنس، یونی ورسٹی، سوپر اِن ٹن ڈنٹ، ٹیلی فون، ری ڈیو، اِس ڈشن، ڈی پارٹ منٹ۔

کمیٹی کو اس امر کا پورا احساس ہے کہ کسی غیر زبان کے لفظوں کو ٹھیک ٹھیک تلفظ کے مطابق ادا کرنے کے لیے یہ تدبیر ناکافی ہے اور لغت اور لسانیات وغیرہ کی کتابوں کے لیے ہر زبان کی خصوصیتوں کو پیش نظر رکھ کر

[1] خود عربی میں اس قسم کے لفظ بعض حالتوں میں معمولی الف سے لکھے جاتے ہیں جیسے اعلاھُم، ادناہُ، مولاہُ وغیرہ۔

زیادہ تفصیلی تجویزیں عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے تجویز کی گئی کہ یہ مسئلہ کسی آیندہ موقع تک ملتوی رکھا جاوے۔

۷۔ رسم خط کو زیادہ آسان بنانے کی غرض سے چند اور تحریکیں بھی پیش ہوئیں جن پر دیر تک بحث ہونے کے بعد طے ہوا کہ تعلیمی ضرورتوں خاص کر بالغوں کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ان امور کی سفارش کی جاوے:۔

(ا) مصدر یا کسی صیغے کے آخر میں جو نا (نے نے)، تا (تی تے) وغیرہ آتے ہیں وہ اصل (یا مادے) سے جدا کر کے لکھے جاویں، جیسے لے نا، لے تا، لے تی، لے تیں، دے نا، دے تی، دے نے، لکھ نا، لکھ تے، لکھ تی، لکھ تیں، سمجھ نا، سمجھ تے، سمجھ تی، بھیج نا، بھیج دانا، دل دانا وغیرہ

(ب) تے بھی (شکل اور حروفِ علت آ اور و کے) منفصل حروف میں شامل کی جاوے اور کتابت کی صورتیں، تلفظ کے مطابق، اس شکل سے ہوں:۔

مجہول	ماقبل مفتوح	معروف
بےر	بےن	بی ن
پھور	پےر	پی ر
شور	صےد	شی ر
پےٹ	پےٹھ	پی ٹھ
کےلا	کےلاش	کی لا

(ج) خواندگی کی ابتدائی کتابوں میں لفظ کا ہر صوتی ٹکڑا (یا رکن) علاحدہ لکھا جاوے اور حروفِ متصل کسی حال میں چار سے زیادہ ملا کر نہ لکھے جاویں، مثلاً

بجاے "مصیبت" کے "مُ صی بت" بجاے "قرینہ" کے "ق ری نہ" بجاے "گھرکنا" کے "گھ رک نا"

کمیٹی کے نزدیک اس تجویز میں ایک ترمیم یہ کی جاسکتی ہے کہ لفظ کا پہلا حرف اگر ایک صوتی رکن ہو مگر متصل حرفوں میں سے ہو تو وہ اگلے ٹکڑے سے الگ نہ کیا جاوے نیز مشدّد حرف دوبارہ نہ

لکھا جاوے یعنی بجاوے " ق ری نہ " کے " قری نہ " اور بجاوے " عزت " کے " عزّت " لکھا جاوے۔
اس امر کا آخری فیصلہ کہ ان دونوں میں سے کون سی صورت زیادہ مناسب ہوگی ان اصحاب کی ماتو پر چھوڑنا چاہیے جن کو تعلیم اور خصوصاً بالغوں کی تعلیم سے تعلق ہے۔
فائدہ - ان تینوں تجویزوں کے متعلق یہ بات بھی بحث میں آئی کہ شاید اس تجویز پر یہ اعتراض ہو کہ اگر ابتدائی تعلیم میں اس طرح کی سہولت بہم پہنچائی گئی تو جن لوگوں نے اس ڈھنگ سے پڑھنا سیکھا ہوگا وہ معمولی چھپی ہوئی کتابوں کو نہ پڑھ سکیں گے۔ اس لیے کمیٹی یہ بتا دینا چاہتی ہے کہ اس طریقے سے تعلیم کے صرف ابتدائی مرحلوں میں کام لیا جاوے گا اور جب پڑھنے والے ترقی کر لیں گے تو انھیں حرفوں کے مروّج جوڑ توڑ بنا کر ان کی مشق کروا دی جاوے گی اور یہ ہرگز دشوار نہ ہوگا۔

تجاویز اصلاحِ رسمِ خط

[منظور کردہ مجلسِ ذیلی کُل ہند اُردو کانفرنس، ناگ پور]

۱۳ر جنوری ۱۹۴۴ء کو حسبِ اعلان رسمِ خط کی ذیلی مجلس کا، ناگ پور کانفرنس کے شان دار پنڈال میں اجلاس ہوا۔ قریب قریب چالیس حضرات نے شرکت فرمائی۔ انجمن کی رسمِ خط کمیٹی کے میرِ مجلس ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کوشش کے باوجود، ریل کے بروقت الہ آباد سے نہ چلنے کے باعث تشریف نہ لا سکے۔ عبدالرحمان صاحب صدّیقی ایم، اے، (کلکتہ) نے جلسے کی صدارت فرمائی۔
انجمن کی کمیٹی نے اس باب میں جو تجاویز اپنے ۲۲ر مارچ ۱۹۴۳ء کے اجلاس میں مُرتّب کی تھیں، وہ یکے بعد دیگرے پیش ہوئیں اور کافی غور و مباحثے کے بعد خفیف ترمیم و اضافے کے ساتھ منظور کی گئیں۔ یہ تجاویز ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۳ء کے اخبار " ہماری زبان " میں شائع ہو چکی

ہیں۔ ملخصاً دوبارہ ذیل میں تحریر کی جاتی ہیں :۔

۱۔ کتابت اور خاص کر چھاپے میں دو لفظوں کے درمیان واضح فصل چھوڑا جائے۔ ایک لفظ کے اوپر دوسرا لفظ نہ لکھا جائے۔ مرکب الفاظ کو ملا کر نہ لکھا جائے۔ جیسے :۔ آج کل۔ کل جگ۔ گل کاری وغیرہ۔ اسی طرح ایسے مفرد الفاظ بھی جو دونوں طرح لکھے جاتے ہیں، آیندہ منفصل ہی لکھے جائیں۔ جیسے : بی بی۔ کھل بلی۔ جھٹ پٹا۔ جھن جھناہٹ۔ ہل چل وغیرہ۔ اور فارسی حروف بہ، نہ، چہ وغیرہ کو بھی ملا کر نہ لکھا جائے بلکہ علاحدہ تحریر کیا جائے۔ جیسے : بہ خوبی۔ بہ ہر حال۔ چناں چہ۔

۲۔ ہمزہ جب کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو جداگانہ لکھا جائے اور اس کے لیے کوئی شوشہ نہ بنایا جائے۔ جیسے : آءی۔ ناءی۔ ساءل۔ گھاءل۔ وغیرہ۔

(ایک گروہ کی راے میں جہاں آسانی سے ممکن ہو وہاں ہمزہ کی بجائے حرف الف ہی سے کام لیا جائے۔ جیسے : عزرا ایل۔ سا ایس وغیرہ)

۳۔ دھ۔ ڈھ۔ رھ۔ ڑھ، کو لکھنے میں ہاے مخلوط کو اصل حرف سے ملا کر لکھا جائے: یعنی دھ۔ ڑھ۔ اور اصل حرف کی مثل انھیں بھی حرفِ منفصل قرار دیا جائے اور دو چشمی ھ کو لفظ کے دوسرے ٹکڑوں سے ملانے کی بجاے حسبِ ذیل طریق پر لکھا جائے :۔

دھ ن (بجائے دھن) دھ رتی (بجائے دھرتی) پڑھ نا (بجائے پڑھنا)۔

[حرف ی اور نون غنہ کے متعلق کمیٹی کی پہلی تجاویز مسترد کر دی گئیں اور قرار پایا کہ ان کی موجودہ کتابت جو انجمنِ ترقیِ اردو نے اختیار کی ہو، برقرار رکھی جائے]

۴۔ عربی کے حرف اِن، مِن وغیرہ علاحدہ لکھے جائیں، جیسے : اِن شاء اللہ، لیکن آگے عربی ضمیر آنے کی صورت میں ملا کر تحریر ہوں۔ جیسے : عنہم۔ منہم۔

۵۔ عربی حرفِ تعریف ال کا الف یا لام جہاں ساکت ہوں وہاں اُن کے اوپر چھوٹا خط بنا دیا جائے۔ جیسے : السلام اور علیکم السلام وغیرہ۔

۶۔ عربی ناموں اور عام الفاظ میں الفِ مقصورہ کی بجائے پورا الف لکھا جائے جیسے: ابراہیم۔ سلیمان۔ حیات۔ ربا اور اعلا۔ ادنا۔ مولانا وغیرہ۔

۷۔ غیر زبان کے الفاظ کو الگ الگ ٹکڑوں میں لکھا جائے۔ جیسے: اِلس پک ٹر۔ ڈاک ٹر۔ یونی ورسٹی۔ اِنس ٹی ٹیوٹ۔ ڈپارٹ منٹ۔ وغیرہ۔ لیکن حروفِ متصل جب شروع میں آئیں تو ایک رُکن ہونے کے باوجود انھیں جُدا نہ لکھا جائے۔ (جیسے بستر کا میم ہے)

۸۔ صرف ابتدائی تعلیم کی حد تک کمیٹی نے یہ تجویز بھی قبول کی کہ علاماتِ مصدر یا ماضی و حال، اصل مادے سے جُدا لکھے جائیں، جیسے: لکھ نا۔ لکھ تے۔ سمجھ نا وغیرہ۔

(ب) دوسرے یہ کہ ان ابتدائی کتابوں میں ہر لفظ کے ایک ایک رُکن کو جُدا کرکے لکھا جائے۔ لیکن شروع میں حرفِ متصل ہو تو اسے ملاکر ہی لکھا جائے گا۔ جیسے: مُصی بت، قری نہ۔ وغیرہ الفاظ میں۔

۹۔ ایک اہم تجویز یہ منظور ہوئی کہ اعرابی یٔ کو الف اور واو کی مثل حرفِ منفصل قرار دیا جائے اور اس کی مجہول، معروف اور ماقبل مفتوح شکلوں کی کتابت وہی رہے جو انجمن نے اختیار کر رکھی ہے۔ جیسے:۔

بےر (مشہور پھل) بی ر (بمعنی بھائی) اور بَیر (بمعنی دشمنی)

۱۰۔ ایک اور اہم قرارداد یہ پیش کی گئی کہ اصل تجاویز (مرتبہ راقم الحروف) کی دفعہ ۵ کو از سرِ نو رائے کے لیے اخبار ہماری زبان میں شائع کیا جائے کیوں کہ کمیٹی کی رائے میں اس قسم کی اِصلاح ضرور ہوتی جاتی ہے۔ یہ تجویز حسبِ ذیل ہے:۔

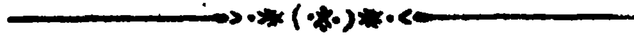
عربی کے ہم آواز حرُوف جن کی تین اور چار شکلیں آتی ہیں، ان کو اُردو تحریر میں گھٹاکر صرف دو شکلوں پر اکتفا کرنا جائز قرار دیا جائے۔ یعنی:

ث۔س۔ص میں سے ص کو، اور ز۔ذ۔ض۔ظ میں سے ض اور ز کو حذف کردیا جائے یا جو لوگ ان کی بجائے س اور ذ، ظ

سے کام لیں ان پر حرف گیری نہ کی جائے۔ ایسے حروف کی باقی تین قسمیں یعنی ذ ا ۔ ع، ت ۔ ط اور ح ۔ ہ، بہ دستور رہیں گی۔

اس آخری تجویز کی نسبت ہماری استدعا ہے کہ ناظرینِ اخبار اور دیگر اہل الرائے حضرات ہمیں اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔

سیّد ہاشمی فریدآبادی



سہ ماہی تبصرہ

ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ میں اردو

(جناب حیات اللہ انصاری صاحب)

رومن رسم الخط

اگر آج کل آپ ہمارے صوبے کے دیہاتوں میں گشت کریں تو ایک انوکھی بات نظر آئے گی۔ فوج کے جو سپاہی چھٹی لےکر آئے ہیں وہ اپنے گھروں کے سامنے کھٹیا ڈالے، دھوپ میں بیٹھے کوئی پرچہ یا کتاب پڑھ رہے ہیں۔ کتاب دیکھیے تو انگریزی میں ہے۔

شام کو جب دو چار تھکے ماندے لوگ الاؤ کے گرد اکٹھا ہوجاتے ہیں تو سپاہی اپنی کتاب زور زور سے پڑھتا ہے۔ سب سنتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں۔ کتاب کا رسم الخط تو انگریزی ہے، مگر زبان وہی جو ہم سب بولتے ہیں۔

کتاب کی زبان خاصی صاف ہوتی ہے۔ نہ تو اس میں سنسکرت کے نامانوس الفاظ ہیں۔ نہ انگریزی کی اجنبی اصطلاحات اور نہ ویسے عجیب و غریب الفاظ جیسے پچھلی لڑائی میں چل نکلے تھے مثلاً محاذ کے لیے "لام"۔ اسی کتاب میں فارسی کے رائج الفاظ مثلاً میدان، کشتی، روشن وغیرہ وغیرہ قدم قدم پر ملتے ہیں۔

رومن رسم الخط میں اردو زبان کا چرچا فوج میں کئی برس سے ہے۔ اب تو بعض دفتروں کے

کاروبار بھی اسی میں ہوتے ہیں۔ انگریز افسر اسی زبان میں حکم لکھتے ہیں۔ ماتحت افسر ضروری ہدایات دیتے ہیں۔ اطلاعات کی تختی پر اسی زبان میں اطلاع چھپاں کی جاتی ہو ان کو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پورب، پچھم، اُتر اور دکھن سب جگہ کے باشندے پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔

انگریز افسروں کو اپنی ترقی کے لیے یہ زبان سیکھنا پڑتی ہو۔ معمولی سپاہیوں کو بھی اس کی تعلیم دی جاتی ہو۔ فوج میں گشتی لائبریریاں ہیں جن میں اخبار، پرچے، کتابیں اسی خط اور اسی زبان میں چھپی ہوئی آتی ہیں۔ سپاہی ان کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ بعض بعض کتابوں کی بھو بھو کاپیاں ہیں اس پر بھی وہ لائبریری میں نظر نہیں آتی ہیں۔

رومن رسم الخط میں اُردو کا چھپنا کوئی نئی بات نہیں ہو۔ اب سے پچھتر برس پہلے ۱۸۶۹ء میں اُردو کی ۱۴۶ کتابیں چھپی تھیں جن میں سے بھو رومن میں تھیں۔ مشن والے جن کو عیسائی بناتے تھے ان کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ پڑھنے والوں کو رسم الخط آجاتا تھا۔ زبان نہیں آتی تھی اس لیے ان کے لیے رومن رسم الخط میں کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔

رومن رسم الخط سے ایک طرح کا فائدہ ہی پہنچے گا۔ وہ یہ کہ کئی لاکھ ہندستانیوں کو اس بات کا احساس ہوجائے گا کہ صرف ایک زبان ہو جس میں ہم سب ہندو مسلمان، سکھ عیسائی تبادلۂ خیالات کرسکتے ہیں اور وہ ہو اُردو۔

صحافت

ممالک متحدہ سے نکلنے والے اخباروں، پرچوں اور رسالوں کی تعداد حسب ذیل ہو :۔

(۱) روزانہ	۹	(۶) سہ ماہی	۱۴
(۲) سہ روزہ	۷	(۷) چوماہی	۴
(۳) ہفتہ وار	۱۵۱	(۸) شش ماہی	۷
(۴) پندرہ روزہ	۱۲	(۹) سالانہ	۴
(۵) ماہ وار	۴۵	میزان	۲۵۳

ہفتہ وار سب سے بڑی تعداد ہفتہ وار پرچوں کی ہو۔ سوائے مسوری، ہردوار اور الموڑے کے کوئی قابل ذکر جگہ ایسی نہیں ہو جہاں سے کوئی پرچہ نہ نکلتا ہو۔ ان میں سے تین 'الیمت'، ٹانڈہ (فیض آباد)، 'الہدی' سنبھل (مراد آباد) اور 'پنچ بہادر' سنبھل (مراد آباد) قصبوں سے نکلتے ہیں۔ پندرہ مقامات ایسے ہیں جہاں سے ۴ سے زائد پرچے نکلتے ہیں۔ ان میں سے علی گڑھ، فیض آباد، گورکھ پور، میرٹھ، مظفرنگر، شاہ جہاں پور سے چھ چھ، لکھنؤ سے سات، آگرہ و بداؤں سے آٹھ آٹھ، بریلی سے نو اور کان پور سے چودہ نکلتے ہیں۔

پابندی کان پور سے سب سے زائد پرچے نکلتے ہیں، اور سب مقاموں سے زیادہ پابندی سے نکلتے ہیں۔ اس کے بعد پھر جن ضلعوں سے ایک ایک یا دو دو پرچے نکلتے ہیں۔ ایسے پرچوں کی تعداد ۲۹ ہو۔ 'پیارا' دیال باغ (آگرہ)' پریم پرچارک' (آگرہ) 'کانفرنس گزٹ' (علی گڑھ) 'غنچہ' (بجنور)' ذوالقرنین' (بدایوں)' البشیر' (اٹاوہ)' دیہی گزٹ' (فیض آباد) 'مستقبل' (جون پور) 'صدق' (لکھنؤ) وغیرہ ۱۷-۱۸ پرچے ایسے ہیں جو بہت زمانے سے پابندی سے نکل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ جو پرچے ہیں وہ غیر پابندی کا شکار ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ ہفتے کا غوطہ مار جاتے ہیں۔ کبھی مہینوں کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جہاں سے تین یا چار یا اس سے زیادہ پرچے نکلتے ہیں اگر وہاں کا اوسط لیا جائے تو پچھتر فی صدی پرچے ضرور نکلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی سو فی صدی بھی ہو جاتے ہیں۔

کاغذ کی کم یابی کاغذ کی کم یابی نے ہفتہ وار پرچوں پر بہت ناگوار اثر ڈالا ہو۔ پرچوں کی بڑی تعداد ایسی ہو جن کا کاغذ، سائز اور صفحات پہلے ہی اچھے نہ تھے۔ اب اس کم یابی نے تو ان کی کمر اور توڑ دی ہو۔ بعض پرچے تو ایسے ہیں جو گھٹ کر چھوٹے سائز کے صرف چار صفحات کے رہ گئے ہیں۔ جو اخبارات بہت پابندی سے نکلتے تھے کاغذ کی فراہمی کی دشواریوں کی وجہ سے وہ بھی کبھی کبھی غوطہ لگا جاتے ہیں۔

لکھائی چھپائی جن پرچوں کے صفحات اور سائز بہت حقیر ہو گئے ہیں اگر وہ لکھائی اور چھپائی

میں ترقی کرلیتے تو بات بنم جاتی ۔ لیکن اس میں جیسے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں ۔اگر پریسوں کی تعداد دیکھو تو اس صوبے میں بہت بڑی ہی۔ مگر کام کے لحاظ سے سب ناقص ہیں۔ اچھے کاتب اور اچھے پریس صرف الہ آباد اور لکھنؤ میں پائے جاتے ہیں۔ یا اب کچھ کان پور میں پیدا ہوگئے ہیں۔ مگر وہ بھی بہت اعلیٰ پایے کے نہیں ہیں ۔ لکھائی میں تمام حروف کی یکسانی اور چھپائی میں حروف کے خط و خال کا برقرار رہنا اور کاغذ کے سادے حصّے پر پرچھائیں نہ ملانا یہ چیزیں یہاں نایاب نہیں تو بہت کم یاب ضرور ہیں ۔ محکمۂ اطلاعاتِ عامہ کے پمفلٹ اور انڈین پریس کا رسالہ 'ہل' کاغذ اور لکھائی چھپائی کے اعتبار سے یہاں کی بہترین پیداوار ہیں۔ ہاں ایک جگہ ہی جو ان تمام نقائص سے بَری ہی اور جہاں کا معیار بہت بلند ہی، وہ ہی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۔مگر وہ ایک جزیرے کی طرح ہی۔ جس کا یہاں کی آب و ہوا سے کوئی تعلق نہیں ۔

بعض عمدہ عمدہ پرچے اچھی لکھائی اور چھپائی کی نایابی کی وجہ سے ترقی نہیں کرسکے ہیں ۔اگر اٹاوہ میں عمدہ لکھائی چھپائی ممکن ہوتی تو 'البشیر' کی اشاعت بہت زیادہ ہوتی ۔

آمدنی ہمارے صوبے میں ایسے تجارتی کارخانے بہت کم ہیں جو اچھے پیمانے پر اشتہار بازی کرتے ہوں ۔ صرف کان پور میں کچھ ایسے کارخانے ہیں ۔اس وجہ سے وہاں سے نکلنے والے پرچوں کی حالت اچھی ہی۔ باقی مقاموں سے نکلنے والے پرچوں کی آمدنی کا سہارا سمن ہوتے ہیں۔ یا پھر وہ خریدار جن کو مقامی حالات سے دل چسپی ہوتی ہی۔

حق تلفی میرے سامنے اس وقت ۳۰ر نومبر کا 'لیڈر' ہی۔ اس میں اُردو کے سات سمن بہت بھدّے ٹائپ میں چھپے ہوئے ہیں۔ کم وبیش اتنی ہی تعداد سمنوں کی اس میں روزانہ ہوتی ہی۔ 'پانیر' میں بھی اُردو کے سمن اتنے ہی نظر آتے ہیں ۔ مدعا علیہ کے نام پیشہ اور سکونت دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہی کہ ان کے عزیزوں اور دوستوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو ان انگریزی اخباروں سے دل چسپی ہو ۔اگر یہ سمن اُردو پرچوں کو جو ان کے جائز حق دار ہیں' مل جائیں تو ان کا سال بھر کا کاغذ نکل آئے ۔

صحافت

بعض پرچوں کی صحافت کا معیار بلند ہے۔ جنگ کے چھڑ جانے سے لوگوں کو خبروں سے اور بین الاقوامی مسائل سے دل چسپی بڑھ گئی ہے۔ اس وقت کوئی ہفتہ وار پرچہ اٹھاکر دیکھیے اس میں فاسسٹزم اور ناسی ازم، جاپان کی جنگی حکومت، بحری و بری ہوائی طاقت، اٹلی اور روس کی سرحد کی میدانی وادیوں اور عراق، مصر، ترکی کی اسلامی حکومتوں پر، اور اس کے ساتھ ساتھ آب دوز کشتیوں اور انتقالِ خون سے علاج پر اچھے اچھے مضامین نظر آئیں گے۔ چند سال ادھر سے اگر موازنہ کیجیے تو ان کی صحافت میں زیادہ روانی چستی ہوگی اور بانکے دار ملے گی۔

ان خوبیوں پر بھی یہ پرچے صحافتی کم زوریوں سے مبرّا نہیں۔ سمن اور مقامی خریداروں کی مدد سے یہ خود کفیل ہوجاتے ہیں۔ یہی زمین کسی پرچے کی نشوونما کے لیے بہت اچھی ہونا چاہیے۔ لیکن اس پر بھی وہ اپنے ضلعوں میں گہری جگہ نہیں پیدا کرپاتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ مقامی لوگوں کے توقعات سے پیچھے رہتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ پڑھنے والوں کو اخبار کا چسکا کیسے لگادیں اور جو لوگ خریدار بن سکتے ہیں ان کو کیسے راغب کرلیں۔ ایک ضلع کی مثال میرے سامنے ہے۔ وہاں ہوا دنگل۔ چوں کہ یہ جنگی فنڈ کے لیے تھا اس لیے ادنیٰ اعلیٰ سب نے اس میں دل چسپی لی۔ اب مقامی اخبار کا یہ کام تھا کہ وہ دنگل سے پہلے شریک ہونے والے پہلوانوں کی تھوڑی تھوڑی سوانح عمری دیتا۔ ہندستان میں اس فن کی ترقی یا تنزلی پر ایک مزے دار مضمون لکھتا۔ اس سلسلے میں دو ایک لطیفے کہاوتیں اور مشہور باتیں لکھتا۔ دنگل کے بعد کشتیوں پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کرتا۔ اس میں سے دو ایک چھوٹی موٹی باتیں چٹ پٹے انداز سے بیان کرتا۔ مگر اس طرح کہ واقعہ نہ بگڑنے پاتا۔ اس کے لیے کسی اکھاڑے میں جبیں سائی کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ واقف کاروں سے بات چیت اور گہرا مشاہدہ کافی ہوتا۔ لیکن مقامی پرچے میں انتظام کی تعریفوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر ہمارے پرچے ایسی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگیں تو مقامی زندگی کا جز بن جائیں۔

صحافت کے اعتبار سے صدق لکھنؤ بہت عمدہ پرچہ ہے۔ ہر بات میں لذت، باتوں باتوں میں بات، حریف کے زبردست وار کو مسکراکر خالی دے جانا، اس کے مضبوط پہلو کو بتاکر کم زور

پہلو پر ہاتھ ماردینا، سنجیدہ بحثوں میں لطیف متانت، یکسانیت ضرور ہوتی ہو مگر 'صدق' یک قلمی پرچہ ہو اور یک قلمی پرچے میں یہ بات ہوتی ہی ہو۔ اس کی صحافی ٹکنیک کا مطالعہ بہت سے پرچوں کے لیے مفید ہوسکتا ہو۔

پرچوں کی دوسری خصوصیتیں ان پرچوں میں کچھ مخصوص فنی یا صنعتی پرچے بھی ہیں۔ مثلاً 'پیارا دیال باغ' اور 'پریم پرچارک' ست سنگیوں کا اخبار ہو جو صنعت وحرفت کی ترقی چاہتا ہو۔ 'مارکٹ رپوٹ' کان پور نیم کاروباری پرچہ ہو۔ 'پنچایت' بارہ بنکی، 'دیہی گزٹ' فیض آباد دیہاتی زندگی اور کاشت کاری سے متعلق ہیں۔ 'کایستھ ہتھکاری' فیض آباد، 'سناتن' سلطان پور اور 'ودیارتھی' سلطان پور اپنی عبارت میں سنسکرت کی چاشنی دیتے ہیں۔ مگران کے نامانوس الفاظ ماسبق اور ماحق سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ 'پنچ بہادر' سنبھل اور 'مذاق' مرزاپور مزاحیہ رنگ میں رہنا چاہتے ہیں۔ 'مستورات' مظفرنگر زنانہ پرچہ ہو۔ اسی طرح مختلف خصوصیتوں کے پرچے نکلتے ہیں۔

روزنامے روزنامے حسب ذیل ہیں:-

(۱)	اودھ اخبار	لکھنؤ	(۶)	ڈیلی رپوٹ	علی گڑھ
(۲)	حقیقت	"	(۷)	ویاپار ہاپڑ	(ہاپڑ) میرٹھ
(۳)	ہمدم	"	(۸)	ویاپار سماچار	"
(۴)	سرفراز	"	(۹)	عادل	رام پور
(۵)	حق	"			

خبریں اور وقت ان میں سے کوئی اخبار ایسا نہیں ہو جو اپنے یہاں آنے والے یا نکلنے والے انگریزی اخبار کے ساتھ نکلتا ہو۔ اگر کوئی اخبار ایسا ہوتا تو وہ انگریزی اخباروں کے خریدار بنالیتا اور بہت ترقی کرجاتا۔ دوسری کمزوری یہ ہو کہ ان کی چھپائی کا انتظام بہت خراب ہو اسی وجہ سے تصویریں یا کارٹون نہیں بن سکتے ہیں۔ کہیں کہیں چھپائی تو ایسی خراب ہوتی ہو کہ پڑھنا مشکل ہوجاتا ہو۔

آمدنی

اخبارات کی اصل آمدنی اشتہارات سے ہوتی ہے۔ جن مقاموں میں اشتہارات ملتے ہیں جیسے کہ کلکتہ، بمبئی یا لاہور وہاں اخبارات بہت جلد پنپ جاتے ہیں۔ ہمارے صوبے میں اشتہار دینے والے کارخانے بہت کم ہیں۔ انگریزی یا ہندی اخبار جن کے پاس سرمایہ کافی ہوتا ہے وہ بمبئی، کلکتہ اور لاہور میں اپنے مستقل ایجنٹ رکھتے ہیں جو ان کے لیے اشتہارات فراہم کرتے ہیں۔ اُردو اخباروں میں سے کسی کے پاس اتنا سرمایہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی آمدنی بہت کم ہے۔ وہ پریس کی بڑی چکردار مشین بھی نہیں خرید سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اور بُرا ہوتا ہے۔ ان کی وجاہت کم ہوجاتی ہے، وقعت گھٹ جاتی ہے۔ جس کا اثر خریداروں اور اشتہار دینے والوں پر پڑتا ہے۔ یہ بھی شکایت سُننے میں آئی ہے کہ یوپی کے بڑے کارخانوں کے اشتہارات کے منیجر فرقہ واری ذہنیت رکھتے ہیں اور اُردو کی راہ میں رُکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اودھ اخبار

اودھ اخبار ایک ایسا اخبار ہے جس کے پاس سرمایے کی کوئی کمی نہیں۔ یہ منشی نول کشور آں جہانی کا قائم کیا ہوا اخبار ہے۔ اور اُنھی کی وصیت کے مطابق جاری ہے۔ اسی اخبار نے منشی نول کشور کے پریس کو شہرت اور عزت بخشی تھی۔ یہ پریس آج بھی بہت بڑا پریس اور اشاعت گھر ہے۔ لیکن اس کا اخبار کیا خبروں میں، کیا صحافت میں اور کیا لکھائی چھپائی میں ہر چیز میں سب اخباروں سے پیچھے ہے۔

صحافت

سب اخبار کسی نہ کسی سیاسی حلقے کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور اس میں کافی صحافی خوبی دکھلاتے ہیں۔ 'حقیقت' ذرا وسیع المشرب اخبار ہے۔ اس کی مخالفت میں بھی موافقت کا پہلو رہتا ہے۔ 'ہم دم' اپنی نوعیت کا ایک اخبار ہے۔ وہ عام لوگوں کو خوش رکھنے کے لیے عامیانہ رنگ پر چلتا ہے، اور کام یاب ہوتا ہے۔ اس کے تمام تصور ایک طرف اور یہ خوبی ایک طرف کہ یہی اخبار ہے جس نے عام لوگوں کو ایک بار پھر اخبار پڑھنے کا چسکا لگا دیا۔ کاش کوئی اخبار ایسا ہوتا جو اس چسکے کے ساتھ ساتھ سیاسی اور علمی چسکا بھی لگا دیتا ہے۔

آج کل ان اخباروں کا معیار پہلے سے کافی اونچا ہوگیا ہے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی نوٹ بین الاقوامی

سیاست پر ہوتا ہی۔ جس میں روانی، پھرتی اور مضبوطی ہوتی ہی۔ اپنے سیاسی حلقوں کی زندگی کے اب وہ نیا رُخ دیکھنے لگے ہیں۔ بیچ بیچ میں تھکاوٹ آجاتی ہی مگر پھر جب سیاست میں کوئی تازہ شگوفہ کھلتا ہی تو چلت پھرت نظر آنے لگتی ہی۔ اگر کہیں ان اخباروں میں تنوّع، بیان میں لذت بخش، میں چاشنی اور میٹھی ظرافت اور آجائے تو ان کا درجہ بہت بلند ہوجائے۔ ان کی خاص کمزوری یہ ہی کہ ان میں سے ہر ایک قریب قریب یک قلمی ہی۔ ہفتہ وار میں تو یہ بات بنھ جاتی ہی۔ لیکن روزانہ ایک شخص کے منھ سے ایک ہی لہجے اور ایک ہی انداز میں تمام خبریں اور رائے سُننا تھکا دیتا ہی۔ اگر یہ اپنی ان چند صحافی کمزوریوں کو دور کرلیں، لکھائی و چھپائی کی طرف توجہ کریں، تصویروں اور کارٹونوں کو جگہ دیں اور انگریزی اخبار کے ساتھ لگالیں تو ہر ایک کی اشاعت کم ازکم چوگنی ہوجائے

سہ روزہ اخبار سہ روزہ اخبار حسبِ ذیل ہیں:۔
"المشرق" الہ آباد۔ "مشعل" بریلی، "مدینہ" بجنور، "دجیت" جون پور، "وسیقہ دار" لکھنؤ، "جدت" مراد آباد، "پیامِ اسلام" لکھنؤ۔

ان میں سے قابلِ ذکر "مدینہ" ہی۔ اس میں سہ روزہ اخبار کی پوری شان ہی۔ گھڑی کی ایسی پابندی، عمدہ لکھائی چھپائی، جیسا موقع ویسے مضامین، دل چسپ بحثیں، ظرافت کا کالم، دہلی کی قربت سے اشتہارات آسانی سے فراہم ہوجاتے ہیں اور آمدنی کی طرف سے وہ بے فکر ہی۔ مزید ترقی کی گنجایش ہر چیز میں ہوتی ہی، اس میں بھی ہی۔ زندگی کے ایسے شعبے بھی ہیں جہاں تک اس کا قلم نہیں پہنچتا ہی۔ عبارت کچھ پھچے دار ہوتی ہی جس کا اب زمانہ نہیں رہا۔ ظرافت اگر دو ٹوک ہو تو اس پر باڑھ آجائے۔ اور اگر اشتہارات میں دواؤں کی تعریف کنایوں میں ہوا کرے تو اور بھی اچھا ہو۔

پندرہ روزہ اخبار تعداد میں پندرہ ہیں۔ یہ اپنی شکل و صورت اور خصوصیات میں ہفتہ وار اخباروں سے مختلف نہیں ہیں۔ ان میں "کاکوری" اخبار اپنی نوعیت کا ایک ہی۔ پندرہ برسوں سے نہایت پابندی سے نکل رہا ہی۔ قصبے کے شرفا کے حالات و خبریں چھاپتا

ہے اور صرف انھی کے چندے سے چلتا ہے۔

سالانہ و شش ماہی چھماہی و سہ ماہی رسالے

۲۹ ہیں۔ ان میں سے بیس اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں۔ باقی میں سے دو سہ ماہی 'نیسان' الہ آباد اور 'بہارستان' آگرہ ادبی رسالے ہیں، دو مذہبی ہیں۔ باقی آدھے ادبی اور آدھے کسی اور سے ... کی پھیلت۔ ان میں سب سے امید افزا 'نیسان' ہے۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی بہت اچھی۔ لیکن ابھی اس کی رفتار دیکھیے۔

اسکولوں اور کالجوں کے میگزینوں میں سے سات ہندو کالجوں اور اسکولوں سے نکلتے ہیں۔ طالب علموں کے میگزین ہیں، اچھے ہوتے ہیں۔ ہم کو لکھنؤ یونی ورسٹی والوں سے کچھ کہنا ہے۔ ان کا میگزین کسی طرح لکھنؤ کے ادبی روایات کے شایانِ شان نہیں۔ مسلم یونی ورسٹی والوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ جتنی توقع دلاتے ہیں اس کو نباہتے کیوں نہیں؟

ماہوار رسالے

ان میں سے 'زمانہ'، 'معارف' اور 'نگار' بہت مشہور اور کُل ہند رسالے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی روایات ہیں اور اپنا مخصوص کردار۔ ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں اُردو کی بہت خدمتیں کی ہیں۔ زمانہ بہت پُرانا رسالہ ہے اور بہت خلوص سے اُردو کی خدمت کرتا ہے۔ اچھا کاغذ اچھی لکھائی چھپائی۔ دو ایک تصویریں، شایستہ مضامین جن میں تنوع اور ضرورت کا لحاظ، سارے میں احتیاط، پُرانے رنگ کے نباہنے میں وضع داری، نئے چلنوں کو انداز کرجانا۔ 'معارف' کا کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی۔ بہت سنجیدہ اور ثقہ پرچہ ہے۔ ہر بات میں عالمانہ شان، تنقیدوں میں علامہ شبلی کا انداز، علم و ادب کو مذہب کی کسوٹی پر نزاکت سے پرکھنا، اگر آگے نہ بڑھنا تو پیچھے بھی نہ ہٹنا۔ نگار ادبی پرچہ ہے۔ اُردو، فارسی اور کبھی کبھی عربی شعرا پر نیم معلوماتی اور نیم تنقیدی سیرِ حاصل بحثیں۔ انداز دل چسپ، ترتیب مزے دار، اداریے کا انداز اور بانکپن چسکا لگا دینے والا۔ وہ موضوع جن پر ابھی تک اُردو میں بہت کم لکھا گیا ہے، ڈھونڈ نکالنا اور اس پر اچھا مضمون دے دینا۔ یہ تینوں رسالے ایسے ہیں، جن کے

بارے میں صرف اتنا کہ دینا کافی ہے کہ ہمارے صوبے کی بہترین پیداوار ہیں۔

'ہل' الہ آباد وضع قطع چوٹی کے رسالوں کی ہوتی ہے۔ مضمون کے بیچ بیچ میں تصویریں، بہت عمدہ سرورق، دہات سدھار کے ہر ممکن پہلو کو گرفت میں لاتا ہے۔ ساتھ ساتھ ضروری معلومات بھی۔ بیج، ہل، آلات سے لے کر ٹینک اور گیس کی لڑائی تک ہر چیز پر مضمون ہوتے ہیں۔ لکھنے والے متعدد ہیں اس لیے تنوع بھی ہوتا ہے۔ اگر ذرا ادبیت اور بڑھ جائے تو بہت پائے کا رسالہ بن جائے۔

'منزل' لکھنؤ ایک نیا رسالہ نکلا ہے۔ پہلے دو نمبروں سے تو نہیں، ہاں تیسرے نمبر سے "نیا ادب" کی جانشینی کر رہا ہے۔ یعنی بہ قول اس کے افتتاحیے کے اس اصول پر ادب کو لے جانا چاہتا ہے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ (اقبال)

خوش آمدید: مضامین اور اندازِ بیان کی جتنی وسعت ہو اتنی ہی زبان کی وسعت ہوگی۔

ایجوکیشنل گزٹ الہ آباد بہت پابندی سے نکلتا ہے۔ بنیادی تعلیم دینے والے مدرسوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ زبان آسان اور مضامین پُرمغز ہوتے ہیں۔

مختلف خصوصیتوں کے رسالے

دو رسالے 'ہیومیوپیتھک لیڈر' لکھنؤ اور 'ہیومیوپیتھک جرنل' کان پور ہیومیوپیتھک کے اچھے رسالے ہیں۔ زبان اچھی ہوتی ہے لیکن اصطلاحیں اکثر انگریزی ہی کی رہتی ہیں۔ 'اُردو لا رپورٹ' ٹھیٹھ قانونی رسالہ ہے۔ 'حریم' لکھنؤ اور 'ضیا' لکھنؤ زنانے رسالے ہیں۔ 'چترگپتا سندیش' علی گڑھ، 'مان سرور' الہ آباد، 'سکسینہ سماچار' بریلی، 'نگم کایستھ پتریکا' کان پور، 'قنوج سماچار'، 'بھٹناگر سماچار' میرٹھ ہندی کی خو بو رکھتے ہیں۔ 'فلستان' لکھنؤ حال ہی میں ایک فلمی رسالہ لکھنؤ سے نکلا ہے۔ مذہبی رسالے بھی متعدد ہیں جیسے کہ 'الفرقان' بریلی، 'شبستانِ شریعت' کان پور، 'روحانی عالم' مراد آباد، 'المبلغ' مظفر نگر، 'النور' مظفر نگر۔

ماہواری رسائل کی تعداد ۴۷ ہی۔ مگر ان کا دو تہائی حصّہ غیر پابندی کا شکار ہی۔ ایک چوتھائی ایسے ہیں جو شکل و صورت میں اور اپنی خصوصیات میں ہفتہ وار پرچوں سے ملتے ہیں۔

صحافت مجموعی طور پر جب سے لڑائی چھڑی ہی، کاغذ کی کم یابی سے اُردو صحافت کو جو مرحلے کی کمی کا شکار تھی اور کاغذ جمع نہ کر سکی سخت دھکا پہنچا ہی۔ لیکن کاروبار چل نکلنے سے خریدار بڑھ گئے دوسری طرف موضوع، مواد اور لکھنے والوں کی فراوانی ہوگئی۔ اس سے اردو صحافت اک دم سے چمک گئی۔ بہت سی سیاسی اور اقتصادی اصطلاحیں، نئے خیالات کے لیے نئی بندشیں اور ترکیبیں چند سال ادھر سے داخل ہوئی تھیں وہ ہزاروں طرح سے استعمال ہوتے ہوتے صحافی زبان میں ہضم ہوگئیں۔ ہر ڈھنگ کی عبارت نے ان کے لیے جگہ نکال لی۔ صحافی جدتوں میں تیزی، روانی اور ہمواری آگئی ہی۔ نئی ملکی فضا نے ان لوگوں کو جو گوشہ نشین ہوگئے تھے، ان کو پھر بلا لیا۔ جو کم لکھتے تھے اب زیادہ لکھنے لگے۔ جو لوگ ابھی تک ملکی اور قومی مسائل سے ادب کو دور رکھتے تھے وہ بھی اس راہ پر گامزن ہوگئے۔ اس سلسلے میں جگر مرادآبادی کی نظم "بنگال" خاص طور پر قابلِ ذکر ہی۔ غزل کا یہ بادشاہ اپنے شبستانِ عشق و تصوف سے نکل کر ملکی و قومی مسائل کے میدان میں بھی آگیا ہی۔

ہندوؤں کا حصّہ زبان کو مذہب کے ترازو پر تولنا بڑی بھاری غلطی ہی۔ مگر حریفوں کو حقیقت دکھانے کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہی۔ جو لوگ اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے صوبے میں ۹۶ پرچوں اخباروں اور رسالوں کی ادارت ہندو صاحبان کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

	سالانہ	ششماہی	سہ ماہی	ماہانہ	ماہوار	پندرہ روزہ	ہفتہ وار	سہ روزہ	روزانہ
ہندو اڈیٹر	۳	۵	۳	۶	۱۷	۵	۵۲	۱	۴
مسلمان اڈیٹر	۱	۱	۱	۸	۲۸	۱۰	۱۹۹	۶	۵

ایک اڈیٹر عیسائی بھی ہو۔ عیسائیوں کی تعداد دیکھتے ہوئے یہ نمایندگی ناکافی نہیں ہو۔

خبروں کی ایجنسیاں صحافت کے سلسلے میں ایک چیز اور قابلِ ذکر ہو۔ خبروں کی دو ایجنسیاں بھی ہیں جو اُردو میں اخباروں کو خبریں فراہم کرتی ہیں۔ ان ڈپی پن ڈنٹ نیوز سروس لکھنؤ (ا۔ن۔س لکھنؤ) اور مسلم نیوز سروس لکھنؤ (م۔ن۔س لکھنؤ) پہلی اپنی خبروں میں ممتاز ہو اور دوسری زبان اور بیان میں۔

اشاعت گھر

دو تین سال ادھر کی بات ہو کہ ہندی کے پرستاروں کی یہ آوازیں سُننے میں آرہی تھیں کہ وہ چار سال اور گزرنے دو پھر یوپی سے اُردو کا جنازہ نکل جائے گا۔ ایسی پیشین گوئی کی جرأت یوں پڑی کہ یوپی میں اُردو کتابوں کا چھپنا کم ہوتے ہوتے برائے نام رہ گیا۔ وہ سمجھے کہ یہ نتیجہ ہو ہماری ہندی تحریک کا۔ پھر تو نئے حملوں کے نقشے بننے لگے۔ پُورب کے اضلاع میں تو ہندی بولی ہی جاتی ہو۔ اگر کچھ دِنوں ہم ہندی کی عام پسند کتابیں سستے داموں فروخت کرتے رہیں۔ اور ہندی پڑھنے میں سہولتیں ہیا کرتے رہیں تو ادھر سو فی صدی ہندی زبان اور خط کا رِواج ہو جائے گا۔ یہی حال ہوگا یوپی کے پچھم کے اور وسطی اضلاع کا۔ یہ صرف چند سال کی بات ہو۔ پھر تو اُردو صرف لکھنؤ، وغیرہ چند شہروں میں رہ جائے گی۔

یہ نقشے جن لوگوں نے بنائے تھے انھوں نے عملی تدابیر کیا اختیار کیں یہ تو معلوم نہیں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ گیتا پریس گورکھ پور اور ساہتہ پریس الہ آباد کئی سال سے ردّی کے بھاؤ عمدہ مجلد کتابیں فروخت کر رہے ہیں۔ اور بعض ہندی کی انجمنوں نے مشنری اسپرٹ سے دیہاتوں میں ہندی چلانے کی دو ایک کوششیں کیں۔

یہ درست ہو کہ بیس پچیس سال ادھر یوپی اُردو کا مرکز تھا۔ ناولیں، کتابیں، اخبار و رسائل سب سے زیادہ یہیں سے نکلتے تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہو کہ سب پُرانے اشاعت گھر اب خاموش ہیں، مگر

اس کے اسباب سو فی صدی وہ نہیں ہیں جو ہمارے بھولے دوست سمجھتے ہیں۔ ان کا آرزو مندانہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اس بات کے ثبوت میں ہم آپ کے سامنے چند ٹھوس ماثلات رکھتے ہیں۔

(۱) یوپی میں صرف وہی فلم کامیاب ہو سکتا ہے جس کی زبان اُردو ہو۔

(۲) کسی شہر یا قصبے میں جاکر آپ دکان دار سے سودا چکائیے۔ وہ اُردو بولے گا۔ ہندی بہت ضروری چیز ہے مگر اتنی نہیں کہ اس کے کارن اپنے سب گاہک سوائے پنڈتوں کے چھوڑ دیے جائیں۔

(۳) جب ہندی سیکھنے میں مجھے دُشواری ہوئی تو میں نے اپنے اُستاد سے کہا زبان بول چال سے زیادہ آتی ہے، کوئی ایسا شہر بتلایئے جہاں صرف ہندی بولی جاتی ہو میں وہاں کچھ دنوں کے لیے چلا جاؤں۔ میرے اُستاد ہندی کے بڑے پرستار اور "لکھک" ہیں۔ مگر وہ ایسی کوئی جگہ نہ بتا سکے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہندی صرف تحریری زبان ہے۔

یوپی میں اشاعت گھروں کی خاموشی کے اسباب ہندی کے حملے کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔

بارہ سال ادھر کی بات ہے کہ ایک صاحب نے اپنے دوست کا دیوان چھپوایا۔ ان کا قول تھا کہ دیوان اچھا ہو یا بُرا بکتا ضرور ہے کیوں کہ کچھ لوگ ہیں جو دیوانوں کے دیوانے ہیں۔

مگر وہ دیوان بکا نہیں۔ لکھنؤ میں جو دیوانوں کے دیوانوں کا مرکز تھا صرف ۲۰ کاپیاں بکیں۔ اب ہوا بدل چکی تھی۔ نوجوان "بانگ درا"، "جذباتِ فطرت"، "دیوانِ غالب نیا اڈیشن" خریدتے تھے۔ پُرانے لوگ ان کتابوں کی مخالفت ضرور کرتے تھے مگر ان کو بھی اب پُرانی کتابوں میں مزا نہ ملتا تھا۔ دکانوں میں "طلسم ہوش رُبا" اور "بوستانِ خیال" کی جلدیں پڑے پڑے دیمک کی نذر ہو گئیں، سلیمانی پریس بنارس کی "کم سن بیوی مُسن شوہر" اور "مُسن بیوی کم سن شوہر"، "خنجرِ شباب"، اور "معشوقۂ فرانس" ردّی میں بک گئیں۔ اب صرف جاسوسی کی ناولیں اور رینالڈز کے ترجمے چلتے تھے۔ اشاعت گھروں نے پُرانی کتابوں کو صبر کیا اور ان کو چھاپنے لگے۔ "نیلی چھتری"، "بہرام کی گرفتاری"، "ظلمی برج"، "زرد گنبد" وغیرہ کتابیں چھپیں اور خوب بکیں۔ لیکن یہ کتابیں ابھی چھپ ہی رہی تھیں کہ رومانی افسانوں اور رومانی رسالوں کی

مانگ ہوگئی۔ ساتھ ساتھ عمدہ کاغذ کی اچھی لکھائی چھپائی کی باتصویر مجلد کتابیں آنے لگیں۔ دہلی اور پنجاب کے اشاعت گھر ایسے رسالے اور ایسی کتابیں لے کر آئے تھے اس لیے اُنھوں نے یہاں جگہ بھی بنالی۔ یوپی کے پرانے اشاعت گھر اپنے کو اس رنگ پر نہ ڈھال سکے۔ کیوں کہ ان کے لکھنے والے، ان کے بچے کھچے جاننے والے، ان کے کارندے اور مشینیں سب پرانی تھیں۔ ان کی دُکانیں بھی شہر کے پرانے حصوں میں تھیں۔ نئے کارخانے اور نئے خریداروں سے وہ بالکل ناواقف تھے۔

کچھ نئے اشاعت گھر اُٹھے اور نئے رسالے نکالے گئے۔ لیکن ان کو نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یوپی میں لاہور اور دہلی کی طرح اشتہار ملتے نہ تھے جو رسالے کو شان سے نکالا جاسکے۔ نئے طرز کے لکھنے والے ہندستان بھر میں بکھرے ہوئے تھے اور ان سے پنجاب اور دہلی کے اشاعت گھروں سے مراسم ہوچکے تھے۔ نئے اشاعت گھروں کو کتابوں اور رسالوں کے خریدار سے پہلے مخالف مل جاتے تھے۔ کیوں کہ یہ مقام پرانے مبصروں کا مرکز تھا۔ ان کو نئی چیزوں میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ جو مقام ادب کا مرکز تھے وہ اپنا پرانا ذوق کھوچکے اور نیا ذوق ابھی حاصل نہ کیا تھا۔ دوسرے مقام ابھی مرکز بنے نہ تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سو خریدار یہاں ہیں تو دو سو وہاں۔ کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں کام یاب دُکان رکھی جاسکے۔ چناں چہ اس دور کے سب سے بڑے اشاعت گھر اور کتاب کے ایجنٹ الناظر بک ڈپو لکھنؤ کی کہیں دُکان نہ تھی۔ اس انتشار کی حالت میں کسی نئے اشاعت گھر کا کام یاب ہونا بہت مشکل تھا۔ یہی حالت تھی کہ ذوق نے پھر پلٹا کھایا۔ ادب لطیف، ٹیگوریت، نیازیت رخصت ہوئی۔ ادب کا صحیح ذوق پیدا ہوچلا۔ نئے اشاعت گھر جو سسک سسک کر اس بیچ کے ذوق پر چل رہے تھے، بیٹھ گئے۔

جدید ذوق کے ساتھ یوپی میں کچھ خوش گوار چیزیں اور بھی آئیں۔ یونی ورسٹیوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اُردو آگئی، سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریاں کھلنے لگیں، لکھنؤ ادب کا مرکز پھر بننے لگا، جابجا شہروں میں ادبی کانفرنسیں ہونے لگیں، انجمنیں کھلنے لگیں، شاعروں میں جدید طرز کی شاعری سے پھر جان پڑگئی۔ جدید نظموں کی کتابوں کی مانگ پیدا ہوگئی۔ اس نئے دور کو خوش آمدید کہنے کو بہت سے

بے سہارے کے اشاعت گھر کھل گئے۔ بہت سے پرچے اور رسالے نکل آئے۔ ایک آدھ پُرانے اشاعت گھروں نے بھی پر پُرزے نکالے۔ مکتبۂ جامعہ کی لکھنؤ میں شاخ کھلی۔ بنارس اور الہ آباد میں کتابوں کی خوب صورت دُکانیں نظر آنے لگیں۔ لکھنؤ میں ایک نیا اشاعت گھر "دانش محل" کھلا۔ یہ سارا انقلاب [illegible] سے لے کر [illegible] تک کی بات ہے۔

اب یوپی میں اشاعت گھروں کے پنپنے کا میدان تیار ہوگیا ہے۔ یہاں ایک مخصوص ذوق پیدا ہوگیا ہے۔ علمی ادبی کتابوں اور رسالوں کی مختلف صنفوں کی مانگ پیدا ہوگئی ہے۔ کان پور کی ترقی سے امید ہوئی ہے کہ دو چار برس میں یہ مقام اشتہاروں کا بھی چھوٹا موٹا مرکز بن جائے۔ لکھنؤ اور کان پور ایسے مقامات ہوگئے ہیں جہاں دُکانیں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ جو ہوشیار موقع شناس اور ایمان دار اشاعت گھر ہوں گے، موقع سے فائدہ اُٹھا کر چمک جائیں گے۔ اور یوپی کے چہرے پر سے یہ کالا دھبا کہ یہاں کتابیں نہیں چھپتی ہیں، مٹا دیں گے۔

کتابیں

تبصرے کے لیے ہم صرف ان کتابوں کو لیتے ہیں جو تین مہینے کے اندر اندر چھپی ہیں۔ اسی طرح ہم ہر سہ ماہی کی کتابوں پر تبصرہ کرتے رہیں گے۔

فن	نام کتاب	مُصنّف	اشاعت گھر
مختصر افسانے			
	(۱) دھوپ چھانو	عبدالشکور ایم اے	دانش محل لکھنؤ
	(۲) نصیرالدین حیدر اور دوسرے افسانے	مجتبیٰ حسن جون پوری	صدیق بک ڈپو لکھنؤ
	(۳) حُسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے	نیاز فتح پوری	نگار لکھنؤ

فن	نام کتاب	مصنف	اشاعت گھر
مختصر افسانے	(۴) دُکھ سُکھ	اعظم کریوی	انوار احمدی پریس الہ آباد
ناول			
	(۱) سوتیا چاہ	شوکت تھانوی	صدیق بک ڈپو لکھنؤ
تنقید و تذکرہ			
	(۱) نقد و نظر	حامد حسن قادری	شاہ اینڈ کمپنی آگرہ
	(۲) یادگارِ شعرا	سعید احمد	ہندستانی اکاڈمی الہ آباد
	(۳) دورِ جدید کے چند ہندو شعرا	عبدالشکور ایم اے	دانش محل لکھنؤ
مضامین کے مجموعے			
	(۱) زندہ رُوس	مرتبہ ادارہ نیا ادب	دانش محل لکھنؤ
	(۲) انتخابِ شبلی	دارالمصنّفین	دارالمصنّفین اعظم گڑھ
نظم			
	(۱) کلیاتِ شبلی	دارالمصنّفین	دارالمصنّفین اعظم گڑھ
سوانح عمری			
	(۱) رحمتِ عالم	سید سلیمان ندوی	دارالمصنّفین اعظم گڑھ

فنّی اعتبار سے اگر دیکھیے تو یہ تناسب اچھا ہی۔ افسانے و ناول سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد اچھی ہی۔ 'زندہ رُوس' وقت کی خوراک ہی۔ تنقید و تبصرے کی تینوں کتابیں اور 'انتخابِ شبلی' علم دوست لوگوں کے مطلب کی چیزیں ہیں۔ 'رحمتِ عالم' مذہبی کتاب ہی۔

ان میں سے رحمتِ عالم، کلیاتِ شبلی، انتخابِ شبلی، سوتیا چاہ، حُسن کی عیّاریاں دوسری بار چھپی ہیں۔ یہ دلیل ہی ان کے مقبول ہونے کی۔

یہ تناسب اچھا تو ہے مگر مکمل نہیں ہے۔ اس میں عام پسند ادب، بچوں کا ادب اور جدید طرز کی نظم نہیں نظر آتی ہیں۔ مختصر افسانے اور ناول جو چھپے ہیں عمدہ چیزیں ہیں۔ وقیع رسالوں نے ان کی تعریفیں کی ہیں۔ شوکت تھانوی ہندستان کے چند گنے چُنے لکھنے والوں میں ہیں۔ اعظم کریوی صاحب دیہاتی زندگی پر افسانے لکھنے والے مشہور ہوچکے ہیں۔ عبدالشکور صاحب کی ایک کتاب 'یارانِ میکدہ' چھپی، مشہور ہوکر فروخت ہوچکی اور اب 'دانش محل' نے اس کا دوسرا اڈیشن چھاپا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتابیں بہت دِنوں تک زندہ رہیں گی۔

ہمارے اشاعت گھروں کو یہ تو دیکھتے رہنا ہی چاہیے کہ کس خاص قسم کی کتابوں کی آج کل کھپت ہے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اگر رُخ بدلا تو کدھر بدلے گا۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں یہ اپنی زندگیوں میں پچھلے دوروں کو مات کیے دے رہا ہے۔ یوپی کا کوئی مکمل ذوق نہیں ہے، اس لیے یہ بدلا تو بہت تیز بدلے گا۔

'دورِ جدید کے چند ہندو شعرا' بہت ضرورت کی چیز ہے اور امید ہے کہ یہ کتاب بہت مشہور ہوجائے گی۔ ہندستانی اکاڈمی کی کتاب کو دیکھ کر تو وہ راے بدلنی پڑتی ہے جو میں نے یوپی کی لکھائی چھپائی کے بارے میں قائم کی تھی۔ اکاڈمی کی کتابوں کی دو خصوصیتیں اور ہیں۔ زیادہ تر وہ لائبریری اڈیشن ہوتی ہیں اور کافی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ کتاب میں اگر ذراسی ریڈر کی شان بھی رہے تو کیا کہنا۔ دُنیا کے بڑے بڑے مصنفوں برگسان اور برٹرنڈ رسل تک کی کتابوں میں یہ شان ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف اشاعت گھر کی آمدنی بڑھ جاتی ہے، بلکہ زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

گرد پوش بھی عجیب چیز ہے۔ جب کتابوں پر عمدہ جلدیں ہونے لگیں تو ان کی حفاظت کے لیے موٹے کاغذ کے گرد پوش آنے لگے۔ لیکن یہ گرد پوش جلد کی خوش نمائی کو چھپا لیتے تھے۔ اس سے دُکان اور لائبریری کی زینت میں کمی ہوتی تھی۔ اس لیے بھدے گرد پوش کی جگہ عمدہ گرد پوش نے لی۔ اب یہ خود ایک حفاظت کی چیز بن گئے۔ اس لیے اُن پر شیشے نما کاغذ چڑھایا جانے لگا۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ یہ کاغذ پھٹ جاتا ہے۔ نہ جانے یہ مسئلہ تہ در تہ کہاں تک جائے، لیکن اس وقت

کتاب کی نمایشی حیثیت رکھنے کے لیے یہ چیز ضروری ہوگئی ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب میں کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

'دانش محل' کی کتابوں پر سوائے ایک کے گرد پوش موجود ہے۔ اور اس پر خوب صورت محرابی ڈیزائن بنا ہوا ہے۔ ڈیزائن کی نوک پلک بہت عمدہ ہے۔ چھپا بھی عمدہ ہے لیکن محرابی ڈیزائن مقفّٰی عبارت کی طرح ہے۔ وہ زیادہ گہرا مطلب نہیں ادا کرسکتا ہے۔ آج کل تو ڈیزائنوں میں لفظوں کی قوت بھر دیتے ہیں۔ لیکن ایسے آرٹسٹ یوپی میں نہیں۔ اور نہ ان کے چھاپنے والے پریس۔ بہ ہر حال مجلّد کتابوں اور گرد پوش کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ پُراثر ڈیزائن کا بھی ہے۔

کیا رحمتِ عالم کے قسم کی کتابیں اور نہیں لکھی جاسکتی ہیں؟ اگر کہیں اس کی زبان ذرا اور آسان ہوجائے اور قیمت اور کم تو کیا کہنا؟ اور ہاں کمیشن زائد ہو۔ کچھ مذہب کی خدمت میں اور کچھ اُردو کی۔ دار المصنفین نے ان دونوں خدمتوں کا بار اُٹھایا ہے۔

کتابچے محکمۂ اشاعتِ عامہ حکومت ممالکِ متحدہ نے وہ کتابچے جو اس نے تین چار ماہ کے اندر اندر نکالے ہیں، ہم کو بھیجے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم محکمے کے ڈائرکٹر جناب وہاج الدین عباسی صاحب کے شکرگزار ہیں۔ یہ کتابچے تعداد میں ۲۸ ہیں۔ ۵۰ صفحے سے لے کر ۸۰ صفحے تک کے ہیں۔ ہر سائز کے ہیں۔ سرورق پر اور اندر بھی عمدہ عمدہ تصویریں ہیں۔ ان کی لکھائی چھپائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یوپی میں یہ بھی ممکن ہے۔ جس صحافی زبان کا ہم اوپر تذکرہ کر آئے ہیں کہ اس میں نئی اصطلاحیں اور نئی بندشیں ہضم ہوگئی ہیں اس کی یہ اچھی مثال ہیں۔ ہماری اُردو کتنی جلد نئی ڈگروں پر سبک خرامی سے چلنے لگتی ہے۔

تبصرے

ادبیات

دستور الفصاحت (مرتبۂ مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی۔ ہندستان پریس رام پور قیمت دو رُپے آٹھ آنے (مجلّد) دو رُپے (غیر مجلّد)

مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانۂ رام پور نے مطبوعات کتاب خانۂ رام پور کے نام سے سلسلۂ کتب شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی چوتھی کتاب ہے۔ کتاب کے مصنّف حکیم اسدعلی خاں یکتا لکھنوی ہیں۔

یہ کتاب اُردو صرف و نحو، عروض و قافیہ اور معانی و بیان پر ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جس میں ان شاعروں کا مختصر تذکرہ اور نمونۂ کلام ہے جن کے اشعار کتاب میں مثال کے طور پہ درج ہوئے ہیں۔

فاضل مرتّب کا یہ ادّعا ہے کہ یہ کتاب انشا کی کتاب 'دریاے لطافت' سے پہلے تالیف ہوئی اور اس لیے اسے تقدّم کی فضیلت حاصل ہے۔ 'دریاے لطافت' ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۸ء) میں تصنیف ہوئی۔ سنہ تالیف یا تصنیف سے ہمیشہ یہ مراد ہوتی ہے کہ کتاب فلاں سنہ میں اختتام کو پہنچی۔ مصنّفِ 'دستور الفصاحت' نے کتاب کے آخر میں قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔ اور مادّۂ تاریخ

"دستورِ فصاحت" ہو اور یہی کتاب کا نام ہو۔ اس سے ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) برآمد ہوتا ہو۔ مگر فاضل مرتب کہتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہو کہ یہ سنہ مسودہ صاف کرنے کے وقت کا تعین کرتا ہو سالِ تالیف کو ظاہر نہیں کرتا۔" اپنے اس دعوے کی تائید میں مصنف کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں :—

"مخفی مباد کہ عرصۂ بعید و مدتِ مدید سپری گردیدہ کہ چہرۂ تسطیر ایں مقالہ و گردۂ تصویرِ ایں رسالہ بر صفحۂ وجود نقش گرفتہ؛ بہ سبب تردد و تشتّتِ بال کہ بہ وجوہ شتی لاحق حال ہچمن طربت مآل ماندہ در عملِ تعطّل افتادہ بود۔ و دریں تعطیل کہ سالہا سال بسر آمد ہرگز طبیعت متوجہ نہ شد کہ بہ نظرِ ثانی پرداز د یا آں را بہ نحوے کہ منظور بود، درست سازد کہ دوستے از دوستانِ فقیر مسمّی بہ شیخ رمضان علی صاحب سلّمہٗ ربّہٗ از باشندگانِ لکھنؤ بستہ بہ نقلش پرداختند و بہ سعی تمام در ماہ ذیحجہ ایں سال آں را تمام ساختند۔"

اس سے بے شک یہ تو معلوم ہوتا ہو کہ اس سال سے بہت پہلے کتاب کی تالیف کا آغاز ہوگیا تھا لیکن مکمل کب ہوئی اس کا پتا نہیں چلتا۔ ایسی صورت میں تکمیل کی تاریخ وہی سمجھی جائے گی جب درستی کے بعد صاف مسودہ لکھا گیا۔ یہ بیان کہ مسودہ سالہا سال یوں ہی پڑا رہا اور درستی اور نظرِ ثانی کا موقع نہ ملا مُصنف کے انکسار پر دلالت کرتا ہو۔ اس قسم کے عذرات اکثر پُرانی کتابوں میں پائے جاتے ہیں جو ہمیشہ سچ نہیں ہوتے۔ عرشی صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں خاتمے کے تذکرۂ شعرا سے جو اس قسم کے ثبوت پیش کیے ہیں کہ فلاں شاعر کو جو ۱۲۴۹ھ سے قبل فوت ہوچکا تھا، سلّمہٗ ربّہٗ لکھا ہو یا یہ لکھا ہو کہ چند سال ہوئے انتقال کرگیا تو یہ بھی قطعی ثبوت نہیں۔ بعض اوقات کتاب کی تکمیل میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں اور مدتوں معرضِ تالیف میں رہتی ہو۔

عرشی صاحب نے اس امر کے ثبوت میں کہ 'دستورِ فصاحت' کی تالیف 'دریاے لطافت' سے بہت پہلے انجام پاچکی تھی، مصنف کا یہ بیان پیش کیا ہو:—

"...کتابے از کتب دریں فن و رسائل ایں تمیز کہ مفیدِ مطلب و معینِ مقصد دریں باب می شد، در نظر نہ داشتم کہ موافق آں می نوشتم و از خطا مصئون می ماندم"

یہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ وہ خود انشا کے تذکرے میں انشا کی نسبت لکھتے ہیں "غواصِ بحرِ فصاحت، صاحبِ دریاے لطافت"۔ اگر "دریاے لطافت" کا علم نہ تھا تو یہاں کیسے لکھ دیا۔ کتاب کے مقدمے کے پڑھنے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ 'دریاے لطافت' مصنف کی نظر سے گزری ہے۔ خصوصاً جہاں انھوں نے عربی فارسی الفاظ کی صحت اور تلفظ کے متعلق گفتگو کی ہے، معلوم ہوتا ہے 'دریاے لطافت' ان کے سامنے تھی۔

افسوس ہے کہ عرشی صاحب نے پوری کتاب نہیں چھاپی صرف اس کا مقدمہ چھاپا ہے جو مشکل سے بارہ صفحے کا ہے۔ رہا خاتمہ جس میں ۳۵ شعرا کا ذکر اور نمونۂ کلام ہے سو وہ اصل موضوع سے کچھ تعلق نہیں رکھتا محض بھرتی کی چیز ہے۔ اگر پوری کتاب چھپ جاتی تو اس سے البتہ کتاب کے حسن و قبح کا اندازہ ہوتا۔

بارہ صفحے کے مقدمے میں دو صفحے تو حمد و نعت اور مربی کی مدح اور سببِ تالیف کے نذر ہو گئے۔ چھ صفحے زبان کی پیدایش اور اس کی فصاحت وغیرہ کے متعلق ہیں۔ باقی چار صفحوں میں اردو کے حروفِ تہجی کا ذکر ہے یعنی عربی اور فارسی کے کون کون سے اور ہندی کے کتنے حروف ہیں۔ حروف میں ڈ ٹ ڑ پ چ کا تلفظ عبارت میں کس طرح ادا کرتے ہیں۔ حسابِ جمل سے ان حروف کے کتنے کتنے اعداد ہیں۔ اس مقدمے میں کوئی بات نئی یا کام کی نہیں۔ 'دریاے لطافت' میں حروف کی بحث دیکھ کر انشا کی طباعی اور نکتہ رسی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس کتاب کو دریاے لطافت کے مقابلے میں پیش کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

البتہ عرشی صاحب نے دیباچہ اور حواشی لکھ کر کتاب کی وقعت بڑھا دی ہے اور تذکروں اور شعرا کے حالات اور ماخذِ کتب کے بیان میں بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔

اعمال نامہ (خود نوشت سوانح حیات سر سید رضا علی صاحب - ہندستانی پبلشرز، دلّی - صفحات ۵۰۰۔ قیمت آٹھ روپے)

سر سید رضا علی ہماری قوم کے خاص لوگوں میں سے ہیں - وہ بہت ملنسار، شگفتہ مزاج، باخبر اور مستعد شخص ہیں - وہ بہت اچھے مقرر ہیں اور اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ ویسے ہی اچھے لکھنے والے بھی ہیں - اور سب سے زیادہ تعریف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے محض اپنی محنت اور لیاقت کے بل پر ترقی کی ہے - اگرچہ یہ کتاب انھوں نے اپنی زندگی کے حالات پر لکھی ہے لیکن اپنے حالات سے زیادہ اس میں قومی حیات کا نقشہ نظر آتا ہے - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوق کتنا وسیع اور ان کے شوق اور اشغال کس قدر گوناگوں ہیں - انھوں نے اپنے زمانے کی سیاست، معاشرت، مذہب، تعلیم، تہذیب و تمدن، زبان و ادب پر تبصرہ ہی نہیں کیا بلکہ اِن تمام معاملات میں خود بھی شریک رہے ہیں اور ان اداروں میں سے اکثر سے ان کا ذاتی تعلق رہا ہے جو اِن مسائل اور مباحث کے مرکز ہیں - یہ سب حالات پانسو سے اوپر بڑی تقطیع کے صفحات پر ہیں - اِن سب پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے -

پہلے ۷۰ صفحوں میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات اور اپنی ابتدائی ثانوی تعلیم کا ذکر کیا ہے - زندگی کا دوسرا باب علی گڑھ کالج کی تعلیم سے شروع ہوتا ہے - وہاں انھوں نے سر انٹنی میکڈانل کے ناگری والے رزولیوشن، ہندی اردو کے مناقشے اور معرکے، سر سید کی جانشینی کا ناگوار قضیہ، ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس، سر انٹنی میکڈانل کے ہاتھوں اردو کی حمایت کی وجہ سے نواب محسنُ الملک کی تذلیل، سر انٹنی کی کوتہ اندیشی سے مسلم لیگ کے قیام اور کان پور کی مسجد کے دِل آزار ہنگامے کے تماشے بچشم خود دیکھے اور ان میں شریک رہے اور کام کیا۔ اسی تذکرے میں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے حالات بھی لکھے ہیں - اِن دونوں بزرگوں کا تذکرہ اور ان کی سیرتوں کا مقابلہ کمال خوبی اور سچائی سے کیا ہے اور مطلق پاسداری اور رو رعایت نہیں کی - نواب محسنُ الملک کی فہم، فراست، موقع شناسی، خوش بیانی اور قومی درد اور خلوص کے بے حد قائل اور مداح ہیں۔ لیکن جو ان

لی گڑھ کالج میں) تھی اُسے بھی بیان کر دیا ہو لیکن ایسے سلیقے اور شائستگی سے کہ اگر نواب محسن الملک اِس وقت زندہ ہوتے اور اسے پڑھتے تو بُرا نہ مانتے۔ یہ بات سیکھنے کے قابل ہو خاص کر ہمارے اخباروں اور سیاست دانوں کو۔

علی گڑھ کالج کی صحبتوں، پروفیسروں اور طلبا کے رجحانات، بعض دوست احباب کے حالات، وہاں کی مصروفیتیں، کالج میں امیر حبیب اللہ خاں کی تشریف آوری، کالج یونین کے انتخاب، کالج کی مذہبی معاملات وغیرہ کا ذکر دِل چسپ طریقے سے لکھا ہو۔ یہ گویا چالیس برس پہلے کا علی گڑھ تھا۔

اس کے بعد کے کئی باب زیادہ تر ہندستان اور مسلمانوں کے سیاسی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ضمن میں بہت سے دِل چسپ اور بعض اہم واقعات آگئے ہیں جو پڑھنے کے لائق ہیں۔

سیّد رضا علی صاحب بہت دِل چسپ اور وسیع مشرب آدمی ہیں۔ دسواں باب جو مذہب پر ہو اور گیارھواں جو حُسن و محبت پر ہو انھیں پڑھ کر آپ میری رائے سے اتّفاق کریں گے۔

بارھواں باب اُردو شاعری اور ادب اُردو کی ادبی حیثیت ناٹک اور ڈرامہ نویسی پر ہو۔ اس میں کئی بحثیں آگئی ہیں جن پر تفصیلی تبصرے کی ضرورت ہو لیکن اس تبصرے میں گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے اسے کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی رکھتے ہیں۔

تیرھواں باب "والدین، متاہل زندگی اور اولاد" پر ہو۔ آخری باب (۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۳ء) کا عنوان "چوتھائی صدی کے پولٹیکل بہی کھاتے کا جمع خرچ" ہو۔ اس میں اگست ۱۹۴۲ء کے ہنگامے، حکومت کا بادہ اور کانگرس کا ظرف، ایگزیکٹو کونسل کے بعض ہندستانی ممبروں کی خصوصیات، صلح کے بعد کا یورپ، کانگرس والوں کا موجودہ روّیہ، بعض اہم پولٹیکل واقعات، یورپ کے سفر، روس کی سیاحت، جنوبی افریقہ کی کہانی وغیرہ ہیں۔

یوں تو اس کتاب میں بہت سی باتیں ہیں جن پر بحث کی ضرورت ہو لیکن ایک غلطی کا میں خاص طور پر ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ صفحہ ۲۷۹ پر سیّد صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "زبان کا قضیہ ہماری بدقسمتی سے محض زبان کا مسئلہ نہیں ہو بلکہ اس کا سنگِ بنیاد در اصل سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی خواہش ہو"

یہ صحیح ہو۔ لیکن اُنھوں نے اپنی تائید میں مسٹر کرشن پرشاد کول کا یہ قول نقل کیا ہو "اُردو ہندی کا جھگڑا پُرانا ہو، اس جھگڑے کی بِنا سیاسی بلکہ قومی ہو۔ یہ اَدبی قضیہ نہیں۔ یہاں اس واردات کی سرگزشت کے سرسری بیان کا بھی موقع نہیں تاہم احباب کو یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ اس قضیے کا شور پہلے پہل اس کے بعد [illegible] میں آیا جب سرسیّد مرحوم نے کانگرس کی مخالفت اس صوبے میں شروع کی تھی۔ اِس جھگڑے کا تانتا بعد میں مسلم لیگ اور ہندو سبھا کی شکل میں جاری رہا اور اب بھی جاری ہو۔ خوشی ہونے کی یہ بات ہو کہ اس جھگڑے کی بِنا قومی تعصّب یا سیاسی اختلاف سے پڑی" یہ قول نقل کرنے کے بعد سیّد صاحب لکھتے ہیں کہ "مسٹر کول کی ہمّت قابلِ داد ہو کہ اُنھوں نے سچی بات صاف طور سے کہہ دی" میں بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ یہ سراسر غلط ہو کہ ہندی اُردو کا جھگڑا سرسیّد مرحوم کی کانگرس کی مخالفت سے شروع ہوا۔ بلکہ یہ تنازع اُس وقت شروع ہوا جب [illegible] میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں اور دفتروں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے خارج کرنے کی کوشش کی۔ اُس زمانے کے اخباروں میں یہ تمام بحثیں اور کارروائیاں موجود ہیں۔ اُس وقت سرسیّد کو اِس بات کا یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بہ طور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو بلاکر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا (جیسا کہ وہ اُس وقت تک کرتے آئے تھے) محال ہو۔ کانگرس کا اُس وقت وجود بھی نہ تھا۔ اب بلاشبہ اس مسئلے کو (خصوصاً گاندھی جی کی تائید کے بعد سے) سیاسی اور قومی حیثیت حاصل ہوگئی ہو۔

سرسیّد رضا علی صاحب نے اپنی کتاب سادہ، بے تکلّف اور اچھی اُردو میں لکھی ہو۔ کتاب میں اُس زمانے کے بہت سے واقعات ملیں گے جنھیں لوگ اب نہیں جانتے یا بھول گئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے بعض غلط فہمیاں بھی رفع ہوگئی ہیں۔ مصنّف نے تمام حالات و واقعات اپنے حدِ یقین تک صحت اور سچّائی کے ساتھ لکھے ہیں اور چوں کہ یہ سب کے سب اُن کے چشم دید ہیں اور خود اُنھوں نے ان میں حصّہ لیا ہو اِس لیے اُن کے سچ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ کتاب بہت دِل چسپ اور پُراز معلومات ہو اور مطالعے کے قابل ہو۔

سلسلۂ تعلیم بالغان مرتبہ اِدارۂ تعلیم و ترقی جامعہ مِلّیہ اسلامیہ، دہلی۔

ہندستان تعلیمی رفتار میں دُنیا کے مہذب ممالک سے اُتنا پیچھے ہے کہ اگر یہاں صِرف بچّوں ہی کی تعلیم پر قناعت کی گئی تو تمام تر کوشش اور دوا دوش کے باوجود ہم ترقی یافتہ ممالک کو نہ پاسکیں گے اور جتنے برس ہمارے آیندہ نسلوں میں پڑھے لکھوں کی تعداد بڑھانے میں صرف ہوں گے اُتنے برسوں میں ترقی پزیر مُمالک و اقوام اور بہت آگے نکل جائیں گی۔ اِس لیے اس کی ضرورت ہے کہ بچّوں کے ساتھ بوڑھوں کو بھی پڑھایا جائے اور نیز جدید حقوق و قوانین سے متنبّع ہونے اور اپنے بچّوں کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے بھی اس کی ضرورت ہے کہ اولاد کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ والدین کو بھی تعلیم دی جائے۔ چناں چہ کچھ دنوں سے مُلک میں تعلیم بالغان کی تحریک شروع ہوئی ہے اور مختلف ادارے اس سلسلے میں اپنی اپنی کوشش کر رہے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو ہند نے بھی اس کے لیے مُلک کے مختلف حصّوں میں شبینہ مدارس وغیرہ جاری کیے ہیں جن میں تعلیم پانے والوں کی ہر طرح امداد اور ہمّت افزائی کی جاتی ہے اور بے پڑھے لکھے ملازمت، تجارت پیشہ بالغوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ دن کو اپنے کام سے فراغت کرکے رات کو تھوڑی دیر پڑھنے میں صَرف کریں۔ مگر اِس وقت جو دِقّت سب سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ دیسی زبانوں میں بالغ مُبتدیوں کے لیے موزوں کتابیں نہیں ہیں اور جو کتابیں بچّوں کو پڑھائی جاتی ہیں وہ ان کے لیے مناسب نہیں ہیں اس لیے کہ بچّوں کے اسباق میں کھیل کُود کی باتوں سے تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور بوڑھے آدمیوں کو ان چیزوں میں خاص دِل چسپی نہیں ہوسکتی۔ نیز سیاسی ترقّی کی موجودہ منزل میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ لوگوں کو شہری حقوق و فرائض سے آگاہ اور نظم و نسق کے مختلف مراحل سے واقف کیا جائے۔ یہ چیزیں چوں کہ بچّوں کی حد سے آگے ہیں اس لیے ان کی ابتدائی کتابوں میں ان مسائل کا ذِکر کم ہوتا ہے مگر بالغ مُبتدیوں کی ابتدائی کتابوں ہی میں یہ سب باتیں ہونی ضروری ہیں۔ اس اہم ضرورت کو محسوس کرکے جامعہ مِلّیہ اسلامیہ دہلی نے چھوٹے چھوٹے سو رسالوں کا ایک سیٹ بالغ مُبتدیوں کے لیے تیار کیا ہے جس

میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عام معلومات، شہری حقوق و فرائض، معاشی اور سماجی ضروریات، نظامِ حکومت اور مختلف علوم و فنون کی سرسری واقفیت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہو۔ کارپردازانِ مکتبہ مستحقِ مبارک باد ہیں کہ اُنھوں نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آگے قدم بڑھایا اور زیرِ نظر سلسلۂ رسائل شائع کرکے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے رسالے جو زیادہ تر سولہ سولہ صفحے کے ہیں اور چند اس سے کچھ زیادہ کے مگر پچیس صفحے سے زیادہ کوئی نہیں ہو اور ایک ایک آنہ فی رسالہ قیمت ہو اور ان میں وہ معلومات بھر دی گئی ہیں جن کا جاننا ایک ہندستان کے عام باشندے کے لیے ضروری ہو اور جن کے بعد وہ حالاتِ حاضرہ کے سمجھنے اور اپنے حقوق و فرائض برتنے کی قابلیت و صلاحیت حاصل کرسکتا ہو۔ مُسلمان بالغوں کے لیے مذہب کے متعلق ۵ رسالے ہیں جن میں نماز، حالاتِ قرآنِ مجید، تعلیماتِ قرآنِ مجید متعلق عقائد و عبادات و اخلاق و معاملات، قصصِ قرآنِ مجید، کعبہ شریف اور حدیث شریف کا بیان ہو۔ سیرت پر پندرہ رسالے ہیں جن میں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدین، صحابۂ کرام، شہیدِ کربلا عمر ابن العزیز، حضرت غوثِ پاک، اجمیری خواجہ اور حضرت نظام الدین اولیا رحمہم اللہ علیہ کے حالات ہیں۔ ہندستان کے دوسرے مذاہب پر بھی چار کتابیں ہیں جن میں مہاتما گوتم بُدھ، کرشن کنھیّا اور رام چندر جی کا ذکر ہو۔ ہمارا وہ ادَبی ذخیرہ جس پر ہمیں ناز کرنا چاہیے کئی رسالوں میں پیش کیا گیا ہو تاکہ اس کے متعلق عام معلومات دورانِ تعلیم میں حاصل ہوجائیں اور ذوق و شوق کی صورت میں اس سے اور زیادہ منتفع ہونے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں مثنوی شریف، گلستاں، فسانۂ عجائب، مثنوی میرحسن، قصہ گل بکاولی، قصہ چار درویش، داستانِ امیرحمزہ، قصہ حاتم طائی، قصہ لیلا مجنوں، شکنتلا اور مولانا عبدالحلیم شرر کے تین مشہور ناولوں کے خلاصے تحریر کیے گئے ہیں۔ ابتدائی مراحل سے مانوس کرنے کے لیے حکایتیں، گنتی، پہاڑے، اُجرت اور تنخواہ کا حساب اور چاند تاروں کا حال چند رسالوں میں بیان کیا ہو۔ چھ رسالے آئین و دستور کے متعلق ہیں جن میں میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، ضلع کی حکومت، حکومتِ ہند اور جمہوریت کے حالات مختصراً بیان کیے

گئے ہیں اور ان سب کی ترکیب اور طریقِ کار کو دل چسپ اور عام فہم انداز میں لکھا گیا ہو۔ دس رسالے جغرافیے کے متعلق ہیں جن میں دُنیا، یورپ، امریکہ، افریقہ، ایشیا، ہندستان اور اس کے صوبوں اور دیسی ریاستوں کے نقشے دیے گئے ہیں اور ان کی مختصر تشریح کی گئی ہو۔ عام روزانہ کی زندگی میں ہمیں جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو اُن کا بھی ذکر الگ الگ رسالے میں کیا گیا ہو جیسے دُکان دار، خدمت گار، خانساماں، بہشتی، درزی، حجام، بڑھئی، حلوائی، تانگے والا وغیرہ اور اس ذیل میں نہایت مفید معلومات اور کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں جن کا افسانوی انداز بہت ہی دل چسپ ہو۔ اسی سلسلے میں "امامی بھی پڑھنے لگے" نامی رسالے میں تعلیم بالغان کی ترغیب کے لیے روزمرہ کی زندگی سے مفید نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ حفظِ صحت کے متعلق علاوہ دو رسالے ہیں جن میں سے ایک نزلہ زکام کے بارے میں ہو اور ایک میں بچوں کی داشت پرداخت اور عام صفائی وغیرہ قصّے کے طرز میں بتائی گئی ہو۔ صحت و صفائی کے ساتھ عام معلومات کے رسالے ہیں ان میں روزانہ زندگی کی عملی ضروریات اور معاشرتی اصلاح کا خاص خیال رکھا گیا ہو اور یہ کوشش کی گئی ہو کہ سارے رسائل پڑھنے کے بعد ہم سماجی اور معاشی اصلاح کے مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے متعلق حسبِ مقدرت کچھ کام کرسکیں۔

اِن رسالوں کی تیاری اور طباعت و اشاعت میں جو کوشش و کاوش اور صرف برداشت کیا گیا ہو اُس کے لحاظ سے کاغذ کی اس گرانی اور قحط کے زمانے میں ایک ایک آنہ قیمت لاگت سے بھی کم ہوگی اس لیے کہ خردہ خریداری میں ایک آنے کا اتنا کاغذ بھی نہ ملے گا جتنا ہر رسالے میں لگا ہو اور چوں کہ ان رسالوں سے ایک بہت بڑی ضرورت پوری کی گئی ہو اس لیے ہمیں یقین ہو کہ یہ کافی مقبول اور کامیاب ہوں گے۔ اسی کے ساتھ ہمیں امید ہو کہ جب ان کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا تو بعض معمولی اسقام جو اس ایڈیشن میں نظرانداز ہوگئے ہیں، وہ بھی دُور کردیے جائیں گے۔ خاص کر پروف کی جا بجا غلطیاں اور بعض رسالوں میں زبان کی خامیاں قابلِ توجہ ہیں جن پر یقیناً ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکنوں کی نظر ہوگی اس لیے ہم زیادہ تفصیل سے ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتے۔ یہ اشارہ

صرف اِس لیے کر دیا ہو کہ مبتدی خواہ نابالغ ہوں یا بالغ اُنھیں تعلیم دینے کے لیے جو کتابیں بنائی جائیں وہ حتی الامکان ایسے اسقام سے پاک ہونی چاہییں۔ اور الفاظ محاورات وغیرہ کے استعمال پر خاص احتیاط برتنی چاہیے۔ خاص کر ایسے فقرے جیسے " ہمیں جان پڑتا ہو " تعلیمی کتابوں میں نہ ہونے چاہییں۔ ورنہ الفاظ کے ہجّوں میں بے احتیاطی برتنی چاہیے جیسے " حفیظ خانساماں " کے رسالے میں "کباب" کو "کواب" اور ن نواب لکھا گیا ہو۔ بدقسمتی سے کباب اور نواب کا ایسا چولی دامن کا سا ہو کہ صاحب بہادر لوگ نواب کو "نباب" کہتے ہیں اور مولوی عبدالملک صاحب نے جو رسالہ "حفیظ خانساماں" کے مؤلف ہیں، کباب کو کواب کردیا ہو۔ گویا کباب اور نواب کے جو ہجے بھی مقرر کیے جائیں دونوں کا یکساں ہونا اور ہم قافیہ ہونا حرف روی تک ضروری ہو۔

لیکن اس قسم کے اسقام زیادہ نہیں ہیں اور ہندستان میں عام طور پر طباعت اور پروف ریڈری کی جو سقیم حالت ہو اُسے دیکھتے ہوئے یہ نظر انداز بھی کر دیے جائیں گے لیکن ان رسالوں کی دیگر خوبیوں اور ان کے کارآمد ہونے کے لحاظ سے ہمارا یہ جی چاہتا ہو کہ ان میں ایسے خفیف نقائص بھی نہ رہنے پائیں۔ اور بہرنوع ان کی وجہ سے رسائل کے عام افادے اور قابلِ قدر ہونے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

(ر۔ ع۔ ہ)

اُردو کے نئے رسالے اور خاص نمبر

انوار

بمبئی سے متعدد اُردو روزنامے، ہفتہ وار اخبار، ماہانہ رسالے شائع ہوتے ہیں اِن دِنوں بمبئی اُس حصّۂ ملک کا اچّھا خاصا اُردو مرکز بنا ہوا ہو۔ وہاں پہلے سے کئی وقیع رسالے نکلتے ہیں، ان میں ابھی ابھی ایک اور اچھے رسالے کا اضافہ ہوا ہو۔ انوار نے محمود سروش الہ آبادی اور عبدالمجید قاضی کی ادارت میں اور پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اور سید انورحسین آرزو صاحب کی سرپرستی میں آنکھ کھولی ہو۔ کچھ مضمون لکھنے والے بھی اچھے پیدا کرلیے

ہیں۔ صحیح راے دو چار نمبر دیکھنے کے بعد قائم ہوسکتی ہے۔ البتہ ابتدا اچھی ہوئی ہے اور ہونہار نظر آتا ہے۔ رسالہ زیادہ تر ادبی دل چسپی کا ہے۔ ایک دو مضمون غور و فکر سے بھی لکھے ہوئے درج ہیں۔ نظموں کی تعداد نثر کے مضمونوں سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہے۔ بمبئی سے ایسے رسالے کا نکلنا بہت غنیمت اور داد کے قابل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پروفیسر نجیب اشرف کی رہنمائی میں یہ اپنے معیار کو اور بلند کرنے کی کوشش کرے گا۔

بہت بڑی تقطیع، دو کالم کے ۶۸ صفحوں پر ہے۔ چھپا بھی اچھا ہے جس کی توقع بمبئی سے کم تھی۔ چندہ سالانہ سات رُپے۔

پیامِ ادب

یہ ماہانہ رسالہ حیدرآباد دکن سے ادارۂ اشاعتِ اُردو کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا ماہِ دسمبر کا نمبر ہے۔ سب سے پہلا مضمون ماہرالقادری صاحب کا "غلط اندیشیاں اور بدگمانیاں یا اصلاحِ خیال کی کوشش" ہے۔ اس میں انھوں نے ترقی پسند ادب پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی جتادیا ہے کہ "وہ ترقی پسند جو گمراہ کن ادبی رجحانات کے حامی نہیں ہیں میرے مخاطب نہ سمجھے جائیں"۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر اختر حسین صاحب کا مضمون "ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم" ہے۔ اس سے رسالے کی ادبی رواداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں اور غزلیں اور کچھ دل بہلانے کی باتیں اور قصّے کہانیاں ہیں۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ خاص کر سرورق خوب ہے۔ سالانہ چندہ چھ رُپے۔

نیا ادب

یہ ترقی پسند مصنفین کی سہ ماہی کتاب ہے (رسالہ نہیں) نیا ادب ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔ جوش ملیح آبادی صاحب کا رسالہ کلیم بھی اسی میں ضم ہوگیا تھا۔ کچھ مدت باقاعدہ اور بےقاعدہ نکلتا رہا۔ لیکن بعض مشکلات کی وجہ سے ۱۹۴۲ء میں بند ہوگیا۔ اب بمبئی سے چھوٹی سی تقطیع پر نکلنا شروع ہوا ہے۔

پہلا مضمون سبط حسن صاحب کا "زندگی کی نقش گری" پر ہے۔ عنوان سے مضمون کا منشا سمجھ میں نہیں آتا۔ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک نئے مصوّر کی اُن چند تصویروں کی تشریح کی ہے جس میں مصوّر نے بنگال کے قحط کا دردناک منظر پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں اس دردانگیز مصیبت اور تصویروں کی تفسیر ہے اور اُن تصویروں کے چند خاکے بھی ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی ایک مثنوی لکھ رہے ہیں جس کا نام "حرفِ آخر" ہے۔ اس میں کا ایک ٹکڑا "دُنیا کی تخلیق" اس سہ ماہی میں شائع ہوا ہے۔ دنیا کی تخلیق جدید سائنس کی رو سے بیان کی گئی ہے۔ سب حقیقت بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں ؎

کتنے قرنوں میں بڑھا یہ کاروانِ زندگی	سانس اُکھڑ جاتی ہے اس تفسیر سے تاریخ کی
سوچ تو کس منزلِ طوفاں سے آئی ہے حیات	کتنی موتوں کو کُچل کر مُسکرائی ہے حیات
کتنی لاتعداد زنجیروں کو ہے توڑے ہوئے	اور کلائی کتنے طوفانوں کی ہے مروڑے ہوئے
کتنی تاریکی کے اندر پائی ہے راہِ نجات	کتنے میداں تھے جہاں گر گر کے اُٹھی ہے حیات
کتنی اندھی طاقتوں سے کس قدر دُکھ پائے ہیں	کس قدر سفّاک قدرت کے طمانچے کھائے ہیں
ابتدائی منزلوں کی بے پر و بالی کو دیکھ	تہرافگن مادّے کی ہمتِ عالی کو دیکھ
قدرتِ جبّار کا بھی خشک ہوتا ہے لہو	مادّے کے فاتحانہ ولولوں کے روبرو
روح کے دھوکے میں عاقل کو نہ آنا چاہیے	مادّے کے سامنے گردن جُھکانا چاہیے

مادّے کے سامنے گردن جُھکانے کے معنے ہوے کہ پھر اُلٹے پیروں اسی طرف جانا چاہیے جہاں سے منزل شروع ہوئی تھی۔ تخلیق کا ارتقا پوری قوت اور جوش سے لکھا ہے جس سے بیان و الفاظ کی شوکت اور قدرت ظاہر ہوتی ہے۔

ایک مضمون "ہمارا پہلا فاشسٹ دشمن ادیب" کے نام سے ہے۔ یہ خطاب ٹیگور کو دیا گیا ہے اور ثبوت میں اٹلی اور جاپان سے ان کی بیزاری پیش کی گئی ہے۔ کچھ نظمیں ہیں اور کچھ روسی افسانوں وغیرہ کے ترجمے۔ نہ معلوم سردار جعفری صاحب کے ناول کا صرف ایک باب کیوں درج کیا

گیا ہو۔ قاضی عبدالغفار صاحب کا خطبۂ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد معمولی اور پامال باتوں سے بھرا ہوا ہو۔ ڈاکٹر اختر حسین کا مضمون "اُردو ادب کے جدید رجحانات" اگرچہ تشنہ ہو لیکن پڑھنے کے قابل ہو اس میں بعض حقیقتیں اپنے اصلی رنگ میں دکھائی گئی ہیں۔

دو غیر ملکی ناولوں کا ذکر ہو۔ ایک "زوالِ پیرس" ہو دوسرا "بیکن میں ایک لمحہ" ان کی کہانی اور کہانی کے خیالات کا خلاصہ دیا ہو۔ آخر میں ہندستانی اور انگریزی فلموں کا مختصر ذکر ہو۔ فلموں کے متعلق رائے ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے نقطۂ نظر سے دی گئی ہو۔ یہ کچھ فلموں ہی پر منحصر نہیں یہ حضرات ہر خیال، ہر کتاب، ہر شخص کو اسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ رجعت پسندی کیا ہو اور ترقی پسندی کیا۔ یہ مختلف فیہ ہو اور اس کے لیے الگ بحث کی ضرورت ہو۔

جو لوگ ترقی پسند ادب سے سوءِظن رکھتے ہیں اور جو حُسنِ ظن، دونوں کو یہ سہ ماہی کتاب پڑھنی چاہیے۔ ایک پرچے کی قیمت ایک رُپیہ اور سالانہ چندہ چار رُپے۔ چھپائی لکھائی بہت خراب ہو۔

ہمایوں، سالگرہ نمبر

یہ سال گرہ نمبر بہت قابلِ تعریف ہو۔ سب سے پہلے سالِ گزشتہ کا جائزہ لیا ہو اور بڑی خوبی اور اختصار کے ساتھ سال بھر کی اُردو کارگزاری کو بیان کیا ہو۔ اُردو کی ترقی اور حمایت میں جو جو کچھ ہوا ہو جہاں جہاں ہوا ہو جس جس نے کچھ کیا ہو، اُن کے پتے اُن کے خیالات اور کاموں کا خلاصہ سلسلے کے ساتھ چند ورق میں بڑی خوش بیانی کے ساتھ آگیا ہو۔ میاں بشیر احمد صاحب ہر سال اس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے اچھے اچھے مضمون ہیں، ادبی اور تنقیدی بھی اور مزاحیہ بھی۔ نظمیں اور غزلیں، فسانے اور داستانیں بھی ہیں۔ سب میں کوئی نہ کوئی خوبی ہو۔ اکثر مضمون قابلیت سے لکھے گئے ہیں۔ سارا نمبر ایک خوش نما گل دستہ ہو۔ ہم میاں بشیر کو اُن کے ذوق پر مبارک باد دیتے ہیں۔

ندیم کا شاد نمبر

جنوری فروری مارچ کے تینوں نمبر ملا کر شاد نمبر شائع کیا گیا ہو اور بیر حضرات نے شاد مرحوم کے کلام پر مضامین لکھے ہیں۔ اس میں ہر قسم کے مضمون ہیں۔ پہلے دو مضمون خود حضرتِ شاد کے لکھے ہوے ہیں جو اتفاق سے دست یاب ہوگئے ہیں۔ پہلے میں انھوں نے اپنی مرثیہ گوئی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہو۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں "شاید ۱۸۸۴ء میں جب کہ میں دہلی گیا تھا مولوی حالی مرحوم نے مجھ سے کچھ بند مولود کے سُنے وہ ایسے متاثر ہوگئے کہ میں کیا عرض کروں۔ پہلے وہ مرزا دبیر کے طرز کو پسند کرتے تھے۔ چناں چہ اپنے دیوان کا مقدمہ جو سُنایا تو مرزا دبیر کے کلام کی ترجیح میر صاحب پر صاف صادف تھی۔ میں نے برابر دو دنوں تک میر صاحب کا کلام سُنا سُنا کر رستے پر لگایا، میر صاحب رشید دیے۔ مجھ پر اصرار کیا کہ اس حصّے کو تم ہی لکھ دو، چناں چہ مقدمۂ دیوانِ حالی میں یہ حصّہ قریب قریب میرا لکھا ہوا ہو۔"

ہمیں اس کے ماننے میں بہت تامّل ہو۔ اوّل تو جو لوگ مولوی حالی کے ذوق اور کلام سے واقف ہیں، وہ ہرگز اسے تسلیم نہیں کرسکتے کہ وہ مرزا دبیر کو میر صاحب پر ترجیح دیتے ہوں۔ ان کے دوستوں اور جاننے والوں کو یہ معلوم ہو کہ وہ انیس کے کلام کی بے حد قدر کرتے تھے اور محاسنِ انیس پر کتاب لکھنے والے تھے۔ دوسرے مقدمہ انھوں نے دیوان مرتّب کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں لکھا۔ یہ تالیف انھوں نے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں کی تھی۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہو اور اس کے بعض مسائل پر لکھتے وقت کئی بار ہم سے گفتگو آئی۔ مولوی حالی اس قسم کے شخص نہیں تھے کہ وہ انیس کے کلام کے متعلق شاد سے کچھ لکھواکر اپنے مقدمے میں درج کرتے۔ شاد اور حالی کے طرزِ تحریر میں زمین آسمان کا فرق ہو۔ شاد کی نثر بہت ہی معمولی بلکہ فصاحت سے گری ہوئی ہوتی ہو۔ اسی کے ساتھ انھوں نے سرسید، مولوی شبلی اور پروفیسر ارنلڈ کی جو رائے اپنے کلام کے متعلق لکھی ہو، وہ بہت ہی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہو۔ پروفیسر ارنلڈ ان کے مولود کے متعلق یہ کیسے کہ سکتے تھے کہ "میں نے کئی سو کتابیں پیغمبرِ اسلام کے مولود

کے بارے میں پڑھی ہیں مگر ایسے نادر مضامین نظم میں کبھی نہیں سُنے" جب کہ وہ اردو پوری طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ شاد مرحوم کی یہ کمزوری تھی کہ وہ اپنے خطوں اور تحریروں میں اس قسم کی تعلّی کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد دوسرا مضمون مرحوم کا ایک طویل خط ہے جو مولانا سید مقبول احمد صاحب صمدانی کے نام لکھا تھا اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ حالات تو بہت کم ہیں لیکن "تنازع اہلِ وطن" کی داستان بہت طویل ہے۔ اور ایک اور مکتوب جو ڈاکٹر سید محمود کے نام ہے اس میں بھی یہی دکھڑا رویا ہے اور ناقدری کی شکایت کی ہے۔

شاد مرحوم بلاشبہ خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے اور ان کا منتخب کلام بہت قابلِ قدر ہے۔ مرثیے بھی انھوں نے (جیسا کہ وہ خود اپنے مکاتیب میں لکھتے ہیں) بہ کثرت لکھے ہیں۔ ایک مرثیہ شہادت امام حسین کے بیان میں اس نمبر میں درج ہے اور اچھا ہے۔ حمید عظیم آبادی صاحب نے خاص طور پر ان کی مرثیہ گوئی کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے اور اُن کے مرثیوں سے کچھ کچھ اقتباس بھی دیے ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر صاحب نے اپنی ایک ملاقات کا حال لکھا ہے۔ بہزاد فاطمی صاحب نے "ارشاداتِ شاد" کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں بہت مبالغے سے کام لیا ہے۔ دوسرے مضامین بھی اس عیب سے خالی نہیں۔ البتہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے احتیاط سے کام لیا ہے اور شاہ ولی الرحمٰن صاحب کی مفصلہ ذیل رائے نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ رائے بالکل صحیح ہے۔ "اُن کے ضخیم دیوان غزلیات کا غایت سے غایت چوتھائی حصہ قابلِ اعتنا ہے باقی حصہ بالکل ناقابلِ توجہ ہے، بہت سے اشعار ایسے ہیں جو شعریت سے یک سر معرّا ہیں۔" اس سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔

قوم (اڈیٹر، محمد یوسف کٹھوریہ۔ نائب مدیر، منظور احمد۔ چندہ سالانہ عام خریداروں سے تین رُپے)

یہ رسالہ انجمن ضیاءالادب دہلی کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے

مضامین نظم و نثر میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ضیاءالادب کے حالات اور کارروائیاں، معلومات عامہ، نسوانی دُنیا کا ذکر اور آخر میں بچّوں کے لیے نونہال کلب کے نام سے کچھ حصّہ ہوتا ہے۔ رسالہ دل چسپ ہے۔ فرصت کا وقت کاٹنے کے لیے اچھا ہے۔

رہنمائے تعلیم لاہور یہ رسالہ اڑتیس سال سے مسلسل سررشتۂ تعلیم پنجاب کی خدمت کر رہا ہے۔ اب اُنتالیسواں سال شروع ہوتا ہے۔ سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ کا یہ استقلال اور شوق قابلِ مبارک باد ہے۔ رسالے میں علاوہ تعلیمی معلومات اور خبروں کے ادبی اور اخلاقی مضامین اور نظمیں بھی ہوتی ہیں۔ اس سے رسالہ کارآمد ہونے کے علاوہ دل چسپ بھی ہوگیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے جنوری اور فروری ۱۹۴۴ء کا نیا رسالہ ہے۔ اس میں علاوہ تعلیمی، ادبی، اخلاقی مضامین کے مطالعے کے قابل سب سے اچھی چیز "پانی پت کا آخری معرکہ" ہے جو کاشی راے سکرٹری نواب شجاع الدولہ وزیر اودھ نے ۱۷۶۱ء میں فارسی زبان میں لکھا تھا۔ کاشی راے اس انقلاب انگیز معرکے میں موجود تھا اور چشم دید حالات لکھے ہیں۔ اس تاریخی جنگ کے حالات اس سے بہتر اور کسی تاریخ میں نہیں ملتے۔ اصل فارسی کتاب اب ناپید ہے۔ یہ حُسنِ اتّفاق ہے کہ لفٹنٹ کرنل جیمس آف دیناپور نے ۱۷۹۱ء میں اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اُسی انگریزی کا یہ ترجمہ اُردو میں ہے جو شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی بی۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ) ہیڈ ماسٹر حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

"مجلہ طیلسانین"

حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

اخبار "صحیفہ" حیدرآباد دکن کی رائے :-

"یہ رسالہ بلند معیار پر پہنچ گیا ہے یہ رسالہ بہترین معاشی، معاشرتی، علمی اور تاریخی مضامین پیش کرتا ہے"

"ہماری زبان" دہلی کی رائے :-

"بہت کم اس نوعیت کے رسالے اس ظاہری و معنوی شان کے دیکھنے میں آئے ہیں۔ واقفیت اور تحقیق سے مالامال مقالے ذہنیت افروز ہیں"

انگریزی رسالہ "ہندوستان ریویو" پٹنہ کی رائے :-

"یہ رسالہ اُردو کا ایک بہت قیمتی اور معیاری رسالہ ہے اس کا حصۂ معاشیات ساری اُردو صحافت میں اپنی نوعیت کا واحد نمونہ ہے۔ مضامین سے خود پڑھنے والوں میں بھی نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں"

قیمت سالانہ پانچ روپے۔

ملنے کا پتہ :-

دفتر "مجلہ طیلسانین" انجمن طیلسانینِ عثمانیہ حیدرآباد دکن

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کی تازہ ترین مطبوعات

کیفیہ — قیمت مجلد چار رُپے، بلا جلد تین رُپے

کتابُ الہند (حصہ دوم) — قیمت مجلد چار رُپے، بلا جلد تین رُپے

نظریۂ تعلیم (حصہ دوم) — قیمت مجلد چار رُپے

مکالماتِ افلاطون — مجلد پانچ رُپے، بلا جلد چار رُپے

حیوانیات — قیمت مجلد تین رُپے چار آنے، بلا جلد دو رُپے چار آنے

الف لیلہ ولیلہ (جلد سوم) — قیمت مجلد پانچ رُپے، بلا جلد چار رُپے

ہمارے بینک — قیمت مجلد دو رُپے بارہ آنے، بلا جلد ایک رُپیہ بارہ آنے

مشاہیرِ یونان و رُومہ (حصہ اوّل) — مجلد چار رُپے آٹھ آنے، بلا جلد تین رُپے آٹھ آنے

ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ — قیمت مجلد چار رُپے آٹھ آنے، بلا جلد تین رُپے آٹھ آنے

تنقید شعر العجم — قیمت مجلد چھ رُپے، بلا جلد پانچ رُپے

دیوانِ بہرام — مجلد دو رُپے چار آنے۔ بلا جلد ایک رُپیہ چار آنے

پودے اور اُن کی زندگی — مجلد تین رُپے، بلا جلد دو رُپے

فردوسی پر چار مقالے — مجلد تین رُپے آٹھ آنے، بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے

چند ہم عصر — قیمت مجلد ڈھائی رُپے، بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے

اصطلاحاتِ پیشہ وراں (جلد ششم) — مجلد دو رُپے بارہ آنے، بلا جلد ایک رُپیہ بارہ آنے

حکایاتِ اغانی (جلد اوّل) — مجلد پانچ رُپے، بلا جلد چار رُپے

مانڈو — قیمت مجلد تین رُپے، بلا جلد دو رُپے

بُدھ اور اُس کا مت — مجلد دو رُپے آٹھ آنے، بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے

اخبارِ مجموعہ — مجلد تین رُپے آٹھ آنے، بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے

دیوانِ نظیر اکبرآبادی — مجلد [illegible] بلا جلد [illegible]

مینیجر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نمبر ۱، دریا گنج، دہلی

رسالۂ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ع سے رسالۂ "سائنس" بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوئے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:-

معتمد مجلس ادارت رسالۂ "سائنس"

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:- رسالۂ سائنس (سہ ماہی) کے پرانے پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ع) تک دفتر انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی سے بہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 24 JANUARY 1944 No. 1

THE URDU

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Delhi.

جلد ۲۴ | اپریل ۴۴ء | نمبر ۲

اُردُو

انجمن ترقیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رِسالہ

ایڈیٹر:- عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اردو (ہند) دہلی

اُردو

۱ ۔ یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے ۔

۲ ۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے ۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ ۔

۳ ۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رپے ۔ نمونے کی قیمت ایک رپیہ بارہ آنے ۔

۴ ۔ مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۰ دریا گنج ۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے ۔

المشتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

نرخ نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ	۸ رپے	۳۰ رپے
یک کالم (آدھا صفحہ)	۴ رپے	۱۵ رپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ رپے ۴ آنے	۸ رپے

جو اشتہارات چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے ان کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے، البتہ جو اشتہارات چار یا چار سے زیادہ بار چھپوائے جائیں گے ان کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد۔ منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے ۔

المشتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

اُردُو

جلد ۲۴	اپریل سنہ ۱۹۴۴ء	نمبر ۲

انجمنِ ترقّیِ اُردُو (ہند) دہلی

کا

سہ ماہی رسالہ

مقامِ اشاعت : دہلی

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلّی ماراں دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

اُردو

جلد ۲۴ ——— اپریل سنہ ۱۹۴۴ء ——— نمبر ۲

فہرست مضامین

عرض داشت برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاعِ شمال ومغرب

بہ حضور جناب نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاسِ کونسل

(منقول از اخبار "سائنٹی فک سوسائٹی" علی گڑھ، مورخہ ۹ر اگست سنہ ۱۸۶۷ع)

[کل ہند اُردو کانفرنس، ناگ پور نے حال میں یہ قرارداد منظور کی ہے کہ انجمنِ ترقیِ اُردو سے درخواست کی جائے کہ وہ ہندستان (انگریزی علاقے) کے کسی مقام میں ایک یونی ورسٹی قائم کرنے کے امکان اور ابتدائی تدابیر پر غور کرے جس میں اعلا تعلیم کا ذریعہ اُردو ہو اور جو سرکاری طور پر بھی مسلّم ہو۔ انجمن اس دُشوار ذمّے داری سے عہدہ برآ ہونے پر متوجہ ہے لیکن اس سلسلے میں ذیل کی عرض داشت خاص دل چسپی سے پڑھی جائے گی جسے آج سے تین پیڑھی پہلے سرسیّد مرحوم نے تحریر کیا اور محضر کے طور پر بہت سے ہندو مسلمان حضرات کے دستخط کرا کے سرکارِ انگریزی میں پیش کیا تھا۔

اس عرض داشت میں مغربی علوم کی اعلا تعلیم دیسی زبان کے ذریعے دینے کی دلیلیں بڑی قوت اور قابلیت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اور زبانِ انگریزی کی تعلیم کو مفید اور ضروری بتانے کے ساتھ، یہ جتایا گیا ہے کہ اگر دیسی زبان ذریعۂ تعلیم نہ ہوگی تو جدید علوم ہندستان میں عام اشاعت نہ پا سکیں گے۔

اس تحریر سے جسے اب ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہی، جہاں سید احمد خاں مرحوم کی حیرت انگیز فراست اور دور بینی کا ثبوت ملتا ہی، وہاں اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہوتا ہی کہ (۱) وہ اعلا تعلیم کو طبقۂ خواص تک محدود رکھنے کے حامی تھے اور (۲) اُس تعلیمی حکمت عملی کے سراسر موید تھے جسے بدقسمتی سے (لارڈ) میکالے کی پُرجوش سفارش پر سرکارِ انگریزی نے ہندستان میں اختیار کرلیا اور اب تک اُسی ڈگر پر چل رہی ہی۔ ادارہ]

ہم برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاعِ شمال و مغرب کے ممبر جن کے دستخط اس عرض داشت کے ذیل میں ثبت ہیں، بہ دل و جان گورمنٹ کی اُن سخت کوششوں سے بہ خوبی واقف اور ان کی قدر و منزلت کرنے والے ہیں۔ جو اُس نے ہندستانیوں کی عام تعلیم کے باب میں کی ہیں۔ اور ان کی عوض میں ہم سب پر گورمنٹ کی نہایت بڑی احسان مندی واجب اور لازم ہی، ہم کو اچھی طرح یقین ہی کہ گورمنٹ نے اس تعلیم کے کام کو نہایت خالص نیت اور بالکل بے غرضی سے اختیار کیا ہی۔ تعلیم سے گورمنٹ کا اصل مقصود بالکل لوگوں کی بہبودی اور فلاح ہی وہ اپنی رعایا کی حالت کو ترقی دینے کے باب میں ہمیشہ ساعی رہتی ہی۔

اس یقین کے متنقل اثر سے جو ہمارے دلوں پر اچھی طرح نقش پزیر ہوگیا ہی پیش گاہِ حضور میں ایسی چند تدبیریں پیش کرنے کے لیے ہماری ڈھارس بندھی ہی جن کا عمل درآمد ہوجانے پر ہم کو کامل بھروسا ہی کہ اس موجودہ سرشتۂ تعلیم سے لوگوں کو حد سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ اور ہم کو بہت بڑی توقع ہی کہ گورمنٹ کمال فیاضی سے ان تدبیروں پر ازبس سنجیدہ اور پسندیدہ توجہ فرمائے گی۔

ہم اقرار کرتے ہیں کہ جو علوم و فنون اب ایشیا کے ملکوں میں جاری ہیں۔ جن کے موضوع اور تاریخی حالات ہمارے بہت سے مشہور مصنفوں کی کتابوں میں موجود ہیں اور اپنی اصل حالت میں بغیر کسی طرح کے تغیر و تبدل اور ترقی کے ہم تک پہنچی ہیں اُن میں سے اکثر ایسے اصول پر مبنی ہیں جو زمانۂ حال میں علم کی ترقی ہونے سے بالکل غلط اور ناجائز ٹھیرے ہیں۔ اور بعضے علم ایسے ہیں کہ اگرچہ بنیاد اُن کی صحیح اور مضبوط اصول پر ہی مگر زمانۂ حال کی نئی نئی تحقیقاتوں اور تلاشوں کے

سبب سے ان کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا ہو اور بعضے علم ایسے ہیں کہ اب تحصیل ان کی محض فضول اور غیر مروّج ہوگئی ہو اور برخلاف اس کے آج کل دُنیا میں بہت سے ایسے علوم و فنون کی گرم بازاری ہو جو زمانۂ حال کے ایجاد ہیں ۔ اور ان کا حال ہمارے بزرگوں کو بالکل معلوم نہ تھا ۔ پس یہ ایک ایسی بات ہو جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ایشیا میں جو علوم اور زبانیں اب جاری ہیں ان کی تحصیل ہمارے علم کی ترقی اور روشن ضمیری کے واسطے محض غیر کافی ہو اور یہ بات بھی ایسی ہی تحقیق اور مسلّم ہو کہ مذکورہ فائدے کے حاصل کرنے کے واسطے کوئی ذریعہ اس سے بہتر نہیں ہو کہ ہم انگریزی زبان کو سیکھیں اور اب جو مالا مال خزانے علم و ہنر کے زمانۂ حال میں جمع اور قائم ہوئے ہیں ان تک اس زبان کے ذریعے سے رسائی حاصل کریں ۔ انھی وجوہات کے لحاظ سے ہم سب اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کی جو تدبیر اس مُلک میں انگریزی زبان کے رواج دینے کی ہو وہ حقیقت میں نہایت عمدہ اور مناسب سوچی گئی ہو ۔

مگر یہ بات ممکن ہو کہ جس حالت میں ہم ایک اچھے کام کے کرنے پر کوشش کرتے ہوں تو ہم اور ایسے کاموں سے جو زیادہ ضروری اور زیادہ مرتبے کے ہیں غافل رہیں اور اسی طرح سے ان کوششوں کی قدر و منزلت کو گھٹا دیویں جن کو اگر بطورِ مناسب اور بلا رُو رعایت کے کیا جائے تو ہم کو وہ نہایت اعلا درجے کی کامیابی پر پہنچادیں ۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ غلطی تعلیم کے سررشتۂ حال میں ہوئی ہو ۔ ہماری بڑی آرزو یہ ہو کہ یہ سررشتہ ایسا بے عیب اور بے داغ ہوجائے جیسا کہ حوصلہ توقّع میں سماسکتا ہو اور ہم اس بات کا خیال کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہم ایک اچھے کام کے پورا کرنے پر کمر باندھے رہنے سے ایسے مطلبوں سے غفلت کر رہے ہیں جو بہت بڑی قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ضروری ہیں ۔ جو کوئی گورنمنٹ خصوصًا انگریزی گورنمنٹ اپنی رعایا کے بہت سے گروہوں کو عام تعلیم دینے کا کام اختیار کرے تو اس کا فرض ایسے علم اور پند اور نصیحت کی تعلیم دینا ہو جو لوگوں کے روزمرّہ کے کاروبار میں کام آوے اور فائدہ بخشے اور اس سے ان کی عادت اور اخلاق کی تہذیب اور اصلاح ہووے اور لوگوں کو قدرت اور علم کے حقائق اور حالات

سے جہاں تک ممکن ہو آگاہی حاصل ہو۔ اور ان کے دلوں میں عمدہ عمدہ اصول اور بڑے بڑے اعلیٰ درجے کے خیال پیدا ہوویں۔ مگر اس بات کی احتیاط رہے کہ اِن اصولوں اور خیالوں کی اصل وبُنیاد کسی مذہب کے مسائل یا کسی قومی یا مذہبی رسم و رواج پر نہ ہووے بلکہ وہ قدرتی اخلاق کے قوانین اور علی العموم عقل کے تسلیم کرلینے پر مبنی ہو یہ کام مُشکل تو بے شک ہی مگر غیر ممکن نہیں اور اگر اس کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے پر کوشش کی جائے تو نتیجے اُس کے مُلک کے حق میں نہایت عمدہ ہوں۔ چناں چہ لوگوں کی عقل کے روشن ہونے سے ان کے مال و دولت اور جسمانی فائدوں کو ترقی ہوگی جب کہ وہ ان سب چیزوں کی ماہیت سے جو ان کے چاروں طرف نظر آتے ہیں واقف ہوجائیں گے۔ تو ایسے فاسد خیالوں اور بیہودہ خوف و اندیشوں کو آیندہ فوراً اور یک بہ یک قبول نہ کرلیا کریں گے جس سے لوگوں کی طبیعتوں کو پریشانی حاصل ہوتی اور سب میں ایک ہل چل پڑجاتی ہی۔ اور عام امن و آسایش اور انتظام میں خلل واقع ہوتا ہی۔ علاوہ اس کے جو نفرت اور عداوت نسل اور مذہب کی غیریت سے پائی جاتی ہی وہ قدرت اور عقل کی روشنی کے آگے نیست ونابود ہوجائے گی اور بجائے ان سب کے آپس میں لحاظ و پاس اور بھروسا قائم ہوجائے گا۔

جو گورمنٹ سوائے اِن غرضوں کے اور کسی قسم کی اور شاید اس کم تر خواہش کے سبب سے اپنی رعایا کی تعلیم پر آمادہ ہو کہ ان کو صرف اس قدر تعلیم کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولی کاروبار کے انجام دینے کے لائق ہوجائیں تو وہ گورمنٹ رعایا کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرے گی جو ایک آدمی اپنا بوجھ کھنچوانے یا اور کوئی کام لینے کی غرض سے کسی جانور کے ساتھ اس کے سدھانے میں کرتا ہی مگر ہم کو دل سے یقین ہی کہ گورمنٹ ہند کی یہ غرض اور ایسا ارادہ نہیں ہی بلکہ اس بات کو ہم تحقیق جانتے ہیں کہ اس نے جو کام تعلیم کا اختیار کیا ہی وہ بڑے بڑے اعلیٰ درجے کے مقصدوں اور ارادوں سے شروع کیا ہی چناں چہ اس کا مشہور عمدہ ثبوت وہ تین یونی ورسٹیاں یعنی مدرسہ ہائے اعظم ہیں جن میں علی العموم علم تک ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی دست رس ممکن ہی۔ اس لیے ہم اپنی گورمنٹ کو اس بات کے تصفیے پر متوجہ کرتے ہیں جو سرشتہ تعلیم کا آج کل سرکار کا درست

اور قائم کیا ہوا موجود ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس سے تعلیم کے اصلی مقصد جن کا تذکرہ بالاجمال اوپر ہوا حاصل ہو ویں ہم نیازمندی سے عاجزانہ عرض کرتے ہیں کہ ہماری رائے میں اس سررشتہ سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوں گے سررشتۂ مذکور کے ذریعے سے چودہ کروڑ آدمیوں میں جو گورنمنٹ ہند کے محکوم اور مطیع ہیں چند آدمیوں کو ایک عمدہ اور معقول تعلیم کے تمام حظ اور لطف اور فائدے حاصل ہوئے ہوں مگر جب کہ بہت سی خلقت کا ان چند تعلیم یافتہ سے مقابلہ کیا جائے تو ان کی تعداد نہایت بے حقیقت اور خفیف ٹھیرتی ہے کیوں کہ خلقت کے اس انبوہِ کثیر کو روشن ضمیری حاصل ہونا تو ایک طرف روشن ضمیری کا پرتو بھی اس پر نہیں پڑا ہے، غرض کہ مُلک بہ اعتبار ہیئت مجموعی اپنی اصلی تاریکی کی حالت میں ہے اور اس نے علم اور شایستگی کے کسی فائدے کا مزہ نہیں چکھا۔ ہم عرض کرچکے ہیں کہ اس عرض داشت کے پیش کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ایشیا کے مُردہ علوم و فنون شایستگی اور خوبی کو تر و تازہ کیا جائے بلکہ اصل غرض یہ ہے کہ پچھلے زمانوں میں اہلِ یورپ نے جو علم و ہُنر بہم پہنچایا ہے اور وہ زیادہ عمدہ اور مفید ہے اس کا رواج ملک میں ہوئے۔ سوائے اس کے ہماری خواہش یہ ہے کہ بجائے چند آدمیوں کے، گروہوں کے گروہوں کو فائدہ پہنچے۔ اخلاقِ پسندیدہ اور قومی دانائی کی نعمتیں تمام ملک پر پھیل جائیں۔

بالفعل بڑے بڑے علموں سے صرف زبانِ انگریزی کے ذریعے سے واقفیت حاصل ہوسکتی ہے اور یہی بات ایسی ہے جس کے سبب سے ملک میں مفید علموں کے عموماً جلد شائع ہونے میں بڑے بڑے موانع اور ہرج واقع ہوتے ہیں۔ اور اسی کے باعث سے لوگوں کی رائے اور خیالات میں بہتر تبدیلی ہونے میں توقف ہوتا ہے اور عام تعلیم مضمحل اور پژمردہ ہوگئی ہے اور چند لوگ ایسے ذریعے سے جس تک رسائی مشکل ہے اس علم کے ثمروں کو حاصل کرسکتے ہیں جس تک سب کی رسائی آسان اور سہل ہونی چاہیے۔

یہ جو حال تعلیم کا ہورہا ہے اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ لوگ انگریزی کی تحصیل سے گریز یا نفرت کرتے تھے۔ ہم کو یقین ہے کہ وہ زمانہ ایسا گزر گیا کہ پھر کبھی نہ آئے گا انگریزی کی ضرورت اور

اس کے فائدوں کو لوگوں نے اچھی طرح سمجھا اور دیکھا اور علانیہ اقرار کیا ہو اور ان میں سے اکثر نے اپنی رایوں کو اپنے ہم وطنوں کی بڑی بڑی شان دار مجلسوں میں اس امر کی نسبت ظاہر کیا ہو۔ چناں چہ ہم خاص ایک شخص یعنی سرسید احمد خاں صدر الصدور علی گڑھ کے قول نقل کرتے ہیں :-

"خاص کر میں تمھاری توجہ اس بڑی ضرورت کی طرف مائل کرنا چاہتا ہوں جو انگریزی کی تحصیل کرنے سے اہلِ ہند کو ہو اس کی تحصیل ان بڑے فائدے بخشنے والے عہدوں کے باعث سے ضروری نہیں جو اس کے سبب سے حاصل ہوتے ہیں ۔ بلکہ اُن بے نہایت فائدوں کے سبب سے ضروری ہو جو زندگی کے روزمرہ کے ذرا ذرا سے کاروبار میں بھی ہوتے ہیں ۔ چناں چہ انگریزی کا پورا علم ہم کو اس بات کے قابل کرنے کے لیے ضروری ہو کہ ہم اپنے مُلک کے قوانین کو بہ خوبی سمجھ سکیں جو گورنمنٹ کے ایکٹوں اور روئدادوں معمولی میں ظاہر ہوتے ہیں اور تجارت کام یابی کے ساتھ کرسکیں اور اہلِ یورپ کے ساتھ ربط ضبط بڑھا سکیں ۔ اور بہت سے علوم و فنون میں جن کی بحث بہت قابلیت سے انگریزی زبان میں ہو کامل ہوسکیں "

تعلیم جو اب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہو اس کی اس حالت کے اور بھی کئی باعث ہیں ۔ جن میں سے سب سے بڑا باعث یہ ہو کہ صرف انگریزی کی تحصیل کے ذریعے سے جیسے کہ اب مروج ہو علی العموم ہر ایک طالب العلم بہ استثناے بعض طالب علموں کے علم کے اس قدر درجے یا اخلاق اور تربیت کے اس قدر مرتبے کو نہیں پہنچتا ، یا اس کی ذات سے ظاہر نہیں ہوتا جس کی لوگ تعظیم اور تکریم حرص و تقلید کریں ، یا جس سے ان کے والدین کو یہ معلوم ہووے کہ اُنھوں نے نہایت اعلا درجے کی تعلیم پائی ہو ۔ البتہ سیکڑوں میں سے ایک کا اس درجے کی عظمت تک پہنچنا ممکن ہو جس کی بڑی خواہش کی جاتی ہو ۔ مگر ایسے طالب علموں کی تعداد بہت خفیف اور تھوڑی ہو ۔ اور ہزاروں جاہلوں پر جو ان کے گرد و پیش موجود ہیں کچھ اثر ان کا نہیں ہوتا ۔

اس نقصان کے علاج کی غرض سے ہم اپنی تجویزیں پیش کرنے کے آرزومند ہیں ۔ ہماری خواہشیں یہ ہیں کہ جو کوششیں انگریزی زبان کی اشاعت کے لیے بالفعل کی جاتی ہیں وہ جاری

رہیں بلکہ ان کو وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہے۔ مگر ایک اور طریقہ تعلیم کا جو عام تعلیم کی ترقی کے لیے زیادہ موثر تصور کیا جاتا ہے قائم اور جاری کیا جائے اور اس کے ذریعے سے انگریزی زبان کو بجائے بہت تھوڑے آدمیوں کے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا وسیلہ بنایا جائے۔ جو طریقہ ہم تجویز کرتے ہیں وہ تعلیم کے طریقۂ مروّجہ حال سے گو علاحدہ اور غیر ہو مگر اس سے مخالف نہیں ہے نتیجہ دونوں کا انجام کو ایک ہی حاصل ہوگا۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ بجائے اس بات کے کہ صرف انگریزی ہی زبان میں تعلیم کی جاوے دیسی زبان کو بھی تعلیم کے اعلا درجے کے مضمون اور مطالب میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ گردانا جاوے۔

بادی النظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تجویز کا ایک مدت ہوئی تصفیہ ہوچکا مگر ہم اس کے سخت مخالف ہیں۔ کیوں کہ ہم جو کچھ تجویز کرتے ہیں اس پر کبھی مباحثہ تک بھی نہیں ہوا ہے۔ جس بات کا تصفیہ ہوچکا وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کا رواج اس ملک میں ہونا چاہیے یا مشرقی زبانوں کا مشرقی زبانوں میں جو فضول علم و ہنر مندرج ہیں ان کی تحصیل کو ترقی اور رواج دیا جاے یا نہیں۔ جو تصفیہ اس امر کا ہوا اس سے ہم کو بخوبی اتفاق ہے۔ وہ تصفیہ ہر طرح سے مقبول اور پسندیدہ ہے مگر جس تجویز کو ہم گورمنٹ اور لوگوں کی غور و فکر اور تصفیہ کرنے کے واسطے پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس حالت میں ہم انگریزی کی تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی میں کوشش کریں تو کیا ہم کسی دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کرسکتے جو ایک غیر ملک کی زبان کی نسبت علم کے عموماً شائع ہونے اور لوگوں کے خیالات اور طور و طریقے اور اخلاق کی ترمیم کے واسطے زیادہ تر مناسب ہو۔ کیا اہل یورپ کی روشن ضمیری اور شایستگی اور فضل و کمال کی تعلیم ایسی زبان کے ذریعے کہ جس سے وہ ناآشنا ہیں اور وہ ایک غیر ملک کی ایسی زبان ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں کہ ہندستان مقبوضہ سرکار کے چودہ کروڑ باشندے کرلیویں بہتر اور علاحدہ نہیں ہوسکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ایک ہی زبان اور وہ بھی نئی سکھائی جاسکے۔ یہ کب ہوسکتا ہے کہ ہم خداوند تعالیٰ کی اس قدرت کے برخلاف عمل کرسکیں جو بابل کے منار پر اس نے دکھائی پس اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس

کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہلِ یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم اور فضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبانوں کو ذریعہ ٹھیرایا جائے جو معقول رائیں کہ ہالسن صاحب نے ہندستان میں علم پھیلنے کے لیے ایک جلسے کی بُنیاد پڑنے پر ظاہر کیں، ان کا ذہن نشین کرنا نہایت مناسب اور بہت اچھا ہو۔ چناں چہ انھوں نے فرمایا ہو کہ میرے نزدیک اگر ہم کتابی تربیت کے ذریعے سے ہندستان کو فی الحقیقت فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہ ہم کو اسی طرح پر پہنچانا چاہیے جس طرح کہ ہم اس کو اپنی حکومت اور اپنے قوانین سے پہنچاتے ہیں یعنی کتاب کے علم کو جھگڑوں اور دقتوں سے پاک صاف اور عام فہم کرکے ان کی خاص زبان سے اس کو ہم رشتہ اور ہم پیوند کر دیں تاکہ بہت لوگوں کی رسائی اس تک ہونے لگے۔ اور انھی مقصدوں کو اصلی اور مستحکم سمجھ کر ان کی تہذیب اور تربیت کو اپنا بڑا منشا قرار دیویں۔ علم کی اس طرح پر تعلیم کی جاوے کہ وہ روزمرہ کے کام میں آئے اور فائدہ بخشے اور اس کی تحصیل میں ہر قسم کی آسانی کرنی چاہیے جب کہ یہ سب میری خواہشیں ہیں تو میں علم کی تحصیل کے واسطے زبان کے ذریعے کو اس لیے ازبس ترجیح دیتا ہوں کہ اوّل تو طالب علم کو اس میں بہت سی آسانی ہوتی ہو دوسرے اس کی یہ خاصیت ہو کہ جو علم اس زبان کے ذریعے سکھایا جاتا ہو اس کا اثر عمل میں بہت قوی اور مفید ہوتا ہو۔ علاوہ اس کے اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہو کہ اس کے ذریعے سے علم خوب شائع ہوتا ہو۔

اگر علم کی تحصیل غیر مُلک کی زبان کے ذریعے سے کی جائے تو اس میں دوچند وقت صرف ہوتا ہو اوّل تو خود زبان ہی کے سیکھنے میں وقت خرچ ہوتا ہو اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالب علم اس قدر وقت کھوتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعے سے جس کو اُنھوں نے حاصل کیا ہو کسی مفید علم کی تحصیل کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا ہو۔ بہت تھوڑے طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو بہ خوبی علم تحصیل کرلیتے ہیں دوسرے علم کی تحصیل خاص بھی کے ہی فائدوں کے لحاظ سے ضروری ہوتی ہو اور شاذ و نادر ایسے طالب علم پائے جاتے ہیں جن کو زبان اور علم دونوں کے تحصیل میں کام یابی حاصل ہو مگر جب کہ اس کے دیس کی زبان میں علم کی تعلیم کی جاتی ہو تو طالب علم کا کچھ بھی وقت ضائع

نہیں ہوتا اور یہ بات تحقیق ہو کہ اُن مضمونوں سے اُس کو کچھ کچھ آگاہی ہوگی جن پر اس کی رسائی اس حالت میں کہ وہ زبان جس کے ذریعے سے اُن مضمونوں کو حاصل کیا غیرملکی ہوتی اگر غیرممکن نہ ہوتی تو جیساکہ اکثر ہوتا ہو نہایت مشکل ضرور ہوتی ۔

ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ان لفظوں سے کہ تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے ہونی چاہیے ہماری یہ مراد نہیں ہو کہ ایشیا کے علوم و فنون پھر تر و تازہ کیے جائیں اور ان کی تعلیم ہو بلکہ ہم صرف اس بات کے خواست گار ہیں کہ جو علوم و فنون بالفعل یورپ میں مروج ہیں ان کو شائع کیا جاوے کیوں کہ بجز اس کے ہماری اور کچھ غرض نہیں ہو کہ اہلِ یورپ کی روشن ضمیری تمام ہندستان میں عموماً پھیل جائے ۔

دو کالج اب ایسے موجود ہیں جن کی سند ہم اپنی تجویز کے مفید ہونے کی تائید میں پیش کرتے ہیں ایک تو ٹامسن سول انجنیرنگ کالج روڑکی اور دوسرا میڈیکل کالج آگرہ کی شاخ اردو روڑکی کالج کے انگریزی اور اردو فریقوں میں سے ہر ایک کو ایک ہی قسم اور ایک ہی درجے کے علم سکھائے جاتے ہیں یعنی جن کتابوں کی تحصیل اردو فریق کے طالب علم کرتے ہیں وہ کتابیں بالکل ان کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو انگریزی طالب علموں کے استعمال میں ہوتی ہیں ۔ امتحان کے سوالات دونوں فریق کے یکساں ہوتے ہیں ایک بند سوالوں کا انگریزی میں اور دوسرا اردو میں دیتے ہیں جو انگریزی کا ٹھیک ترجمہ ہوتا ہو ۔ امتحان کے نتیجے بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں کبھی اردو فریق کا طالب علم انگریزی فریق والے اپنے ہم سر سے بہتر نمبر حاصل کرتا ہو اور کبھی انگریزی طالب علم اپنے ہم سر اردو کے طالب علم سے سبقت لے جاتا ہو دونوں فریق کے طالب علموں کو مساوی فائدے حاصل ہوتے ہیں صرف وہ ذریعہ مختلف ہوتا ہو جس سے وہ علم کی تحصیل کرتے ہیں ۔ علاوہ اس کے میڈیکل کالج آگرہ میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی ہو کہ اردو کے طالب علم اپنے انگریزی کے ہم سر طالب علموں سے اُن مضمونوں کے بہ خوبی تحصیل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہوں جو دونوں کو ایک ہی معین حد تک یکساں طریق پر سکھاتے ہیں ۔

پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ ٹھیرایا جائے تو اسی درجے کا علم جس تک اب چند ایم اے کے سندیافتہ طالب علموں کو رسائی ہوئی ہو بے انتہا لوگوں کو حاصل ہونے لگے گا۔ اب جو سرشتۂ تعلیم کا غیرملکی زبان کے ذریعے جاری ہو اس کی بدولت طالب علم جس علم کو ایک مرتبہ حاصل کرتا ہو اس کو وہ یونی ورسٹی کے چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام کاج میں مصروف ہونے کے بعد جلد بھول جاتا ہو اور جلد اس کے ذہن سے وہ علم اُتر جاتا ہو۔ مگر جو طریقہ ہم نے تجویز کیا ہو اس کے ذریعے سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ہوجائے گا صرف وہ ہی باقی اور برقرار نہیں رہے گا بلکہ علم کے تحصیل کا ذریعہ اس معمولی زبان کے ہونے سے جس میں ہر وقت اس کے خیالات ظاہر اور پیدا ہوتے ہیں وہ علم طالب علم کی استعداد اور قابلیت کی مناسبت سے ہمیشہ ترقی اور شگفتگی پاتا رہے گا۔

اس بات کا خیال کرنا بے جا ہو کہ دیسی زبان کے ذریعے اعلیٰ درجے کی تعلیم کرنا انگریزی زبان کی اشاعت کو مضر اور ہارج ہوگا کیوں کہ یہ کہنا بھی تو اسی طرح سے صحیح نہیں کہ نہر اور سڑکوں دونوں کا ایسے مقاموں میں بنانا جہاں دونوں کی ضرورت ہو مُضر اور ایک دوسرے کا مخالف اور مانع ہوگا حالاں کہ یہ دونوں کام ایسے جُداگانہ ہیں کہ اپنی ذات سے ہر ایک فیض بخش ہو اور ایک دوسرے کا ہارج اور مزاحم نہیں۔ انھی وجوہات سے تعلیم کا انگریزی میں ہونا اور علی العموم تربیت کا دیسی زبان کے ذریعے سے ہونا ایسے دو متفرق کام ہیں کہ دونوں ایک اچھے نتیجے کا ممد و معاون ہیں۔ حقیقت میں یہ دونوں دو جُدا جُدا آلے ایک ہی قسم کے نتیجوں کے حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں بلکہ اچھی طرح یقین ہو کہ اگر اہلِ یورپ کے علوم اور ان کے نتیجوں کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے کی جائے تو اس سے انگریزی زبان کی تحصیل کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور ہندستانیوں میں انگریزی کے عموماً پھیلنے میں اس سے بڑی مدد ہوگی۔ بالفعل ہندستانیوں میں ان علموں اور فضل کی تعظیم و تکریم بہت سی نہیں ہو جو اہلِ یورپ کو حاصل ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہو کہ یورپ کی تحصیل اور تحقیق اس سے برتر نہیں ہو جو ایشیا والوں کو پہلے حاصل تھی اس کی یہی وجہ ہو کہ ہندستانی اہلِ یورپ کے علم تربیت سے

بالکل واقف نہیں ہیں اور یہ اُن کی ناواقفیت ایسی ہے کہ جب تک ان کو اس کے دُور کرنے کا ذریعہ حاصل نہ ہوگا جیسا کہ اب تک حاصل نہیں ہے اس وقت تک وہ ناواقفیت قائم رہےگی۔ فرض کیا جائے کہ ایک ہندستانی کلکتہ بلکہ انگلستان کی کسی یونی ورسٹی میں علم تحصیل کرکے گھر کو واپس آئے اور ایم اے یا ایل ایل ڈی کی سند کے تمام اعزاز اس کو حاصل ہوے ہوں لیکن جب وہ اپنے دوستوں سے گفتگو کرےگا تو جو علم اس نے حاصل کیا ہے اس کا کچھ بھی حال ان کو نہیں بتاسکےگا۔ انگریزی اصطلاحیں اور الفاظ تو اس کے دل میں بھرے ہوں گے مگر مطلب اور منشا اپنی دیسی زبان میں مہارت نہ رکھنے کے سبب سے اپنے دوستوں کے رُوبرُو بالکل نہیں بیان کرسکےگا۔ اسی وجہ سے اس کا علم اس کے دوستوں اور واقف کاروں کو کچھ فائدہ نہ بخشےگا۔ اور اس کے علم کو ذلیل اور حقیر سمجھیں گے۔ اب اگر تعلیم اس کی دیسی زبان کے ذریعے ہووے اور وہ تمام لوگوں پر جو اس سے ملتے جُلتے ہیں اپنے علم اور تجربوں کو فوراً ظاہر کرسکے تو ان میں اس کی کسی قدر زیادہ عزّت اور بڑائی ہو اور ناواقفیت کی وجہ سے نفرت کرنے کی بجائے لوگ اس کی حرص اور تقلید کریں۔ اور ایک برتر درجے کی تربیت کے عمدہ نتیجوں کے ان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہونے سے ان کو بھی اس کی مانند علم حاصل کرنے کی ترغیب ہو اور اس کا ایسا اثر ہو کہ زمانۂ حال کے علموں کی تحصیل کا شوق لوگوں کے دلوں میں پھیل جائے۔

وجوہاتِ مسطورہ بالا کی رُو سے ہم مسکینی اور نہایت عاجزی سے گزارش کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہند اعلیٰ درجے کی تعلیمِ عام کا ایسا سررشتہ قائم کرے جس میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے ہُوا کرے اور دیسی زبان میں انھی مضمونوں کا امتحان سالانہ ہُوا کرے جن میں کہ اب طالب علم کلکتہ کی یونی ورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں اور جو سندیں اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کے مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کی عوض میں عطا ہوتی ہیں وہی سندیں اِن طالب علموں کو عطا ہُوا کریں جو اِنھی مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔ حاصل یہ ہے کہ خواہ تو ایک اُردو فریق کلکتہ کی یونی ورسٹی میں قائم کیا جائے

یا ممالک شمالی و مغربی میں ایک یونی ورسٹی دیسی زبان کی علاحدہ مقرر کی جائے۔

گورنمنٹ پنجاب نے مشرقی زبانوں کی ایک یونی ورسٹی کی ضرورت کو تسلیم کرکے اس کی بنیاد ڈالنے کی کوشش شروع کی ہو اس یونی ورسٹی کا مقصود اور منشا مشرقی زبانوں کا شگفتہ اور سرسبز کرنا ہو اور یہ یونی ورسٹی ایک ایسا ذریعہ ہوگی جس کی بدولت اہلِ یورپ کے علم اور شائستگی اور تربیت ہندستان میں پھیلے گی۔ جس سے ہندستان کی حالت بالکل بدل جائے گی۔

یہ بات البتہ سچ ہو کہ بالفعل ایسی کتابیں دیسی زبانوں میں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے طالب علم اس درجے تک علم کی تحصیل کرسکے جو اب یونی ورسٹی میں امتحان دینے کے واسطے ضرور ہوتا ہو مگر ایسی کتابوں کا موجود ہوجانا کوئی مشکل امر نہیں ہو۔ جو کتابیں یونی ورسٹی کے امتحان کی فہرست میں مندرج ہیں، ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہوسکتے ہیں۔ اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہوسکتی ہیں۔ چناں چہ بہت سے عالم فاضل اس کام کے لائق موجود ہیں۔ اور علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی اسی کام کو انجام دے رہی ہو۔ اس نے حال ہی میں ایلفنسٹن صاحب کی مشہور تاریخ ہندستان کا ترجمہ مشتہر کیا ہو جو ایک کتاب یونی ورسٹی کے امتحان کے مضمونوں میں سے ہو اور آیندہ بھی وقتاً فوقتاً سوسائٹی اسی قسم کے ترجمے چھاپتی رہے گی۔

خاتمے پر ہم اپنا یہ قوی یقین ظاہر کرتے ہیں کہ جس تجویز کی ہم تائید کرتے ہیں اگر اس کو جاری کیا جائے تو اس مُلک کی حالت کو ازسرِنو عمدہ اور بہتر کرنے اور اس کے باشندوں کی طبیعتوں میں سے غلطی اور جہالت کے دور کرنے اور سب حاکم محکوموں کو برابر بہت سا فائدہ پہنچانے کا یہ تجویز ایک بڑا موثر وسیلہ اور ذریعہ ہوگی۔ ہم اس لیے نہایت ادب اور بھروسے کے ساتھ امید رکھتے ہیں کہ ہماری روشن ضمیر گورمنٹ ہند جس نے اپنی ہندستانی رعایا کی بہبودی اور ترقی کے لیے ہمیشہ اپنی آرزو اور فکر ظاہر کی ہو اس بڑے پایہ کی تجویز پر جو اب ہم پیش کرتے ہیں اپنی نہایت سنجیدہ اور پسندیدہ توجہ فیاضی سے کرے گی۔ الٰہی آفتاب، دولت و اقبال ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہے۔

عرض داشت کی رسید از جانب حکومتِ ہند

(منقول از اخبار "سائنٹی فک سوسائٹی" علی گڑھ، مورخہ ۲۳ر اگست سنہ ۱۸۶۷ع)

چٹھی

بہ نام راجا جے کشن داس بہادر و دیگر ممبرانِ برٹش انڈین ایسوسی ایشن ممالکِ مغربی و شمالی مقام شملہ

مورخہ ۱۲ر اگست سنہ ۱۸۶۷ء

اے صاحبو ـــــ آپ کی عرض داشت تعلیم کے باب میں مورخہ یکم ماہِ حال مقامِ علی گڑھ سے بہ جنسہٖ میرے پاس پہنچی اور میں نے اس کو حضور وائسرائے کے روبہ رو پیش کیا۔ عرض داشت مذکور حضور وائسرائے کے ارشاد کے بہ موجب صیغۂ ہوم ڈپارٹمنٹ کو حضور معتشم الیہ بہ اجلاسِ کونسل کے روبہ رو پیش ہونے کے واسطے منتقل کر دی گئی ہے جہاں اس پر وہ دلی غور اور توجہ کی جاوے گی جو اس کی عمدگی کے باعث سے اس پر ہونی چاہیے۔

میں آپ سے نہایت رضامندی کا اظہار کرتا ہوں جو حضور معتشم الیہ کو آپ کی عرض داشت کے ملاحظے سے حاصل ہوئی ہے جو دلی فکر عرض داشت مذکورہ سے آپ کے اپنے ہم وطنوں کے اصلی مطلبوں کے واسطے ثابت ہوتی ہے اور جو عمدہ تربیت یافتہ رائیں اس سے ظاہر ہوتی ہیں اور جس ملائم اور صاف تقریر میں وہ مرتب کی گئی ہے یہ سب باتیں آپ کو یکساں قدر و منزلت اور نیک نامی بخشتی ہیں علاوہ اس کے ان ہی سب باتوں سے اس انتظامِ تعلیم کے فائدے ثابت ہوتے ہیں جو آج کل رائج ہے۔

حضور وائسرائے کو بھی اسی قدر فکر ہے جس قدر آپ کو ہو سکتی ہے کہ سررشتۂ تعلیم کو جہاں کہیں اس میں ترقی پذیر ہونا اور ممکن معلوم ہو وہاں وسعت دی جاوے اور اس کی ترقی کی جاوے اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہِ عنایت حضور وائسرائے کی خدمت میں ایک اور عرض داشت اس معاملے میں تحریر

کریں جس میں عمل میں لائے جانے کے قابل ایسی تدبیر کی نسبت مفصل رائیں مندرج ہوں جس سے رعایا کو تعلیم کے فائدے دیسی تعلیم کی صورت میں عمدہ پہنچائے جانے ممکن ہوں۔

(دستخط) آپ کا نہایت صادق دوست

جی ڈی گارڈن پرائیویٹ سکرٹری

جواب عرض داشت من جانب حکومتِ ہند مع انتخاب مراسلہ کورٹ ڈائرکٹرز

(منقول از اخبار سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ، مورخہ ۱۷ر ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء)

۱۱۔ اب ہم کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ ہمارے مقصد کی تکمیل کس طرح پر ہوسکتی ہے اور اس سے ہم کو اُس ذریعے کے بحث پر توجہ ہوتی ہے جس سے ہندستان کے لوگوں کو علم کی تعلیم کی جاوے اب تک ہندستان کی دیسی زبانوں میں یورپ کی کتابوں کا ترجمہ نہ ہونے سے یا دیسی ہی اصل کتابوں کے نہ ہونے سے اور مشرقی اعلا درجے کی زبانوں میں یورپ کے علم کی نہایت ناقص کتابوں کے ہونے سے اُن لوگوں کے واسطے جو عمدہ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اب تک اس بات کی ضرورت ہے کہ انگریزی زبان کو یورپ کے علم کی کنجی سمجھ کر اوّل اوّل اُسی کی تحصیل سے شروع کریں اور انگریزی کا علم ہمیشہ ہندستان کے اُن باشندوں کے واسطے جو اعلا درجے کی تعلیم کے حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں ضرور ہوگا۔

۱۲۔ ہندستان کے بعض حصوں میں خصوصاً صدر مقاموں کے قرب و جوار میں جہاں کہ انگریزی کا علم رکھنے والوں کو بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری نوکریوں کے لیے اور لوگوں پر ترجیح دی جاتی ہے وہ لوگ جو مدرسوں میں پڑھتے ہیں انگریزی کے اوسط درجے کی استعداد کو اپنے عام علم کی ترقی کا ضروری سلسلہ نہیں بلکہ اپنی تعلیم کا مقصد اور مآلِ کار سمجھتے ہیں ہم بہت سی باتوں میں صرف انگریزی بولنے اور لکھنے کی لیاقت کے فائدے سے منکر نہیں ہیں لیکن ہم کو خوف ہے کہ ان اضلاع میں کچھ ایسا ڈھنگ پڑگیا ہے کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کی جانب سے بے جا غفلت کی جاتی ہے۔

۱۱۔ ہمارا یہ ارادہ یا خواہش نہیں کہ ملک کی دیسی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان کو قائم کریں۔ ہم ہمیشہ یہ بات جانتے ہیں کہ جن زبانوں کو صرف جمہورِ انام کے بہت سے فرقے سمجھ سکتے ہیں اُنھی کا رواج بہت ضرور اور مفید ہو ہم نے یہی زبانیں نہ انگریزی زبان بجائے فارسی کے داد رسانی کے محکموں اور گورنمنٹ کے افسروں اور لوگوں کے درمیان میں معاملات کے واسطے قائم کی ہو پس یہ ضرور ہو کہ تعلیم کے عام انتظام میں اُن کی تحصیل پر بڑی توجہ کی جاوے اور یورپ کے ترقی یافتہ علم کی کوئی واقفیت جو جمہورِ انام کے اُن بہت سے فرقوں کو سکھلایا جاوے جو اپنی حالتوں کے باعث سے ایک اعلا درجے کی تعلیم حاصل کرنے سے معذور ہیں اور جن کی ذات سے یہ توقع نہیں ہوسکتی ہو کہ وہ ایک غیر زبان کی تحصیلوں پر قالب آویں گے ان دیسی زبانوں میں سے کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے ان کو حاصل ہوسکتی ہو۔

۱۲۔ تعلیم کے کسی عام سررشتہ میں انگریزی زبان اُن مقاموں میں سکھلائی چاہیے جہاں اس کی خواہش ہو اور انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ ہمیشہ ضلع کی دیسی زبان کی تحصیل پر بڑی توجہ اور ایسی عام تعلیم و تلقین ہونی چاہیے جو اُس زبان کے ذریعے سے ہوسکتی ہو اور جس صورت میں کہ انگریزی زبان کا استعمال بطور ایک نہایت کامل ذریعے کے واسطے تعلیم اُن شخصوں کے جاری رہے جن کو اُس سے اس قدر واقفیت حاصل ہوگئی ہو کہ وہ اُس کے ذریعے سے عام تعلیم و تلقین حاصل کرسکتے ہیں تو اُن بہت سے فرقوں کے سکھلانے کے واسطے جو انگریزی زبان سے بالکل ناواقف ہیں یا کم واقف ہیں دیسی زبانوں کو استعمال کرنا چاہیے اس کا انجام ایسے ماسٹروں اور پروفیسروں کی معرفت بہ خوبی تمام ہوسکتا ہو جو خود انگریزی دان اور ترقیاں حال میں ہر ایک قسم کے علم میں ہوئی ہیں اُن سے بہ خوبی واقف ہوکر اپنے ہم وطنوں کو اپنے وطن کی زبان کے ذریعے سے وہ علم سکھلا سکتے ہیں جو انھوں نے بہ ذریعے انگریزی کے حاصل کیا ہو اس کے ساتھ ہی اور جس قدر کہ روز بروز دیسی زبان کی قدر کو لوگ پہچانتے جاویں ہندستان کی دیسی زبان علم انگریزی کتابوں کے ترجمے یا اُن شخصوں کی اصلی تصنیفات کے ذریعے سے جن کے دل میں یورپ کی شایستگی کی بو سما گئی ہو رفتہ رفتہ مالامال ہوجاوے گا اور اس طرح پر تمام فرقے رفتہ رفتہ یورپ کے علم کو حاصل کرسکیں گے۔ پس ہم انگریزی زبان اور نیز ہندستان کی دیسی زبانوں کو ذریعۂ اشاعت علم

یورپ کا سمجھتے ہیں اور ہماری یہ خواہش ہی کہ جو مدرسے ایسے اعلا درجے کے ہندستان میں ہوں جن میں ایک ایسا مدرس رہ سکتا ہو جس میں تمام ضروری یاقتیں موجود ہوں اُن سب میں انگریزی اور دیسی غرض کہ دونوں زبانوں کی تحصیل ہووے ۔

مراسلہ من جانب برٹش انڈین ایسوسی ایشن

(منقول از اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ مورخہ ۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ع)

۱۔مسٹر جے ڈی گارڈن صاحب پرایوٹ سکرٹری حضور وائسرائے اور نواب گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند کی چٹھی مورخہ ۲ اگست سنہ ۱۸۶۷ع اور آپ کی چٹھی صیغۂ ہوم ڈیپارٹمنٹ نمبر ۴۲۱۷ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۷ع اس ایسوسی ایشن کے ممبروں کے سامنے پیش ہوئی اور اُن کے ممبروں نے خود اور نیز بہ شرکت ممبران سائنٹفک سوسائٹی کے نہایت غور و فکر سے اُس پر لحاظ کیا۔

۲۔اس قدر غور اور توجہ واجب حضور وائسرائے اور نواب گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند نے بہ اجلاسِ کونسل ایسوسی ایشن کی عرض داشت پر جو درباب ترقیٔ تعلیم اہلِ ہند تھی فرمائی ہی اُس کی بابت دونوں سوسائٹیوں کے ممبر نہایت عاجزی اور ادب سے اپنے دلی شکر اور دلی احسان مندی پیش کرتے ہیں اور نہایت ادب اور عاجزی سے بہ اتباع اُس تجویز کے جو آپ کی چٹھی کی دفعہ ہشتم میں مندرج ہی اُن عملی تدبیروں کے پیش کرنے کی اجازت لیتے ہیں جو دونوں سوسائٹیوں کے ممبروں کی رائے میں اُس امرِ اہم کے انجام پانے کے لیے سردست ہونی ضروری ہیں اور وہ امید رکھتے ہیں کہ وہ تدبیریں حضور وائسرائے اور نواب گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند بہ اجلاسِ کونسل کی غور اور توجہ کے قابل ہوں گی۔

۳۔جس وقت کہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ممبروں نے اس درخواست کا پیش کرنا گورمنٹ میں تجویز کیا تھا اُس وقت وہ مشکلات جو اُس تدبیر کے انجام میں تھیں اُن کے پیشِ نظر تھیں اور وہ اُن سے بخوبی واقف تھے جن کا ذکر حاشیے پر * مندرج ہی مگر اُن کو اس بات میں شبہہ تھا کہ آیا وہ اصول

* (اوّل) نہ ہونا یورپ کی نہایت مفید علوم و فنون کی کتابوں کا دیسی زبانوں میں ۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

عام تعلیم کا بذریعہ ورنیکلر زبان کے جس کی ایسوسی ایشن تائید کرتی ہو گورمنٹ کو تسلیم اور منظور ہو یا نہیں اور اسی سبب سے اُس عرض داشت میں صرف اُن اصولوں کی ہی صحیح اور مستحکم ہونے پر گفتگو کی گئی تھی اور اس کی عملی تدبیر کا بیان کرنا آیندہ موقع پر منحصر رکھا تھا اب کہ ایسوسی ایشن کو یہ بات حسب اطمینان دریافت ہوئی ہو کہ گورمنٹ کی تدبیریں درباب ترقّی عام تعلیم کے اُس کی تدبیروں سے متفق ہیں تو اُس نے عام رعایا کی ترقّی تربیت کی طرف گورمنٹ کی فیاضی سے متوجہ ہونے پر بھروسا کرکر اُس کی عملی تدبیر کو پیش کرنا ضروری سمجھا ہو

۴. یہ بات مسلّم ہو کہ ایک ناقص تربیت جس قدر کہ ایک قوم کی اصلی غرضوں اور فائدوں کی غالباً حارج اور مانع ہوتی ہو اُسی قدر کامل تربیت بلاشبہہ اُس کے حق میں مفید ہوتی ہو اب کہ گورمنٹ کی پیش گاہ سے یہ بات منظور اور پسند ہوچکی کہ دیسی زبان کے ذریعے سے تمام فرقوں کو عام تعلیم کرنا نہایت کارآمد اور موثّر طریقہ ہو اور اُس طریقے کے فائدے گورمنٹ بخوبی تسلیم کرچکی ہو تو یہ عرض کرنا ضرور ہوا کہ وہ طریقہ کس طرح پر جاری ہوسکتا ہو۔

۵. سنہ ۱۸۵۴ع کے مراسلۂ کورٹ آف ڈایرکٹرز کے دیکھنے سے جیسی ایسوسی ایشن کو خوشی ہوئی ہو ویساہی اس کو رنج ہوا ہو اور اس کو افسوس ہو کہ اگر ہندستان کے شریف اور متمول لوگ متعدد ارادوں مندرجہ مراسلۂ مذکور کی مدد پر متوجہ ہوتے تو آج تک کیا کچھ ترقّی تربیت اور روشن ضمیریِ اہلِ ہند کی ورنیکلر کے ذریعے سے ہوجاتی مگر اب ایسوسی ایشن گورمنٹ کو اس بات کا یقین دلانے کو واجب سمجھتی ہو کہ زمانۂ گوشتہ کی کاہلی اور سستی دور ہوتی جاتی ہو۔ اب اکثر اہلِ ہند ورنیکلر کے ترقّی دینے پر بہت شوق

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) (دوم) صرف انھی کتابوں کا ورنیکلر میں ترجمہ کافی نہ ہونا جو یونی ورسٹی میں امتحان کے لیے مقرر کی جاتی ہیں بلکہ بالضرور ایک اور سلسلہ بڑے درجے کی اصل کتابوں کا ورنیکلر میں موجود ہونا۔

(سوم) اِن تمام کتابوں کے ورنیکلر میں موجود اور شائع کرنے کی تدبیر اور اُس کے اخراجات کیوں کہ ایسوسی ایشن بالیقین جانتی ہو کہ یہ غیر ممکن ہو اور اصولِ گورمنٹ کے بھی خلاف ہو کہ اِن اخراجات کا بالکلیہ بوجھ گورمنٹ اپنے ذمّے لیوے۔

(چہارم) تدبیر اور طریقہ اِن کتابوں کے رواج کا اس طرح پر کہ سرکاری مدرسوں اور اسکولوں اور نیز پرائیوٹ مکتبوں کے دفتر میں لائی جاویں۔

(پنجم) بہم پہنچانا ایسے ٹیچروں اور پروفیسروں کا جو اُن کتابوں کی تعلیم کی لیاقت رکھتے ہیں۔

سے مستعد ہیں اور ایسے آدمی بھی کچھ کم نہیں ہیں جن کے نزدیک تمام ترقی تربیت اہل ہند کی صرف ورنیکلر پر منحصر ہو اور اہل ہند میں عام ترقی تربیت و شائستگی اور یورپ کی روشن ضمیری بہ ذریعہ ورنیکلر کے پھیلانے کی ضرورت کا اُن کے دل پر ایسا نقش ہوگیا ہو کہ وہ اپنے ارادوں کے پورا کرنے کے لیے اپنے وقت اور محنت اور رُپے کے بڑے بڑے نقصانوں کے گوارا کرنے پر مستعد اور آمادہ ہیں۔

۶- ایسوسی ایشن کا کبھی یہ ارادہ نہیں ہو کہ کوئی تدبیر یا درخواست پیش کرنے میں گورمنٹ کے حالات اور اُن عظیم الشان امورات کے ضروری اخراجات پر جن کا بجا لانا گورمنٹ کو تمام ہندستان کی امن و آسایش کے لیے ضرور ہوتا ہو خیال نہ کرکر خودغرضانہ کوئی درخواست یا تدبیر پیش کرے پس ایسوسی ایشن نہایت سچے دل سے اس بات کا اقرار کرتی ہو کہ جو کچھ سکرٹری آف اسٹیٹ نے اپنے مراسلے سنہ ۱۸۰۱ع میں لکھا ہو وہ صرف منصفانہ اور بالکل حق ہو اور بلاشبہہ کوئی گورمنٹ عمدہ تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمے نہیں لے سکتی بلاشبہہ اگر ملک کے دولت مند اور ذی علم لوگ اپنا رُپیہ اور اپنا وقت اور اپنا رعب داب تعلیم کے معاملے میں کام میں نہ لاویں تو کوئی گورمنٹ کامیابی کی توقع کرکر تعلیم کا بوجھ بالکل اپنے ذمے نہیں لے سکتی اس لیے ایسوسی ایشن کی طرف سے گورمنٹ کو اس بات کا یقین دلانا چاہیے کہ اُس کا یہ مقصد نہیں ہو کہ عام تعلیم کے لیے کوئی خرچ زائد بجز اُس کے جو خود گورمنٹ بہ لحاظ اپنے مالی حالت کے مناسب سمجھے گورمنٹ پر ڈالنا چاہیے۔

۷- جو مشکلات اس تدبیر کے عمل درآمد ہونے میں ہیں اور جن کا بیان اوپر ہوا ان میں سے چوتھی اور پانچویں مشکل کچھ زیادہ فکر اور تردد کرنے کے لائق نہیں ہو البتہ پہلی تین باتیں زیادہ فکر و اندیشے کے لائق اور عملی ہیں مگر ایسوسی ایشن اور سائنٹی فک سوسائٹی کے ممبر بالاتفاق ان کے رفع کرنے کا بار اپنے ذمے لینے کو مستعد ہیں او اس بات کو وہ اپنے قابو سے باہر نہیں سمجھتے بہ شرطے کہ گورمنٹ ان کی دل دہی اور تشفی کرے اور ہمت بڑھاوے۔

۸- لیکن یہ بات ضرور ہو کہ ایسوسی ایشن اور سائنٹی فک سوسائٹی کے روبرو ایک معین مقصد جس کی حد معلوم ہو ہونا چاہیے کیوں کہ جب تک ایک صریح اور معین نتیجے کی امید نہیں ہوتی ہو تو جو محنت اس کے لیے کی جاتی ہو اس کے رائگاں جانے کا اندیشہ ہوتا ہو اور جو لوگ اس پر سرگرمی سے کوشش کرتے ہیں اُ

کی ہمت ٹوٹ جاتی ہو اسی وجہ سے ایسوسی ایشن کے ممبر گورمنٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گورمنٹ سے بجز اس کے اور کچھ نہیں چاہتے کہ اپنی واجبی عملی تدبیروں سے ہماری سچی اور نیک کوششوں کی تقویت کرتی ہے اور ہماری پشت پناہ ہو۔

۹- ایسوسی ایشن سچے دل سے اس بات کی تصدیق کرتی ہو کہ صرف اُن کتابوں کا ترجمہ جو یونی ورسٹی خاص کر ہندستانی طالب علموں کے لیے مقرر کرتی ہو اس قدر کافی نہ ہوگا جس سے تدبیرات مجوزہ کے جاری کرنے کی ہمت پڑے کیوں کہ اُس سے صرف طبیعت کو مستعد اور تیار کرنا مقصود ہوتا ہو اور یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرے میں قدم رکھنے کو اور بہت سے عام مضمونوں کی کتابوں کا ترجمہ ہونا ضرور ولابد ہو مگر ایسوسی ایشن سمجھتی ہو کہ ان دونوں سلسلوں کی کتابیں گو وہ کیسی ہی نامحدود ہوں از روے عمل کے اُن کی تعداد ایک حد پر محدود ہونی ضرور ہو۔

۱۰- اس لیے ایسوسی ایشن اس بات کی درخواست کرتی ہو کہ گورمنٹ حکام مناسب کے ذریعے سے یونی ورسٹی کے ہر ایک درجۂ امتحان کے لیے دو سلسلے کتابوں کے قائم کردے ایک وہ سلسلہ جو خاص کر یونی ورسٹی کے متعدد درجوں کے درس کے واسطے ہو اور دوسرا وہ سلسلہ جو یونی ورسٹی کی خواندگی پوری کرنے کے بعد علم کے دائرے کے فراخ کرنے کے واسطے ضروری ہو سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اس بات پر آمادہ ہیں کہ اب جس قدر خرچ گورمنٹ عام تعلیم کے معاملے میں بہم پہنچاتی ہو اُس پر اُن دونوں سلسلوں کی کتابوں کو ورنیکلر میں ترجمہ کرکر اور چھاپ کر تیار و موجود کردے گی اور یہ بات بالکل گورمنٹ کی مرضی پر منحصر رہے گی کہ جس قدر روپیہ گورمنٹ ہر سال ورنیکلر تعلیم کی ترقی کے لیے منظور کرتی ہو اُس میں سے جس قدر چاہے اس کام کی مددگاری میں خواہ بہ ذریعے خرید کتب خواہ اور کسی طرح پر مرحمت کرے چاہے نہ کرے اس بات کا جتانا کچھ ضرور نہیں ہو کہ گورمنٹ کی تحریک سے اور گورمنٹ کی طرف سے عمدہ تجویزوں کے جاری ہونے سے ایسی محنتوں کا ثمرہ کس قدر زیادہ ہوجاوے گا۔

۱۱- گورمنٹ کی عملی تدبیروں سے جو ایسوسی ایشن کے ممبر اپنی تقویت بڑھانے کی درخواست کرتے ہیں اُس سے اُن کا مقصد یہ ہو کہ بعد اس کے کہ یونی ورسٹی کے ہر ایک درجۂ امتحان کے دونوں سلسلوں مذکورہ بالا کی کتابیں معین ہوجاویں اور تیار ہوجاویں تو گورمنٹ ان کو اپنے مدرسوں اور کالجوں میں ترتیب وار خواندگی کے طور پر جاری کرنا منظور کرے اور اس طرح سے دیسی زبان کے ذریعے سے تمام فرقوں پر یونی ورسٹی کے

امتحان کا ذریعہ کھول دیوے اور علاوہ اس کے جس قدر کتابیں ترجمہ ہوتی جاویں اُن سے اس خواندگی کے سلسلے کو وسعت دیتی رہے۔ ایسی عملی تحریک سے اُن سخت محنتوں میں ایک لذّت اور تقویت حاصل ہوگی جو سوسائٹی اپنے ذمّے پر گوارا کرنے پر آمادہ ہی۔

۱۲۔ اگر گورمنٹ ایسوسی ایشن کی اس درخواست کو منظور کرے تو ایسوسی ایشن اس بات پر آمادہ ہی کہ اُن معقول سلسلوں کی کتابوں کی فہرستیں جو بہ ذریعے دیسی زبان کے یونی ورسٹی کے امتحان کے لیے تجویز کی جاویں گورمنٹ میں منظوری کے لیے پیش کرے اور جو کتابیں ورنیکلر کی گریمر اور عروض اور لاجک وغیرہ کی بھی جو انگریزی کتابوں کے ترجمے سے پیدا نہیں ہوسکتیں ہندستانی اہلِ علم کی تصنیف کی ہوئی گورمنٹ کی منظوری کے لیے پیش کرے جب کہ یہ کتابیں پسند اور منظور ہوجاویں گی تو اُن کو یونی ورسٹی کی خواندگی میں داخل کیا جاوے گا۔ جس سے دیسی زبان کے طالب علم یونی ورسٹی کے اعزاز حاصل کرنے میں ضبط کریں گے۔

۱۳۔ علاوہ اس کے شاید تھوڑی سی عملی تائید گورمنٹ سے اور درکار ہوگی جو علاقہ رکھتی ہی تشریح مطالب ایکٹ ۲۰ سنہ ۱۸۴۷ء سے اگر درحقیقت اُس کی تشریح یا ترمیم کی ضرورت ہو چناں چہ اس باب میں ایسوسی ایشن نے جداگانہ اپنی عرض داشت گورمنٹ کی خدمت میں روانہ کی ہی۔

انجام کو ایسوسی ایشن کی درخواست یہ ہی کہ آپ اس چٹھی کو حضور وائسرائے و نواب گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند بہ اجلاسِ کونسل کے حضور میں مہربانی سے پیش کرکر جو احکام کہ اس پر نافذ ہوں گے اس سے اطلاع بخشیں گے۔

مراسلہ ایم کیمپسن صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم

(منقول از اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، مورخہ ۱۷ر جنوری سنہ ۱۸۶۸ء)

صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال و مغرب نے جو چٹھی بنارس انسٹی ٹیوٹ کے سکرٹری کے نام لکھی ہی اور جس کا ترجمہ ذیل میں مندرج ہی اس کا مضمون دریافت ہونے سے ہم کو نہایت خوشی ہوئی ہی کہ جو تجویز علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے درباب مقرر ہونے ایک دیسی زبانوں کی یونی ورسٹی کے

گورنمنٹ ہند میں پیش کی تھی آخرکار اس پر لحاظ کیا گیا

ناظرینِ اخبار یہ بھی ملاحظہ فرمایں گے کہ ممبرانِ بنارس انسٹی ٹیوٹ سے صرف نسبت فوائد قائم ہونے ایسی یونی ورسٹی کے جس کی تحریک ہماری ایسوسی ایشن نے کی تھی نہیں پوچھا گیا ہے بلکہ ان اصولوں کی نسبت بھی راے چاہی گئی ہے جن پر مذکورہ بالا یونی ورسٹی قائم ہو۔

بلاشبہ یہ مضمون ہمارے بھی نہایت مفید ہے کچھ شبہ نہیں کہ اگر اُس کا عمل درآمد ہوا تو ہندوستان کے لیے حد سے زیادہ مفید ہوگا پس ہم کو امید صادق اور یقینِ واثق ہے کہ ممبرانِ بنارس انسٹی ٹیوٹ نہایت باعزت راست بازی اور بڑی سچائی اور بے ریائی سے بلا کسی خوف و خطر کے اور بغیر دباؤ کسی عہدہ دار سررشتۂ تعلیم کے اپنی اپنی راے ظاہر کریں گے ورنہ ان کی راے آزادانہ اور لوگوں کے دلوں کی خواہش بتلانے والی متصوّر نہ ہوگی۔

صاحب ڈائرکٹر کی چٹھی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب ممدوح علاوہ بنارس انسٹی ٹیوٹ کی راے کے اور بھی رائیں اس نہایت مفید مضمون پر اس غرض سے جمع فرما رہے ہیں کہ اُن سب کو معہ اپنی تجویز کے گورنمنٹ میں پیش فرماویں گے ہم کو یقینی امید ہے اور جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر کی مہربانی پر بہ خوبی بھروسا ہے کہ ایک نقل اُن رایوں کی جو صاحب ممدوح پاس جمع ہوں معہ اپنی تجویزوں کے ازراہِ عنایت علی گڑھ ایسوسی ایشن کو بھی مرحمت فرماویں گے تاکہ وہ ایسوسی ایشن بھی اُس پر اپنی راے ظاہر کر سکے۔ ۲

برکریماں کارہا دشوار نیست

چٹھی ایم کیمپسن صاحب بہادر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی و شمالی

بہ نام صاحب سکرٹری بنارس انسٹی ٹیوٹ مقام بنارس مورخہ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ء

صاحب من۔

بالفعل گورنمنٹ اِن اضلاع میں دیسی زبان کے ذریعے سے تعلیم دینے کے معاملے پر بموجب اس تجویز علی گڑھ سوسائٹی کے کہ ایک یونی ورسٹی دیسی زبانوں کی ان اضلاع میں قائم کی جاوے اور اس میں انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھلائی جاوے نہ یہ کہ عام تعلیم کا ذریعہ گردانی جاوے غور کر رہی ہے مجھ کو

معلوم ہوتا ہو کہ بنارس انسٹی ٹیوٹ میں اس مضمون پر بحث کا ہونا مفید ہوگا اور میں انسٹی ٹیوٹ کی رایوں کو گورمنٹ میں پیش کیا چاہتا ہوں اس لیے میں اس عام مضمون کو بطور ایسے مضمون کے پیش کرتا ہوں کہ اُس پر تم اپنے انسٹی ٹیوٹ میں جتنی جلد ممکن ہو گفتگو کرو اس مضمون میں متعدد باتیں غورطلب ہیں مثلاً اوّل اگر عام تعلیم اس ملک کی ایسی زبان کے ذریعے سے ہو تو حال کے طریقۂ تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں ضرور ہوں گی دوسرے اگر یونی ورسٹی قائم کی جاوے تو عموماً انتظام اُس کا کن اصولوں پر ہونا چاہیے تیسرے کس مقام پر یہ یونی ورسٹی مقرر ہونی چاہیے چوتھے اس یونی ورسٹی کو کون کون سی ڈگری یعنی منصب اور خطاب لوگوں کو دینے کے مستحق اور لائق سمجھنا چاہیے پانچویں بہترین وسیلے کتابوں کے (یعنی ترجموں کے) بہم پہنچانے کے جو مطلوب ہوں گے وہ کیا ہوں گے تم کو مضمون مذکور کے ان بڑے مراتب سے ہر ایک سوال مذکور کی نسبت اظہار رائے اور بحث کے لیے بڑی گنجایش حاصل ہوگی۔ میں بھی رائیں جمع کر رہا ہوں اور انسٹی ٹیوٹ کے ممبروں کی رائے کے دریافت کرنے سے بھی خوش ہوں گا۔

ان سب رایوں میں میں بھی ایک رائے اپنی شامل کروں گا جو یوں قیاس کی جاسکتی ہو کہ اگر یونی ورسٹی ان اضلاع میں قائم کی جاوے تو وہ یونی ورسٹی اضلاع ممالک مغربی وشمالی و اودھ وپنجاب سب کے لیے قرار پانی چاہیے اور میں یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ جہاں یونی ورسٹی قائم ہووے وہیں طالب علموں کی سکونت بھی ہوگی یعنی جو شخص تعلیم یونی ورسٹی سے مستفید ہونا چاہیں وہ یونی ورسٹی کے مقام میں جاکر تعلیم حاصل کیا کریں گے۔

مراسلہ وزیر ہند

بنام ویسرائے و گورنر جنرل ہند

مقام لندن دفتر ہند ۳۱ ر جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع نمبری ۵

صاحب من

آپ کا مراسلہ بہ اجلاس کونسل نمبری ۱۴ مورخہ ۱۸ر دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع معہ اور مراسلات کے بہ ایں مضمون پہنچا

کہ ہندستانیوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے دیسی زبانیں ذریعہ گردانی جاویں۔ اُس پر میں نے مع اصحاب کونسل کے بخوبی غور کیا۔

مراسلات مذکور کو میں نے ایسے شوق و ذوق سے پڑھا جیسے کہ اُن کے عالی مضامین مستدعی تھے۔ جو رائیں بہ اجلاسِ کونسل آپ نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے باب میں ظاہر کی ہیں اُن کو پسند کرتا ہوں معلوم ایسا ہوتا ہو کہ آپ کی گورمنٹ اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن دیسی زبان کا ایسا علم قائم کرنے کے واسطے جو ہندستانیوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم پر حاوی ہو صرف عمدہ عمدہ انگریزی کتابوں کے ترجمے کو ذریعہ ٹھیرایا چاہتی ہو پس آغازِ حال میں یہ تدبیر معقول ہو مگر میں ایک یہ رائے ظاہر کرتا ہوں جس پر آپ بھی بہ اجلاس کونسل غور کریں کہ دیسی زبان میں انگریزی اخلاق کی کتابوں میں سے کسی خاص مضمون پر کتابوں کی تالیف کرنے کی رغبت اور جرأت دلانی چاہیے یہ تدبیر جیسے کہ طلبا کے حق میں مفید ہو ویسے ہی معلموں کو فائدہ بخش ہو اور جب اس کی ترقی ہوگی تو مولفوں کو ایک بڑی بات یہ حاصل ہوجاوے گی کہ ایک مصنف کے بیان کو دوسرے مصنف کے بیان سے مطابق کرنے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے اور پسند کرنے کی جہت سے اُن کی طبیعتیں اِس امر کی عادی ہو جاویں گی کہ ہر قسم کے خیالات بغیر وسیلے اور امداد کے پیدا کرسکیں اس تدبیر سے یہ امید ہو کہ ترجمے اور تالیف کی مشق سے دانا اور تعلیم یافتہ ہندستانی اپنے ہم وطنوں کے لیے انجام کار کتابیں تصنیف کریں گے۔

آپ کا خادم
اسٹی فورڈ نارتھ کوٹ

* * *

اُردو ، ہندُستانی ، ہندی

(ایک علمی مقالہ جو جناب پنڈت دتاتریہ صاحب کیفی نے اُردو کانفرنس ناگ پور میں پڑھا)

یہ جنگِ اعظم اپنی عمر کے پانچویں سال میں داخل ہو چکی ہی۔ جن کو ہماری نسبت جنگ کے زیادہ صحیح اور اصلی واقعات و کوائف کی خبر ہی ان کا قیاس ہی کہ اس سال میں یہ جنگ ختم ہوجائے گی۔ کیا اچھا ہو کہ جلد سے جلد خاتمے کو پہنچے۔ ہوگا وہی جو خدا کو منظور ہی۔ مگر انسان نے آخربینی سے کام لینا شروع کردیا ہی۔ یعنی معاشرت کے مختلف شعبوں، اقتصادیات، تعلیم وغیرہ یہاں تک کہ شہروں اور قصبوں کی نوتعمیری سے متعلق ابھی سے تمگدے بن رہے ہیں کہ جنگ کے بعد فلاں ادارے کی نئی ترتیب کس ڈھنگ پر ہوگی۔ اُن تجربوں کی بنا پر جو اِس جنگ سے حاصل ہوئے ہیں قوم کے بچّوں کی تعلیم کس طرز کی ہوگی، وغیرہ۔ مختصر یہ کہ زندگی کے ہر شعبے اور ادارے کی تجدید یا نوتعمیری اور اصلاح کا پروگرام ابھی سے بننا شروع ہوگیا ہی۔ ہندُستان بھی اس لائحۂ عمل سے خارج نہیں ہی۔ آپ نے سُنا ہی ہوگا جو پروگرام حکومتِ ہند کے تعلیمی کمشنر نے جنگ کے بعد کی تعلیم سے متعلق تیار کیا ہی جو آپ کے بچّوں کو دی جائے گی، اور شعبوں کی تجدید کے بارے میں بھی حکومت سوچ رہی ہی۔ ری کنسٹرکشن کمیٹیاں یعنی تجدیدی کمیٹیں قائم ہوگئی ہیں۔ یہ تو ہوا حکومت کا کام۔ مگر آپ کو بھی کچھ کرنا ہی، ہر کام حکومت ہی کے ذمّے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ پچھلی صدی کے اعلیٰ مفکر ہربرٹ سپنسر نے اپنی ایک کتاب اِن الفاظ سے شروع کی تھی :-

"گاؤں کے شراب خانے میں پائپ کے دھوئیں کے بخاروں میں ایک مزدور بہت خود اعتمادی کے ساتھ کہتا ہو کہ پاؤں اور منھ کی بیماریوں کے لیے پارلیمنٹ نے کیا کیا ؟"

فلسفی یہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ جو کام خود اُن کے کرنے کے ہیں وہ بھی حکومت ہی کرے ۔

میرے اہلِ وطن یہ سُن کر کہیں گے، تو بتائیے ہمیں کیا کرنا ہو ۔ میں ابھی اس موضوع پر آتا ہوں ۔

میرا خطاب صرف ان حضرات سے نہیں جو اس وقت اس جگہ تشریف رکھتے ہیں بلکہ تمام ہم وطنوں سے ہو ۔ ان کا دھرم اور ملت چاہے کچھ ہو اور اپنے گھروں میں وہ چاہے کوئی زبان بولتے ہوں ۔ مجھے جو کہنا ہو وہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ میری درخواست صرف ایک پرانی رسم کو تازہ کرنے سے متعلق ہو ۔ اور یہ وہ کام ہو جو خود ہمارے کرنے کا ہو ۔

رِنزلی ایک انگریز سیاسی مصنف نے لکھا تھا کہ انسانوں کی کوئی جماعت ایک قوم نہیں کہی جاسکتی جب تک اس میں سہ گانہ اتحاد حاصل نہ ہو، یعنی مذہبی اتحاد، سیاسی اغراض کا اتحاد اور لسانی یعنی زبان کا اتحاد ۔

اس سہ گانہ اتحادی اصول کے تحت جب ہم وطنِ مالوف پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری نظر بالکل مایوس نہیں پلٹتی، ہندو اور مسلمان مع اپنے شکمی فرقوں اور ملتوں کے صدیوں سے یہاں رہتے ہیں اور رہ رہے ہیں، نہ ایک دوسرے کو ہضم کرگیا نہ ایک دوسرے کو اپنے میں جذب کرلینے پر مُصِر کرتا ہو ۔ ایک شق تو اس تگڈم کی صاف ہوگئی ۔ دوسری شق ہو سیاسی اغراض، اس میں تمام ہندوستانی متحد ہیں یعنی آزادی اور حریت کے طالب ہیں ۔ کرپس کی تجاویز کا جو حشر ہوا اس اتحادِ اغراض کا بیّن ثبوت ہو ۔ اس سے مطلب نہیں کہ جو جواب کرپس کو یک زبان ہوکر ہندستان نے دیا وہ صحیح اور مناسب تھا یا نہیں ۔ اب صرف ایک شق رہی جاتی ہو یعنی لسانی اتحاد، یہ سب سے زیادہ تفصیل طلب ہو اور اسی کو اس صحبت کے لیے میرا موضوع سمجھیے ۔

گریرسن نے تازہ ترین تحقیقات کے بہ موجب اُن زبانوں اور بولیوں کی تعداد جو ہندستان میں کم و بیش مروج ہیں، دو سو تیس قرار دی ہے۔ اگر ان دو سو تیس زبانوں اور بولیوں کی فہرست ہی پیش کی جائے تو ایک طولِ امل ہوگا۔ خیر یہ تعداد سُن کر آپ سرسری طور پر یہ تو کہہ اُٹھیں گے کہ اگر لسانی اتحاد قومی ساخت کے لیے لازمی ہے تو ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔ باقی دو اتحاد کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اُردو ہندی کا تنازع اپنی جناتی جسامت میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ میں کہوں گا کہ نہ تو ہمیں مایوس ہونے کا موقع ہے اور نہ اُس جناتی جسامت سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ اُردو اور ہندی میں کل تک اتحاد تھا اور اب بھی ہوسکتا ہے۔ اسی بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ان دونوں زبانوں سے متعلق چند لسانیاتی کوائف کا موازنہ کرنا ہے اور اسی لیے موضوع رکھا گیا ہے اُردو، ہندستانی، ہندی۔ کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہو یورپ اور ہندستان کے عالموں یعنی ہندو مستشرقوں کے اقوال سے استدلال کیا جائے۔

لسانیاتی کوائف ہم کو قدیم زمانے میں لے جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس تذکرے کو غور اور توجہ سے سُنیں گے۔ میرے لیے تو یہ موضوع نہایت دل چسپ ہے۔ بہ ہرحال اس بارے میں جو کچھ عرض کیا جائے گا غور کے قابل ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مُلک میں زبانوں کی گڑبڑ ابتدا سے رہی ہے۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ آریہ لوگ ہندِ قدیم میں ایک ہی وقت میں آکر پنجاب کے میدانوں میں نہیں بس گئے تھے۔ وہ راستے میں ٹھہرتے ہوئے آئے تھے اور وہ ٹھہرنا کبھی صدیوں تک لمبا ہوجاتا تھا۔ غرض کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف ٹولیوں میں یہاں آئے چوں کہ وہ اپنے مخرج سے چل کر مختلف ملکوں میں ٹھہر ٹھہر کر آئے تھے ان کی بولیاں بھی مختلف ہوگئی تھیں۔ اس لسانی اختلاف کو سب مانتے ہیں، لکھا ہے :-

"کچھ ٹولیاں پہلے کئی بار میں آئیں اور کچھ اُن کے کچھ سمے کے اُپرانت۔ ان سب ٹولیوں کی بولیوں میں انتر آوشیک تھا۔۔۔۔ پہلے آنے والی ٹولیوں کی بولی الگ تھی اور پیچھے

آنے والی ٹولیوں کی الگ بولی[1]

رگ وید جو کتابوں میں سب سے پرانی کتاب مانی جاتی ہے اس کے منتروں کی زبان بھی ایک نہیں بتایا ہے:۔ "دھیان دینے سے منتروں کی بھاشا میں وبھید دیکھ پڑتا ہے۔"

ٹولیوں کی جن کا آگے ذکر آیا ہے، بولیاں وہی تھیں جنھیں پراکرت کہتے ہیں۔ انھی پراکرتوں کو صاف اور منظم کرکے سنسکرت بنائی گئی۔ پانِنی، پاتنجلی اور کاتیاین وغیرہ حضرات سنسکرت کے مُدوّن اور اس کے چلانے والے ہیں لیکن عام بولی کی حیثیت سنسکرت کو حاصل نہیں ہوئی۔ کہا گیا ہے:۔ "اب آریوں کی سنسکرت بھاشا کیول ساہتیہ کی بھاشا ہوگئی۔"

یہ تاریخی واقعہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے پہلے بلکہ بعثت سے بہت پہلے ہندستان کی زبانوں یعنی پراکرتوں میں فارسی کے لفظ شامل ہونے شروع ہوگئے تھے۔ میں اس تنقیح کو یہیں صاف کیے دیتا ہوں۔ حکومتِ ہند کے آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا نمبر ۳۷ مطبوعہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۹۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان کے شمال میں ایک سنگین کتبہ کھروشٹی میں لکھا ہوا ملا۔ اسے ٹورڈھیری کا کتبہ کہتے ہیں اس میں فارسی لفظ موجود ہے۔ یہ تو ہوئی ظہورِ اسلام سے بہت پہلے کی بات۔ کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے پراکرت یعنی شورسینی پراکرت کی سب سے پرانی کتاب جو ملتی ہے وہ ہے مہاراجا پرتھی راج کے دربار کے شاعر چند بردائے کا پرتھی راج راسو۔ اس میں بےشمار فارسی اور عربی کے لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔

بس سمجھیے کہ اردو کی ابتدا ہوگئی۔ اور وہ ٹورڈھیری کے کتبے کی بنا پر مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے بیش تر ہی ہوچکی تھی۔

میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میرا منشا اس مقالے میں اردو ہندی کا جھگڑا اٹھانا ہرگز نہیں، بلکہ یہ ہے کہ تاریخ کی سند سے اور اُن کی تحقیقات کی سند سے جو اردو والے نہیں کہے جاسکتے اردو اور دوسری خاص زبانوں کے لسانیاتی کوائف ملک کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ وہ غلط فہمیاں دفع

---

[1] ہندی بھاشا کا وکاس، مصنفہ شام سندر داس جی سکریٹری ناگری پرچارنی سبھا بنارس، صفحہ ۳ سے۔

ہوجائیں جو مشکلیں پیدا کررہی ہیں۔

پہلے اُردو کے ناموں کو سمجھ لیا جائے۔ ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں:۔ دہلوی، زبانِ ہندستان، ہندوی، ریختہ، ہندی، اُردو اور ہندستانی[1] یہاں صرف آخر کے تین ناموں سے بحث کی جائے گی یعنی اُردو، ہندی اور ہندستانی۔ اُردو کا نام ہندستانی فورٹ ولیم کالج نے ڈالا۔ اب تک انگریز اور اینگلو انڈین اُردو کو ہندستانی کہے جاتے ہیں۔ میر امّن باغ وبہار کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"اب خداوندِ نعمت جان گلکرسٹ صاحب نے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔"

یہ ہندوستانی کا لفظ میر امّن نے اپنے کلکتہ کے خداوندانِ نعمت سے سیکھا چناں چہ ڈاکٹر ڈنکن فاربس اسی کتاب باغ وبہار کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"Bagh-o- Bahar consisting of entertaining tales in Hindustani by Mir Amman of Delhi."

اس ہندستانی کے بارے میں ایک بات اور ذکر کے قابل ہے، بمبئی کے السٹریٹڈ ویکلی مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۴۲ء میں ایک اشتہار پلمین انسٹی ٹیوٹ کا نکلا ہے۔ اس کے صرف دو چار لفظ یہاں نقل کیے جائیں گے۔ لکھا ہے:۔

"No more bother about learning Hindustani (Urdu)"

کوئی لاکھ مین میکھ نکالے اور 'ایجادِ بندہ' سے کام لے مگر مستند بات یہ ہے کہ ہندستانی نام ہے اُردو ہی کا۔

انسائکلو پیڈیا برٹینیکا نے اس بات کو بالکل صاف اور واضح کردیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

"The name Hindustani given by Europeans to the Indo-Aryan dialect,

---

[1] تشریح کے لیے دیکھو میری کتاب کیفیہ ص۲۳

whose home[1] is in the upper Gangetic Doab and near the city of Delhi, which owing to political causes has become the Linguafranca of modern India. The name is not employed by Indians, except as an imitation of the English nomenclature."

ہندی سے متعلق ملاحظہ ہو۔ مولانا محمد قطب الدین دہلوی کی اُردو کتاب احکام العیدین جو ۱۲۸۰ھ کی تصنیف ہے، نول کشور پریس سے چھپتی ہے۔ اس کے دیباچے کی یہ عبارت غور کے قابل ہے:۔

"اگرچہ یہ شرح زبانِ ہندی میں کہ اہلِ علم اس کی طرف التفات نہیں کرتے ہیں لکھی گئی۔"

اب چند باتیں اُردو نام کے بارے میں کہی جائیں گی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سنے اکثر بے پروائی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اُردو کے معنی بتائے جاتے ہیں لشکر، اور لشکر میں اُجڈ اور اکھڑ آدمی ہی تو ہوا کرتے ہیں، بہت حقارت سے کہا جاتا ہے کہ اُردو تو لشکری بولی ہے، اور لشکر جس میں یہ بولی جاتی تھی باہر کے آدمیوں پر مشتمل تھا، لہذا نہ یہ بھلے مانسوں کی بولی ہے اور نہ دیسی بولی ہے، ایک بدیسی چیز ہے۔ لفظ اُردو میں اصلی حرف آ، ر اور د ہیں۔ یہ تینوں حرف الف کی مختلف حرکتوں کے ساتھ اور لفظوں میں بھی آتے ہیں، جیسے اُردی بہشت، اُردوان، اُردبیل، اردشیر وغیرہ۔ لفظ اُرد کے معنی ہیں مانند، جب اسی اُرد پر واؤ نسبتی بڑھایا تو اُردو بنا، اور معنی ہوئے مماثل اجزا سے مل کر بنی ہوئی چیز، اور یہ نام اس زبان کے لیے جو فارسی اور پراکرت دو آرین زبانوں کے میل سے بنی بہت مناسب اور موزوں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب عربوں کی فتح کے بعد ایران کی زبان میں عربی لفظ آن ملے تو اس عربی آمیز فارسی کو اُردو کہا گیا تھا۔ مرزا غالب ایک خط میں جو مولوی ضیاء الدین خاں ضیا کے نام ہے اور بُرہانِ قاطع کے قضیے کے متعلق ہے، لکھتے ہیں:۔

"فارسی و عربی کو باہم ربط دے کر ایک اُردو پیدا کیا ۔۔۔۔ سو بھی جو اکابر فریقین (ایرانی اور

[1] چودھواں اڈیشن، جلد ۱۲، صفحہ ۵۷۰۔

عرب) موجد اُردو زبان ہوئے تھے وہ تسمیہ قواعد فارسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے"

اب یہ واضح ہوگیا کہ اردو ملی جلی زبان کو کہتے ہیں۔ ناموں کا ذکر ختم کیا جاتا ہی، ناموں کے بارے میں تو یہ کیفیت ہی کہ اردو گویا زبانِ حال سے کہ رہی ہی ؎

نیا ہی لیجیے جب نام میرا
بہت وسعت ہی میری داستاں میں

اب زبانِ اُردو کی پیدایش سے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہی۔ اُردو شورسینی پراکرت بھاشا اور فارسی الفاظ سے مل کر بنی۔ اس فارسی میں عربی لفظ پہلے سے شامل ہوچکے تھے۔ سنسکرت اس وقت ہندو عالموں کی ادبی زبان تھی مگر سنسکرت سے یا اسی طرح عربی سے براہِ راست اُردو نے استعارہ نہیں کیا۔ چار بڑی پراکرت بھاشائیں یہ ہیں، شورسینی، مہاراشٹری، ماگدھی اور اردہ ماگدھی۔ ان میں شورسینی کا میدانِ عمل سب سے زیادہ تھا۔ اس کے عمل میں سارا پنجاب مع سرحدی صوبے کے، لہذا سندھ، جنوب میں گجرات کے شمال اور مشرق میں بہار یا مگدھ دیس کی مغربی حد تک اس کے دائرۂ عمل میں داخل تھے۔ امتدادِ زمانہ اور صوبائی کوائف نے اس میں بیسیوں مقامی خصوصیتیں اور امتیاز پیدا کردیے، چناں چہ شورسینی پراکرت مختلف مقامی زبانوں میں تقسیم ہوگئی جو اپ بھرنش بھاشائیں کہلاتی ہیں۔ شیام سندر داس جی لکھتے ہیں:-

"پراچین گرنتھوں کے دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہی کہ عیسٰی کی دوسری یا تیسری شتابدی میں اپ بھرنش (آبھیری) نام سے پرسدھ تھی اور سندھ، ملتان، تتھا اُتری پنجاب میں بولی جاتی تھی، عیسٰی کی چھٹی شتابدی میں اس کا نام اپ بھرنش ملتا ہی۔"[1]

مجھے اس سے پورا اتفاق نہیں کیوں کہ پاہڑ دوہا جو اپ بھرنش کی ایک مستند کتاب ہی وہ اپ بھرنش میں ہی اور اس کا مصنف پنجاب، سندھ یا ملتان میں سے کسی جگہ کا رہنے والا نہ تھا۔

ان اپ بھرنش بھاشاؤں میں سے صرف ایک کا ذکر کیا جائے گا یعنی کھڑی بولی کا۔ اس کا

---

[1] ہندی بھاشا کا وکاس، صفحہ

تذکرہ بہت دل چسپ ہو۔ پہلے یہ زبان میرٹھ سے آگے نہیں چلی تھی مگر مسلمان فاتح اس کو ہندُستان کے کونے کونے میں لے گئے، انھوں نے اس کو اپنایا ہی نہیں بلکہ ملک بھر میں پھیلایا۔ اور یہ تاریخ بتاتی ہو کہ مسلمانوں کے عَلم کا پرچم سیت بندرامیشور تک لہرایا تھا، یہ ہونا ہی تھا کہ اس میں فارسی اور عربی کے لفظوں کا خلط ملط ہوا۔ چناں چہ یہ ہوا مگر موزوں تصرف کے عمل کے ساتھ۔ کھڑی بولی کو لٹریچر بھی مسلمانوں سے ملا، کیوں کہ امیر خسرو ہندی کے محققوں کے قول کے مطابق کھڑی بولی کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں[۱] اور یہی اُردو کے بھی پہلے شاعر ہیں[۲]۔

جس کھڑی بولی کا ابھی ذکر ہوا اس کی حال کی ترقی کی نسبت لکھتے ہیں :-

"برج اور اودھی کے ستھان میں کھڑی بولی اپنا پورن ادھکار جما چکی ہو۔"[۳]

جناب میتھلی سرن گپت اپنی نظموں کے مجموعے پلّو کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"ان بیس پچیس برسوں کے چھوٹے سے بیتے میں کھڑی بولی کی کوتا کے مول دیش کے ہردے میں کتنے گہرے چلے گئے۔"[۴]

...

گپت جی نے اسی دیباچے میں آگے چل کر کھڑی بولی کا برج بھاشا سے مقابلہ کیا ہو۔

یہ امیر خسرو کی جدت تھی کہ جس بولی کو انھوں نے شاعری کا تمغا عطا کیا تھا آج وہ تلسی داس اور سور داس، جائسی اور بہاری کی زبان کے سامنے خم ٹھوکتی ہو۔

یہاں تک کام ہو چکا تھا اور مسلمان ہندُستان میں بس گئے تھے، اور فاتح اور مفتوح کا امتیاز بہت کچھ کم زور پڑ گیا تھا کہ زبان کی تنظیم اور تدوین میں ہندو بھی شریک ہو گئے۔ چناں چہ اُردو کی پہلی مکمل غزل جو ہم کو ملتی ہو وہ ایک ہندو شاعر ہی کی ہو۔[۵]

اس مقالے کے موضوع میں صرف تین نام دیے گئے ہیں یعنی "اُردو، ہندُستانی، ہندی"۔ اُردو اور ہندُستانی کی نسبت تو آپ اب تک کافی سُن چکے ہیں، مگر ہندی کی بابت ابھی تک اتنا ہی کہا

---

[۱] ہندی بھاشا کا وکاس ص۵۰۔ [۲] تفصیل کے لیے دیکھو کیفیہ ص۲۳۔ [۳] پراچین اور نوین کاویہ دھارا، مصنفہ سوریہ بلی سنگھ، ص۱۶۔ [۴] ص۱۸۔ [۵] تفصیل کے لیے دیکھو کیفیہ ص۲۳۔

گیا کہ وہ بھی اُردو کا ایک نام ہو۔ جیسا ابھی دیئے گئے اقتباسوں سے واضح ہوا ہوگا۔ ابھی تک امیر خسرو والی کھڑی بولی کا نام ہی ادب میں لیا جاتا ہو اور اس کا مجمل ذکر کیا گیا لیکن آج کل عرفِ عام میں جسے ہندی کہا جاتا ہو اس کے بارے میں غور کرنا بے محل نہ ہوگا۔

اس ضمن میں انسائکلو پیڈیا برٹینیکا کا یہ قول ہو:۔

"It (Hindi) was intended to be a Hindustani for the use of Hindus, and was derived from Urdu."

پنڈت ایندر دھر گلیری صاحب کی تحقیق جو اس بارے میں ہو ابھی عرض کی جاتی ہو۔ ہندی دُنیا میں اس کا بہت چرچا ہو۔ ملاحظہ ہو:۔

"کھڑی بولی یا پکّی بولی یا ریختہ یا عہدِ حاضر کی ہندی کے ابتدائی زمانے کی نثر اور نظم کو دیکھ کر یہی جان پڑتا ہو کہ اُردو رچنا (انشا) میں فارسی، عربی تت سموں یا تدبھوں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تت سم اور تدبھو رکھنے سے ہندی بنالی گئی۔ ۔ ۔"

کاشی کی ناگری پرچارنی سبھا کے بنیادی سکریٹری شیام سُندر داس جی فرماتے ہیں:۔

"اُردو کھڑی بولی کے بکٹ تم ہو۔" [۵۲]

مدھ پرانتیہ ہندی ساہتیہ سمیلن میں جو ۱۹۴۲ء میں منعقد ہوا، شری بھال چندر راؤ نے استقبالیہ خطبے میں فرمایا:۔

"ہندی ساہتیہ کے اِتہاس پر یدی درشٹی ڈالی جائے تو یہ سپشٹ گیات ہوگا کہ ہندی ساہتیہ کا نرمان کسی ایک جاتی نے نہیں کیا، وبھِن بھاشا بھاشیوں تھا بھِن پرانتوں کے کویوں نے ہندی ساہتیہ کا کاویہ نرمان کیا ہو، ہندو کوی، مسلمان کوی، سنت کوی، صوفی کوی، پنجاب، راجستھان ... آدی پرانتوں کے کویوں نے اس ساہتیہ کا کاویہ نرمان کیا ہو۔" [۵۳]

---

[۵۱] چودھواں اڈیشن، جلد ۱۲، صفحہ ۵۸

[۵۲] ہندی بھاشا کا وکاس صفحہ ۵۸

[۵۳] ماذھری، مارچ ۱۹۴۲ء

بابو کالی داس کپور لکھتے ہیں :-

"سوتنتر بھارت میں . . . ہندی، اُردو کی راشٹریتہ اور پرانتیہ بھاشاؤں اور اُن کے ساہتیہ کی پورن رکشا کی جائے گی۔ ہندی اور اُردو ایک ہی بھاشا کے دو وبھن ساہتیک روپ ہیں۔" [۱]

جناب 'حق پرست' کی کتاب "ہماری زبان" پر مؤلف یا مصنف نے جو پیش لفظ لکھوایا ہے وہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے :-

"مُلک کے مشہور ادیب جناب اختر حسین رائے پوری کا یہ خیال غالباً بالکل درست ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث زبان کا نہیں رسم الخط کا ہے۔" [۲]

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب اُردو ہندی کے جھگڑے سے متعلق ہے اور مصنف کا روئے سخن اُردو کے خلاف ہے تو اس اقتباس کی وقعت جو ابھی پیش ہوا اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ امرِ واقعہ ہے کہ اُردو نے اور اُردو والوں نے صوبائی زبانوں یا کھڑی بولی سے کبھی سرد مہری کا برتاؤ نہیں کیا۔ دُور کے زمانے کو رہنے دیجیے کہ وہ تذکرے تاریخ میں آچکے ہیں۔ سید انشا کے کئی زبانوں کے قصیدوں سے بھی قطع نظر کیجیے جن میں صوبائی بھاشاؤں کا بڑا دخل تھا اور ان کی رانی کیتکی کی کہانی کو بھی رہنے دیجیے، عہدِ حاضر پر نظر رکھیے تو بداہت کے ساتھ واضح ہوگا کہ دلگیر کا دیوان ہی نہیں بلکہ بیسیوں شاعر جہاں اُردو نظمیں لکھتے ہیں ہندی میں بھی اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ موجودہ جنگ سے متعلق حکومتِ ہند نے اپنے مساعی کو نامکمل سمجھا جب تک کہ اُردو کے شاعر سے استمداد نہ کیا گیا۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا اس سے یہ حقیقتیں حاصل ہوتی ہیں :-

۱۔ ہندستان کی زبانوں میں فارسی لفظوں کی آمیزش اسلام اور مسلمانوں کے یہاں آنے سے پہلے ہونے لگی تھی۔

۲۔ کھڑی بولی کو عام رواج اور ادبی حیثیت دینے والے مسلمان تھے۔

---

[۱] ماذھری، دسمبر ۱۹۴۲ء صـــ ۱۰۰-۴۸۰۔

[۲] ہماری زبان، مصنفہ "حق پرست" صـــ ۳

۳۔ اُردوٗ کی تدوین و تنظیم میں ہندو مسلمانوں کا برابر کا حصّہ ہے۔

۴۔ ہندی کی شاعری اور ادب کے ترقی دینے والوں میں مسلمانوں کا عظیم الشان حصّہ ہے۔

۵۔ ہندستانی وہ نام ہے جو انگریزوں نے اُردوٗ کو دیا۔

۶۔ آج کل عُرفِ عام میں جس زبان کو ہندی کہا جاتا ہے وُہ اُردوٗ سے ماخوذ ہے۔

۷۔ اُردوٗ اور ہندی میں بہت نزدیکی اور یکسانیت ہے۔

۸۔ اُردوٗ اور ہندی میں صرف رسمِ خط کا امتیاز ہے۔

حضرات اب تک جو عرض کیا گیا اگر التفات کے قابل ہے اور جن آدمیوں اور کتابوں سے مختلف رائیں اور حقائق پیش کیے گئے، وہ قابلِ قبول ہیں تو کیا آپ کہیں گے کہ یہ اُردوٗ ہندی کے جھگڑے کا بھوت مُلک کے سر سے نہیں اُتارا جاسکتا۔ یہ اُتر سکتا ہے اور اسے اُتارنا پڑے گا۔

مَیں نے شروع میں دکھایا تھا کہ بعدِ جنگ کی نوتعمیری اور تجدید کا عمل ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اور اسی پروگرام میں زبانوں کا قضیہ بھی شامل ہے۔ اگر ہم نے یعنی اُردوٗ ہندی والوں نے اب اس جھگڑے کو نہیں نبیڑا تو کوئی اور اس کو نبیڑے گا اور یہ صاف ظاہر ہے کہ اُس میں خوش اسلوبی کی پرواز کا ہونا دُشوار ہے، اس لیے ہم اہلِ ہند کا فرض ہے کہ اور مختلف فیہ اور متنازعہ معاملوں کے ساتھ زبان کے معاملے میں موجودہ صورت کے ختم کرنے کی حد بھر کوشش کریں۔ بعض اہلِ غرض نے جو دقّتیں موانع کی شکل میں پیدا کردی ہیں، وہ اصلی نہیں، بےحقیقت ہیں۔ ان کے ساتھ اس مشورے پر عمل پیرا ہونا چاہیے ؎

گفتند کہ ایں دوراں آیا بہ توئی سازد

گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

——————>•*(※)*•<——————

سرسیّد کے لکچر (یعنی تقریریں)

(جناب سید رشید الحسن صاحب ایم اے عثمانیہ)

(۳) سرسیّد کی تمدّنی اور معاشرتی تقاریر

اس طبقۂ تقاریر میں ہم نے سرسید کی چار تقریریں رکھی ہیں۔ جن میں "تہذیب و شایستگی" اور "رسم و رواج" پر اُنھوں نے سیرِ حاصل بحث کی ہو۔ ان سے ظاہر ہوتا ہو کہ سرسید کا مطالعہ کس قدر وسیع اور قوموں کی تہذیب و شایستگی اور رسم و رواج کے متعلق ان کی معلومات کا ذخیرہ کتنا وافر تھا۔ اُنھوں نے ان عنوانات میں دنیا کی تمام قوموں کی تہذیب و شایستگی اور رسم و رواج پر ایک تقابلی اور حکیمانہ نظر ڈالی ہو۔ جس میں تاریخی تسلسل بھی باقی ہو۔ یہ استدلال اب بھی اپنی اپنی جگہ درست اور قابلِ تسلیم ہیں۔ ان میں سے دو تقریریں سرسید کی ابتدائی تقریروں میں ہیں۔ چوں کہ سرسید اپنی ابتدائی قومی زندگی میں ایک زبردست محقق اور مصنف کی حیثیت سے روشناس تھے اس لیے اِن تقریروں میں بھی ان کی تحقیق اور تفتیش کی شان نظر آتی ہو۔ وہ ایک زبردست عالم کی طرح اپنے بیانات کو کھول کھول کر اور مدلّل طریقے پر پیش کرتے ہیں۔ "تہذیب و شایستگی" پر جو تقریر کی ہو اس میں سب سے پہلے انگریزی لفظ سویلیزیشن کے مشتقات بتائے ہیں اور پھر معنی وغیرہ۔ سب سے دل چسپ حصّہ تقریر کا وہ ہو جہاں اُنھوں نے تہذیب و شایستگی کے اسباب پر بحث کی ہو اور ان کی پانچ قسمیں قرار دی ہیں۔ ان کی تشریح کا خلاصہ حسبِ ذیل ہو :-

تہذیب و شائستگی پیدا کرنے والی یا اس کے روکنے والی پہلی چیز ایک مقام کے قدرتی اسباب ہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہو کہ جن مقامات پر کھانے پینے کی چیزیں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں وہاں زیادہ لوگ آباد ہوجاتے ہیں اور ان کو اعلیٰ درجے کی شائستگی حاصل کرنے کا موقع ملتا ہو لیکن یہ غلط ہو اس لیے کہ اشیاے خورد و نوش کا آسانی سے مل جانا انسان کو کاہل بناتا ہو اور اس کے بعد طرح طرح کی بُرائیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس امر کی تصدیق کے لیے ہمارے سامنے افریقہ، جنوبی امریکہ اور ہندستان کی نظیر ہو جو اب تک جہالت میں مُبتلا ہیں۔ البتہ مصر، شام اور ایران کے زرخیز خطّے ایک عرصے تک تہذیب و تمدن کے مرکز رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی مُلک کی زرخیزی اور خوبی جہاں اس کی شائستگی کے واسطے کوئی لازمی سبب نہیں وہاں اس کی مزاحم بھی نہیں ہو۔

دوسری چیز قوموں کے آمد و رفت کے ذرائع ہیں۔ جو قومیں اپنے جغرافیائی حالات سے مجبور ہیں کہ ایک دوسرے سے مل جُل نہیں سکتیں اور علم و عقل کی روشنی حاصل نہیں کرسکتیں وہ تہذیب و شائستگی سے محروم رہتی ہیں۔ چناں چہ بحرِ قلزم کے کناروں اور جزائرِ متعلقہ یونان اور قسطنطنیہ میں جو آمد و رفت ہو یا یورپ و ایشیا و افریقہ و جزائرِ انگلستان کے باہم جو آمد و رفت ہو اس کی بدولت ان مقامات پر تہذیب کی روشنی پھیلی ہوئی ہو۔ برخلاف اس کے افریقہ کا ریگستان، تبت و بھوٹان کی پہاڑیاں بیرونی آمد و رفت کو روکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے یہاں کی قومیں وحشی ہیں۔

تیسری چیز مذہبی امور ہیں۔ مذہبی اعتقادات کی زنجیریں بھی انسان کو اس قدر جکڑ دیتی ہیں کہ جس سے قدیم ڈگر پر بے سوچے سمجھے چلتا ہو اور کبھی جہالت و تاریکی سے نکلنے نہیں پاتا۔ لیکن بعض مذاہب انسان کی صحیح رہبری کرتے ہیں۔ غرض مذہبی امور بھی کسی مقام کے تمدن کے پھیلنے میں ممد یا مزاحم ہوتے ہیں۔

چوتھی چیز آزادی ہو۔ جن مُلکوں میں آزادی ہو وہاں انسان ہر قسم کی ترقّی کرسکتا ہو۔ برخلاف اس کے غلام قوم دوسرے کی تابع ہونے کی وجہ سے ترقّی نہیں کرسکتی اور ان کی تہذیب و شائستگی بھی برقرار نہیں رہنے پاتی۔ چناں چہ جب رُومیوں میں شہنشاہی قائم ہوئی تو غلام بنانے کے دستور اور آزادی

گے چلتے رہنے سے ان کی شائستگی بالکل معدوم ہوگئی۔ برخلاف اس کے یورپ کی تمام آزاد سلطنتیں دن دونی اور رات چوگنی تہذیب و شائستگی حاصل کررہی ہیں۔

پانچویں چیز مختلف قوموں کی تہذیب کو اخذ کرنے کی صلاحیت ہے۔ بعض قومیں کسی چیز کو جلد اخذ کرتی ہیں اور بعض دیر سے۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گورے رنگ کے لوگ کالوں سے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں۔ گوروں میں تحقیق و تفتیش کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ کالے رنگ کی قوموں میں ایجاد یا اختراع کا مادہ کم پایا جاتا ہے۔

سرسید کی "رسم و رواج" والی تقریر بھی نہایت مفصّل و مبسوط ہے۔ پہلے رسم و رواج کی مختلف تعریفیں کی ہیں ان میں سے ایک قانونی تعریف یہ ہے کہ :-

"رسم ایک ایسا قانون ہے جو کبھی تحریر میں نہیں آتا مگر مدتوں سے اور عام لوگوں کی رضامندی سے جاری ہے۔"

پھر فرماتے ہیں :-

"رسم و رواج کی حکومت انسانوں کے دلوں میں نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ہر شخص غلام سے زیادہ اس کی تابع داری کرتا ہے۔ آقا کو اپنے غلام پر کبھی کبھی نافرمانی کرنے کا اندیشہ ہوتا ہے مگر رسم و رواج کو اپنے غلاموں کی نسبت نافرمانی کا کبھی اندیشہ نہیں ہوتا۔"

پھر ان کی تین قسمیں بتائی ہیں کہ رسم و رواج ایک مذہبی، دوسرے حکومتی اور تیسرے معاشرتی ہوتے ہیں۔ ان تینوں قسموں کے تحت اس کے موافق اور مخالف مختلف یورپی مصنّفین کے اقتباسات درج کیے ہیں اور آخر میں خود اپنی رائے پیش کرتے ہیں کہ رسم و رواج کا تبدیل کرنا اور ان کو ترقی دینا معاشرت کے لیے ضروری ہے اور ایک منطقی دلیل یوں پیش کی ہے کہ :-

"رسمیں نتیجہ ہیں زمانے کی حالت کا اور زمانے کی حالت ہمیشہ قابلِ تغیر ہے پس رسمیں بھی قابلِ تغیر ہیں۔"

رسومات کی اصلاح نہ کرکے ہمیشہ ایک ہی بات کے پیچھے پڑے اور لکیر کے فقیر بنے رہنے سے

انسان کی عقل سوجاتی ہی اور قوتِ ایجاد باقی نہیں رہتی جس کے سبب قومی تنزل شروع ہوجاتا ہی۔
زمانہ اور تعلیم و تربیت خود بخود انسان کو اچھی اور بُری رسموں میں فرق دکھاتا ہی اور بُری رسمیں ازخود مِٹ جاتی ہیں۔ جس شخص کے دِل میں اصلاحِ رسوم کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ وہ نہایت استقلال اور پامردی کے ساتھ قوم سے اختلاف کرے۔ گو شروع شروع قوم اس کو برا کہے گی لیکن رفتہ رفتہ اسی کی پیروی کرنے لگے گی۔ دُنیا کی تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ سقراط نے جب اپنی قوم کی بد رسموں کی اصلاح چاہی تو اسی کی قوم نے اس پر دیوتاؤں کے بُرا کہنے اور ایتھنز کے نوجوانوں کو بہکانے کا الزام لگایا اور آخر میں زہر کا پیالہ پلاکر مارڈالا۔ مگر چند روز بھی نہ گُزرے تھے کہ اہلِ ایتھنز نے اس کا ماتم کیا۔ اسی طرح لوتھر نے بھی عیسائی گرجا کی تمام بُری رسموں کا مُقابلہ کیا اور اپنی سچائی پر نہایت استقلال سے قائم رہا۔ مسلمانوں میں غزالی نے مسائلِ اسلام بیان کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کی اس پر علماے زمانہ نے کفر کے فتوے لگائے اور اس کی کتاب " احیاے علوم" کے جلانے کا حکم دیا یہاں تک کہ قتل کا حُکم جاری کردیا۔ مگر بالآخر وہی امامِ غزالی اور حُجۃ الاسلام کے لقب سے پُکارا گیا۔

سرسید بعض مذہبی رسُومات کے دِل سے قائل تھے۔ جن میں سے ایک رسم بسم اللہ ہی جس پر اُنھوں نے سید مسعود کی بسم اللہ کے موقع پر نہایت ہی مدلل بحث کی ہی۔ اُنھوں نے پہلے رسُوم کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک شعائرِ اسلام یا شعائراللہ۔ دوسری شعائرالمسلمین۔

"شعائرِ اسلام وہ جن کے کرنے کو رسول نے فرمایا اور خدا نے اس کو شعائرِ اسلام گردانا اور اس کے کرنے کا حکم دیا۔"

اس میں نہ کسی قسم کی کمی ہوسکتی ہی نہ زیادتی۔

"شعائرِ مسلمین وہ ہیں جو آں حضرت کے قول وفعل سے ماخوذ ہیں۔ اس کے کرنے کا قولاً کوئی حکم نہیں ہی۔ لیکن گروہ در گروہ مسلمان اس کو مدت دراز سے کرتے آئے ہیں۔"

شعائرالمسلمین میں سے ایک مستحسن رسم بسم اللہ کی ہی۔

"بسم اللہ کی رسم نہ فرض ہو نہ سنّت نہ واجب مگر کیا اچھا شعائرِ مسلمین ہو کہ جب بچّہ اس حد تک پہنچ جاتا ہو کہ کلام کو دُہرا سکے تو اس وقت کی یادگار میں جب کہ خدا نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ اقراء باسم ربك الذی خلق تو اس سے بھی کہلوایا جاتا ہو اور دوستوں اور مسلمانوں کے سامنے اس کی خوشی منائی جاتی ہو۔"

مگر سرسید نے اس قسم کی اچھی رسموں میں بے جا خرچ سے بچنے کی نصیحت کی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے قوم کی بھلائی کے کاموں کو نقصان ہوتا ہو۔

آخر میں ہمارا یہ لکھنا نہایت ضروری ہو کہ سرسید نے بہ حیثیت ایک رفارمر کے کیا کام کیا۔ اگرچہ سرسید کے زمانے میں راجا رام موہن راے، بابو کشیب چندر سین، ایشور چندر ودیا ساگر، سرشی چندر بھٹاچاریہ، رام تنولا ہیڑی، سوامی دیانند وغیرہ نے ہنود کی اصلاح کی کوشش کی۔

"مگر مسلمانوں[۱] میں ظاہرا دو شخصوں کے سوا کہ دونوں دلّی کی خاک سے اُٹھے تھے کسی نے اس کام پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسمٰعیل اور دوسرے سید احمد خاں۔"

حالی کا یہ قول صحیح ہو۔ سرسید نے اس خصوص میں جو بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ اُنھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے معاشری حالات میں جو سمندر حائل تھا اس کو پاٹا۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ اسلام اہلِ کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، ان کا کھانا اور ذبیحہ کھانے اور ان کے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا ہو۔ سرسید کا قول تھا کہ جس طرح مسلمانوں کی سیاسی حالت درست کرنے کے لیے مغربی تعلیم کی اشاعت ضروری ہو اسی طرح حاکم قوم سے معاشری تعلقات کو بھی مستحکم کرنا ان کا فرض ہو۔ اس دُشوار گزار کام میں جو کامیابی ہوئی اور جو کام اُنھوں نے کیا وہ کسی اور شخص سے ناممکن تھا۔ سرسید کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اُنھوں نے

"بجائے[۲] اس کے کہ وہ جزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے جہاں تک ممکن تھا مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصلاحوں کی جڑ ہو کوشش کی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے

ف ۱ - حیاتِ جاوید

ف ۲ - حیاتِ جاوید

مذہبی خیالات و اوہام کی اصلاح کو ضروری سمجھا کیوں کہ جن باتوں کو لوگ غلطی سے مذہب پر مبنی سمجھتے ہیں ان کا چھوٹنا قریب ناممکن کے ہوجاتا ہے۔ دوسرے سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جس نے یورپین اقوام کو حُسنِ معاشرت میں تمام دُنیا میں فائق کردیا ہے۔"

سرسید نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ قوم کا اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ خود نہایت استقلال سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے۔ بلاشبہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کے لائق نہیں رہتا۔

سرسید اپنے قول کے بڑے پابند تھے جو وہ کہتے وہی کرتے۔

"رسم و رواج[ف ۱] کی پابندی کو اُنھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور عید تہوار میں جو فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سرسید کے گھر میں کہیں اُن کا نام و نشان نہ تھا۔"

سرسید کا قول ہے کہ

"نہایت[ف ۲] کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرتا ہے۔"

(۴) سرسید کی تنقیدی تقریریں

ابتدا ہی سے سرسید کو تحقیقاتی کاموں کا شوق تھا۔ چناں چہ حالی لکھتے ہیں کہ :-

"سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عماراتِ بیرونِ شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔"

ف ۱ و ۲، حیاتِ جاوید

اس تحقیقی کام کے لیے بعض وقت جان جوکھوں میں ڈالتے تھے۔ حیاتِ جاوید میں لکھا ہو کہ سرسید قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کی وجہ سے پڑھے نہ جاتے اس کے پڑھنے کے لیے وہ ایک چھینکے کے ذریعے اوپر جاتے اور اس میں بیٹھ کر گھنٹوں کتبوں کا چربہ اُتارا کرتے۔

اس کے بعد سرسید کا ایک مشہور کام "تاریخ سرکشیٔ بجنور" ہو۔ جس کے ترتیب دینے کے لیے باوجود اس کے کہ ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے وہ اپنی یادداشتوں اور ضروری کاغذات کو مرتب کرتے جاتے تھے۔ ان کا رسالہ اسبابِ بغاوت بھی اسی قسم کے تحقیقی کام کا نتیجہ ہو۔

سرسید اپنی تقریروں میں ہمیشہ علمائے اسلام سے خطاب کرکے کہا کرتے کہ وہ اپنے اسلاف کی طرح اس زمانے میں بھی مخالفِ اسلام تحریکوں کو دبانے کے لیے علمِ کلام کی طرح ایک اور علم ایجاد کریں اور خود بھی اکثر مذہبی تحقیقات میں مصروف رہا کرتے۔ حالی نے لکھا ہو کہ سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندستان میں زمانۂ حال کے شبہات جو لوگوں میں اسلام کی نسبت پیدا ہوئے ان کو دُور کرنے کی کام یاب کوشش کی۔

"اگرچہ[ف۱] مذہبی تحقیقات کا خداداد ملکہ جو سرسید کی طبیعت میں ودیعت تھا اس کا ثبوت ان کی ہر ایک تحریر میں جو غدر کے بعد ان کے قلم سے نکلی نمایاں طور پر پایا جاتا ہو مگر تفسیر القرآن جس میں گویا نئے کلام کی بنیاد قائم کی گئی ہو سب سے عمدہ نمونہ ان کی تحقیقات کا ہو۔"

تحریروں کی طرح سرسید کی تقریریں بھی ہر قسم کی تحقیقات اور تنقیدات سے ملو ہیں۔ سرسید علاجِ ہومیوپیتھک کے بڑے حامی تھے۔ اُنھوں نے بنارس میں سنہ ۱۸۷۶ء میں ایک طول طویل لکچر ہومیوپیتھک طبابت کی تاریخ اور اس کے اصول و طریقۂ علاج پر دیا جس کے دیکھنے سے ان کی تحقیق کی عظمت دل میں بیٹھتی ہو۔ چناں چہ اس تقریر میں وہ ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کا

ف ۱ - حیاتِ جاوید، ص ۶۸۴۔

مقابلہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایلوپیتھی دو یونانی لفظ سے مرکب ہو جس کو یونانی حکیم علاجِ بالضد کہتے ہیں اسی طرح ہومیوپیتھی بھی دو یونانی لفظوں کا مرکب ہو جس کے معنی علاج بالمثل یا علاج بالشبہ کے ہیں۔ جب سے ایلوپیتھی کا وجود ہوا اسی وقت سے ہومیوپیتھی کے اصول بھی لوگوں کو معلوم تھے جو متعدد بیماریوں کے علاج میں مروّج تھے۔

اس بحث کے ساتھ ساتھ وہ حوالے بھی دیتے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کالی داس اپنے سنسکرت کے ایک قصیدہ "سنگار تلک" کے ایک شعر میں ہومیوپیتھی کے اصول تمثیلاً بیان کرتا ہو:-

"پُرانے زمانے کی بات اس دُنیا میں یوں سُنی گئی کہ زہر خود زہر کے لیے علاج ہو"

ہپوکرسٹن بیان کرتا ہو:-

"جس قسم کی چیزوں سے بیماری پیدا ہوتی ہو اسی قسم کی چیزیں بیمار کو دی جاتی ہیں تو وہی چیزیں ان بیماریوں کا علاج بن جاتی ہیں"

آگے چل کر اپنے نظریے کی تائید میں کہتے ہیں کہ ڈاکٹر ہنوّمن جو اس علاج ہومیوپیتھی کا موجد ہو اس نے ان اصولوں کی ایجاد نہیں کی بلکہ ان کو اختیار کیا ہو۔ اوّل اوّل یہ اصول یورپ کے ایک طبّی اخبار (سنہ ۱۷۹۶ع) میں مشتہر ہوئے اور بعد میں ہزاروں عالموں اور معالجوں نے ان سے علاج شروع کیا۔

ہندستان میں صنعتی تعلیم کے نہ پھیلانے کے لیے جو دلیلیں سر سید نے اپنی ایک تقریر میں پیش کی ہیں وہ ایک بڑے محقق اور دانش مند کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ایک دلیل انھوں نے یہ بیان کی کہ صنعتی تعلیم کی خواہش اور تقاضا اُسی مُلک میں ہوسکتا ہو جہاں ہر قسم کے خانگی کارخانے کثرت سے ہوں اور فی الواقع ان کارخانوں کو صنعتی تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہو۔ ہندستان کی حالت یہ ہو کہ یہاں کسی قسم کے کارخانے نہیں ہیں اور نہ صنعتی تعلیم یافتوں کی مانگ ہو ایسی صورت میں مُلک کو صنعتی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں۔

دوسری دلیل یہ ہو کہ ہندستان کے معدودے چند کارخانے مثلاً ریلوے یا چند کارخانوں کے

مزدوروں کے متعلق دیکھا گیا ہے کہ اُنھوں نے کسی مدرسے میں مشین یا اسٹیم یا فزکس کی اصولی تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ صرف عملی تعلیم سے اِن سب کاموں کے کرنے کی لیاقت پیدا ہوئی۔ غرض عملی تعلیم درحقیقت اصلی صنعتی تعلیم ہے۔ نِری اصولی تعلیم بےفائدہ اور عمر کا ضائع کرنا ہے۔

سرسید زبان اور اس کے ادب کے متعلق اعلا قسم کی معلومات رکھتے تھے۔ وہ اُردو زبان کے معمار اور محسن ہیں۔ اُنھوں نے اُردو کو سنوارا اور اس میں بےشمار راہیں نکالیں۔ اُردو شاعری جس کی صورت کورانہ تقلید کی وجہ سے مسخ ہورہی تھی اس کو نور بخشنے والے یہی بزرگ ہیں۔

سرسید چوں کہ اُردو کو ہندستان کی مشترکہ زبان قرار دیتے تھے اور اس کو ہندو مسلم اتحاد کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اس کی وسعت اور اشاعتِ عام کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ سنہ ۱۸۶۸ ع میں جب بنارس کے سربرآوردہ ہندو حضرات نے یہ تحریک شروع کردی کہ سرکاری عدالتوں سے اُردو زبان کو نکال کر ہندی زبان رائج کی جائے تو سرسید بہت رنجیدہ ہوئے اور کھٹک گئے کہ اگر اس تحریک نے زور پکڑا اور اُردو زبان کو دھکّا لگا تو مُلک کی متحدہ قوت پارہ پارہ ہوجائے گی اس لیے وہ اُردو زبان کی اصلاح اور ترویج میں اور زیادہ منہمک ہوگئے۔ خوش قسمتی سے ان کو حالی جیسا ذہین اور طبّاع شخص ملا جس نے ان کی تحریک کی رُوح کو سمجھا اور اس کو کام یاب بنانے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہُوا۔ چناں چہ ہم کہ سکتے ہیں کہ حالی کی شاعری سرسید کی اصلاحی تحریکات کا ایک جُز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید حالی اور ان کے دیگر معاونین کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ چناں چہ ایک ایڈریس کے جواب میں جس میں اُن کی اُردو خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا سرسید نے نذیر احمد کے ساتھ ساتھ حالی کو اس طرح سراہا ہے :-

"ایک ہی دِن گزرا ہے کہ آپ نے ہمارے دلی کے فخر نذیر احمد کا اُردو لکچر سُنا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو کہ ایسا فصیح لکچر دے جس میں اُردو کی فصاحت اور مولویانہ پن دونوں اضداد جمع ہوں۔ یہ دلی کے روڑے ہیں شاعر نہیں مگر چند اُردو کے اشعار جو اُنھوں نے پڑھے آپ نے سُنے کہ کس فصاحت کے تھے۔ مولانا حالی کا مسدس سب صاحبوں نے سُنا ہوگا۔ قوم کا ایک مرثیہ ہے

جو زبان سے نکلتا ہو اور دل میں بیٹھتا ہو۔ یہ سب لوگ آفتاب ہیں جنھوں نے زبان کی درستی پر توجہ کی ہو نہیں تو ان لوگوں کا جھوٹا کھانے والا اور خوشہ چیں ہوں اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

حالی کی "مدو جزرِ اسلام" جیسا کہ معروف ہو سرسید کے کہنے پر لکھی گئی تھی۔ سرسید نے جب دیکھا کہ حالی کی نظموں میں وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو انھوں نے اردو شاعری کے قالب کو بدلنے کے لیے پیش کی تھیں تو بہت خوش ہوئے اور حالی ہی کو جدید اردو شاعری کا بانی و موجد قرار دیا۔ ایک اور تقریر میں سرسید حالی کی تعریف میں اس طرح گویا ہیں :-

"شاعری جو مدت سے ہندستان میں جاری ہو وہ سب لوگ یقین کریں گے کہ ان کے مضامین کے بیان کرنے سے کوئی خوشی شاید کانوں کو ہوتی ہو مگر دل میں اثر کرنے والی نہیں ہوتی لیکن جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہو وہ ایسا مشکل ہو کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہو۔ جذباتِ انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا اس طرح کہ کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے مولانا حالی ہی کا کام ہو۔"

اس ضمن میں سرسید کی ایک تقریر "تعلیم زبانِ فارسی" کے دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہو کہ سرسید لسانیات سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا مطالعہ ہر قسم کے ادب پر حاوی تھا۔ جس زمانے میں ہندوؤں نے فارسی کو نصاب سے نکالنے کے لیے بہت سے شاخسانے نکالے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ فارسی کو کلاسکل نہیں سمجھتے تھے اور جیسا کہ سرسید نے کہا ہو وہ شاید کسی مُردہ زبان ہی کو کلاسکل سمجھتے ہوں لیکن سرسید نے پہلے اس لفظ کی تحقیق کی اور بتایا کہ کلاسکس لیٹن کے لفظ کلاسکو سے نکلا ہو اور یہ لفظ روم کے اعلا درجے کے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس صفت نے آگے چل کر اعلا درجے یا مستند کا مفہوم پیدا کرلیا۔ اور لٹریچر اور آرٹ میں اس کا اطلاق ہونے لگا۔

کلاسکل کے مفہوم کو سمجھانے کے بعد سرسید یہ ثابت کرتے ہیں کہ فارسی زبان بھی ایک کلاسکل زبان ہو۔ اس کی شیرینی تمام دُنیا میں مُسلّم ہو:-

"اس کی شاعری کیا بہ اعتبارِ نازک خیالی، کیا بہ لحاظِ علمِ اخلاق اور کیا بہ اعتبار تمام فنونِ شاعری کے ایسی اعلا درجے پر پہنچی ہوئی ہو کہ بڑے بڑے لیٹن اور گریک کے شاعروں کی ہمسری سے بھی کسی قدر بلند ہوگئی ہو"

عمر خیام کی رباعیات، فردوسی کی مثنوی (شاہ نامہ)، حافظ کی غزلیات سب کو دُنیا کی شاعری میں ایک اعلا مقام حاصل ہو۔ اسی طرح سعدی، نظامی، جامی، خسرو، انوری و خاقانی وغیرہ فارسی کے نہایت بلند پایہ اور مستند اُستاد گزرے ہیں۔

اس کے علاوہ فارسی ایک علمی زبان بھی ہو۔ اس میں فلسفہ، علم الاخلاق، سیاست، تمدن، ہیأت، ریاضی، تاریخ، طب وغیرہ کا ایک وافر ذخیرہ ہو۔ یہ زبان ایسی طاقت ور اور فصیح ہو کہ ہر قسم کے علمی مسائل ادا کیے جا سکتے ہیں۔

سرسید فرماتے ہیں کہ فارسی ایک اعلا درجے کی اور کلاسکل زبان ہونے کے علاوہ ہندستان کے مسلمانوں سے ہمیشہ متعلق رہی ہو اس میں ان کی تاریخ، تمدن اور اخلاق مدوّن ہوا ہو اور فارسی زبان ہی نے ہندستان کے لوگوں کو تہذیب اور حسنِ معاشرت سکھایا اور یہاں کی ذہنی اور دماغی نشوونما کا کام اسی نے کیا ہو۔ اِن وجوہات کی بِنا پر یہاں کے مسلمان فارسی زبان کو فراموش نہیں کر سکتے۔

ایک مقام پر سرسید نے فارسی زبان میں عربی الفاظ کے مستعمل ہونے کے وجوہات پر بڑی دل چسپ بحث چھیڑی ہو۔ کہتے ہیں کہ جب عربوں نے ایران فتح کیا اور وہاں ایک عرصۂ دراز تک حکومت کرتے رہے تو لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی زبان میں جو فارسی تھی بہت سے عربی الفاظ داخل ہوئے جس طرح اب اُردو زبان میں انگریزی کے الفاظ شامل ہوگئے ہیں۔ اور اس طرح گھل مل گئے کہ اسی زبان کے الفاظ معلوم ہونے لگے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ الفاظ تین قسم کے ہیں :-

اوّل: قرآن کی بے مثل فصیح و بلیغ آیتیں جو فارس کے چپّے چپّے پر پڑھی جاتی تھیں ایسی

بلکہ کشش تھیں کہ کوئی دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لیے ان کیفیات کے اور مذہب اسلام کے خاص الفاظ فارسی میں داخل ہوئے۔“

دوم: فاتح قوم کی زبان کے وہ الفاظ جو امورِ سلطنت سے متعلق ہوتے ہیں مفتوح قوم کی زبان میں قدرتی طور پر داخل ہوتے ہیں۔ چناں چہ فارسی میں بھی یہی ہوا۔

سوم۔ ان تمام علوم کے الفاظ جو عرب فارس میں لائے وہ بھی بلا کسی جبر و اکراہ کے فارسی میں شامل ہوئے۔

غرض یہ تین قسم کے عربی الفاظ اب فارسی کے جزوِ بدن ہوگئے ہیں ان کو اس سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے علاوہ جتنے غیر مانوس عربی کے الفاظ ہیں وہ یقیناً فارسی سے خارج کردیے جاسکتے ہیں تاکہ اس میں اس کا اصلی لوچ باقی رہے۔

(۵) سرسید کی سیاسی تقریریں

سرسید کی سیاسی قابلیت سرسید کی سیاسی قابلیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ غدر کے بعد ”رسالہ اسبابِ بغاوت“ لکھ کر انھوں نے ثابت کیا کہ غدر ایک سرکشی تھی جس کا

”اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول حکمی تھی جس نے رفتہ رفتہ ان عام غلط فہمیوں کے سبب جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں ملکی بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔“

اور پارلیمنٹ کا ان غلط فہمیوں کو مان لینا یقیناً سرسید کی زبردست سیاسی قابلیت پر دلالت کرتا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ”اَوَر انڈین مسلمانز“ کی تردید میں سرسید کا ایک جامع کتاب لکھنا ان کی اعلا سیاسی قابلیت کی دوسری دلیل ہے۔ سب سے زبردست ثبوت ان کی سیاسی قابلیت کا محمڈن کالج کے قیام کا ہے جن کے متعلق حالی نے لکھا ہے کہ:۔

اگر کوئی اصلی چیز مسلمانوں کو پولٹیکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں ان کا اعتبار دلانے

کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندستان کی چھ کروڑ رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہوسکتی ہو

تو وہ یہی محڈن کالج ہوسکتا ہو۔"

اس کے متعلق مسٹر کین نے لکھا ہو :-

"وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر پولیٹیکل جوش پھیلانے والا ہو۔"

سب سے آخری چیز ان کے وہ دلائل ہیں جو کانگرس کی مخالفت میں دیے گئے ہیں جن پر ہم آیندہ بحث کریں گے۔

سرسید کی سیاست

سرسید کے دِل میں حریت کا جذبہ بہ حیثیت مسلمان موج زن تھا۔ ان کا خیال تھا کہ آزادی کی تڑپ مسلمان کو وراثتاً ملتی ہو۔ ان کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیے جس میں انھوں نے اِن خیالات کی وضاحت کی ہو :-

"میں[ف۱] مسلمان ہوں ہندستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ انہی دو باتوں سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہلِ عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں کوئی اور اُن پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہلِ عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ سلطانِ ٹرکی کو سلطان نہیں کہتے بلکہ اپنے ویران اور پتھریلے جزیرہ نما کا خادم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دُنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اونٹ چراتے ہیں، بوریے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔"

اسی تحریر میں آگے چل کر اسلام کی جمہوریت کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں کہ اسلام:

"ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہو اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لیمیٹڈ مانارکی کو مانتا ہو بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہو۔ ایک پریسیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہو۔"

ف ۱ - حیاتِ جاوید - ص ۴۴۴

"لیکن ہمارا مذہب جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کیے ہیں اس نے اور باتیں بھی سکھلائی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہو، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہو، ملک میں امن و امان قائم رکھتی ہو اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہو —— تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابع دار اور خیرخواہ رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں اُن پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیے جب کہ زمانے کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو۔"

متذکرہ بالا اقتباس کا آخری جملہ قابلِ غور ہے۔ ہندستان کی عام حالت جو کچھ اس زمانے میں تھی وہ نہایت ابتر تھی۔ تعلیم کا فقدان تھا، قوتیں متفرق ہو چکی تھیں، مفلسی کی بلا پھیل چکی تھی۔ اور اس وقت تو کیا اب تک بھی قوم میں وہ تمام چیزیں پیدا نہیں ہوئیں جن کے بل بوتے پر آزادی کے نقارے بجائے جائیں۔ زمانے کی حالت جب اس قدر بُری تھی تو پھر کیسے یہ توقع رکھ سکتے تھے کہ ہندستانی اپنے مُلک پر خود حکومت کرنے کے قابل تھے۔

انگلستان سے ایک خط میں انھوں نے انگریز اور ہندی کا اس طرح موازنہ کیا ہے:-

"اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان میں انگریزوں کی بداخلاقی اور ہندستانیوں کو جانوروں سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل سمجھنا گو میرے نزدیک قابلِ معافی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں سے ناواقفیت کی بنا پر وہ لوگ ایسا کرتے ہیں اور میرا تو خیال یہ ہے کہ ہم لوگوں کے متعلق جو رائے اُنھوں نے قائم کی ہے وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ انگریزوں کی بے جا تعریف کیے بغیر میں سچ کہتا ہوں کہ ہندستانی خواہ اونچے طبقے کے ہوں یا نیچے طبقے کے، سوداگر ہوں یا معمولی دکان دار، تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل جب ان کا مقابلہ تعلیم، اخلاق اور ایمان داری میں انگریزوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہی نسبت ہے جو ایک گندے جانور کو ایک خوب صورت اور لائق انسان سے ہوتی ہے۔"

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندستان میں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ذلیل ہو چکے تھے۔ ان میں گرداو نام کو نہ تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے غلامی کا طوق پہن لیا تھا۔ ہندو ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے محکوم تھے اور جب تک ان کے محکوم رہے انھی سے عزت و جاہ کے خواست گار رہے۔ چناں چہ انھوں نے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت حاصل کرکے ان سے اعلا مرتبے پاتے رہے۔ جب مسلمانوں کی غلامی سے نکل کر انگریزوں کے ماتحت ہوگئے تو مغربی علوم سیکھ کر مسلمانوں بلکہ خود انگریزوں سے ہم سری کا دعویٰ کرنے لگے۔ مسلمانوں کے سر سے ابھی حکومت کا نشہ نہیں اُترا تھا وہ ابھی اپنے خوابِ گراں میں بے خبر تھے۔ ان کا وہ اعلا کردار جاتا رہا تھا جو کسی زمانے میں ان کو دُنیا کی ساری قوموں سے ممتاز کرتا تھا۔

سرسید اس خیال کے حامی تھے کہ پہلے ہم اپنی خامیوں کو دور کرکے تہذیب یافتہ قوموں کے برابر ہوجائیں اور ان موافق حالات کے منتظر رہیں یا ان کو پیدا کریں جن کے ہم خواہاں ہیں۔ سرسید انگریزوں کے اعلا کردار کے مدّاح تھے اور جب وہ انگلستان گئے اور وہاں کی سوسائٹی کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تو ان کے اِس خیال کو اور تقویت ہوئی۔

رہی یہ بات کہ سرسید انگریزی حکومت کو کیوں پسند کرتے تھے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اس کی سب سے پہلی اور اہم وجہ سرسید یہ بیان کرتے ہیں کہ ہندستان انگریزوں کی آمد سے پہلے ایک عرصے تک چند جابر اور غاصب بادشاہوں کے ہاتھ سے تاخت و تاراج ہوتا رہا اس کے بعد:

> "خدا کی یہ مرضی ہوئی کہ ہندستان ایک دانش مند قوم کی حکومت میں دیا جائے جس کا طرزِ حکومت زیادہ تر قانونِ عقلی کا پابند ہو۔ بے شک اس میں بڑی حکمت خدا تعالا کی تھی کیوں کہ جب ہندستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ آباد تھے تو اس خدا کو جو کرشن کا بھی ایسا ہی خدا ہو جیسا کہ ہندو مسلمان کا، ضرور ایسی حکومت ہندستان میں قائم کرنی چاہیے تھی جو زیادہ تر عقلی قوانینِ حکومت کی پابند ہو۔"

اسی طرح سرسید اور جگہ فرماتے ہیں :-

"گو ہندستان کی حکومت کرنے میں انگریزی حکومت کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انھوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے بلکہ درحقیقت ہندستان کو کسی حاکم کی اس کے اصلی معنی میں ضرورت تھی سو اس کی ضرورت نے ہندستان کو اُن کا محکوم بنایا ہے"

دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی حالت نہایت خراب ہوگئی تھی اور اس کی اصلاح کا ذریعہ بھی انگریز ہی ہوسکتے تھے۔ چناں چہ سرسید نے کئی مرتبہ کہا:-

"میں ہندستان میں انگلش گورمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہواخواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

"اب زمانے نے پلٹا کھایا ہے۔ خدا نے انگریزوں کو ہم پر حکومت دی ہے۔ علم کے خزانوں کی کنجی بھرتی پھراتی ان کے ہاتھ پڑی ہے۔ پس اب تم کو نہایت احسان مندی سے علوم و فنون کو ان سے لینا چاہیے اگر احسان مندی سے نہیں لینا چاہتے ہو تو اپنے باپ دادا کا قرضہ ہی وصول کرلو۔ اگر ہم نے آج نہیں کیا تو حماقت ثابت ہوتی ہے۔"

تیسری وجہ سرسید کے نزدیک یہ تھی کہ چوں کہ انگریزوں کے پاؤں ہندستان میں جم چکے تھے اور وہ اپنی دولت اور طاقت میں بہت بڑھے ہوئے تھے اس لیے ہندستانیوں کا اُن کے مقابلے میں کھڑے ہونا پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنے کے برابر تھا۔

چوتھی وجہ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت نے ہندستان کے سب مذاہب کو آزادی دے رکھی ہے، ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور اپنی دانش مندی اور قوتِ بازو سے ملک

میں امن و امان قائم رکھا ہے۔ ان تمام چیزوں کے ہونے کے باوجود ان کو نکالنے کی کوشش کرنا ملک میں بے چینی اور انتشار پیدا کرنا ہے۔ سرسید مسلمانوں سے خاص طور پر مخاطب ہوکر کہتے کہ انگریزوں کا دورِ حکومت ہی ان کے لیے پُرامن زمانہ ہے جس میں وہ اطمینان سے علم و فضل حاصل کرکے مہذب قوموں کے صف بہ صف کھڑے ہوسکتے ہیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے سرسید پر یہ الزام لگایا ہے کہ :-

"سرسید[ف ا] نے اپنے تعلیمی کاموں کو حکومت کے تعاون اور امداد کے بھروسے پر شروع کیا تھا۔ اور اس لیے وہ کوئی ایسا قدم بے سوچے سمجھے نہیں اُٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کام کو نقصان پہنچے۔ چناں چہ انھوں نے نوزائیدہ نیشنل کانگریس کو پس پُشت ڈالا۔ ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت یہی چاہتی تھی اور اس لیے ان کی پوری حمایت کی۔"

یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے۔ سرسید نے ایک نہیں متعدد جگہ اس خیال کو دُہرایا ہے کہ :-

"گورنمنٹ کی مدد ہمارے آزادانہ انتظام میں کچھ نہ کچھ مخل ہوتی ہے۔ جو ہم کرنا چاہتے ہیں اس میں بہت سی پابندیاں کرنی پڑتی ہیں۔ تمھاری ذاتی مدد میں تم کو کسی کی پروا نہ ہوگی۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

"قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک کہ ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کرسکے۔ قومی کاموں میں صرف گورنمنٹ پر بوجھ ڈالنا اور اسی کا منھ تکتے رہنا نہایت بزدلی اور بے عزتی کا کام ہے۔"

کانگریس کی مخالفت

اگرچہ سنہ ۱۸۸۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس اس غرض سے قائم کی گئی کہ وہ حکومتِ ہند سے اپنے جائز مطالبات پیش کرکے ان کو حاصل کرے لیکن اس سے کئی سال قبل سنہ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے بھی اسی قسم کی ایک انجمن کی

ف ا۔ میری کہانی (جواہرلال)۔

بنا "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے ڈالی

"جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے دردِ دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں"[ف۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگرس جس جذبے کے ساتھ قائم ہوئی تھی بالکل اسی قسم کے جذبات سرسید کے دل میں پہلے ہی سے موج زن تھے۔ انھوں نے بھی کانگرس کے قیام سے قبل "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے ذریعے بعض ایسی تحریکات حکومتِ ہند کو روانہ کیں جو ان سے بہ طور شکایت کے تھیں۔ اس کے علاوہ "رسالہ اسبابِ بغاوت" میں جو سخت اعتراضات حکومتِ ہند پر کیے تھے اس میں بھی سرسید کی یہی ذہنیت کام کر رہی تھی جس کے متعلق حالی لکھتے ہیں:۔

"سرسید نے اس کتاب میں گورنمنٹ پر بہ نسبت نیشنل کانگرس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی۔"

لیکن آگے چل کر حالی کانگرس اور سرسید کا مقابلہ اس طرح کر کے دکھاتے ہیں:۔

"سرسید کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگرس سے مختلف تھی۔ سرسید نے جو الزامات گورنمنٹ پر عائد کیے تھے ان کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی متنفس کو نہیں ہوئی اور کانگرس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگائے ان کی تمام ملک میں منادی کی گئی۔ سرسید نے رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی اور کانگرس نے غلط فہمیوں کو پھیلانے میں۔ سرسید نے اُن باتوں کی خواہش کی جن سے تمام ملک کا فائدہ متصور تھا اور کانگرس نے زیادہ تر اُن باتوں پر زور دیا جن سے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سرسید کی تمام خواہشوں میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی مصالح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگرس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ کی مصالح مُلکی کے برخلاف تھیں۔"

سرسید کانگرس اور خود کے اس تفاوت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کانگرس کے قیام کے بعد تقریباً تین سال تک سرسید اس کی کارروائیوں کو دیکھتے رہے جب ان پر اچھی طرح غور کر لیا تو انھیں

ف۱۔ حیاتِ جاوید۔

معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا کانگرس میں شریک ہونا نہایت مضرت رساں ہو۔ چناں چہ سنہ ۱۸۸۷ع میں انھوں نے لکھنؤ میں ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کانگرس کی تمام کارروائیوں اور اس کے نتیجے سے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور کانگرس میں شریک ہونے سے باز رکھا۔ کانگرس نے جو اعتراضات حکومت پر کیے تھے ان میں سے بعض کے جوابات تقریر میں دیے۔ سب سے بڑا اعتراض کانگرس کا یہ تھا کہ کوئین وکٹوریہ کے اس اعلان کے مطابق کہ :-

"تمام رعایا خواہ گوری ہو یا کالی، خواہ یوروپین ہو یا کوئی۔ سب مساوی ہیں اور عہدے پانے کے مستحق ہیں۔"

"غیر متعہد" عہدوں کا امتحان عام مقابلے کے لحاظ سے ہو۔ اعلا اور ادنا کا فرق نکال دیا جائے اور وہ امتحان بجائے انگلستان کے ہندستان ہی میں ہوا کرے۔

اس اعتراض کا جواب سرسید یوں دیتے ہیں کہ اس ملک کے افراد جہاں موچی سے لے کر ڈیوک تک ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں وہاں مقابلے کا امتحان جاری کرنا کچھ مشکل کام نہیں ہو لیکن جس ملک میں مختلف قومیں آباد ہیں جیسا کہ ہندستان ہو مقابلے کا امتحان ایک دشوار امر ہو۔

"ہندستان کی شریف قومیں ہندستان کے ادنا درجے کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے واقف ہیں، اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہیں کریں گی۔"

ایک وقت ہندستانیوں کے لیے یہ بھی ہو کہ یہاں کی سب قومیں باعتبارِ لیاقت، تعلیم اور دولت کے برابر نہیں ہیں۔ بنگالی علم و لیاقت میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر مقابلے کے امتحان میں سب کے سب بنگالی آجائیں اور ان میں سے ایک کسی راجپوت یا پنجابی علاقے میں حکومت کرنا چاہے تو ناممکن ہو۔

"پس مقابلے کا امتحان نہ صرف ملک کی کسی خاص قوم کے لیے مضر ہو بلکہ امن کے لیے بھی مضر ہو۔"

کانگریس کی دوسری خواہش یہ تھی کہ :-

"وائسرائے کی کونسل میں رعایا کی طرف سے اور رعایا کے انتخاب سے ممبر مقرر ہوں - وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح لندن میں ہوس آف کامنس اور ہوس آف لارڈز ہے اسی طرح ہندستان میں بھی اس کی نقل بنائی جائے اور جو الیکشن سے مقرر ہوں وہ بہ طور ہوس آف کامنس کے ہوں اور جو ممبر گورمنٹ کے ملازم ہیں مع وائسرائے کے بہ طور ہوس آف لارڈز کے ہوں "

اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہندو چوں کہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں اس لیے ایک ووٹ مسلمان ممبر کے لیے ہوگا اور چار ہندو کے لیے

"پس مسلمانوں کا ٹھکانا ہندوؤں کے مقابل کہاں رہے گا اور جوسے کے اصول کے مطابق چار پانسے ہندوؤں کے لیے اور ایک پانسہ ہمارے لیے ہوگا "

اس کے علاوہ اگر الیکٹر کے لیے دولت کی شرط لگائی جائے تو مسلمان تو کہیں کے نہ رہیں گے اور ہندوؤں میں بھی سوائے بنگالیوں کے کوئی منتخب نہ ہوسکے گا۔ اور اگر اس کے سوا ایک تعداد معیّن ہندوؤں کی اور ایک مسلمانوں کی بھی مقرر کی جائے تو بھی مردم شماری کی رُو سے ایک مسلمان ہوگا تو چار ہندو ہوں گے اور اگر طریقۂ انتخاب فرقہ‌واری کی بنا پر ہوگا تو بھی :-

"تمام قوم میں ایک مسلمان بھی نہ نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بہ مقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو "

تیسرا اعتراض کانگریس کا یہ تھا کہ ہندستان کا بجٹ ان کی رائے سے منظور ہو لیکن سرسیّد کہتے ہیں کہ ہندستان کا بجٹ خواہ وہ کسی سیاسی امور کے متعلق ہو یا فوج وغیرہ کا اس کا اندازہ ہندستانی نہیں کرسکتے اس لیے اُن سے اس معاملے میں رائے لینا بے سُود ہو اور یہ اُسی وقت ممکن ہو جب کہ حاکم و محکوم دونوں ایک قوم سے ہوں :-

"انگریزوں نے ہندستان اور اس کے ساتھ ہم کو فتح کرلیا ہو۔ پھر کیا یہ اصولِ سلطنت کے مطابق ہو کہ وہ ہم سے پوچھیں کہ ہم برما جاکر لڑیں یا نہ لڑیں۔ ہندستان میں گورمنٹ کا ذمّہ

ہو کہ وہ خود اپنی سلطنت تھامے اور جس طرح مناسب سمجھے اپنی فوج اور سلطنت کا خرچ پیدا کرے۔"

سرسید کانگرس کو خالص ہندوؤں کی جماعت سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ اس کے جتنے مقاصد تھے سب کے سب ہندوؤں کے فائدے کے تھے۔ مسلمانوں کی اس میں کوئی خاص بہتری نہیں تھی۔ ہندو چاہتے تھے کہ وطنیت (Nationalism) کے نام سے مسلمانوں کو جو مغربی تعلیم اور دولت میں ان سے پیچھے رہ گئے تھے اپنے میں ضم کریں۔ اس چیز کو جواہر لال نہرو نے اپنے خاص رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے :۔

"سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہییں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی مضبوط تھے۔"

اس ذہنیت کی بنا پر کانگرس نے ابتدا ہی سے بعض مسلمانوں کو ٹڈی پیسے اور شہرت کا طمع دے کر اپنے زمرے میں شریک کرلیا۔ سرسید کانگرس کے اس منشا سے آگاہ ہوچکے تھے اس لیے اُنھوں نے سنہ ۱۸۸۸ع کے میرٹھ کے لکچر میں مسلمانوں کو خطاب کرکے کہا کہ وہ کانگرس میں شریک نہ ہوں کیوں کہ وہی ان کی تباہی کا باعث ہوگی۔ سرسید نے ان چند مسلمانوں کے متعلق جو کانگرس میں شریک ہوچکے تھے کہا کہ :۔

"ان کی حقیقت بجز اس کے کہ کرائے کے آدمی ہیں اور کچھ نہیں۔"

"گنتی کے دو چار مسلمان تمام مسلمانوں کے خیالات کے نمایندے نہیں ہوسکتے۔

"جھوٹ بات بیان کرکے کہ یہ فلاں ضلع کے رئیس ہیں اور فلاں مقام کے نواب ہیں اور ہماری قوم کا غلط ارادہ ظاہر کرنا کہ مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک رہیں ہماری قوم پر ناواجب

ف ۱۔ میری کہانی (جواہر لال نہرو)

دست اندازی ہو۔"

مسلمانوں کو تو کیا سر سید ہندوؤں کو بھی کانگرس میں شریک ہونے سے منع کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے:۔

"ہمارے مُلک کے ہندوؤں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کی حالت گو مسلمانوں سے کسی قدر اچھی ہو لیکن ایسی اچھی نہیں ہو کہ وہ دوڑکر ہم سے آگے نکل جائیں گے۔ ہم سب ایک مُلک کے رہنے والے ہیں۔ بہت سے ہندو ایسے ہیں کہ ان میں مسلمانوں کی عادتیں گھس گئی ہیں جیسے کہ ہمارے دوست کایستھ صاحب ہیں ان کی عادت اور ان کی حالت ہم سے کچھ زیادہ بڑھی ہوئی نہیں ہو اور ہندو بھی کچھ ہم سے بڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ جو کچھ ہمارا حال ہوگا وہی حال اس مُلک کے ہندوؤں کا بھی ہوگا۔"

سر سید کانگرس کو بنگالیوں کی ان مختلف تحریکوں یا سازشوں میں سے ایک تصوّر کرتے تھے جو انھوں نے انگریزوں کے دورِ حکومت کی ابتدا ہی سے انگریزی تعلیم حاصل کرکے شروع کی تھیں۔ اس لیے وہ ہندوؤں کو بھی روکتے تھے اور کہتے تھے کہ:۔

"یہ تجویزیں کانگرس کی ایسے مُلک کے لیے جہاں دو مختلف قومیں مل کر آباد ہیں۔ ایک کنوئیں سے پانی پیتے ہیں، ایک شہر کی ہَوا کھاتے ہیں، ایک کی زندگی دوسری پر منحصر ہو۔ نہایت بداندیشی کی تجویزیں ہیں۔ ایک دوسرے میں عداوت پیدا کردینا نہ امن کے لیے مفید ہو نہ مُلک کے لیے نہ شہر کے لیے۔"

سر سید خاص کر مسلمانوں کو بنگالیوں کی اس قسم کی سازشوں میں شریک ہونے سے ہر وقت منع کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ غدر میں جو کچھ نقصان مسلمانوں کا ہُوا وہ کچھ کم نہ تھا۔

• سر سید[ف ۱] ایک چھٹی میں جو انھوں نے بدرالدین طیب جی کے نام لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں امریکہ میں اوّل اسی قسم کا ایجی ٹیشن شروع ہُوا تھا اور آخر کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے مُنھ سے نِکلا وہ یہ تھا۔" ڈیکلیریشن وِد آوٹ ریزولیشن " پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی

ف ۱۔ حیاتِ جاوید

طاقت ہو وہ اس کانگرس کے ایجی ٹیشن میں شریک ہوں ورنہ ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجانی چاہییں۔"

پھر آگے چل کر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں:۔

"غدر میں کیا ہوا۔ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہوگئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔"

سرسید نے سیاسی معاملات میں ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو قوم کی بھلائی میں ہر وقت مفید اور کارآمد ثابت ہو۔ آخر زمانے میں مسلمانوں نے ان کی ہر بات اور ہر تحریک پر بھروسا کیا چناں چہ مولوی حالی کہتے ہیں:۔

"اگرچہ سرسید کو مسلمانوں نے عموماً مذہبی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہوگا جو ملکی معاملات میں ان کو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک آواز پر باستثنائے معدودے چند، ہندستان کے تمام مسلمان کیا سُنی، کیا شیعہ، کیا وہابی کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا اَن پڑھ۔ کیا وہ لوگ جو ان کی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعت کثیر جو ان کی ہر بات کی مخالفت کرتی تھی سب نے بالاتفاق نیشنل کانگرس سے صرف اس بنا پر علاحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک ان کا اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لکھوکھا مسلمانوں نے ان کاغذوں پر آنکھیں بند کرکے دستخط کردیے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے اظہار کے لیے ولایت بھیجے تھے کہ ہندستان کے مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔"

متذکرہ بالا اقتباس اور دیگر سوانح سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید اپنے وقت کے ایک بڑے سیاس تھے اور ان میں وہ تمام اوصاف اور خوبیاں موجود تھیں جو آج کل کے ماہرینِ سیاست میں پائی جاتی ہیں۔

(۶) سرسید کی قانونی تقریریں

سنہ ۱۸۷۸ء میں سرسید پہلی مرتبہ کونسل کی ممبری کے لیے منتخب ہوئے۔ قانونی کونسل

میں ہندستانیوں کو شریک کرنے کی تحریک سب سے پہلے سرسید ہی نے کی۔

"انھوں نے اپنے رسالہ "اسباب بغاوت" میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں ہندستانیوں کی بھرتی نہ ہونے اور انتظام سلطنت سے بالکل بےخبر رہنے کو قرار دیا تھا۔"

"ہندستانیوں میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ممبری کونسل کے زمانے میں ہندستانیوں کی بھلائی کے لیے قانون بنایا۔ وہ چار برس مستقل وائسریگل کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے دو مسودے کونسل میں پیش کیے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہوگئے"[ف ۱]

کونسل کی ممبری کے زمانے کی بہت سی تقریروں میں سے ان کی صرف چار تقاریر ہمارے سامنے ہیں جو "مجموعۂ لکچرز سرسید" میں پائی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے سنہ ۱۸۷۹ء کے قانون ٹیکۂ چیچک کی تقریر ہے جس میں انھوں نے نہایت خوبی سے بحث کی ہے کہ ملک میں ٹیکے کا جبری قانون جاری کرنے سے شخصی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہونے پاتی۔ کہتے ہیں :۔

"کوئی ذاتی رعایت یا ذاتی آزادی اس مضرت کو جائز قرار نہیں دے سکتی جو وہ اس بیماری کے انتقال سے اپنے ہمسایوں کو پہنچاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ٹیکے کے لازمی کردینے کی تجویز سے معصوم بچوں کی جانوں کی ان کے والدین کی بےوقوفی کے نتائج سے محافظت عمل میں آوے گی"

اس کے ساتھ ایک سہولت اس مسودے میں یہ بھی رکھی گئی تھی :۔

"ہندستان کے بعض اقطاع ایسے بھی ہیں جن کی حالت بالفعل اس قانون کے اجرا کے مناسب نہیں ہے۔ اس واسطے قانون مجوزہ عام طور پر لازمی نہ ہوگا۔ یہ قانون صرف ان حصہ جات

ف ۱۔ حیات جاوید

بلدیوں کے متعلق ہوگا جہاں لوکل لیجس لیچر نہیں ہو اور اس کا عمل درآمد برٹش انڈیا کی ان میونسپلٹیوں اور چھاؤنیوں پر محدود ہوگا جن سے لوکل گورنمنٹیں اس قانون کا متعلق کرنا اپنے نزدیک مناسب سمجھیں۔"

اس کے بعد چیچک کے ٹیکے کی اہمیت پر زور دیا ہے کہ یہ مرض ہندستان میں متعدی ہے اور جس سے ہر بچے کو گزرنا پڑتا ہے۔ اگر اس سے بچ بھی جائیں تو چہرے کے داغ یا آنکھ کا نقصان ضرور برداشت کرنا پڑتا ہے۔

"ایسا قانون جس کا منشا ہندستان کی آیندہ نسلوں کو ایسی عام اور سخت بلا سے محفوظ رکھنے کا ہو اگر مناسب طور سے عمل میں آئے گا تو بجائے اس کے کہ غیرمانوس ہو اس ملک کے لوگ اس کو ایک غیر مترقبہ نعمت خیال کریں گے۔"

اس مسودے کی عمدہ ترتیب اور بحث سرسید کی اعلا قابلیت کا پتا دیتی ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ قانون سے سرسید کو ہمیشہ تعلق رہا اور ایک عرصۂ دراز تک ججی کرتے آئے تھے۔ ان کی قانونی قابلیت کو ان کے حکامِ بالادست نے بار بار تسلیم کیا ہے۔ بنارس کا ایک جج ان کے متعلق لکھتا ہے :-

"ف ۱ اس کے (یعنی سرسید کے) فیصلے نہایت غور سے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ مقدمے کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالت اپیل کے فیصلے کے واسطے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ان کے اس بہت بڑے تجربے سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں ان کو حاصل ہے میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"

گو سرسید بری پری زینٹیشن کے اصول کے موافق تھے لیکن وہ اپنے تجربے کی بنا پر ہندستان کے لیے جہاں بہت سی قومیں، مختلف قابلیت، مختلف مذاہب اور مختلف درجوں کی بستی ہیں، نامناسب تصور کرتے تھے۔ چناں چہ مسودۂ قانون "لوکل سیلف گورمنٹ" متعلقہ اضلاعِ متوسط کی تائید میں تقریر کرتے وقت کہا کہ لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر انتخاب سے اور ایک ثلث نامزدگی سے مقرر

ف ۱۔ حیات جاوید۔

کیے جائیں۔

"جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندستان کی سوشل اور پولٹیکل حالت میں ایک جزوِ اعظم رہے گا اور ان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے متعلق ہیں ان کے باشندوں پر اثر ڈالے گا اس وقت تک ایلکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جاسکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر غالب آجاوے گی جن کے باعث قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی زیادہ سخت ہوجاویں گے۔"

اپنے وسیع تجربے کے متعلق خود سرسید نے قانون حقوقِ استفادہ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ یہ بِل ایک ایسا قانون ہے جس کی ضرورت ملک کو بہت عرصے سے ہے۔

"میرا اپنے ذاتی تجربے کی وجہ سے یہ خیال ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں حقوقِ استفادہ بڑی قدر و قیمت کے حقوق خیال کیے جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے اکثر مقدمات بازی ہوتی ہے۔"

اس بحث کے آخری حصے میں یہ بھی بتایا ہے کہ حقوقِ استفادہ اہلِ اسلام کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ وہی ہے جن کو فقہاے اسلام نے حقوق کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

باوجود اس کے کہ سرسید انگریزوں کو ہندستانیوں سے ممتاز قوم سمجھتے تھے لیکن انھوں نے قانون کے مقابلے میں ہمیشہ دونوں کو برابر اور ہم رتبہ سمجھا۔ حکومتِ ہند نے انگریزوں کو ضابطۂ فوج داری میں ایک امتیاز دے رکھا تھا مگر سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ سنہ ۱۸۸۳ع میں مسودۂ قانون ترمیم مجموعہ فوج داری پر ایک طویل بحث کرتے ہوئے یہ بتایا کہ قانونی حقوق کے معاملے میں قانون کی نگاہ میں قوم و مذہب کے امتیازات کی کچھ وقعت نہیں ہونی چاہیے۔ جہاں حکومت نے ہندستان کے تمام باشندوں کیا ہندو کیا مسلمان کیا انگریز سب کو مساویانہ حقوق دینے کا اعلان کرکے دُنیا کی تاریخ میں ایک مثال قائم کی ہے وہاں قانون کی نظر میں انگریز کو بزرگی عطا کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ اس طرح کا امتیاز کسی قوم کو دے دینا آپس کے تعلقات کا خراب کرنا ہے۔

"انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گزر جانے سے ہم اب شائستگی کے اس درجے کو پہنچ گئے ہیں

جب کہ قومی امتیازات کو بہر کیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہی"

(۷) سرسید کی متفرق تقریریں

سرسید کی متفرق تقریروں میں سوائے دو ایک کے سب کی سب وہ جوابی تقریریں جمع کی گئی ہیں جو اُنھوں نے مختلف ایڈریسوں کے پیش کیے جانے پر کی تھیں۔ سرسید نے اپنی طبیعت کے جوش اور مختلف کاموں کے کرنے کی لیاقت کے باعث قوم کی درستی کے لیے اتنے کثیر کام انجام دیے اور قوم کو اس قدر ابھارا کہ سارا ہندستان انھی کی تحریکوں سے گونج اُٹھا اور یہ پھر ایک حقیقت ہی کہ قوم کے تعمیری کام میں از ابتدا تا انتہا انھیں کا ہاتھ تھا۔ چناں چہ مولوی حالی کہتے ہیں :۔

"سرسید کو اس معمار کی طرح جو تعمیر کے لیے آپ ہی اینٹیں پکائے، آپ ہی مسالا تیار کرے، آپ ہی ماڑ باندھے، آپ ہی ٹوکری ڈھوئے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چنے۔ ایک سر اور ہزار سودا کا مصداق بنا دیا تھا۔"

مسٹر آرنلڈ[ف ۱] نے سرسید کی وفات کے بعد اپنی اسپیچ میں بمقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے :۔

"دنیا میں بڑے آدمی کثرت سے گزرے ہیں مگر ان میں سے ایسے بہت کم نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، تعلیم کا حامی، قوم کا سوشل رفارمر، پولی ٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔"

ان تمام اوصاف کے ہونے کے بعد قوم سے یہ ناممکن تھا کہ وہ سرسید کے مختلف احسانات کو فراموش کرتی۔ ساری قوم میں عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ہر جگہ ان کی قومی، ملکی، مذہبی خدمات اور دیگر اصلاحی کاموں کا اعتراف کیا گیا اور مختلف جماعتوں اور انجمنوں نے ان کی ستائش میں ایڈریس پیش کیے ذیل میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان ایڈرسوں کے بعض حصے اور اس کے ساتھ سرسید کے جوابات درج کریں تاکہ سرسید کے بعض ان مشہور و مقبول کاموں پر روشنی پڑسکے جو ان کی زندگی ہی میں قوم

ف ۱۔ حیاتِ جاوید

نے ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

ان ایڈرسوں کے مطالعے میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والے اور سرسید مرحوم کی عظمت کو دلوں میں منقش کرنے والے وہ الفاظ ہیں جن میں قوم نے ان کے فنا فی القوم ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ انجمن مفید عام موہنیہ نے اپنے ایک ایڈریس میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:-

"بغیر کسی مبالغے کے یہ کہنا درست ہے کہ انھوں نے فنا فی القوم کا رتبہ اپنی ذات کے لیے خاص کر لیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے سامعین کے سامنے بھی ایک تازہ واقعہ ظاہر کر دینا کافی ہوگا کہ انھوں نے جناب نواب گورنر جنرل بہادر وائسرائے ہند کی کونسل کی ممبری سے بہ عذر عدیم الفرصتی تار پر استعفا دے کر اس فقرے کا کوئی بھی مستثنا باقی نہ رکھا تھا کہ "حضرت کے تمام اوقات صرف قوم کی خدمت اور ہمدردی میں صرف ہوتے ہیں۔"

آگے چل کر ارباب انجمن کہتے ہیں:-

"سید صاحب گو بہ اعتبار لقب آپ کو نجم الہند کہا جاتا ہے لیکن آپ نے اس برِ اعظم کے باشندوں کی طبیعتوں کو اپنے نورانی خیالات کی کرنوں سے روشن کرنے کے سبب نہ ستارۂ ہند بلکہ نیرِ اعظمِ ہند ہونے کا واقعی منصب حاصل کیا ہے۔"

اس قسم کی تعریفوں کا سرسید اس طرح جواب دیتے ہیں:-

"اگر میں نے قوم کی کوئی خدمت ایسی کی ہے جس کو قوم پسند کرتی ہے تو میری نسبت صرف اسی قدر کہا جا سکتا تھا جتنا کہ ایک آقا اپنے خادم کی خدمت سے خوش ہو کر اس کو کچھ کہتا ہے۔"

ایک اور جگہ قوم کی حق شناسی پر اس طرح گویا ہیں:-

"ہماری قوم میں اب یہ بات پیدا ہو چلی ہے کہ وہ جس شخص کو اپنے خیال میں ملک کی بھلائی یا قوم کی خیرخواہی کرنے والا سمجھتے ہیں اس کی قدر کرتے ہیں۔ میں اس کا مستحق نہیں ہوں مگر اس جوش سے جو اس وقت ظاہر کیا گیا ہے میں خدا سے امید رکھتا ہوں کہ ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اس عزت کے مستحق ہوں گے۔"

نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی سرسید کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ طلبائے جالندھر اسکول کی جانب سے ایک ہندو لڑکے نے اپنے ایڈریس میں لکھا ہے :-

"جناب سید صاحب صرف ایک قوم یا ایک خاص فرقے کے ہی مددگار نہیں ہیں بلکہ وہ جناب بابو کشیب چندر سین اور سری سوامی دیانند سرستی کے پیروؤں کو بھی اسی نظر عنایت سے دیکھتے ہیں کیوں کہ وہ خاص مسلمانوں ہی کے معاون نہیں ہیں بلکہ وہ کل ملک کے مددگار، کل ہندستان کے جاں نثار ہیں۔"

انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے جلسے میں اس کے پریزیڈنٹ دیال سنگھ اس طرح رقم طراز ہیں :-

"آپ واجبی طور پر رعایائے ہندستان کے تمام فرقوں کی طرف سے قدر، منزلت و احسان مندی کے مستحق ہیں۔ ہماری ایسوسی ایشن جس میں اس صوبے کے تمام اقوام و مذاہب کے لوگ شامل ہیں، نہایت خوشی سے آپ کی ان اعلا درجے کی خدمتوں کی تصدیق کرتی ہے جو آپ نے عوام کے حق میں کی ہیں۔ آپ کا برتاؤ ابتدا سے انتہا تک تعصب یا خودرائی کے دھبے سے بالکل مبرا رہا ہے۔"

سرسید کی متحدہ قومیت کی مساعی جمیلہ کی تعریف یوں کی گئی ہے :-

"ہمارے وہ بزرگ آج ہمارے سامنے موجود ہیں جو تھوڑا عرصہ گزرا کہ مقام پٹنہ میں ایک جم غفیر کے سامنے بہ آواز بلند ہندو اور مسلمانوں کو ہندستان کی دلھن کی دو پیلی آنکھیں قرار دے کر اس کی خوبی اور قدر و منزلت کے لیے یہ ضروری تصور فرماتے تھے کہ برابر دونوں کی غور و پرداخت رہے، برابر دونوں کو فروغ ہو۔"

سرسید کا بلند ترین مقصد علی گڑھ یونی ورسٹی کا قیام اور اس کا استحکام تھا۔ اس عظیم کام میں جو صعوبتیں اور محنتیں سرسید نے کھینچیں اس کو قوم تسلیم کرتی ہے اور اس کو قوم کی ترقی میں ایک دلیل راہ اور قومی زندگی کے سمندر میں ایک منارہ تصور کرتی ہے۔

"آپ نے مدرسۃ العلوم کی نگرانی میں گرمی کی دھوپ اور سرما کی سردی اٹھائی۔ حالت بیماری میں بھی آپ نے قوم کا غم کھایا۔ آپ کی قومی محبت کی یہ یادگار ہمیشہ صفحۂ روزگار پہ رہے گی۔"

" مدرستہ العلوم علی گڑھ کی بنا اور اس کا عدم سے حالت موجودہ تک پہنچنا اور اس کی آیندہ ترقی میں بہ دل و جان ساعی رہنا قوم پر وہ بھاری احسان ہو کہ نہ صرف موجودہ نسلوں کے لیے بلکہ ابدالآباد تک قوم کی خوش حالی ــــ روحانی نعمتوں کا ذخیرۂ لازوال آپ نے مہیا کر دیا۔"

"آپ نے ایسا دارالعلوم بنایا جس کو قوم کے لیے تمام ترقیوں کی بنا اور تمام کمالات کی بنیاد تصور کرنا چاہیے۔"

سرسید اس کا جواب یوں دیا کرتے :۔

"آپ نے مدرستہ العلوم کا کچھ ذکر کیا ہو اور میری کوششوں کا کچھ بیان کرکے مجھ کو اس کا بانی قرار دیا ہو مگر حقیقت میں میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔ کیوں کہ میں نے تنہا کچھ نہیں کیا اور نہ کرسکتا تھا اس تعریف کے مستحق اور بانی ہونے کے لقب کے اور بہت سے لوگ مستحق ہیں جنھوں نے اس میں کوشش کی اور مدد دی۔"

سرسید کی دیگر قومی، مُلکی اور مذہبی خدمات کا بھی قوم نے ہر وقت اقرار کیا ہو چناں چہ ملاحظہ ہو ۔ کونسل کی ممبری کے متعلق :۔

"آپ نے ممبر کونسل ہونے کے زمانے میں بھی قوم کو فراموش نہیں کیا۔ ٹیکہ اور قاضیوں کا ایکٹ اس امر پر کافی دلیل ہو۔"

"ممبر کونسل ہونے کے زمانے میں جو رائیں مُلکی معاملات میں آپ ظاہر فرماتے رہے ہیں اکثر اہلِ ہنود ان کی قدر کرتے رہے ہیں بلکہ بعض ہندو اہل الرائے اپنے بعض ہم مذہب ممبروں پر آپ کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔"

" ہمارے پچیس کروڑ ہندستانیوں کے وہ فصیح البیان خیرخواہ آج یہاں تشریف فرما ہیں جو اپنے مُلک کے وکیل ہوکر کونسل ہال میں کھڑے ہوکر بے دھڑک اپنے بے زبان موکلوں کی وکالت کرتے تھے۔ ان کے حقوق کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلاتے تھے۔"

"ہندوستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے نہایت منفعت بخش کارروائی کی اس کی نسبت یہاں سرسری طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے اور آپ جو اس زمانے میں جب کہ آپ مجلس مذکور میں کام کرتے تھے بےطرف دارانہ طور پر تمام فرقوں کی بہبودی کی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راست بازی کے ساتھ اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال رکھتے تھے۔"

سرسید کا جواب :-

"جس زمانے میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص اسی قوم (یعنی ہندوستان) کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔ مجھے اس بات سے نہایت مسرت ہوتی ہے کہ آپ میری ناچیز خدمتوں کی اس قدر وقعت کرتے ہیں۔"

تحریروں اور تقریروں کے متعلق اعتراف :

"وہ سچے خیرخواہ ہمارے سامنے موجود ہیں جو اپنے قلم جادو رقم سے لارڈ مکالے کی روح میں جان ڈالتے ہیں اور اپنی تحریروں سے ان لوگوں کی تحریروں اور تقریروں کو رد کرتے ہیں جو اہلِ ہند کی تعلیم کو مشرقی علوم کی متعدد کتابوں اور پرانے اور نامکمل خیالات پر محدود رکھنا چاہتے ہیں۔"

"اپنی تحریر و تقریر کے پُرزور اثر سے ہندو مسلمان بلکہ بڑے بڑے معتدد فاتح قوم کے اراکین سے بھی بلا قیدِ مذہب چندہ لے کر مقام علی گڑھ میں عالی شان اور مشہور و معروف کالج قائم کیا۔"

سرسید کا جواب :-

"آپ نے اپنے ایڈریس میں میری پچھلی تصنیفات کا کچھ ذکر کیا ہے وہ میری تصنیفات اس سے زیادہ کچھ مرتبہ نہیں رکھتی تھیں جو ایک طالب علم اپنے زمانۂ طالب علمی میں اپنے کچے علم اور کچی زبان میں کچھ لکھتا ہے لیکن آپ نے اس کی بھی قدر کی میں اس کا شکرگزار ہوں۔"

"آثار الصنادید" کے ذکر پر سرسید کا جواب :

"وہ کتاب "آثار الصنادید" ہے جس میں دلی کی پرانی عمارت کا عالی شان مکانات کا اور ان کے کتبوں کا ذکر ہے۔ یہ وہ یادگاریں ہیں جو ہمارے بزرگوں نے بنائی تھیں جن سے ان کی شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی مگر اس زمانے میں وہ سب افسوس اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے کے لائق ہیں ــــــ مگر ہماری قوم کے لوگ اس کو توجہ سے پڑھیں گے اور اس سے عبرت پکڑیں گے۔"

"رسالہ اسباب بغاوت" کے ذکر پر سرسید کا جواب :-

"غدر کے حالات پر میں نے لکھا تھا اس سبب سے کہ میں بھی ہندستان کا باشندہ ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ جو غلط خیال ہمارے حاکموں کے دلوں میں اس خراب زمانے کی نسبت جم گئے تھے ان کو مٹاؤں اور سچے واقعات ظاہر کروں"

"تہذیب الاخلاق" کے ذکر پر سرسید کا جواب :-

"تہذیب الاخلاق کا پرچہ ابتدا میں اسی واسطے جاری کیا گیا تھا کہ ہندستانیوں کے دل جو مُردہ ہو گئے ہیں ان میں کچھ تحریک لائی جاوے۔ اس نے اپنا کچھ کام کیا۔ اب تحریک پیدا ہوگئی ہے۔ ہندستانیوں کی زبانوں اور قلموں سے قومی ترقی اور ہمدردی کے الفاظ نکلنے لگے ہیں۔"

مذہبی خدمات کی تعریف پر سید صاحب کا جواب :

"میں نے یہ کوشش دین و دنیا میں کسی صلہ پانے کی امید پر نہیں کی ہے۔ میرا قدرتی جوش اس کا مقتضی تھا کہ میں اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کوشش کروں۔ جوں جوں لوگ گالیاں دیتے ہیں، جوں جوں تکلیف دیتے ہیں، جوں جوں بُرا کہتے ہیں میرا جوش بڑھتا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھتے۔"

انھی ایڈریسوں کے سلسلے میں ہم سرسید کے انتہائی خلوص کا ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ ایک ایڈریس میں جب سرسید کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے کہ :-

"جو جو کوششیں آپ نے ہماری قوم کی بھلائی کے واسطے کیں اس کے شکریہ ادا کرنے کے واسطے ہم کو الفاظ نہیں ملتے اور ناممکن ہے کہ کسی طرح ہم اُس کا صلہ ادا کریں بجز اس کے کہ ہم دعا مانگیں کہ خدا اس کا صلہ آپ کو دے۔"

سید صاحب[ف ۱] نے آب دیدہ ہو کر کہا :-

"مجھ کو اس کا صلہ نہیں چاہیے۔ خدا اس کا صلہ قوم ہی کو دے۔"

انجمنوں کے قیام کے متعلق :-

"سید صاحب، ہند کی انجمنوں نے جو آپ کے ہی مقدس ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے

ف ۱۔ مجموعۂ لکچرز سرسید۔

ہیں اپنی اپنی لیاقت کے موافق آپ کی خدمت میں اڈریس پیش کیے ہوں گے اور کرتے ہیں مگر حق یہ ہو کہ نہ آپ کی عنایت اور اوصاف کا بیان اس میں ہوسکتا ہو نہ ہوا اور نہ آپ کی ذاتِ بابرکات اس کی محتاج ہو"۔

سب سے متاثر کن عورتوں کے وہ جذبات ہیں جن کو انھوں نے ایک ایڈریس میں ظاہر کیا ہو جس میں ہندو اور عیسائی عورتیں بھی شامل ہیں۔

"سید۔ آج وہ دن ہو کہ ہم اپنی بے بسی اور قوم کی حالت دیکھ کر آنسوؤں کو ضبط نہیں کرسکتیں۔ اے خدا ایک وہ زمانہ تھا کہ خاتونانِ عرب و ہند اپنے گھر کے مردوں کی قومی ترقی اور تعلیم کے معاملات میں اس قدر حوصلہ اور ہمدردی ظاہر کرتی تھیں، آج ہم جو انھی کی اولاد ہیں ایک بزرگ محسن قوم کے شکریے کے لیے چند موزوں الفاظ بھی نہیں سوچ سکتیں"۔

جوابی ایڈریس میں سرسید نے اس طرح شروع کیا:۔

"آج کی رات میرے لیے شبِ قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں۔ جو ایڈریس تمھاری طرف سے مجھ کو ملا گئی وہ میرے لیے ایک عزت ہو جو آج تک ہندستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی میں تمھاری اس شفقت کا دل سے شکرگزار ہوں"۔

"اے میری ہندو اور عیسائی بہنوں تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہو شرکت کی وہ ایک نمونہ تمھاری محبت و یگانگت کا ہو۔ میں دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

بعد از قرونِ اولا کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آکر جو قوم میں کیا ہو (حالی)

خاتمہ حالی کی حیاتِ جاوید سرسید کی زندگی کا ایک ایسا رکارڈ ہو جس پر اب تک اضافہ نہیں کیا گیا۔ سید کی حیات کے اکثر واقعات اور بڑے بڑے کام حالی نے اس بے مثل سوانح عمری میں درج کیے ہیں۔ باوجود اس کے سرسید کے اندرون اور اصل طبع کے عمق میں رسائی پانا ایک

وقت طلب امر ہو۔ حیاتِ جاوید تو کیا خود سرسید کی تمام تصانیف سرسید کو بے نقاب کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کی "آثار الصنادید" دلی کے کھنڈروں پر ایک تحقیقاتی کام ہو جو مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ یاد دلاتی ہو۔ "تاریخ بجنور" اور "رسالہ اسبابِ بغاوت" مسلمانوں کو حکومت کے خلاف باغی ہونے کے الزام سے بری کرتی ہو۔ ہنٹر کی کتاب کا جواب بلادِ مغرب میں مسلمانوں کا صحیح موقف معلوم کراتا ہو اور ان کی تفسیر بہ قول حالی مسلمانوں کا جدید علم کلام ہو۔ مگر ان میں سرسید کی تصویر صاف طور پر نظر نہیں آتی۔ البتہ سرسید کے لکچروں میں سید صاحب اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ نما ہیں۔ گو حیاتِ جاوید سرسید کو کھولنے کی ایک کلید ہو لیکن حیاتِ جاوید میں ایک دوسرا شخص ان کے گن گا رہا ہو اور سرسید کے لکچر ان کے دل کا تموّج ہیں۔

حالی کا منشا یہی تھا کہ وہ سید کی قائدانہ شان اور ان کے کمال کو پوری آب و تاب کے ساتھ لوگوں پر عیاں اور واضح کردیں۔ انھوں نے سرسید کی ان تمام جولانیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیان کیا جو سرسید نے سیاسی، لٹریری اور مذہبی خدمات کے میدان میں سرانجام دیں لیکن ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ "حیاتِ جاوید" میں سرسید ہم کو ایک واسطے کے ساتھ نظر آتے ہیں اور اپنے لکچروں میں ہو بہو۔ حالی کہتے ہیں کہ سرسید نے فلاں فلاں قومی و مذہبی خدمات انجام دیں اور سرسید اپنے لکچروں میں اپنی آواز سے ان خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ حالی نے کہا ہو کہ سرسید سیاست کے مردِ میدان تھے لیکن وہ خود بنفسِ نفیس میدانِ سیاست اور قانونی مجلسوں میں بڑے شور سے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غرض اگر سرسید کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنی ہو تو ہمیں ان کے لکچروں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

خطوط کے متعلق عام طور سے یہ بات چل نکلی ہو کہ وہ کاتب کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کاتب کی پیچ در پیچ اس کی طبیعت کے خط و خال اور ان کی سیرت کے تیور ان میں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے خطوط میں بے نقاب ظاہر ہوتا ہو۔ انگریزی ادیب اور عالموں کے ادبی خطوط مثلاً سودے Southey - کوپر Cowper . اور مکالے Macaulay . کے مکاتیب کے دیباچوں میں اسی قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں اور ان کا بیان کرنا کچھ فیشن میں داخل ہوگیا ہو۔ ہمارے ملک کے انگریزی داں

حضرات ان دیباچوں کو پڑھ پڑھ کر ان کے مطالب کو اُردو کے خطوط پر صادق کرتے ہیں۔ غالب کے رقعات کے دیباچوں میں یا مولوی حالی کے مکاتیب کے مقدمے میں بے سوچے سمجھے اور یورپین مصنفین کی تقلید میں اسی قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہو کہ غالب کے خطوط میں ان کا دل ملفوف ہو اور کوئی حالی کے مکاتیب میں یہ فرماتا ہو کہ اگر ان کے دل کا دیوتا دیکھنا ہو اور اس کی پرستش کی خواہش ہو تو ان کے مکاتیب کے مندر میں داخل ہونا چاہیے۔ ایسے بیانات میں کچھ نہ کچھ صحت پائی تو جاتی ہو گر ہمارے نزدیک وہ مبالغہ اور بے جا تخیّل سے پاک نہیں۔

خطوط خواہ کیسے ہی برجستہ لکھے جائیں ان میں دل ضرور لگایا جاتا ہو اور قلم بھی سنبھالا جاتا ہو اور جب ایسا ہو تو بناوٹ اور تصنّع کی راہیں کھلنے لگتی ہیں اور خود کاتب چھپنے لگتا ہو گر تقریر میں ان عیوب کا آنا مشکل بلکہ محال ہو۔

یہی حال سرسید کے لکچروں کا ہو جس میں سرسید بے حجاب ہیں۔ لکچر پڑھتے پڑھتے لکچرار کی نبض ہاتھ میں آجاتی ہو۔ ممکن ہو کہ ایک دو لکچر میں کسی کی شخصیت نمایاں نہ ہو لیکن یہاں تو لکچروں کا ایک وافر ذخیرہ ہو جس میں سرسید کا پورا اندرون مقید و محفوظ ہو۔ ان کے برجستہ حالات کو دیکھنا ہو تو اسی میں دیکھنا چاہیے۔ ان کے احساسات و جذبات ان کے جوش و خروش اور قوم کے ساتھ محبت و ہمدردی۔ ان کی بے تکان مساعی اور مساعی کی صداقت و خلوص غرض سرسید کو ہم جس طرح چاہیں ان کی تقریروں میں سمجھ لے سکتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ مجموعۂ لکچرز سرسید۔

۲۔ حیاتِ جاوید (حالی)

۳۔ تواریخ کانگرس۔

۴۔ میری کہانی (جواہر لال نہرو)۔

(۵)۔ حیاتِ سعدی (حالی)

(۶)۔ مضامین شرر۔

(۷)۔ لکچر سید محمود (سنہ ۱۸۹۳ ع)

(۸)۔ رسالہ اُردو۔ جلد دوم جنوری سنہ ۱۹۲۲ ع۔

(۹)- Effestive Speeches by Dwight E. Watkins. A. M.
Prcfessor, California University.

(۱۰)- Sir Syed's Life & Work by Graham Baily.(۱۱)Encyclopedia Britanica.

(۱۲)- Life of Macaul ay by Travelyan.

· Induenee of English Literature on Urdu Literature, Dr. Latif.



منشی اقبال ورما سحر ہتگامی

(بہ قلم جناب بابو راج بہادر لمگوڑہ ایم اے، ال ال بی)

سحر جی کی وفات ۲۷ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ع کو اتنی مختصر علالت کے بعد یکایک ہوئی کہ بہت سے ارمان جیوں کے تیوں رہ گئے۔ میں آخری ملاقات کے لیے نہ پہنچ سکا اور نہ مرحوم کی کسی ادبی وصیت سے بہرہ ور ہوسکا۔ انھیں خود بھی کوئی گمان موت کا نہ تھا ایک ہفتہ قبل جو دستی رقعہ مجھے ملا تھا اس میں وہی ادبی دل چسپیاں، وہی علمی یادد ہانیاں تھیں گویا دنیائے علم و ادب کے باہر نہ کوئی زمین ہے نہ آسمان، نہ کوئی پیشہ ہے نہ مشغولیت۔ شکوہ تھا تو بھی وہی کہ ’’ادھر‘‘ بھیجنا غالباً ایڈیٹر صاحب نے ناخوشی کی وجہ سے بند کردیا۔ مانگ تھی تو اسی کی کہ پڑھنے کے لیے بھیج دوں۔ جواب بھی میں نے وہی حسب عادت دیے تھے کچھ وعدے کیے، کچھ معذرتیں۔ پر کیا سمجھتا تھا کہ یہ آخری رقعہ ہے، نہیں تو یادگار کے طور پر رکھ ہی لیتا۔

ہم دونوں سنہ ۱۹۰۵ و ۱۹۰۶ میں ہم سبق رہے تھے اور دونوں نے گورمنٹ اسکول فتح پور کے فسٹ ڈویژن میں انٹرنس پاس کیا تھا۔ پنڈت سری دھر راد گورے کا مبارک باد دینے والا فقرہ ہم دونوں کو کبھی نہیں بھولا:-

"Both the Bahadurs have passed in the first Division.

گویا اسی اتفاق نے ہی ہماری ادبی زندگیوں کو توأم کردیا اور ایک دوسرے کا اتنا رفیق و ہم دم و ہم راز بنا دیا کہ مجھے تو سحر کے بغیر ادبی زندگی دوبھری معلوم ہورہی ہے۔ خود مذاق نہیں کرتے تھے مگر

ہنس مکھ بہت تھے اور مذاق کو پسند بہت کرتے تھے۔ ایک رشتے سے میں ان کا موسیا ہوتا تھا اس وجہ سے اکثر مذاق میں کہا کرتا تھا کہ میرے بعد ادبی ترکہ تم کو ملے گا ہی۔ میرے کچھ حالات زندگی بھی قلم بند کردینا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۵ میں جب میں ایسی بیماری میں مبتلا ہوا تھا کہ زندگی کی امید جاتی رہی تھی تو ایک پرچے پر پنسل سے لکھ کر انھیں ادبی وصیت دے دی تھی کہ میری غیر طبع شدہ تفسیر راماین چھپنے کا انتظام کرنا۔ آہ! یہ معلوم نہ تھا کہ زمانہ اُلٹ جائے گا اور مجھے ہی سحر جی کے سوانحی حالات پر ان کے بعد مضمون لکھنا پڑے گا۔ سچ ہے ؎

ہوتا ہو وہی خدا جو چاہے مختار ہو جس طرح بنا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہو کہ مخفی طور پر قدرت انھیں بتا رہی تھی کہ زندگی کا خاتمہ ہو، ورنہ ابھی عمر بہت نہ تھی اور صحت بھی معمولاً اچھی تھی، یہ ضرورت نہ تھی کہ مختصر حالات زندگی کو بطور یادگار پسماندگان کے لیے قلم بند کرجاتے۔ ان کے بڑے صاحب زادے مسٹر کیلاش ورما شائق بی۔اے کے ذریعے سے جو ایک صفحے کے مختصر خودنوشت حالات موصول ہوئے ہیں ایسے سادہ طرز میں تحریر ہیں کہ دل پر بہت ہی گہرا اثر کرتے ہیں۔ مضمون ہذا کی بنیاد وہی ہو۔ یہ وہی حالات ہیں جن کا ہندی ترجمہ 'وشال بھارت' میں شائع ہوچکا ہو۔

(۲)

پیدایش کا سنہ و تاریخ تحریر نہیں ہو۔ مگر ایسی مکمل زندگیوں میں سنہ و تاریخ کا کوئی خاص اثر ہی کیا ہو۔ پرانے مشاہیر میں سے بھی بہتوں کے سنہ و تاریخ پیدایش پر بحث ہی بحث نظر آتی ہو۔ غالباً مجھ سے ایک سال بڑے تھے کیوں کہ اکثر اس بات کا مذاق ہوا کرتا تھا کہ "موسی کے لڑکے بڑے ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، دیکھو اُمان (ماموں کی ایک چہار سالہ لڑکی) کا بیٹا راما ایف۔اے میں پڑھتا ہو۔" میرا سنہ ولادت ۱۸۸۷ ہو اور غالباً ان کا ۱۸۸۶ تھا۔ سماجی خیالات کی وجہ سے جنم پتر بہت عرصہ ہوا تلف کردی تھی۔ اس وجہ سے اب معلوم ہی کیسے ہوسکتا ہو کہ واقعی سنہ ولادت کیا تھا۔

خاندان و جاے پیدائش

والد بزرگوار کا نام منشی شیو نراین تھا جو قصبۂ ہتگام کے اچھے خاندانی رئیس تھے اور زمیں دار بھی۔ قصبہ ہتگام کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ " اس قصبے کو راجا جے چند والیِ قنوج نے آباد کیا تھا" یہ کایستھوں کی پُرانی بستی تھی مگر "ایک مدت سے اُجڑی ہوئی حالت میں ہوتا جارہا ہو" حکامِ بندوبست نے موازنہ کرتے ہوئے نوٹ کیا ہو کہ کئی فی صدی حصہ کایستھ صاحبان کی زمیں داری کا نکل گیا ہو۔ ورنہ ضلع فتح پور اور خاص کر پرگنہ ہتگام میں ایک نمایاں حصہ کایستھوں کی ملکیت تھی۔ اُجڑے ہوئے زمانے میں بھی یہ خطہ مردم خیز رہا ہو اور جو خاندان باہر جاکر آباد ہوئے ہیں وہ اس خطے کا نام رکھے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر قابل الذکر گنیش شنکر جی ودیارتھی مرحوم ہیں جنھوں نے سیاست کی دُنیا میں اور ایثار کے دائرے میں اپنی ہستی کو ایک عجیب اعجاز ثابت کر رکھا تھا اور ہندو مسلم اتحاد پر تو ان کی جان ہی قربان ہوگئی۔ منشی بانکے بہاری لال صاحب وکیل لکھیم پور نے بھی ایک چھوٹا موٹا تعلقہ سا وہاں پیدا کرلیا۔ منشی بیج ناتھ سہاے و رگھناتھ سہاے صاحبان نے ریاست ہاے سنٹرل انڈیا میں نام آوری حاصل کی۔ رے بہادر مان سنگھ صاحب و میجر رنجیت سنگھ صاحب (مرحوم) و راے بہادر لالہ ایشور سہاے صاحب کا خاندان بھی وہیں کا ہو۔ اور پُرانی عظمت کی یادگار اب بھی ایک ٹوٹے ہوئے پھاٹک کی عمارت کی شکل میں موجود ہو۔

تعلیم

سحر جی تحریر فرماتے ہیں "میں بچپن میں پڑھنے سے جی چُراتا تھا۔ پہلے ۹ سال کی عمر تک گھر پر اور مکتب میں پڑھایا گیا۔ گلستان اور بوستان تک فارسی پڑھی۔ پھر انگریزی کی طرف ڈھکیلا گیا۔ کسی طرح جنوری سنہ ۱۹۰۳ء میں انگریزی مڈل کے آخری امتحان میں پرائیویٹ شریک ہوا۔ اور تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔ کچھ وقت پھر ٹلا۔ آخر سنہ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ ہائی سکول فتح پور میں داخل ہوا۔ اور سنہ ۱۹۰۶ء میں قدیم الہ آباد یونی ورسٹی کا انٹرنس والا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اب پڑھنے سے دل چسپی ہوچلی تھی۔ کالج جانے کی زبردست خواہش تھی۔ الہ آباد تک گیا۔ مگر دفعتًا وہاں پیچش اور بخار سے ایسا بیمار پڑا کہ داخلے کی نوبت ہی نہ آئی اور مکان لوٹ آنا پڑا۔ بیماری نے طول پکڑا اور تعلیم کا خاتمہ ہوگیا"۔

سچ ہو وہ فطرت سے سبق حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی فطرت ہی ان کی معلم تھی۔ پھر تعلیم کی بندشوں سے ان کو یوں نہ اُلجھن ہوتی۔ دنیائے ادب میں درس گاہوں کے بھگوڑوں نے اکثر نام کیا ہو۔ انگریزی ادب میں بھی شیلی اور بائرن اس کی مثالیں ہیں۔ انٹرنس تک کی تعلیم بھی منشی ——— مرحوم اور ان کے لڑکے کنور بہادر صاحب وکیل کے دباؤ اور کوشش کا نتیجہ تھی۔ بابو کنور بہادر صاحب سحر جی کے پھوپھا زاد بھائی ہیں۔ اور بیٹھر قریب ستر سال فتح پور کے نام آور وکیل ہیں۔ دونوں بھائیوں میں ایسی محبت رہی ہو جو حقیقی بھائیوں میں بھی کم دیکھی جاتی ہو۔

حساب سے سخت اُلجھن تھی۔ لیکن ادبی دل چسپی شروع سے ہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میرا ساتھ سنہ ۱۹۰۵ء سے شروع ہوا۔ کتنے ہی دیوان ہم لوگوں نے منگائے اور پڑھے۔ مومن سے اس وقت سحر جی کو خاص دل چسپی تھی۔ لیکن بعد کو غالب ہی کے دل دادہ رہے۔ گو مومن کے تغزل کی تعریف ہمیشہ کرتے تھے۔ انگریزی میں اس وقت رینالڈس کے ناولوں کے پڑھنے کی دُھن تھی۔ میں نے کبھی کبھی آدھی رات تک مٹی کے تیل کی ڈبی (لمپ نہیں) کی دھیمی روشنی میں اُنھیں باریک حروف کے رینالڈس کے ناولوں کو اس محویت کے ساتھ پڑھتے دیکھا ہو کہ انھیں دُنیا کی خبر نہیں رہتی تھی۔ امتحان کے قریب بھی ایک پارسل آیا تھا۔ بابو گریش چندر دیب صاحب ہیڈ ماسٹر کو شک ہوگیا اور انھوں نے پارسل چھین لیا۔ کھول کر دیکھا تو رینالڈس کے ناول تھے۔ ہنس کر کہا کہ "اقبال بہادر! تمھارا ضبط امتحان کے قریب بھی بند نہ ہوگا۔ اچھا۔ امتحان تک یہ کتابیں ضبط"۔ اس ضبط کا اثر یہ تھا کہ انگریزی کی قابلیت اچھے گریجویٹ سے کم نہ تھی۔ میری عادت عجلت کے ساتھ لکھنے کی ہو ہی۔ اور عجلت میں سہو ہوجانا کون مشکل ہو؟ اسی لیے میں اپنے انگریزی مضامین کو بھی ان کے حوالے کردیتا تھا کہ ایک سرسری نظر ڈال لیں۔ غلطی پاکر ہنس دیتے تھے اور کہتے تھے۔ "جناب تمھیں کس نے انگریزی ایم۔ اے کی ڈگری دے دی ہو۔ ایسی ٹھوکر لیتے ہو کہ خدا حافظ"۔ میں نے بھی جواب گھڑ لیا تھا اور کہہ دیا کرتا تھا ع "قلم ہو منشیوں کا یا کوئی رہرو ہو بیچارا ——— بھائی! بگ ٹٹ دوڑ میں ٹھوکر لینا کیا مشکل ہو۔ جب کہ استاد خالی ست ہے"۔

شاعری کا آغاز

شاعری بھی اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ اور اسی لیے مولوی رضی الدین صاحب ہیڈ

مولوی' سحر جی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ہاں خودپسند طبیعت نے کسی کا تلمذ کبھی گوارا نہیں کیا۔ اصلاح تو مولوی رضی الدین صاحب سے اور خاص کر مولوی فضل حسن صاحب ہنگامی سے اکثر لے لیا کرتے تھے۔ فارسی کی عبارت بھی خاصی تھی۔ حوصلہ افزائی کے طرز پر مولوی رضی الدین صاحب کہا کرتے تھے۔ "منشی جی آپ کے ترجمے پر قلم لگانا تو مشکل ہی۔ مشورے کے طور پر کچھ اصلاح تجویز کرتا ہوں، مناسب ہو تو کرلیجیے" ایسے فقرے یاد کرکے ہم دونوں کی آنکھوں میں اب بھی اکثر مولوی صاحب کو یاد کرکے آنسو بھر آتے تھے کہ موجودہ زمانے میں اب ایسے اُستاد کہاں؟

اس زمانے میں قصیدہ لکھنے سے بھی عار نہ تھا۔ حالاں کہ بعد کو قومی خیالات اور حب الوطنی کا جوش اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کسی حاکم وغیرہ کی مدح سرائی گوارا نہ تھی اور بہت اصرار پر بھی ٹال جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں جو قطعہ پرنس آف ویلز (ملک معظّم جارج پنجم آں جہانی) کی تشریف آوری پر لکھا تھا اس کے چند شعر یادداشت سے اپنے خود نوشت حالات میں بھی لکھے ہیں ؎

ہر بزم میں ہی دھوم ترے آنے کی شاہا	ہر سمت نگاہوں میں کھلا جلوۂ راحت
ذرّاتِ زمیں مردمکِ چشم بنے ہیں	ہر نقشِ قدم آنکھ ہی ہنگامِ سیاحت
تاروں کو منطقہ ہی سپیدیِ سحر کا	رکھتا ہو ترا حُسنِ ملیح ایسی صباحت
تو صاف دلی سے ہو اگر دافعِ زشتی	اندازِ لطافت سے بدل جائے قباحت
تو شورشِ دریا کو جو دریا سے کرے سلب	مصری کا ذخیرہ ہو ہر اک کانِ ملاحت

طبیعت کی جدّت کے ساتھ زبان کی صفائی کس قدر صاف جھلک رہی ہی۔ ہونہار بروا کے ہوت چیکنے پات۔

میں نے پہلے ہی لکھا ہی کہ ہنس مکھ بہت تھے۔ ابتدائے زمانہ میں ان کے ہنسی خوشی میں شریک دوستوں میں بچّو بابا (منشی رام نراین) اور چند کا چاچا بہت ہی عزیز تھے۔ اکثر ان کے آپس کے مذاق کے لطیفے اب بھی سُنایا کرتے تھے۔ اور قہقہہ لگا کر ہنسا کرتے تھے۔ بچّو بابا پر تو ایک مذاق کا قصیدہ بھی اسی زمانے میں لکھ ڈالا تھا۔ جس کے چند اشعار مجھے یاد ہیں ؎

خاک اُڑاتی ہو ہر قدم پر ڈھیر واہ حضرت کی شوخیٔ رفتار !

چوک میں یوں نگاہ چلتی ہو جیسے میدانِ جنگ میں تلوار

سر بڑا قد پہ یوں ہوا موزوں جیسے سونٹے پہ ہو گرنڈے کا بھار

عمر کا تقاضا تھا۔ عشقیہ مضامین اور غزلیں بھی لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ بعد کو جب آریہ سماج کے بانی رشی دیانند کا اثر غالب ہوا تو قدرتاً تغزل میں ایک اخلاقی دھبہ نظر آیا۔ اور پہلے کے کلام کو چاک کر ڈالا۔ اسی زمانے میں گل زارِ نسیم کے طرز پر ایک مثنوی لکھی تھی۔ جس کے متعلق خود نوشت حالات میں خود تحریر فرماتے ہیں :-

سنہ ۱۹۰۹ء میں سنسکرت کے زندۂ جاوید شاعر کالی داس کے مشہور و معروف ناٹک شکنتلا کے ترجمے کو ختم کیا جو پہلے سنہ ۱۹۰۹ء میں زمانہ پریس کان پور، بعد ازاں سنہ ۱۹۲۵ء میں ادبی پریس لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ حقیقتاً اسے ترجمہ نہیں بلکہ ایک ایسی طبع زاد مثنوی کہنی چاہیے جو اس ناٹک پر مبنی ہو ”

مجھے اس مثنوی کے متعلق زیادہ وضاحت کے ساتھ آگے چل کر لکھنا ہو کیوں کہ اسی نے سحر جی کو خود زندۂ جاوید بنا دیا ہو، اس لیے یہاں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں ایک طرف آریہ سماج کا اثر یہ ہوا کہ سحر جی کے حُسن و عشق پرست مزاج کو ایک سادگی پسند سنجم اور نیم سے منظم سچے آریہ اخلاق میں بدل دیا، وہاں ان کے مزاج میں خشکی پیدا کر دی، جس نے ان کی شاعری پر بھی اثر کیا۔ اور پھر وہ ویسی دوسری مثنوی نہ لکھ سکے۔ اسی انقلاب کا اثر تھا جو سحر جی اپنے خود نوشت حالات میں فرماتے ہیں کہ ”بہت سا ابتدائی کلام چاک کر ڈالا، جس کا اب افسوس ہو“ وہ مثنوی مذکور بھی چاک کیے ڈالتے تھے مگر میں نے چھین لی اور دوستانہ سختی کے ساتھ کہا۔ ”بھائی۔ سماجی ہو جانے کے معنی خبطی ہو جانا نہیں ہیں۔ کیا سوامی جی نے رامایَن اور مہابھارت کا احترام کرنے کو نہیں کہا اور کیا تمھاری مثنوی کا اصلی قصہ مہابھارت میں موجود نہیں ہو۔ یاد رکھو۔ اس مثنوی پر تمھاری شہرت کا دار و مدار ہوگا“ بہت ناخوش ہونے پر بھی سالہا سال تک اسے اپنے پاس رکھا۔ سنہ ۱۳-۱۹۱۲ میں جب میں دہرہ دون میں ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول کا اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تھا تو سخن فہم ڈاکٹر سری رام سے کچھ ادبی دوستانہ ہوگیا تھا۔ انھیں میں نہایت ذوق و شوق سے مثنوی مذکور سُنایا کرتا تھا۔

ان پر تو ایک مجذوب کی سی حالت طاری ہوجاتی تھی اور ان کی آنکھیں سُرخ ہوجاتی تھیں۔ وہ کہتے تھے بھائی اسے ضرور شائع ہونا چاہیے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے اور کہتے تھے کہ مثنوی میں نسیم کا طرز نکھار دیا گیا ہے۔ اس میں تو دہلی اور لکھنؤ کا مشترک رنگ ہے۔ دونوں جگہ کی زبانوں کی خوبیاں موجود ہیں۔ مگر نقائص میں نہ تو لکھنؤ کا تصنّع ہے اور نہ دہلی کا اکھڑپن۔ میں نے وکالت سنہ ۱۹۱۶ء میں شروع کی اور تب انھیں وہ قلمی نسخہ واپس کیا۔ تب تک طبیعت میں اعتدال آگیا تھا۔ شاعری کا رُخ اخلاقی ضرور ہوگیا تھا۔ لیکن جذبات بھی کافی اُبھر آئے تھے۔ اور مزاج کی خشکی بھی رفع ہوگئی تھی۔ میرے اصرار پر اس کی نظرثانی ہوئی اور وہ چھپی۔ اِن واقعات کو یاد کرکے مجھے خوشی ہے کہ اس بے بہا نظم کو میں تلف ہونے سے بچا سکا۔ اس مثنوی کے تعلق کا ایک واقعہ اور قابلِ ذکر ہے۔ جب میں سنہ ۱۵-۱۹۱۴ء میں آگرہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوکر آگرہ کے قیام کے لیے دہرہ دون سے آیا۔ اور منشی سرن شنکر شائق صاحب اکبرآبادی کی شفقتِ برادرانہ کے زیرِ سایہ پھر رہنے کا موقع مِلا تو اس مثنوی کو انھیں بھی سُنایا۔ وہ بھی مفتون ہوگئے۔ اور انھوں نے کل مثنوی کا ایک نسخہ بھی صاف کرکے اپنے پاس رکھ لیا تھا جو اب بھی ان کے لڑکے کے پاس محفوظ ہے۔ دونوں میں پھر تو ایسی گہری ادبی دوستی ہوگئی تھی کہ خط و کتابت کے ذریعے سے بھائی سرن شنکر صاحب اکثر اصلاح لیا کرتے تھے۔ اور جب ایک بار میں نے دونوں کو آگرہ میں بلایا تو شعر و سخن میں ہی دونوں نے قریب قریب رات کی رات گزار دی۔ شاعری کی دُنیا میں وقت کا اختیار کہاں؟ جوگی کی طرح غالباً شاعر بھی جب دُنیا سوتی ہے تب جاگتا ہے۔ اور شاید جب دنیا جاگتی ہے تو سو جاتا ہے۔

شاعری اور ادَبی دل چسپی میں انقلاب

وجہ تو اُوپر لکھ ہی چکا ہوں اور ادبی دُنیا میں جہاں منطق کا زور ہوا کہ نثر نے زور پکڑا اور نظم کو نیچا دیکھنا پڑا۔ پیورٹن (Puritan) تحریک نے ناٹک اور شاعری سب کو ہی دھکا پہنچایا تھا۔ آریہ سماج کا بھی یہی اثر ہوا۔ ہمارے ممدوح کی طبیعت پر بھی وہی انقلاب پیدا ہوا اور نثر کا آغاز ہوا۔ مگر شاعری ایک فطری جذبہ ہے، جسے دبانا بھی مشکل ہے اور جس نے پیورٹن زمانے میں بھی ملٹن (Milton) جیسا نام آور

شاعر پیدا ہی کر دیا۔ اس جذبے نے گو طبیعت کا رجحان دیکھ کر نیا جامہ پہنا مگر اس ہنگامے میں بھی وہ پھولا نہ سمایا کہ سحر کی جادو بیانی کا اُسے فائدہ مل گیا۔ تغزل کو خیرباد کہہ کر اب نظموں کی طرف رجحان ہوا اور نثر نگاری کی طرف طبیعت راغب ہوئی۔ سحر جی خود نوشت حالات میں تحریر فرماتے ہیں۔ "غزل لکھنا قریب قریب ترک ہوا اور نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کم و بیش اب بھی جاری ہے۔"

میرا ہرگز یہ مفہوم نہ سمجھا جائے کہ میں آریہ سماج کی تحریک کے خلاف ہوں۔ میں تو اس کا دل دادہ ہوں۔ حالاں کہ خود سناتن دھرمی ہوں۔ سوامی درشنانند کے اپنشدوں کے ترجمے اور ویدانت بھاشیہ کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ [illegible] وید کا پنڈت [illegible] دیوشرما کا کیا ہوا ترجمہ تو میرے روز کے مذہبی مطالعہ کا جزو ہے اور شاید ۶ ۷ مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ ہندی کی ستیارتھ پرکاش بھی تین مرتبہ پڑھتا ہے اور دو مرتبہ انگریزی والا۔ سوامی جی کی زندگی کے حالات اور ان کی صداقت کی آنچ کی وجہ سے میرے خیالات ان کے متعلق اس بات سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا نام بھی روزانہ رشی ترپن کے وقت لیتا ہوں۔ پنڈت گرودت کی کتابیں بھی احترام سے سن کر پڑھی ہیں اور رگ وید بھاشیہ بھومکا نے جو انقلاب ویدک ترجمے میں کیا ہے اس کا بہت کچھ جزو میری نظر میں سوامی جی کی خاص عنایت تھی ورنہ ویدوں کا ایک رخ ہی غائب ہو گیا ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اسے ایک ہی پہلو سمجھتا ہوں اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے سناتن دھرم کا نام دیا جاتا ہے۔ اصل پوچھیے تو ناموں کا فرق ہے اختلاف کی جڑ ہے ورنہ دونوں ایک ہی مذہب کے دو رخ ہیں۔ جیسے کسی ڈھال کے دو پہلو یا کسی سکے کے دو رخ۔ مگر میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا کہ یہ منطقی ادھیڑبن کی تحریک جذبات کی اس عمق تک پہنچے کہ جہاں جاکر وہ بھی شعریت کے رنگ میں رنگ جائے ستیارتھ پرکاش کا ایک منظوم ترجمہ سحر جی کے پاس آیا تھا تب انھوں نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی اور کہا تھا کہ بھائی، یہ تو کوری تک بندی ہے، شاعری نہیں۔ اگر زندہ رہا تو سوامی جی کی سوانح عمری کو نظم کروں گا۔ مگر وہ وقت ہی نہ آیا اور سحر جی چل بسے۔ پدم سنگھ جی شرما بھی آریہ سماجی تھے۔ لیکن شاعری کی دنیا میں وہ ہماری ہی جیسے مجنونوں میں سے تھے۔

سنہ ۱۹۱۱ء سے سحر جی کا کلام زمانہ (کانپور) اور ادیب (الہ آباد) میں شائع ہونے لگا۔ غزلیات

کے نمونے میں نہیں دیتا کیوں کہ وہ ان کی شاعری کا خاص جزو نہیں ہیں ۔ اور ان کے غزلیات کے بہترین نمونے وہی ہیں جو مثنوی شکنتلا کے اندر جابجا موجود ہیں ۔ ہاں دو چار شعر البتّہ یہاں دے رہا ہوں ؎

۱۔ بلبل میں ہے جو نغمہ تو گل میں شمیم ہے　　　کتنا وہ بے حجاب ہے ہوکر حجاب میں

جب میں ایسے اشعار پر دوستانہ مذاق میں یہ فقرہ کستا تھا کہ آخر ویدانت شاعری میں تو موجود ہی ہے تو مسکرا کر کہہ دیتے تھے بھائی دویت ویدانت تو سوامی جی نے مانا ہی ہے فرق اتنا ہی ہے کہ "ہمہ اوست" ٹھیک ہے کہ "ہمہ از وست" اور جب میں کہتا تھا کہ وہاں تو تین ہیں جیو ، برمھ اور پرکرتی ، تو کہتے تھے کہ ایک دوسرے میں چولی دامن کا ساتھ سمجھو ۔

۲۔ تری خوشی سے ہے دُنیا میں اپنی آمد و رفت　　　نہ رنج ہے ہمیں آنے میں اور نہ جانے میں

اسے ان کے عقیدوں کا عطر سمجھیے ۔ اتنے کٹّر بھوگ وادی تھے کہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس بات میں میں سوامی درشنانند جی کا پیرو ہوں کہ انسان کو جو بھوگنا ہے وہ بھوگنا پڑے گا ۔ اگر میں ٹوک دیتا کہ ؎

پتا کہیں حکم بن ہلا ہے　　　بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے

تو بس یہی کہتے کہ اس میں صرف اِتنا اضافہ کردو کہ یہ حکم خدا اس کے انصاف اور ہمارے اعمال پر مبنی ہوتا ہے ؎

۳۔ بُتوں سے کام رہا آخری زمانے تک　　　خدا سے کام پڑا آخری زمانے میں

اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس میں انھوں نے دُنیا کی دلآویزی کی گم راہی کو نظم کیا ہے جسے ہم سناتنی مایا کہا کرتے ہیں ۔ اور ایشور کا انصاف اسی کی سزا کی شکل میں ہماری پریشانی کا باعث ہوتا ہے ۔ جو آخری مصرع میں ایک عجب انداز سے دکھایا گیا ہے ؎

۴۔ عیاں ہے مجھ پہ تعلق سے کل نظام کا حال　　　جو ایک راز ہے دُنیا تو ایک راز ہوں میں

جب میں کہتا تھا کہ جو اندر جیو ہے وہی باہر برمھ ہے تو کہہ دیتے کہ دراصل "راز" ہے کون جانتے ہے کیا ۔ آخر شاستر بھی تو علمی قیاس ہے ۔ رہا شرتی وہاں بھی دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں ۔ مجھے ٹیگور جی کی بات یاد آتی ہے کہ واقعی یہ ایک راز ہے ، کیوں کہ مایا کا لفظ استعمال کرنے سے راز کھل تو نہیں جاتا ۔ ہاں ۔ تنزل

کے تصوف والے رُخ کی غزلوں کو پڑھتے اخیر تک رہے، اور ہمیشہ پسند کرتے رہے۔ دیوانِ حافظ کا ترجمہ کرنے کی بالکل ٹھان ہی لی تھی۔ اور یہ طے کر لیا تھا کہ اب کے جاڑوں میں ڈلمئو میں رہ کر یہ کام کریں گے۔ مگر زندگی نے جواب دیا اور یہ ادبی خدمت باقی رہ گئی۔ کچھ زمانے سے تو تغزّل کے جذبات اتنے ابھر آئے تھے کہ شاعری کی دُنیا میں جوشؔ ملیح آبادی کے کلام پر فدا تھے کہ خوب لکھتا ہے اور بڑے مزے سے اکثر اشعار سُنایا کرتے تھے۔

نظمیں شروع میں مدرسے کے ہیڈ ماسٹر تو تھے ہی اس لیے مناظرِ فطرت سے زیادہ دل چسپی تھی۔ ان کے تخیّل کی نشو و نما بھی وہیں ہوئی تھی۔ ہتگام کے چاروں طرف بہت دور تک بلکہ یوں کہیے کہ ریلوے اسٹیشن کے مقام کھاگا تک ڈھاک کا جنگل زیادہ ہے اور موسمِ بہار میں جو فضا وہاں ہوتی ہے بیان سے باہر ہے۔ "ٹیسو کے بن" والی نظم سے دیکھیے ؎

یہ ٹیسو کا سماں برگِ سیہ کے رنگِ شامل سے	کھلے گُل ہائے تر گویا ہیں منقارِ عنادل سے
نمایاں ہے مگر گردوں سے ننھا سا دھنک کوئی	کوئی چھوٹی سی کشتی یا لگی ہے آکے ساحل سے
کہ اک ننھا سا شعلہ منقلِ آہن سے اُٹھتا ہے	کہ برق اب چھیڑ کرتی ہے کسی کے آہِ حاصل سے
یہ تیغِ خوں چکاں ہے یا کسی کے دستِ نازک میں	شہیدوں کا لہو گرتا ہے یا دامانِ قاتل سے
زباں یا آشکارا ہے مسی مالیدہ ہونٹوں سے	عیاں ہے یا جبیں، زلفِ بتِ رنگیں شمائل سے
گہن کے رنگ میں یا مہرِ انور مبتلا ہو کر	ہلال آسا بنا ہے اس کے آثارِ مقابل سے
کلیدِ عیش بن کر یا ہے کوشاں ناخنِ قدرت	بہارِ راحت افزائے جہاں کے گرہ حائل سے
شرابِ سُرخ یا نیلم کے پیالوں سے چھلکتی ہے	کہ ہیں اہلِ نظر سب وجد میں رندانِ غافل سے
دکھاتا ہے جہاں کو یا تماشا دل ربائی کا	نکلتا آستیں سے اُف، کسی دستِ حنائی کا
نظر آتا ہے چاروں سمت اک عالم چراغاں کا	ہیں جلتی دیکھ چھوٹی چھوٹی شمعیں بزمِ گلشن میں
برستی ہے جوانی شاہدِ قدرت پہ سرتاپا	جھلکتی ہے نمو کی سرخیٔ خوش رنگ جوبن میں

تشبیہات اور استعارات کی افزائش آپ نے ملاحظہ کی گویا شاعری کی جوانی ٹیسو کے بن کی شکل میں نمودار ہے۔

شاعر کی طبیعت کے پیالے سے "شرابِ سُرخ" کیسے جرعات بن کر چھلک رہی ہے۔ سچ ہے شاعر خود "اہلِ نظر" کے مانند "رندانِ غافل" کی طرح "وجد میں ہے"؛ تغزل کا رنگ یہاں بھی پھوٹا پڑتا ہے۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ یہ رنگ بعد کو کچھ دب گیا۔ لیکن قدرت اور فطرت سے شاعر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ کیسے چھوٹتا؟ بیربہوٹی والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

اے میرے چھوٹے سے کیڑے! کچھ کہے جا اپنا حال

کس کی دھن ہے؟ کیوں نہیں میری طرح تجھ کو قرار	ٹھیر جا دم بھر لگا کر سینے سے کرلوں میں پیار

اپنے قلبِ خوں چکاں کی آہ تجھ میں ہے مثال!

شاعر نے ناصح بن کر اپنے سکون سے بیربہوٹی کی بے قراری کا تضاد دکھاکر اسے نصیحت کرنا چاہا۔ لیکن ذرا ہی دیر میں یہ ناصح خشک کی نصیحت والی دھاک ہٹ گئی۔ بیربہوٹی میں اپنے قلبِ خوں چکاں کا نمونہ دیکھ کر شاعر مفتوں ہوگیا۔ اور سینے سے لگاکر پیار کرنے کی تمنا ہی اصلی وجہ نکلی اور سکون و قرار کا تضاد صرف بیرونی چلنے پھرنے یا سکون کی ہی میں شکل میں رہ گیا۔ مگر دیکھیے تو سہی کس پیار سے شاعر ننھے سے کیڑے کو ٹھیرانا چاہتا ہے۔ لڑکوں کی طرح زبردستی پکڑکر نہیں ؎

دل ربا ہے غنچۂ گل سا ترا رنگِ جمال

خوش نما ہے کس قدر تیری شبیہِ طرح دار	تیری نرمی پر گلابی شرم سے ہیں خدِ یار

خون، شیدائی کا کرتا ہے ترا یہ سرخ شال

لائی تجھ کو بہرِ زیبایش عروسِ برشگال

لال بندی سے فزوں کرنے کو چہرے کی بہار	آہ یہ منظر ترا خوش کن، یہ جوشِ سبزہ زار

آہ یہ منظر ترا خوش کن، یہ جوشِ سبزہ زار	ہیں خطِ گل زار کو موزوں یہ نقطے لال لال

پہلے مصرع میں ہندستان کی وطنیت دولھا دولھن کے تغزل کے ساتھ ظاہر ہے اور لال بندی کی تشبیہ مزہ دے رہی ہے۔ اور دوسرے شعر میں تو خطِ گل زار گویا گل زارِ نسیم کی زبان میں ہی لکھا ہے ؎

آ۔ اُٹھا لوں۔ آہ، ساکت ہوگئی تو شکلِ خال

یہ محبت سے مرا لینا ہی تجھ کو ناگوار چھوڑ دوں ۔ اچھا ستاؤں گا نہ تجھ کو زینہار

جا زمیں پر کھیل خوش خوش ہاتھ پیر اپنے نکال

ذرا سا چھونے سے بیربہوٹی اپنے ہاتھ پیر سکوڑ لیتی ہی گویا وہ ایک چلتی پھرتی چھوئی موئی ہی۔ یہ دونوں شعر ہیں کہ جذباتِ فطرت کی جان ۔ جذبات کتنے بے تصنع مگر کتنے پُر لطف اور پاک ہیں !

دور ہی سے دیکھ لوں میں حُسن کا تیرے جمال

محو ہو کر بس کروں دل ہی میں وصفِ کردگار . . . .

فضا سے خدا کی طرف رجوع ، صنعت سے صانع کی طرف رجحان ، سحر صاحب کے حسن قدرت کی مصوری کا اکثر خاص جزو ہی اور وہ یہاں صاف عیاں ہی۔

دیکھ لوں جی بھر کہ دورِ ہستیِ ناپائدار . . . .

پھر دکھائے گا نہ مجھ کو تیری صورت ایک سال

وصال کے چند لمحے کس مزے سے استعمال کیے جاتے ہیں کیوں کہ آیندہ ایک سال کے ہجر کا خوف ہی اب پورے ناصح (مگر خشک نہیں بلکہ پُر درد) کی شکل میں شاعر کو دیکھیے ؎

راہ رو رکھ ہر قدم کو خوب کرکے دیکھ بھال

خوں نہ ہو جائے کسی معصوم کا دل ہوشیار اس قدر ہو جن پہ ہر دم شفقتِ پروردگار

یوں حقارت سے انھیں دیکھے بشر کی یہ مجال

شاعر کا جذبہ ہم دردی میں اوپر کے اشعار کی روح رواں ہی۔

حب الوطنی کا جذبہ سحر میں اتنا تھا کہ اسی کے جوش میں اور ادبی خدمات کی دل چسپی کی وجہ سے پیشۂ مختاری کو خیرباد کہا اور ایک ادبی سنیاسی کی سی زندگی قبول کی ۔ لیکن ہمارے ملک کی تقدیر میں ایسے جذبۂ شاعری کو مایوسی اور مرثیہ نویسی ہی نصیب ہی ۔ سحر جی کی وہ نظمیں جن میں لوک مانیہ تلک ، لالہ لاجپت رائے ، سوامی شردھانند اور گنیش شنکر ودیارتھی کے نوحے ہیں ، درد ، سوز و گداز سے بھری ہیں ۔ اور پکار پکار کر اپنے ہر لفظ سے کہتی ہیں ؎

مبالغہ نہیں تمہید شاعرانہ نہیں   غریب قوم کا ہے مرثیہ فسانہ نہیں

نمونے ملاحظہ ہوں:-

لالہ لاجپت رائے مرحوم

پھٹ پڑا قوم کے سر پر غم و آفت کا پہاڑ   اپنی حالت میں زیادہ نظر آتا ہے بگاڑ
ہوگیا سوگ سے ہر خانۂ آباد اُجاڑ   شیرِ پنجاب کی باقی نہ رہی آج دہاڑ

صفِ اعدا کو جو کردے تہ و بالا نہ رہا
کھیلے جو موت سے وہ کھیلنے والا نہ رہا

جلوہ زا اب نہیں وہ ناز وہ اندازِ وطن   جان سے اپنی گیا عاشقِ جانبازِ وطن
دفعتاً ٹوٹ کے بے ساز ہوا سازِ وطن   اگلے لہجے میں اب اٹھتی نہیں آوازِ وطن

پھیلے جو دہر میں ہر سمت فسانہ ہوکر
گونج اُٹھے ہند کی عظمت کا ترانہ ہوکر

اے اجل، اے ستم ایجاد! تجھے کچھ ہے خبر   تو نے اک ساتھ کیے کتنے مظالم ہم پر
آج مٹ مٹ کے رہے تیرے ہی ہاتھوں یک سر   دم و خم ادب و شرف فیض و کرم علم و ہنر

کیسے آسودگیٔ خاطرِ ناشاد کریں
مرنے والے تری کیا کیا صفتیں یاد کریں

سوامی شردھانند مرحوم

آہ سوامی! یہ اک آفت ہے تری موت نہیں   قوم پر گونہ مصیبت ہے تری موت نہیں
مایہ صد غم و حسرت ہے تری موت نہیں   پھر بھی بے شبہہ شہادت ہے تری موت نہیں

گہ رُلایا، گہے در پردہ ہنسایا سب کو
ہاں تری موت نے دیوانہ بنایا سب کو

(اس آخری شعر کی تو تعریف ہی نہیں کرتے بنتی۔ جذبات کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔) ے

تھا شرارہ مگر آتش کی حرارت تھی نہاں قطرہ تھا، تجھ میں مگر بحر کی وسعت تھی نہاں
تھا تماشا مگر آرائشِ قدرت تھی نہاں ذرہ تھا، تجھ میں مگر مہر کی جدت تھی نہاں

ایک جاں تھی تری صد مجمعِ جاں کے قابل
ایک ہستی تھی تری ایک جہاں کے قابل

(حضرت اؔنیس بھی بے ساختہ بہشت میں بول اُٹھے ہوں گے ”خوب“)

اب تو گو مٹ کے رہی ہستیٔ فانی تیری پر مٹے گی نہ کبھی زندہ نشانی تیری
آن ہر آن بیاں جائے گی مانی تیری مائیں بچوں کو سُنائیں گی کہانی تیری

جس سے رد ہوگا عمل خواہشِ نفسانی کا
آئے گا جذبہ دلِ قوم میں قربانی کا

سری جت گنیش شنکر ودیارتھی مرحوم

تجھ کو اے ودیارتھی محزونیٔ جاں کی قسم اپنے دِل کے درد کی اور اس کے درماں کی قسم
جس پہ تو مٹ مٹ گیا اُس عہدِ پنہاں کی قسم تجھ کو اپنے دین کی اور اپنے ایماں کی قسم

سچ بتا، وہ کون سا تھا اک خیالِ پُر امید
جو بنا کر ہی رہا آخر تجھے اپنا شہید ؟

ہندو و مسلم کے بل جانے کا تو حامی رہا میل کے خاطر ہی تو نے آہ کتنا دُکھ سہا
آپ تو اپنے دِلی جذبات کی رَو میں بہا جان ہی دے کر کیا پورا اُسے، جو کچھ کہا

آج ہم سب کے لیے یوں اے فدائے اتحاد
ہو کے قرباں بن گیا تو رہنمائے اتحاد

گرچہ تھا اپنا ہی اُجڑا گانو تیرا بھی وطن اپنی یکتائی سے تھا تو واقعی فخرِ زمن

گو ہو تیری موت سے دل وقفِ آلام و محن		پھر بھی یہ اک بات تسکین کا سبب جاتی ہو بن

باخبر ہوکر جیا اور باخبر ہوکر مرا
تو مرا لیکن حقیقت میں امر ہوکر مرا

مجھے اور سحر جی کو تو پرتاپ[1] کے ایڈیٹوریل مضامین اس قدر پسند تھے کہ ہفتہ وار پرتاپ پڑھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ منشی دیا نراین نگم صاحب مرحوم کے زمانہ کے متعلق جو مضمون زمانہ کی سلور جبلی نمبر کے موقع پر پرتاپ میں نکلا تھا آج بھی میرے کمرے میں شیشے میں لگا ہو۔

تین بڑی نظموں کے متعلق یعنی مثنوی شکنتلا، رباعیات عمر خیام اور کریا کے متعلق مضمون ہذا کا بالکل ایک علاحدہ جزو محفوظ کیا جارہا ہو، اس وجہ سے ان کے متعلق یہاں لکھنا ضروری نہیں، ہاں - یہ ضرور کہہ دینا ہو کہ سحر جی اپنا نام شاعری کی دُنیا میں ان تین نظموں کی شکل میں زندۂ جاوید کرگئے ہیں۔ اور سحر جی کی وفات کی خبر پاتے ہی میرے بھائی کے پوتے بابو اندرموہن لگوڑہ نے جو شعر لکھ بھیجا تھا[2] وہ بالکل ٹھیک ہو ؎

تمھیں کہتا ہو مُردہ کون، تم زندوں سے بہتر ہو
تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی

وضع قطع | خودنوشت حالات میں خود سحر جی تحریر فرماتے ہیں :-

"ہر چیز کو ٹھیک جگہ پر رکھنے اور دیکھنے کی عادت ہوگئی ہو۔ جس میں پوری صفائی کا بھی خیال رہتا ہو۔ زندگی بھی کچھ قاعدے کے ساتھ چل رہی ہو۔ سادہ کھانا، سادہ رہنا، اپنے کسی کپڑے پر کسی رنگ کی ایک لکیر بھی مجھے پسند نہیں ہو۔ یہ کپڑے کھدر کے ہی ہوتے ہیں "

سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات کا وہ ایک مرقّع تھے۔ اسی لیے تو میں نے ان کو "ادبی سنیاسی" کہا ہو۔ سنیاس کے معنی ہیں تمام طرف سے خیالات کو ہٹاکر مرکزی بنا لینا۔ اور انھیں کسی ایک رُخ میں کرکے ایشور کے ارپن (وقف)

---

[1] ہفتہ وار اخبار کان پور صاحب موصوف جس کے ایڈیٹر تھے۔

[2] یہ شعر مولانا حالی کے مرثیۂ محسن الملک سے منقول ہو۔ پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے :
" تمھیں کہتا ہو مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو "		(مدیر "اردو")

کردینا۔ سحرجی کی دُنیا دنیائے ادب تھی اور بقیہ امور سے انھوں نے زیادہ تر سنیاس لے لیا تھا۔ ہاں اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی ذمے داریوں سے بےخبر تھے۔ جو کچھ بھی تھوڑا بہت ملتا تھا وہ ان کے پاس ٹکنے نہ پاتا تھا۔ لڑکی کی شادی اور اپنے دونوں لڑکوں کی تعلیم میں کافی صرف کیا۔ خاندان، ملک، ملت و قوم کے غربا بھی ان کے پیسے سے فیض یاب رہتے تھے۔ بہار میں زلزلہ آیا اور سحرجی پُرانے کپڑے اور چندہ و اناج اکٹھا کرنے میں مشغول ہوگئے۔ گڑھوال میں قحط ہوا اور سحرجی در بدر بھیک مانگتے دیکھے گئے۔ بقول چکبست سے

"جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں
طمع میں دولتِ دنیا کے یہ اسیر نہیں"

اپنے لیے تو گدائے متکبر ہی تھے۔ پیسے کی ضرورت رہتی تھی۔ مگر رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان کی بےالتفاتی ساتھ ہی ساتھ تھی۔ جھنجھلاکر اس تعلق سے ایک مضمون بھی سرسوتی میں شائع کرادیا۔ مگر اپنی شان کبھی نہ چھوڑی۔ نثر کے مضامین بلا معاوضہ نہیں لکھتے تھے۔ مگر نظمیں بلا معاوضہ ہی دے دیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ "بھائی نثر کا ہی کیا معاوضہ ملتا ہے جو نظم فروشی کرکے اس کی مٹی پلید کروں"۔ اسی لیے سوائے ان نظموں کے جو کتابی صورت میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب ہی بلا معاوضہ رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی ہیں۔

قدرت سے اس قدر اُنس تھا کہ علاج بھی زیادہ تر لوئی کوہنی کا ہی پسند تھا۔ یا بہت ہوا تو ہومیوپیتھی۔ مگر یونانی اور ویدک کی ادویات سے بھی دل چسپی تھی۔ کیوں کہ ان میں زیادہ تر بنسپتی ہی شامل ہیں۔ ہاں ایلوپیتھی ناپسند تھا۔ کئی بار یہ کوشش کی کہ بھگویا ہوا کچّا گیہوں یا چنا، منقّیٰ یا کشمش، یا نمک اور پھل کھاکر زندگی بسر کریں۔ مگر کام یاب نہ ہوئے۔

سیاست

سچائی، سادگی اور خودداری ان کی زندگی کے جوہر تھے۔ خوشامد بالکل پسند نہ تھی۔ اسی لیے سوائے شروع کے پھر حکام کی خوش نودی کے لیے نظمیں نہیں کہیں۔ حب الوطنی کی وجہ سے ہی پیشۂ مختاری چھوڑا اور کھدرپوش ہوئے۔ مگر تصنع اور ظاہرداری سے اس قدر نفرت تھی کہ کانگرس کے دل دادہ ہوتے ہوئے بھی جہاں اس میں ہُلّڑ بازی شروع ہوئی وہاں اسے بھی خیرباد کہا۔ اور آخر میں چار آنے والے ممبر بھی نہ رہ گئے۔ اتنا ہی نہیں، ایک کہانی بھی عام دیہاتی کانگرسیوں کی بدعتوں پر لکھ ڈالی جو سرسوتی میں بہ معاوضہ

بچاس ڈولی (صدر) شائع ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ بلا خاص تربیت اور اخلاقی تعلیم و خوفِ خدا ہر کس و ناکس کو والنٹیر بناکر اہنسا کی خدمت سپرد کرنا سخت غلطی ہے۔

ایک بڑا مضمون کانگرس کی تاریخ پر لکھا تھا۔ جو غالباً مادُھری میں شائع ہوا تھا۔ اخبارات سے نوٹ کر لینے کے اس قدر عادی تھے کہ میرے خیال میں پوتھے کے پوتھے موجود ہوں گے۔ سنہ ۱۹۳۱ سے سنہ ۱۹۴۱ تک کے نوٹ تو میں نے خود اپنے یہاں ہی ان کو برابر لیتے ہوئے دیکھا تھا۔

مذہب بڑے پکے آریہ سماجی تھے اور سب ہی تصانیف اس فرقے کی پڑھی تھیں۔ سوامی درشنانند جی کے منطقی نقطۂ نظر کے خاص دل دادہ تھے۔ وہ انہی کی تقلید میں کٹر بھوگ وادی تھے جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا ہے۔ ہتگام کی آریہ سماج کے سالہا سال سے پردھان (صدر) تھے۔ سب ہی درشن پڑھے تھے۔ اور خاص اصول بھی زبانی یاد تھے۔ یَم اور نِیَم کے خود بھی بہت پابند تھے اور انھیں مذہب کی عملی شکل کی بنیاد مانتے تھے۔ لیکن دو باتیں ناپسند تھیں۔ ایک تو دوسروں کی مذمت اور دوسری خیرات میں کنجوسی۔ کبھی کبھی جھنجھلاکر کہہ دیتے تھے کہ سماجی لینا جانتا ہے دینا نہیں۔ سندھیا اور اشنان دونوں وقت ضرور کرتے تھے چاہے معمولی بخار ہی کیوں نہ ہو۔ کوتاہ نظری نہ تھی۔ ورنہ مجھ جیسے سناتنی سے گہری دوستی کیسے نبھتی۔ یہ نہ تھا کہ ہم دونوں آپس میں مذاق اور رویئے پر نکتہ چینی نہ کرتے ہوں مگر وہیں تک جہاں تک ہنسی آئے۔ مثلاً میں اکثر کہتا: "میاں، آنکھ بند کرکے سندھیا میں کیا دیکھتے ہو وہی اندھیالا، ہمارے راجا رام کو دیکھو" تو ہنس دیتے۔ اور ایک مرتبہ تو کہا کہ "بھائی کہتے تو صحیح ہو مگر کیا کروں لامحدود کو محدود دیکھنے میں ہچک ہوتی ہے۔" میرے بڑے بھائی ست نراین کی کتھا کے بعد جو چرنامرت اور پنجیری منگاکر دیتے اسے بڑے شوق سے کھاتے مگر یہ کہہ کر کہ "آپ چرنامرت سمجھیں، میں تو اسے پنچامرت سمجھ کر پیتا ہوں" اور زور سے قہقہہ لگاتے۔

میں اکثر مذاق میں کہتا کہ تم ایسے ہو کہ چُلو بھر ترپن کی بھی امید نہیں تو ہنس کر کہتے "میاں گھڑوں پانی ڈھنکا دوں گا بلے تو لے لینا"۔ آہ! آج وقت پلٹ گیا اور اُلٹا ترپن کرنا مجھے نصیب ہوا۔ جو حسبِ قاعدہ روزانہ تحریر جی کے لیے بھی کرتا ہوں۔

درس و تدریس خود نوشت حالات میں تحریر فرماتے ہیں " اُردو ، ہندی ، انگریزی نظم و نثر کی ہزاروں کتابیں پڑھ چکا ہوں ۔ سوچتا ہوں کہ شروع سے کتابوں کے نام کہیں نوٹ کرتا جاتا تو اچھا تھا "
ان کا ہاتھ نہ کبھی لکھنے میں تھکتا تھا اور نہ دماغ پڑھنے سے ۔ زور سے پڑھنے کے عادی نہ تھے اور اسی وجہ سے بہت تیز پڑھتے تھے ۔ جو کتاب لی شروع سے آخر تک چاٹ گئے ۔ میں مذاق میں کہا کرتا تھا کہ لوگ سوختے کو " روشنائی چاٹ " کہتے ہیں مگر تم تو بھائی " کتاب چاٹ " ہو ۔ جس شاعر پر مضمون لکھتے تھے، کیا مجال کہ اس کے مجموعے کا ایک بھی شعر پڑھنے سے رہ جائے ۔ ہفتوں پڑھنا اور نشان لگانا، پھر رسالوں میں اسی شاعر کے متعلق مضامین پڑھنا اور نوٹ لینا اور تب ہی قلم اُٹھانا ۔ یہ ان کی تکمیل پسند طبیعت کا ایک خاص رُخ تھا.
اور یہی وجہ تھی کہ جب معاوضہ کم ملتا تھا، تاخیر یا وعدہ خلافی ہوتی تھی تو انھیں جھنجھلاہٹ ہوتی تھی ۔ خطوط میں سخت الفاظ بھی لکھ دیتے تھے ۔ ان کی معشوقہ کہیے، رفیق کہیے، کتابیں اور رسالے ہی تھے ۔ Southey کے حسب ذیل اشعار ان پر صادق آتے ہیں :۔

My hoposarc with the Dead; anon
My place with them will be.
And I with them shall travel on
Through all Futurily
Yet leaning have a name, I trust
That will not perishin the dust.

زندگی کے شائبے میں دو واقعات یہاں لکھنا ضروری ہے ۔ وفات سے ایک یا دو دن پہلے انھوں نے اپنے بڑے صاحب زادے مسٹر کیلاش ورما شائق سے، جو خود بھی ایک ہونہار ادبی خادم ہیں، کہا کہ مجھے اپنے کتب خانے کی الماری کے پاس لے چلو ۔ جب وہاں پہنچے تو ایک حسرت کی نگاہ کل کتابوں پر ڈالی اور کچھ عرصے کے لیے آنکھیں بند کرلیں ۔ پھر اپنے بستر پر لوٹ آئے ۔ ضبط کا مادّہ تو بہت تھا ہی پوچھنے پر ٹال مٹول کا جواب دیا ۔ مگر لڑکے کا دل کھٹک گیا اور اس نے اپنے چچا بابو نرسنگھ بہادر وکیل کو بلانے

کے لیے آدمی فتح پور بھیج دیا۔ مجھے تو اس واقعے سے یقین ہو کہ سحرؔ جی ادبی خدمت کے لیے ہمارے ملک میں پھر تشریف لائیں گے۔

سنہ ۱۹۴۱ کے بڑے دن کی چھٹی میں جب میں اجودھیا جی جانے لگا تو میرے گرو دیو کی علمی خدمات و ادبی تبحّر کے قایل ہونے کی وجہ سے مجھ سے یہ درخواست کی کہ ایک جوڑی کھڑاؤں لے کر گروؔ مہراج سے کہنا کہ اپنے قدموں سے چھوکر مجھے دے دیں۔ مَیں انھیں بہ طورِ یادگار پہنا کروں گا۔ اس سچے جذبے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرے گروؔ دیو سری انجنی نندن سرن جی ہیں۔ جنھوں نے دس جلدوں میں رامایَن کی تنقید اور ٹیکا لکھی ہو اور تمام ہی سنسکرت کے رامایَنوں اور دیگر علما کے تلسی داس کی رامایَن کے متعلق خیالات کو جمع کر دیا ہو۔ ہم دونوں کا یہ خیال ہو کہ اس سے بہتر تنقیدی کتاب دنیاے ادب میں اب تک نہیں لکھی گئی۔ جب مَیں نے گروؔ جی سے یہ عرض کیا اور کھڑاؤں سامنے رکھے تو انھوں نے ہنس کر فرمایا کہ "بھائی مَیں تو آریہ بھائیوں کو بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ بھگوان نے خود گیانی کو प्रौढ तनय کہا ہو۔ مگر ہم تو بچے ہیں۔ بھگوان کے سگن روپ کے اُپاسک۔ ہمارے لیے وہ راستہ تلوار کی دھار ہو۔ ہاں، ایک ہی بات مجھے ناپسند ہو کہ وہ ہم بچّوں کے صدقِ محبّت پر شبہہ کرکے کبھی کبھی سخت کلامی اور مذمّت کرنے لگتے ہیں۔ جو خاص کر بڑے بھائی کے شایانِ شان نہیں ہو۔ سحرؔ جی سے کہنا کہ مَیں اس بات کا ادھکاری نہیں ہوں کہ اپنے چرنوں سے لگا کر کھڑاؤں دوں۔ ہاں، لو یہ کھڑاؤں بھگوان کے چرنوں میں لگا کر اپنے سر سے چھلا کر حوالے کرتا ہوں۔"

سحرؔ جی نے یہ پرشاد بڑی محبّت سے لیا اور چند آنوں کے کھڑاؤں کو ایک بیش بہا یادگار سمجھ کر لے گئے اور استعمال کرتے رہے۔ دونوں جانب کی انکساری اور قدردانی ہی اس واقعے کی جان ہو۔

اُردو، ہندی، ہندستانی

ایک روز اتفاقیہ یہ گفتگو چھڑ گئی کہ حضرت نیازؔ فتح پوری کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو اُردو لکھنی نہیں آتی۔ مَیں نے کہا کہ نیازؔ صاحب تو میرے بڑے بھائی بابو بینی بہادر ورما کے ہم سبق رہے ہیں۔ لڑکپن میں ان کے یہاں کی بڑی بوڑھی عورتیں ہمارے یہاں آتی تھیں اور ہمارے یہاں کی عورتیں بھی ان کے یہاں جاتی تھیں۔ خیر، یہ تو کسی تقریب کے موقع

پر ہوتا تھا لیکن جاڑوں میں دوپہر کو اور گرمیوں میں چاندنی رات یا شام کو اکثر دونوں طرف کی عورتوں میں چھتوں پر سے خوب بات ہوتی تھی (نیاز صاحب کا گھر ہمارے گھر کے پیچھے تھا اور چھتیں ملی ہوئی تھیں) میں بھی لڑکپن میں اکثر ان زنانہ کی سکوٹوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ خاص کر صغرا دادی مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ مگر مجھے تو اپنے یہاں کی اور نیاز صاحب کے گھر کی عورتوں میں زبان کا بہت بڑا فرق نہیں معلوم ہوتا تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ ادھر سے "اللہ اللہ" "خدا جانے" وغیرہ سُنائی دیتے تھے تو اِدھر سے "رام رام" اور "رام جانے"۔ مگر طرفین کو اس میں بھی پورا یقین تھا کہ اللہ اور رام اور خدا ایک ہی معبود ہے۔ دو نہیں۔ کبھی تو محبت یا رحم کے جوش میں غالباً ہمدردی کا وہ اُبھار ہوتا تھا کہ صغرا دادی کے منھ سے "رام رام" نکل جاتا اور میری ماں کے منھ سے "خدا جانے"۔ اس پر سحر صاحب نے فرمایا کہ "بھائی۔ اب نیاز صاحب نام کے فتح پوری رہ گئے ہیں۔ ورنہ اب وہ اصل لکھنوی ہیں۔ اور ان کے رسالہ نگار کو بلا لغت پڑھنا مشکل ہے"۔ تب میں نے بات کاٹ کر کہا کہ ان کی جذبات بھاشا پڑھ کر سُنیے تو یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ ہماری مادری زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔ میں تو اسے اپنی چھوٹی سی لائبریری میں ایک یادگار کی طرح پر اب بھی محفوظ رکھے ہوں۔ سحر جی کا جواب تھا کہ "اب پاکستان کا زمانہ ہے اور ہم لوگ ناپاک ہیں نہ وہ پُرانے دن رہ گئے اور نہ وہ پُرانے لوگ۔" گفتگو کا سلسلہ بڑی دیر تک چلتا رہا۔ آخر میں انھوں نے مجھے اپنے خیالات ایک مضمون کی شکل میں "اردو" میں شائع کرانے کی رائے دی۔ پہلے تو میرا یہی جواب تھا کہ میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا تو وہی خیال ہے جو میرے اُستاد مولوی نیاز محمد صاحب ریٹائرڈ ماسٹر نارمل اسکول الہ آباد کا ہے اور جس کی تعلیم انھوں نے مجھے اسی صدی کے آغاز میں دی تھی کہ ہماری مادری زبان ہندی، ہمارے ملک کا نام ہند یا ہندستان ہے۔ کیوں کہ اسی نام سے ہم ہندی کہ کر عرب فارس اور مصر میں بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ ہاں، شاہی دربار کے تعلق رکھنے والوں میں ایک پدری زبان مستعمل ہونے لگی تھی جس کو اُردو نام بعد کو دیا گیا۔ اور اسی کا شائبہ اب بھی زبان کے ایک طرزِ تحریر اور تقریر میں موجود ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ مذہب کے تعلق سے اہلِ اسلام عربی اور فارسی پڑھتے ہیں، اور ہندو سنسکرت۔ اس لیے دونوں کی تحریر و تقریر میں اپنے اپنے مطالعات کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن جب واحد جمع بنانے کے طریقے ایک،

اسما کی تذکیر و تانیث ایک سی، اور افعال کی بناوٹ ایک سی تو زبانیں دو کیسے کہی جا سکتی ہیں۔ دیکھیے نہ، انگریزی میں بھی جو لوگ لاطینی زبان پڑھتے تھے ان کی انگریزی اور طرح کی ہوتی تھی اور جو یونانی زبان پڑھتے تھے ان کی اور طرح کی۔ پھر فرانس کی زبان کا اثر بھی تھا۔ الغرض اب بھی انگریزی ادبیات میں ملٹن کی زبان اور بائرن یا ورڈس ورتھ کی زبان میں فرق ہے لیکن اس بنا پر کوئی دو باتیں انگریزی زبان میں نہیں کہتا۔ اور معمولی روزمرہ کا کام چلانے کے لیے اور اخبارات وغیرہ کے لیے ایک سی زبان بن گئی ہے جسے سب سمجھتے ہیں اور آسانی سے بولتے ہیں۔ یہی ہندستان میں بھی ہونا چاہیے۔ روزانہ کاموں کے لیے عام زبان ہندستانی سب بولیں اور لکھیں اور سمجھیں۔ رہا علمی اور ادبی تعلقات سے اگر کچھ فرق رہے تو بھی مضائقہ نہیں۔ جہاں ایک ہونے کی خواہش ہوگی وہاں اتنا تو ہو ہی جائے گا کہ سمجھ سب سکیں اور صرف طرزِ تحریر اور طرزِ مکالمہ کا فرق رہ جائے اب بھی اکثر مسلمان صاحبان پنڈت کو آتے دیکھ کر" براجیے" کہہ دیتے ہیں اور ہندو صاحبان مسلمان کو دیکھ کر" تشریف لائیے" یہ الفاظ کا اضافہ تو اچھی چیز ہے۔ ہمارے علمی اور ادبی خزانے میں غالب مومن، نظیر اکبر آبادی، ملک محمد جائسی، رحیم، رسکھان، تلسی داس سب ہی انمول جواہرات ہیں، کیسے نکالیں، کیسے رکھیں؟"

سحر جی نے جواب دیا کہ انھیں بیانات کی توضیح درکار ہے۔ میں نے مطالعہ شروع کیا اور کئی رسالوں پر بھی سحر جی نے عطا کیے تھے نشانات لگائے۔ آخر میں انھوں نے انھیں میری یادداشت کی کتاب میں اپنے دستِ مبارک سے لکھ دیا۔ میں بولتا جاتا تھا او وہ لکھتے جاتے تھے۔ یہ کام ۱۲ جون سنہ ۴۲ ع کو ختم ہوا۔ میری صحت گرمی اور برسات میں بوجہ دمہ خراب رہتی ہے۔ تساہلی میں یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہو پایا اور آخری خط میں بھی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس کا تقاضا تھا۔ خیر۔ اب دیکھیے کب یہ کام ہوتا ہے، یا نہیں ہوتا۔ البتہ ان کے خیالات کا لبِ لباب ضرور یہاں دے دینا مناسب ہے۔ ان کے خیالات مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خیالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن کا اظہار انھوں نے جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع کے زمانہ میں "اردو ہندی تصفیہ" کے عنوان والے مضمون میں کر دیا ہے۔ اس لیے ذیل کا اقتباس دیا جاتا ہے:-

"جو اپنے کو اُردو ہندی کا ادیب کہتے ہیں یہ فرقہ انتہا درجے کی ضد اور تعصب سے کام لے کر دراصل دونوں زبانوں کو نقصان پہنچا رہا ہے ..... مگر زیادہ سرزنش کے قابل اُردو کے حامی خصوصاً ہمارے مولوی صاحبان ہیں ..... اب تو اخبارات میں بھی غیرمانوس عربی، ترکی وغیرہ کے نئے الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں کہ ہندوؤں کو اُردو پڑھنے میں بڑی دقت ہوگئی ہے ..... ان الفاظ کو جو عرصۂ دراز سے اُردو میں داخل ہوگئے تھے نکال کر پھینک دیا ہے۔ مثلاً ایڈیٹر کا لفظ کیا اُردو کیا بنگالی مرہٹی وغیرہ زبان میں بھی استعمال ہونے لگا تھا اور لالٹین اور اسٹیشن کی طرح اُردو میں کھپ گیا تھا۔ لیکن اب مدیر ٹھونس دیا گیا ہے۔ خزانچی کے بجائے خازن .... میں نے خود اخباروں میں پڑھے ہیں" ...." اس طرح ہندو مجبور اور تنگ کیے جانے لگے ..... جواب میں ہندی میں بھی سنسکرت لفظوں کی بھرمار ہونے لگی ..... میرا سوال ہے کہ آپ نے ہندوؤں کو مُلک کی واحد مشترکہ زبان سمجھنے سے کیوں محروم کردیا؟ اصلی رونا ذہنیت کا ہے (ضلع جون پور میں تعلیم یافتہ مسلمان نے نیرمہ گوانی کو سرکاری کاغذات میں کج گوانی لکھوا ہی دیا) یہ ذہنیت مسلمانوں خصوصاً ادیبوں میں پھیلی ہوئی ہے .... اگر یہی خیال ہے تو دعوے چھوڑ دیجیے کہ اُردو دونوں کی مشترکہ زبان ہے"

جو اصحاب سحرؔ جی کے خیالات کو زیادہ وضاحت سے جاننا چاہیں وہ ان کے پدم سنگھ شرما والے مضمون میں جو اپریل سنہ ۱۹۴۱ کے اُردو میں شائع ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

ایک رُخ اس تحریک کا یہ بھی ہے کہ اُردو کی خدمت کرنے والے ہندو اصحاب کی قدردانی تو درکنار، کبھی کبھی مذمت کی جاتی ہے۔ سحرؔ جی بھی اس کا شکار ہوئے۔ میں نے سوائے دس پانچ اشعار کے اور ان کے کلام کا کوئی جُز کسی اسکول میں پڑھائی جانے والی کتاب میں اپنے صوبے میں نہ دیکھا۔ حالاں کہ سُنا ہے کہ حیدرآباد میں ان کی مثنوی کے اقتباسات اکثر کتابوں میں لیے گئے ہیں۔ خیر، یہ سُنی ہوئی بات ہے۔ مجھے جو بات کھٹکی ہے اسے یہاں ضرور لکھوں گا۔ گو اختصار کے ساتھ کیوں کہ مشرح جواب کا موقع نہیں ہے۔ اُردو چوں کہ اپنے کو فارسی اور عربی کا وارث سمجھتی ہے اس وجہ سے وہیں کے راگ الاپتی ہے۔ اس میں ہندستان کی وطنیت کم پائی جاتی ہے۔ سُنے ہوئے مناظر کا لکھنا اور باندھنا تصنّع سے خالی کیسے ہوسکتا ہے؟ رہیں گنگا جی کے کنارے اور کریں ذکر فرات اور دجلہ کا تو وہ بات کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ ایک رُخ اس خامی کا یہ ہے کہ سب لکیر کے فقیر بنے ہیں۔ جو لفظ بھی ہو کسی اُستاد کا اُدھار لیا ہونا چاہیے۔ جو طرزِ تحریر ہو

کسی اُستاد کی تمثیل کی بنیاد پر۔ بس اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم فطرت سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔ سحر جی نے انصافِ جہاں گیری کے اس واقعے کو نظم کیا تھا جس میں نور جہاں نے عجلت میں بجائے مچھلی کے ایک دھوبی کو اپنے طمنچے کا نشانہ بنایا۔ دھوبن کی فریاد پر جہاں گیر نے اپنا سینہ اس کے سامنے کھول دیا اور کہا کہ بیگم کی معقول سزا یہی ہے کہ تو مجھے طمنچے کا نشانہ بنا۔ تاکہ وہ بھی بیوہ ہوجائے۔ اپنی "تاریخ و تنقید ادبیاتِ اُردو" میں جناب حامد حسین قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے کتنے ہی نقائص اس نظم میں نکالے ہیں اور بنیاد نکتہ چینی کی وہی ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ اور جیسے میں لکیر کا فقیر ہونا کہتا ہوں۔ ہم نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ ہمیں یہاں سب کا جواب دینا منظور نہیں، صرف ایک نکتہ چینی کا جواب دینا ہے جس کا تعلق خاص طور سے فطرت سے ہے۔ سحر جی کا شعر ہے ؎

لیکن افسوس کہ چاہی ہوئی مچھلی کے بجائے ایک دھوبی پہ پڑا جاکے نشانے کا اثر

اعتراض یہ ہے کہ تاکی ہوئی کی جگہ چاہی ہوئی (یعنی جس کو نشانہ بنانا چاہا تھا) روزمرہ کے خلاف ہے۔ پروفیسر صاحب خود سحر جی کو "سن رسیدہ اور کہنہ مشق شاعر" تسلیم کرتے ہیں۔

چوں کہ اس "چاہی ہوئی" ترکیب کی میں نے سحر جی سے پہلے بڑی تعریف کی تھی اس وجہ سے سحر جی نے مجھے یہ تنقید دکھائی اور کہا کہ جسے تم بہت پسند کرتے تھے اور جس پر مفتون ہورہے تھے وہی ترکیب میری مذمت کا باعث ہوئی۔ مجھے تعجب ہوا اور خاص کر اس وجہ سے کہ میرے ہی کالج کے پروفیسر کے قلم سے یہ تنقید نکلی تھی۔ مجھے اس سنٹ جانس کالج کے اپنے تعلیم والے زمانے کا ایک اَدبی واقعہ یاد آگیا اور اس کی بنا پر میں نے سحر جی سے بھی عرض کیا تھا اور یہاں بھی لکھتا ہوں کہ پروفیسر صاحب نے مناظرہ کی فطرت کو محاورے پر قربان کردیا ہے اور یہ نہیں سمجھا کہ محاورہ بھی مشاہدۂ عام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن مشاہدۂ خاص میں باریک امتیاز بلا محاورہ روزمرہ سے انحراف کیے ہوئے منظوم نہیں ہوسکتا۔

میں ایم۔اے کلاس میں پڑھتا تھا۔ اور ریورنڈ ڈرنٹ صاحب جو بعد کو لاہور کے لارڈ بشپ ہوئے پروفیسر تھے اور علم ادب میں نہایت ہی قابل تھے۔ ورڈس ورتھ کی مشہور نظم "Daffodils" پڑھا رہے تھے اس میں پھولوں کی کثرت کا بیان کرتے ہوئے ایک جگہ .Crowd تحریر ہے اور کسی شارح نے اعتراض

کیا ہو کہ اس خوب صورتی کے منظر میں یہ "بے ترتیب جھنڈ" کا خیال ناموزوں ہو۔ مگر میرے دل نے گواہی دی کہ یہ تفسیر غلط ہو خیر۔ کالج میں بھی پروفیسر نے بھی اسی شارح کے خیالات کی بنا پر سخت تنقید کی اور جب میں نے کوئی احساس ظاہر نہ کیا تو جھنجھلائے کہ تم لوگ ادبی نزاکت کو نہیں سمجھتے۔ میں نے دبی زبان میں کہا کہ پروفیسر جی میں اس تنقید نگار سے متفق نہیں ہوں کیوں کہ اس نے فطرت کے مشاہدے اور دل کے جذبات کی باریکی کے پہلو کو بالائے طاق رکھ دیا ہو۔ اور صرف لفظی اُدھیڑبُن میں پڑگیا ہو۔ پروفیسر صاحب چونکے اور کہا کہ اپنا خیال اور وضاحت کے ساتھ بیان کرو۔ تب میں نے عرض کیا کہ رسکن نے یہ اصول قائم کیا ہو کہ جب کوئی بڑا شاعر ہمیں خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہو تو محاورے وغیرہ میں ایسی تبدیلی کردیتا ہو کہ ہم چونک جائیں۔ اور غور کرنے لگیں۔ بس جہاں غور کیا گیا، جذبات یا فطری مناظر کی باریکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور بڑا مزہ آتا ہو۔ مثلاً اس نے مثال دی ہو کہ ملٹن نے پیٹو پادریوں کے لیے ایک جگہ Blind mouths (اندھے منھ) لکھ دیا ہو۔ جب ہم چونکتے ہیں تو معلوم ہوتا ہو کہ ٹھیک لکھتا ہو کیوں کہ وہ علمیت میں اندھے ہیں تو رہبری کون کرے۔ مگر پیٹو تو ہیں ہی اور سب منھ میں رکھ لینا چاہتے ہیں، ورنہ کہیں منھ اندھا ہوسکتا ہو۔

ذرا غور فرمایئے کہ ایک شخص جو رنجیدہ ہو یا اس کا دل دُنیا سے اچاٹ ہورہا ہو۔ اسے عمدہ سے عمدہ باترتیب باغ بھی جس میں گلاب ہی گلاب لگے ہوئے ہوں، گلاب کے کانٹوں سے ہی بھرا دکھائی دے گا۔ تو پھر جھیل کے کنارے کے جنگلی ڈیفوڈل اگر اسے "بے ترتیب جھنڈ" معلوم ہوتے ہیں تو بات ہی کیا لیکن شاعر یہ دکھلانا چاہتا ہو کہ فطرت کی فتح بھی فوری ہی تھی کہ اس نے جھٹ سے Crowd کا لفظ بدل کر Host کا لفظ استعمال کردیا جس میں ترتیب کا خیال آگیا۔ اور جہاں ایک مرتبہ ادبیاتِ فطرت نے فتح پائی کہ اس کا دل خوش ہونے لگا۔ اور اخیر میں اسے وہ پھول ناچتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اتنا ہی نہیں، نظم کے آخر میں شاعر نے یہاں تک لکھا ہو کہ اس کے دماغ پر اس منظر کا یہ اثر ہو کہ یاد کرکے بعد میں بھی اس کا دل خوشی سے بھر جاتا ہو اور ڈیفوڈل پھولوں کے ساتھ ناچنے لگتا ہو۔

پروفیسر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور مجھے شاباشی دی اور کہا کہ تنقید کرنے والے مفسر ابھی

زندہ ہیں ۔ میں انھیں لکھوں گا ۔ اس فیاض طبیعت مفسّر نے بھی میری راے پسند کی ۔ اور وعدہ کیا کہ دوسرے ایڈیشن میں وہ اپنی راے بدل دیں گے ۔ یہ ہے فیاضانہ ادبی قدردانی ۔ اب اس نقطۂ نظر سے سحر جی کے شعر پر نظر ڈالیے ۔ انھوں نے "تاکی ہوئی" کے بجاے "چاہی ہوئی" کیوں لکھا ؟ میرا دل تو مشاہدے کی اس بارکی پر پھڑک اُٹھتا ہے ۔ ایک تو مچھلی پانی کے اوپر مرغابی کی طرح دیر تک تو تیرتی نہیں ذرا نکل کر پھر ڈوب جاتی ہے ۔ تاک کر نشانہ لگانے کا موقع ہی کہاں تھا ۔ پھر نورجہاں کی عجلت کا نقشہ بھی تو دکھلا دینا تھا کہ مچھلی کو چاہا اور جھٹ طمنچہ داغ دیا تاک کر نشانہ نہ لگایا ۔ اور بھی سوچیے ۔ نشانہ اگر تاک کر لگایا جاتا تو خطا کرنا مشکل ہی تھا ۔ اُدھر مچھلی کے غائب ہوجانے کا خوف اور یہ خواہش کہ وہ بل جاے ۔ اور اِدھر جذبات کی عجلت ۔ پس جلدی ہوگئی اور تعجیل کار شیاطین بود کا مقولہ سچ نکلا ۔ نورجہاں کے طمنچے کا شکار مچھلی نہ ہوئی بلکہ بے چارہ دھوبی ۔ آہ ! ہماری خواہش اور عجلت کتنی بڑی غلطی کرا دیتی ہے ۔ تبھی تو اسے شیطنت کہا جاتا ہے ۔ نزاکت پسند شاعر نے غضب کیا ہے ۔ نشانہ لگنے کے بجاے "پڑا جاکے نشانے کا اثر" لکھا ہے ۔ "جاکے" کے لفظ پر غور کیجیے ۔ کہاں سے کہاں پہنچا دیا ۔ کس کو ؟ نشانے کے اثر کو ۔ نشانہ چاہا تھا لگانا کدھر اور اس کا اثر جاکے پڑا کدھر ۔ پھر سحر جی نے نسیم کے طرز پر ایک مثنوی ہی لکھ ڈالی ہے تو ان کی شاعری پر اس طرز کا اثر ہونا ایک معمولی بات ہے ۔ "چاہی" اور "مچھلی" اور "دھوبی" کے تلازمے کا لطف اور ادھر "بجاے" اور "جاے" کے تلازمے کا لطف شعر کو عجب رنگت دے دیتا ہے اور وہ اَن مول ہوجاتا ہے ۔

یہی ناقدرشناسی تھی ، جس نے پریم چند اور سحر کو اُردو سے ہٹاکر ہندی کی طرف مائل کیا اور دونوں کی ہندی میں اچھی قدر ہوئی ۔ ہاں ۔ پریم چند زیادہ خوش نصیب تھے کہ اُردو نے بھی بالآخر کچھ ان کی قدر کی ۔ قصّہ مختصر سحر جی نے دونوں زبانوں میں کمال دکھایا ۔ وہ اپنے خودنوشت حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ "پریم چند آں جہانی نے متعدد قصّے اور کئی ناول ہندی سے اُردو میں ترجمہ کیے جو چھپ چکے ہیں ۔ چند ناولوں کے نام یہ ہیں ۔ رنگ بھوم ، کرم بھوم ، پریم آشرم ، گودان وغیرہ ۔ اسی طرح ہندستانی اکیڈمی یو۔پی الہ آباد نے بھی تلسی داس نامی ہندی کتاب مجھے اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے دی تھی ، ترجمہ بھیجے

ہوئے تو کئی سال ہوگئے مگر کتاب اب تک نہ چھپی۔"

کتنے ہی اُردو شاعروں پر ہندی میں مضمون لکھے اور اسی طرح ہندی کے مشاہیر پر اُردو میں مضمون لکھے۔ سعدیؔ کی کریما کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ اور عمر خیام کی ۴۴۴ رباعیات کا ہندی میں ترجمہ اس سج دھج سے انڈین پریس الہ آباد نے چھاپا ہے کہ باید و شاید ان کی بڑی نظموں کے متعلق کچھ زیادہ علاحدہ لکھنے کا ارادہ ہے اس وجہ سے اس جزو میں زیادہ عرض نہیں کیا جاتا۔

مثنوی سحر المعروف بہ شکنتلا

میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ یہ مثنوی مجھے بہت پسند رہی ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں اسے تلف ہونے سے بچاسکا ہوں اور اسی وجہ سے میں نے اس کی واضح تنقید بھی لکھی جو آگرہ کالج میگزین میں شائع ہوئی۔ تنقید سحر جی کو اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے وہ پرچہ بڑی حفاظت سے رکھا تھا۔ اور مجھ سے کہا تھا کہ اس میں چوں کہ سر تیج بہادر صاحب کے ایک اَدبی سوال کا جواب ہے اور مثنوی کی بہترین تنقید ہے اس وجہ سے اب تیسرے ایڈیشن میں میں اسے بہ طورِ خاص دیباچے کے ضرور شائع کروں گا۔ اور پہلے دیباچے کو اس کے بعد جگہ دوں گا۔ مجھے وہ پرچہ ان کے فرزند کیلاش ورما شائقؔ بی۔اے سے موصول ہوا ہے اور میں اسی تنقید کو لفظ بہ لفظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں کیوں کہ مرحوم کی بھی خواہش تھی کہ اس کی اشاعت ایک بڑے اَدبی دائرے میں ہو اور میری بھی استدعا مرحوم کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ جب تیسرے ایڈیشن کی نوبت آئے تو یہ تنقید اس میں ضرور جگہ پائے۔

" اقبال ورما سحر اُردو کے لیے مایۂ ناز ہیں۔ اگر ڈاکٹر اقبال نے تصوّف میں نئی روح پھونک دی ہے اور اسلام کے خاص جُز وحدانیت کو ولولہ انگیز زبان میں ادا کرکے اس میں جان سی ڈال دی ہے۔ اگر چکبستؔ نے انیسؔ اور دبیرؔ کی کام یاب تقلید کا حق ادا کرتے ہوئے مسدس کو حب الوطنی اور قوم پرستی کا جامہ پہنایا ہے تو ہمارے اس شاعر نے اُردو مثنوی کو نیا رنگ دیا ہے اور نسیمؔ کے شاعرانہ معجزے میں اپنی سحر بیانی سے ایک نیا افسوں پھونکا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو صاحب نے چکبستؔ مرحوم کے صبحِ وطن کے

دیباچے میں مثنویاتِ گلزارِ نسیم و میر حسن کی تعریف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر فرمایا ہو کہ آخر یہ مثنویاں ہمیں کہاں لے جاتی ہیں؟ شاعری کے ان ارکین کی تصنیفات دنیائے ادب میں ضرور ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔ مگر اس وقت کے خیالات محدود ہونے کا اثر یہ تھا کہ حُسن و عشق کی داستانیں لکھتے وقت اخلاقی صفائی اور روحانیت کے اعلیٰ مراتب کا خیال ان میں موجود نہیں ہو۔ تو کیا مثنوی کا طرز محض تغزّل اور شعریت تک ہی محدود کردیا جاسے یا بالکل ہی ترک کردیا جاسے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ دُنیا میں ایشیائی تہذیب اور شاعری کے برگزیدہ نمونے اسی صنف میں ہیں۔ سکندرنامہ، شاہ نامہ اور مثنوی مولانا روم اور تلسی داس کی رامائن شایقینِ ادب کو متحیّر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ہمارے سحرؔ صاحب نے بھی اپنی مثنوی دشینت و شکنتلا میں حضرت نسیمؔ کے طرزِ بیان کی تقلید کرتے ہوئے اس میں ایک خاص صفائی اور آمد پیدا کردی ہو اور ساتھ ہی اخلاق کی ایک ایسی چاشنی اس قصّۂ حسن و عشق میں بھردی ہو جو انھیں کا کام ہو۔ المختصر سرتیج بہادر صاحب کے سوال کا جواب اسی مثنوی میں موجود ہو۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ مناظرۂ چکبستؔ و شررؔ کے سلسلے میں حضرت شوقؔ جیسے بلند پایہ شاعر نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہو کہ نسیمؔ کی تقلید کوئی آسان کام نہیں ہو تو سحرؔ صاحب کی کامیابی ضرور قابلِ مبارک باد ہو۔

سحرؔ صاحب میرے خاص دوست اور ہم سبق ہیں۔ اور مجھے اس بات کا فخر حاصل ہو کہ میرے دوستوں میں سے اُردو میں سحرؔ صاحب اور برج بھاشا میں پنڈت ست نراین مرحوم اس قدر بلند پایے پر پہنچے۔ مجھے فخر ہو کہ میرے مذاقِ سخن کے سبب سے میرے دوستانہ اظہارِ خیالات کو یہ ہر دو اصحاب بڑی خوشی سے قبول کرتے رہے ہیں۔ گویا اس طرح ان اصحاب کی خدمات کا اور ان کے ذریعہ دنیائے ادب کی خدمت کا مجھے بھی موقع ملتا رہا ہو۔ میں نے اپنے ایک دوست کی کسی نظم پر کوئی تنقید اس وجہ سے نہیں لکھی تھی کہ مبادا لوگ کہ اٹھیں "کس نہ گوید کہ دوغ من ترش است" مگر آج دُنیائے ادب ان کے کلام کی داد دے رہی ہو۔ چکبستؔ صاحب نے مثنوی کے تعلق سے فرمایا تھا "نظم خوب ہو اور انشاءاللہ مقبول ہوگی" منشی دیانراین نگم ایڈیٹر زمانہ نے تو مثنوی کا دیباچہ کیا لکھا ہو عروسِ نظم کے بناؤ سنگار کا پورا سامان مہیا کردیا ہو۔ منشی پریم چند مادھری میں تنقید کرتے ہوئے اس مثنوی کو تصنّع اور آورد سے پاک تبلاتے

ہیں ۔ اور حضرت نیاز فتح پوری نے بھی جنوری ۱۹۳۸ء کے نگار میں شاعر کی کام یابی کی داد دی ہے۔ لیکن کے الفاظ بھی کچھ اس مفہوم کے تھے " شاعر کی غیر معمولی کام یابی سے کوئی انکار نہیں کرسکتا " (پہلے ایڈیشن کے تبصرے میں) ۔ منشی تلوک چند محروم نے ایک بڑی تقریظ منظوم لکھی ہے جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

دکھلائے ہیں لطف فن سے تو نے | کیا حسنِ کلام کے نمونے
اور رنگِ سخن یہ مثنوی ہے | یہ حسنِ بیاں یہ شاعری ہے
آمد کے بہاو پر رواں ہے | دریائے لطافتِ بیاں ہے
یہ نظم وہ ہے کہ جس کو سن کر | ہو روحِ نسیم شاد یکسر

منشی مہراج بہادر برق دہلوی بھی فرماتے ہیں ؎

جادو ہے ترے سخن سخن میں | ساحر ہے تو شاعری کے فن میں
دشینت و شکنتلا کا قصہ | ہے زورِ قلم کا تیرے حصہ
اُردو میں یہ جدّتِ سخن ہے | شیشہ ہے نیا مئے کہن ہے
گل زارِ نسیم کی روش پر | گل کاریاں تو نے کی ہیں یکسر
یہ شاخِ قلم کی گل فشانی | ہے زینتِ گلشنِ معانی
اے برق یہ داستانِ رنگیں | ہے لائقِ آفرین و تحسیں

میری سمجھ میں اور زیادہ سندات کی ضرورت نہیں ہے ۔ ناظرین خود پڑھیں اور دیکھیں ۔ شاعر نے ہندستان کی پاک تہذیب کے اثر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔ ان کے مشاہدے ، ان کے مکالمے سب خاص ہندستان کے ہیں ۔ قصہ کالی داس سے لیا گیا ہے ۔ مگر اسلوب اور " طرزِ بیان " کل شاعر کا اپنا ہے ۔

میں اپنے تلسی کرت رامائن کے مضامین کے سلسلے میں اکثر لکھ چکا ہوں کہ زمانۂ شاعری کے اسی معیار سے کہ " شاعری صرف قدرت کی آئینہ دار ہے " اکتا گیا ہے ۔ اس معیار نے اتنا ضرور کیا کہ تصنع اور خیالی اُڑان کو کم کر دیا مگر پھر بھی صرف " تصویرِ حال " پیش کر دینے سے ہم کو کوئی ہدایت نہیں ملتی ۔

کون نہیں جانتا کہ موجودہ زمانے کے اس قسم کے ناولوں اور ناٹکوں سے بُرا دل اور بھی بُرا بن جاتا ہے۔ البتہ بھلے لوگ اس سے حسبِ خواہش نتیجہ اخذ کرلیا کرتے ہیں۔ سعدی نے فرمایا ہے کہ جب کسی بُرے آدمی کو کوئی کام کرتے دیکھو تو یہ نصیحت حاصل کرو کہ تم ایسا نہ کروگے۔ مگر لُطف تو جب ہے کہ نہ نظمِ کی طرح روکھی سوکھی شاعری ہو کہ جہاں مذاق اور تغزّل کا نام نہیں اور نہ "گُل کھلاتی گئیں گل بھڑے اُڑانے آئیں" والی تغزّل کی بھرمار کہ پڑھنے والا اخلاقی مایوسی میں پکار اُٹھے ؎

" درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای ۔۔۔ بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش "

یہ کمال گو اس حد تک نہ سہی جیسا رامائن کے قادرالکلام شاعر تلسی داس کو حاصل ہوا تھا۔ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک سحرؔ صاحب کو بھی یقیناً نصیب ہوا ہے۔ مثنوی میں ابتدا سے انتہا تک ایک عجیب اخلاقی اور روحانی چاشنی موجود ہے۔ دیکھیے نہ۔ پہلے ہی باب میں جنگل کی خوب صورتی کی تعریف میں شاعر کہتا ہے ؎

صحرا رنگینیوں سے معمور ۔۔۔ تھا مظہرِ شانِ حُسن مستور
پھولوں میں نمود جلوۂ حُسن ۔۔۔ کلیوں میں وجود عقدۂ حُسن
اک دفترِ رازِ برگِ تر تھا ۔۔۔ تفسیرِ نکات ہر شجر تھا
دریا امواج کی زبانی ۔۔۔ کہتا تھا فسانۂ نہانی
پانی میں حباب کی وہ مستی ۔۔۔ دِکھلا رہی تھی فریبِ ہستی
لاتی تھی صبا ہوائے جنّت ۔۔۔ تھی پیشِ نظر فضائے جنّت

حسنِ آشکار و حُسنِ مستور کا ایک میل ہے! آہ، گویا کل حصّہ ہی پانی میں "حباب کی مستی" کا نقشہ کھینچ کر "فریبِ ہستی" کا نمونہ پیشِ نظر کررہا ہے۔ مگر بہ قول شاعر یہ حباب و رنگینیاں ہی "حسنِ مستور" کا ہی مظہر تھیں۔ "حباب کی مستی" اسی بحرِ "حسنِ مستور" سے نکلی اور پھر اسی میں غائب ہوگئی۔ اب ذرا آگے چل کر دیکھیے۔ مینکا وشوامتر کے پاس پہنچتی ہے ؎

بے پردہ تھا نورِ حسنِ دل کش ۔۔۔ ظاہر تھا سرورِ حسنِ دل کش
شوخیٔ خرام کا یہ تھا حال ۔۔۔ فتنہ تھا قدم قدم پہ پامال

تھا لب پہ جو حُسن و عشق کا راگ تاثیر میں تھی بھری ہوئی لاگ
خاموش طیورِ خوش نوا تھے مدہوش صدائے نغمہ زا تھے
تھا رقصِ پری بھی یوں نمودار تھے وجد میں جھومتے کُل اشجار

اُف کیا غضب ہے۔ "کُل" کا لفظ اثر کے تکمیل کا ایک نمونہ ہے۔ بھائی جب یہ اثر ہے تو بے چارے وشوامتر کا یہ حال تو واقعی قابلِ معافی ہے۔ اور مایا کی تسخیر کا ایک معمولی نمونہ ہے ؎

دِل گھر تھا خدا کا اب ہوا دیر کعبے کی صنم نے آکے کی سیر
ہرچند وہ تھا صراطِ رم پر رُکتا تھا مگر قدم قدم پر
"مانیں گے تو عشق میں نکل کر" ارمان نے کہا مچل مچل کر

آہ۔ انسان! تو کیا بھاگ سکتا ہے؟ جذبۂ قدرت تو تیرے ساتھ ہی ہے جو ارمان کی شکل میں کسی پُرزور لہجے میں کہتا ہے "مانیں گے تو عشق میں نکل کر"۔ عابد بعد میں تاسف سے بے قرار ہوجاتا ہے اور کہتا ہے ؎

"تقوے کا مٹا نشاں صد افسوس! محنت ہوئی رائگاں صد افسوس!"
یہ کہہ کے وہ زار زار رویا بس پھوٹ کے ابروار رویا

فطرتِ مینکا کی شکل میں اس تاسف پر مسکراتی ہے! تضاد کس قدر پُرلطف اور معنی خیز ہے ؎

دیکھی جو پری نے کج ادائی کچھ فتح پر اپنی مسکرائی

معصوم شکنتلا جس طرح جنگل میں پڑی ہوئی ہے اس کی تصویر حسبِ ذیل ہے ؎

بلوے سے ہے گرد وحشتِ تنویر آئنہ میں حُسن کی ہے تصویر
اک ہنس ہے سر پہ سایہ افگن شعلہ سا نہاں ہے زیرِ دامن
خوبی کی ہے اِک نرالی صورت پیاری سی ہے بھولی بھالی صورت

کیا دِل آویز نقشہ ہے۔ زہد اور تصوف کے ابرِ نیساں سے فطرت نے مینکا کی شکل میں گویا صدف بن کر یہ دُرِ یکتا پیدا کیا! شکنتلا، کون؟ صرف ناٹک کی معشوقہ نہیں، بلکہ مہراج بھرت کی ماں۔ کورو، پانڈو جن کے کارنامے (مع مہراج یدھشٹر کے دھرم والے خیالات کے) مہابھارت کے اوراق اب بھی

نہایت عزت کے ساتھ بیان کرتے ہیں انھی کی اولاد میں سے ہیں ۔

میں تو یہ کہوں گا کہ اس آئینے میں صرف "حسن" ظاہری کی تصویر نہ تھی بلکہ "حسنِ مستور" کی جھلک بھی تھی سے

کارِ لیلیٰ نیست ایں کارِ من است حُسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است

ہنس کا سایہ ایک طرف تو اس بھولی بھالی صورت کے لیے ایک ظاہری بےساختہ کشش کا نمونہ ہی اور دوسری طرف گویا قدرت زبانِ حال سے کہہ رہی ہی کہ اس انوکھی شخصیت کی حفاظت کی ذمے دار خود قدرت ہی ۔ ہر سہ اشعارِ بالا کی تشبیہات کی لطافت اور نفاست بیان سے باہر ہی ۔ حُسن ہی مگر ابھی بھولا بھالا۔ شعلہ ہی مگر زیرِ دامن ۔

اس طرح جب دشینت کج ادائی کرتا ہی اور کنو رشی کے بھیجے ہوئے چیلے بھی شکنتلا کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ، وہ بےکسی کی حالت میں آہ و فغاں کرتی ہوئی کہتی ہی سے

"اے عشق بتا کدھر رواں ہوں ؟ آوارہ ہوں اور خستہ جاں ہوں "

یوں سوچ میں وہ کھڑی تھی ناچار ناگاہ ہوئی مینکا نمودار

ہالے میں لیا قمر کو آکے فردوس کو لے چلی اُڑا کے

دیکھیے اس فطرت نے پھر تحفظ کا انتظام کیا اور جس روحانیت کے بحرِ فردوس سے وہ قطرہ اس دنیا میں خدا کی ابرِ رحمت سے آیا تھا وہیں واپس جارہا ہی ۔ ہالے اور قمر کی تشبیہ بھی کتنی نفیس ہی ۔

ناظرین ۔ اس روش سے تو ہر شعر پر کچھ نہ کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہی مگر اس مضمون کے لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہی کہ جا بجا سے چند اشعار لے کر "مشتے نمونہ از خروارے" کے مطابق درج کردوں ، اور بس ۔

دوسرا باب مثنوی میں حُسن و عشق کی شاعری اور دِل کش مصوری کا ایک افسوں ہی ۔ دیکھیے نہ شکنتلا کا سراپا کس قدر قابلِ داد ہی سے

خوبی کا مجسمہ وہ سر تھا یا حُسن کی شاخ کا ثمر تھا

پھولوں سے بسے تھے بال سارے تھے چرخ پہ جلوہ گر ستارے

(آہ، مگر ان میں یہ خوش بُو کہاں ؟)

تھی آئینۂ جبیں کی تنویر دکھلا رہی عکسِ حسنِ تقدیر

تھا آنکھوں و پتلیوں سے جلوا کونین کے رنگِ مختلف کا

پلکیں تھیں کہ نصف چاند تھے دو قوسین کہوں میں ابرووں کو

رخساروں میں کچھ عجب سماں تھا سعدین کا باہمی قراں تھا

بینی میں ہلال کا تماشا تھا طرفہ جمال کا تماشا

یہ تصویر کا ساکت حصّہ تھا۔ اب ذرا حرکت کا لُطف دیکھیے ؎

تھے محوِ خرام پاے گُل فام اک حشر بپا تھا جس سے ہر گام

دو ساتھ سہیلیاں تھیں گل فام انسوئیا اور پریمبدا نام

(شاعر نے قصّے کی وطنیت کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ ناموں کا تلفّظ بھی نہیں بگاڑا۔ یہ نہیں کہ ہے جو رِندر کو اِندر لکھتے۔ دونوں سکھیوں کے ناموں کے ٹھیک تلفّظ کا قائم رکھنا بھی قابلِ تحسین ہے)

؎ احساس نزاکتِ بدن تھا سادہ سا لباس زیبِ تن تھا

(پہلے میرے دوست نے "ہلکا سا" لکھا تھا جو نزاکتِ بدن کے لیے خوب موزوں تھا۔ پھر "سادہ سا لباس" کردیا جو اپنے بے تصنّع سادگی سے نزاکتِ بدن کو کچھ ابھار ہی رہا ہے اور "زیبِ تن" کے ساتھ عجیب تضاد کا لُطف دے رہا ہے۔) ؎

تھا گُل بدنی کا پاس یک سر جسموں پہ گُلوں ہی کا تھا زیور

گو وضع میں سادگی کا تھا ڈھنگ پھوٹا پڑتا تھا حُسنِ خوش رنگ (وہ بھی ساکت نہ رہ سکا)

عالم تھا شباب و دل لگی کا تھا دَور عجب ہنسی خوشی کا

بھر بھر کے گھڑے وہ کھینچتی تھیں ہر شاخ و شجر کو سینچتی تھیں

وہ عارضِ سُرخ پر عرق سے　　بارش کا نظارہ تھا شفق سے

اُڑ اُڑ کے وہ آنچلوں کا پھنسنا　　منھ پھیر کے شرم سے وہ ہنسنا

دکیسی جیتی جاگتی تصویر ہو کیا تصویری کیفیت ہو) ؎

اِک اِک کا مذاق کی وہ لینا　　اِک اِک کا غضب وہ چھینٹے دینا!

جب دشینت و شکنتلا یکجا ہوتے ہیں تو شاعر مساوات اور تضاد کے دو نقشے پیش کرتا ہو جو قابلِ دید ہیں ؎

مساوات

دونوں میں غضب کا بانک پن تھا　　دونوں میں تناسبِ بدن تھا

دونوں تھے فروغِ مہرِ خوبی　　دونوں تھے مہِ سپہرِ خوبی

تصویرِ مثالِ حُسن دونوں　　تنویرِ جمالِ حسن دونوں

اب تضاد دیکھیے اور عشق کے اثر سے دونوں کا فرق ملاحظہ کیجیے۔ دشینت شکارِ عشق ہو چکا ہو اور یہی باعثِ فرق ہو ؎

تھا عشق سے اب مگر یہ عالم　　مہتاب سے نورِ مہر تھا کم

شوخی سے وہاں نہ تھی اسے کل　　بے تابی سے تھا یہاں یہ بے کل

(تضاد میں مساوات کا نباہنا شاعر کے کمال کی ایک مثال ہو)

واں پرتوِ نور سے پُرنیا چاند　　یاں سایۂ مہ سے مہر تھا ماند

(یہ شعر کیا ہو شاعری کا ایک معجزہ ہو۔ حضرت نسیم بھی ضرور اپنے مقلد کی بہشت سے داد دیتے ہوں گے)

خنداں تھی وہاں وہ صورتِ گل　　نالاں تھا یہاں یہ مثلِ بلبل

وصالِ یار کا بہانہ بھی عجیب دل کش ہو ؎

اُڑ کر ناگاہ ایک بھونرا　　چہرے پہ شکنتلا کے پہنچا (گویا کنول کا دھوکا ہوا)

بھاگی وہ۔ اُدھر سے ہٹ گئی پھر جھجکی۔ ٹھٹکی۔ سمٹ گئی پھر

ہاتھوں کو پٹک پٹک اُڑایا آنچل کو جھٹک جھٹک اڑایا

آخر چلائی ڈر کے مجبور "سکھیو، دوڑو اسے کرو دور"

"پھر ہائے وہ دیکھو آرہا ہی ناحق یہ مجھے ستا رہا ہی"

(کتنے جذبات اور حرکتیں نظم کی گئی ہیں؟ بھولاپن، خوف، نزاکت، بےکسی سب کا ایک مجسم مرقع ہی) سکھیاں مذاق کرتی ہیں اور کہتی ہیں مظلوم کا فریاد رس تو دشینت ہی، وہیں تیری فریاد سُنی جاسکتی ہی۔ یہ سنتے ہی دشینت کو ایک بہانہ ملتا ہی ؎

پہنچا وہیں جو تھی جاے امید اک برج میں آئے ماہ و خورشید

"قاطع ہوا کون آشتی کا؟" "دعویٰ ہوا کس کو سرکشی کا؟"

(آخری شعر میں دبدبۂ شاہانہ کی عجیب پُرلطف شان ہی)

اس کے بعد گندھرپ کی رسم کے موافق شادی وغیرہ کے نقشے ہیں۔ ناظرین۔ گندھرپ شادی کشتری ورن میں جائز ضرور تھی مگر یہ اصولِ شادی کہ ایک مرتبہ شادی ہونے پر وفاے صادق ہمیشہ قائم رکھنا ضروری اور لازمی ہو اس رسم شادی کے ساتھ بھی وابستہ تھا یہ ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ اب ہجر کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔

شکنتلا خیالِ یار سے گفتگو کرتی ہی۔ کیا نفیس تخیل ہی ؎

کہتی تھی کہ "ای خیالِ دِل دار پرتو فگنِ جمالِ دِل دار"

"تصویر کا عکس سے ہو کیا کام؟ کیا نقل سے اصل کا بھلا کام؟"

"ہی خیر اسی میں تو بھی جا جا! جلد اب مجھے چھوڑ کر چلا جا!"

"کچھ لائے نہ رنگ ساتھ تیرا ہو سُرخ نہ خوں سے ہاتھ میرا"

"پچھتائے گا ہوگا تو پشیماں کردوں گی میں تجھ پہ جان قرباں"

(مومن کے اس شعر پر کہ ؎ "تم مرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا" غالب

نہایت مفتون تھے، کون جانے کہ ان اشعار پر اس سے کس قدر زیادہ داد کے مستحق حضرت سحر ہیں) ؎

کہتی تھی کہ " ای بہارِ قدرت!   ای ہوش ربا نگارِ قدرت!"

"ہو جب کہ کشش تری ادا میں   کھینچا اسے کیوں نہ پھر فضا میں!"

"نرگس کی پھری تھی چشمِ بدخو   روکا نہ اُسے چلا نہ جادو"

"سوسن، تو ہی خوش بیان ہوتی   گویا منھ میں زبان ہوتی!"

"سیدھا نہ تھا حیف تو بھی شمشاد!   کچھ آئی نہ روک تھام کی یاد"

"سبزے پہ بھی نیند کا رہا بار   پکڑے نہ لپٹ کے پاے دل دار"

حضرت نسیم کے اشعارِ ذیل سے ان کا موازنہ کیجیے۔ اور شاعر کی کام یابی کی داد دیجیے ؎

ای خار پڑا نہ تیرا چنگل   مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

سنبل میرا تازیانہ لانا   شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

سوسن نے زباں درازیاں کیں   نرگس نے نگاہ بازیاں کیں

کنو رشی شادی کی خبر سے نہایت خوش ہوتے ہیں اور کس پدری محبت سے شکنتلا کو رخصت کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

سوچا کہ ہو گُل چمن کو موزوں   شوہر ہی کا گھر ہو زن کو موزوں

کرنا طاعت نثار ہوکر   رہنا خدمت گزار ہوکر

اکسیر ہو خاکِ پاے شوہر   ہو حق کی رضا رضاے شوہر

ہندو معیارِ زوجیت کی روح ان اشعار میں عجیب اختصار مگر اثر کے ساتھ بھری ہوئی ہو۔ یہی ہو روح ساوتری جس کا قائم رکھنا بہ قول شری متی سروجنی نائڈو جی کے ہر ہندو عورت کا فرض ہو۔ چاہے وہ کسی جھونپڑے میں بیٹھی ہوئی ہو۔ یا طلائی تخت پر مسند گزیں ہو۔ ساتھ ہی ساتھ گُل اور چمن کا استعارہ اپنے شاعرانہ طرز میں نہایت دل آویز ہو۔ یہ تو ایک پہلو ہو جس میں پدری محبت پاک محبت پر مفتون نظر آتی ہو۔ مگر جیوں ہی پاکیزگی میں اشتباہ ہوتا ہو تو رشی کیا اس کے چیلے جو شکنتلا کی حفاظت کے لیے بھیجے گئے

تھے وہ بھی نفرت کے ساتھ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

بولے وہ کہ "اے کثیف دامن! کس منہ سے چلے گی اب تو تپوبن (تضاد کس قدر دل دوز ہے)

چھوڑا راجا نے ہاتھ تیرا بہتر نہیں اب تو ساتھ تیرا

یہ کہ کے چلے وہ، منہ کو موڑا پیچھے اسے نقشِ پا سا چھوڑا

ایک طرف گندھرپ بیاہ کی آزادی اور دوسری طرف سختی کے ساتھ پاک دامانی کا تحفظ ہندو معیارِ زوجیت کے دو خاص پہلو ہیں۔ ہمارے یہاں آزادی کا مقصد بے قید و بے لگام آزادی کبھی نہیں رہا اور نہ ہونا چاہیے رشی دُرباسا کی بددُعائی وجہ سے راجا نے ہاتھ چھوڑا تھا۔ اوّل تو بے چارا کل ماجرائے عشق بھول ہی گیا تھا کچھ غصہ کچھ رحم، مگر پاس اخلاق کی کشمکش میں راجا دشینت نے شکنتلا کو یوں جواب دیا ؎

راجا نے کہا "دکھا نہ گھاتیں خاموش ہو بس بنا نہ باتیں

بدنام نہ نیک راہ کو کر ماخوذ نہ بے گناہ کو کر

حیلے سے چلی ہو لینے مجھ کو آئی ہو فریب دینے مجھ کو (کیا لین دین ہے!)

خود رفتہ نہیں کہ بھول جاؤں کچھ یاد ہو تو زباں پہ لاؤں

جب رشتہ نہیں بیاہ کیسا؟ بیگانے سے میل و بیاہ کیسا؟

ہرچند ہو پاسِ مقصدِ خیر ممنوع ہو صحبتِ زنِ غیر"

مہاراج بشوامتر راج رشی تھے۔ راجپوت عورت کو یہ اتہام تڑپا دینے کے لیے کافی تھا۔ کچھ بے کسی کی جھنجھلاہٹ بھی تھی۔ اس کا جواب کیسی خودداری سے بھرا ہوا ہے ؎

"خود ہو کے ذلیل اے بد انجام کرتا ہے مجھے ذلیل و بدنام"

"اب آن پہ تو نہیں ہے قائم ایمان پہ تو نہیں ہے قائم"

"بھولا رہِ معدلت پناہی یعنی آئینِ بادشاہی"

"یوں عاملِ فرض جب نہیں تو بس راج کے قابل اب نہیں تو"

"ہے دادرسی کی طرفہ ایجاد فریاد سے مجھ پہ ہے یہ بے داد"

مگر مایوسی و انسانیت اور فرضِ زوجیت کے احساس سے متاثر ہوکر راضی بہ رضائے حق ہوتے ہوئے پھر یوں کہتی ہے ؎

"اچھا قسمت کا جو لکھا ہو　　راضی ہوں اسی میں جو رضا ہو!"
"امید سے آئی شاد ہوکر　　اب جاتی ہوں نامراد ہوکر"
"یاد آئے گی میری جب کسی دن　　پچھتائے گا سوچ کر کسی دن"
"محروم ہوں اپنے ہم بغل سے　　رشتہ جوڑوں گی اب اجل سے"

ایڈورڈ کارپنٹر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ معیارِ انسانیت یہ نہیں ہو کہ ساری فطرت سے الگ ہوکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی عمارت علاحدہ بنائیں۔ بلکہ انسانی تمدن کی ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ فطرت کی رُوح سے اس کے پہاڑ، دریا، سمندر، ستارے، آب وہوا کی زندگی سے یگانگت ہوجائے یعنی یہ لطف ہو ع "تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری" قادرالکلام شاعر نے ان حبابوں کی "مستی" کے فسانے میں دریا کی لہر اور امواج کی رُوح سے ان کو کبھی علاحدہ نہیں ہونے دیا اور شکنتلا کی زندگی کی ترتیب تو ایسی ہو کہ معلوم ہوتا ہو گویا فطرت کا ایک گل کھل کر چل پڑا ہو۔ بھونرے کا دھوکا تو آپ نے دیکھا ہی ہو پھر جنگل سے رخصت ہونے کا منظر اس یگانگت کی ایک انوکھی مثال ہو۔

پہلے سکھیوں سے مخاطبہ کرکے کہتی ہو ؎

پھر کہنے لگی یہ بے تامل　　"تارے مری آنکھ کے ہیں یہ گل"
"یوں لطف سے شادکام رکھنا　　شاداب انھیں مدام رکھنا"

پھر ؎

دیوار سے در سے مل کے روئی　　ایک ایک شجر سے مل کے روئی
رو رو کے کہا کہ "اے گلِ باغ　　ہیں یاد کو تیرے دل کے بس داغ"

("بس" کا لفظ کیا ہو افسوں ہو!)

"پھولے گا مدام تو اثر سے　　سینچے جاتی ہوں اشک تر سے!"

"اے آہوئے دشت ہو اجازت اب اپنی سکھی کو دو اجازت" (سکھی کا لفظ ایک جادو ہے)
"اے جملہ طیور نغمہ خواں ہائے اٹھتا ہے اب اپنا آشیاں ہائے" (کیا تلازمہ ہے)
"تفریح فضائے دشت رخصت تردیح ہوائے دشت، رخصت"

مضمون طول پکڑتا جاتا ہے اور دل اقتباسات سے سیر ہی نہیں ہوتا اس لیے جبراً اپنے آپ کو روک کر آپ سے بھی استدعا کرتا ہوں کہ فطرت اور اس کے اندر کی پاک روح (جس کو صوفی اور ویدانتی پرماتما کہتے ہیں) کے آغوش میں اپنی زندگی کی ترتیب دیں تاکہ بہ قول ٹیگور جی "شہری دیواروں کا طرزِ معاشرت ضرورت سے زیادہ آپ کو قدرت کی یگانگت سے جدا نہ کردے۔"

صرف دو تنقیدوں کے اقتباس یہاں اضافہ کیے جاتے ہیں۔

رسالہ اردو حیدرآباد دکن بابت جنوری سنہ ۱۹۲۷ع :-

"اس میں شک نہیں کہ حضرتِ سحر بہت پختہ کار شاعر ہیں اور فنِ شعر پر قدرت حاصل ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے گل زارِ نسیم کا پورا تتبع کیا ہے۔ اور اس اعجاز اور اختصار سے کام لیا ہے کہ باوجود اس کے نہ کہیں تعقید ہے اور نہ زبان کے روزمرہ اور محاورے سے ہی الگ ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں غزلیں بھی آگئی ہیں جن سے حضرتِ سحر کی خوش گوئی اور پختہ کلامی کا پتا لگتا ہے......"

حضرت اعظمی (احسن سبھی صاحب مرحوم) اپنی تنقید مثنوی سحر جو زمانہ سنہ ۱۹۳۱ع میں شائع ہوئی ہے تحریر فرماتے ہیں :-

"جادو وہی ہے جس کو آج سے ہزاروں برس پہلے کالی داس نے جگایا تھا لیکن جناب سحر نے اسے اپنی جادو بیانی سے اعجاز کا ہم پایہ بنادیا ہے..... سچ پوچھیے تو یہ مثنوی ہر حیثیت سے مثنوی گل زارِ نسیم کا جواب ہے وہی فصاحت، وہی لطافت، وہی جلوۂ اعجاز۔ اس میں تمام خوبیاں موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ نقشِ اوّل ہے اور یہ نقشِ ثانی۔ اب یہ فیصلہ ناظرین کے ذوقِ ادب پر منحصر ہے کہ زیادہ لطافت نقشِ اوّل میں ہے یا نقشِ ثانی میں....."

وہ یہ دو گفتگو میں تو اعظمی صاحب نے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تنقید بہت قلم روک کر لکھی ہے ورنہ

مجھے تو خود نقشِ ثانی زیادہ پسند ہے۔ اور کچھ ویسے ہی وجوہات تھے جیسے کہ رسالہ اُردو کے اقتباس میں اوپر آ چکے ہیں۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ شوق قدوائی میرے اُستاد ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اکثر آپ ان سے بھی بازی مار لے گئے ہیں گو اخلاقاً میں نے اپنے اُستاد سے موازنہ کرنا شائع شدہ تنقید میں مناسب نہیں سمجھا۔

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے صوبے میں ایسی مثنوی کو کسی بھی درس گاہ کے کورس میں جگہ نہ ملے اور نہ کسی کتاب میں ہی اس کا اقتباس نظر آئے۔

کریما اور رباعیاتِ عمر خیام

کریما سماجی خیالات کا ان کی زندگی کی تنظیم پر اثر ہم دیکھ چکے ہیں۔ اسی لیے کریما یا سعدی کے سب ہی کلام کو وہ بہت پسند کرتے تھے چناں چہ جب فارسی نظموں کے ہندی میں ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا تو پہلے ہی ان کی نظر کریما پر گئی جسے انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ ترجمہ کیا۔ وہی سادگی اور قریب قریب ویسی ہی روانی قائم رکھی ہے۔ اور جہاں تک ہوسکا ہے خیالات کا زور بھی وہی ہے۔ ......

پھر بھی ان کا کمال رباعیاتِ عمر خیام کے ترجمے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ دنیا کے ادب میں عمر خیام کے ترجمے بہت ہوئے ہیں۔ انگریزی کا فٹز جرالڈ کا ترجمہ تو اس قدر مقبولِ عام ہوا کہ اس نے انگریزی زبان میں ایک نیا طرزِ شاعری ہی پیدا کردیا لیکن یہ معجزہ کسی سے نہ ہوا کہ چار مصرعوں کا ترجمہ چار ہی مصرعوں میں ہو اور وہی لطافت وہی فصاحت اور وہی زور قائم رہے۔ کہیں کہیں تو استعارات وغیرہ بھی بالکل وہی ہیں خاص کر جہاں ہندی میں قافیے بندھ گئے ہیں وہاں تو وہ بات پیدا ہوگئی ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

مہراج رُوپ کلاجی کہا کرتے تھے کہ ہمیں چیونٹی کی طرح وہ قوتِ امتیازی پیدا کرنا چاہیے کہ ہم جذبات کے مد و جزر سے اس طرح رُوحانیت کو نکال لیں جیسے بالو کے ساتھ ملی ہوئی شکر کے باریک سے باریک ریزے کو چیونٹی نکال لیتی ہے۔ مگر یہ کام مشکل ہے۔ سحر جی جیسے ماہر ہی کرسکتے ہیں۔ اور اس لیے ان کا خاص ادبی کارنامہ رباعیاتِ عمر خیام کا صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ہے کہ علاحدہ عنوان

کرکے انھوں نے زمین والی رباعیات کو آسمان والی رباعیات سے علاحدہ کردیا ہے۔ دُنیا ہر شعر میں جس میں شراب کا ذکر ہو روحانیت کی شراب تلاش کرتی ہے مگر سحر جی نے صاف لکھ دیا ہے کہ ایسا مناسب نہیں ہے۔ نمونے کے طور پر چند رباعیات سحر جی نے دیباچے میں ہی دے دی ہیں۔ اور کہا ہے کہ یہاں سوائے شراب کے اور کوئی مطلب لیا ہی نہیں جاسکتا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ حافظ اور مولانا روم کے کلام کو جو مقبولیت تصوف میں حاصل ہے وہ خیام کے کلام کو کیوں نہ ہوئی؟۔ خیام کی رباعیات میں شاعری کا معجزہ سہی، مگر تصوف کے لحاظ سے ان کا وہ پایہ ہرگز نہیں جو حافظ کی غزلیات کا ہے۔ بات یہی ہے کہ مولانا روم کا کلام تو بالکل صاف تصوف ہے اور حافظ کے کلام میں شکر کے ساتھ بالو کی آمیزش کم ہے مگر خیام میں آمیزش کا وہ حال ہے کہ سحر جی کے ایسے لوگ ہی وہاں شکر کو بالو سے علاحدہ کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خیام کے کلام میں صاف بیانی ہے ہی نہیں، لیکن اکثر اشتباہ کی گنجایش پائی جاتی ہے۔

تشطیر

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

[اُردو نظم میں تضمین اور تخمیس کا رواج مدت سے چلا آتا ہی لیکن «تشطیر» کے معنی ہیں نیمہ رُباعی۔ یعنی آدھا لے اُڑنا۔ ادد شاعری میں یہ ایک قسم کی تضمین ہی جس میں شعر کے پہلے مصرع پر دوسرا، اور دوسرے مصرع پر پہلا مصرع اپنی طرف سے لگاکر اُسے دوبیتی بنادیتے ہیں۔ اُردو کے لائق اور ہونہار شاعر جناب محمود اسرائیلی صاحب نے اسی نئی طرز میں طبع آزمائی شروع کی ہی جس کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہی۔ اسرائیلی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں:-

«آپ کو یہ سُن کر مسرت ہوگی کہ خاکسار اصناف سخن میں تشطیر کا اضافہ کررہا ہی۔ تشطیر عربی شعرا میں مقبول ہی۔ مگر ابھی تک اُردو اور فارسی شاعروں کے کلام میں اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔ میں نے ابتداءً میر تقی اور غالب وغیرہ کی چند غزلیات کو مشطر کیا تھا۔ اب افادیت کے خیال سے علامہ اقبال مرحوم کے اُردو کلام کے بعض پُرلطف اشعار اور ان کی مسلسل نظموں کو مشطر کرنا شروع کردیا ہی۔ چند تشطیریں بطورِ نمونہ ارسالِ خدمت ہیں سوچتا ہوں کہ (آیندہ) انھیں کتابی صورت میں شائع کرادوں تاکہ ان کے بلند پایہ اشعار کی وضاحت سے عوام کو فائدہ پہنچے اور اُردو کے موجودہ شعرا کو تشطیر نویسی کا شوق پیدا ہو اور یہ صنفِ لطیف اُردو شاعری میں داخل ہوجائے»

ادارہ]

لالۂ صحرائی

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی ... یہ آبلہ پائی اور یہ بادیہ پیمائی
جادہ ہے نہ منزل ہے رہرو ہے نہ رہبر ہے ... مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو ... اک میں بھی تماشائی، اک تو بھی تماشائی
تو دیدۂ حیرت سے رہ رہ کے جو تکتا ہے ... منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ ... ہر سنگ کے سینے میں ہے طور کی رعنائی
ہر داغ ترا روشن، ہر داغ مرا روشن ... تو شعلۂ سینائی میں شعلۂ سینائی

غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو ... ہے بلبلا اس قلزم کا گنبدِ مینائی
ہر ورطۂ جنباں میں عالم نئے رقصاں ہیں ... ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ ... جس کا دلِ لرزاں تھا محرومِ توانائی
وہ مقصدِ ہستی میں ناکام رہی آخر ... دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم ... ہے اس ہی کی ہستی سے یہ انجمن آرائی
حیرت سے اسے تکتی ہے چشمِ فلک اب تک ... سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو ... تو نے جو عطا کی ہے اس لالے کو زیبائی
حیرانی و نم ناکی خودداری و یکسوئی ... خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

تشطیرِ دیگر

آتی ہے دمِ صبح صدا عرش بریں سے .... سرمایۂ کونین ہے انسان تری خاک
تیری نظر و فکر پہ روشن تھے سماوات .... کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟

کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق .... بسمل تھیں کبھی جس کی رگِ سنگ و رگِ تاک
کیوں پردۂ گیتی کو نہیں کرتا دوپارہ .... ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

تو ظاہر و باطن میں خلافت کا سزاوار .... دارائے زمیں - خضرِ رہِ منزلِ افلاک
کیا فطرتِ حاکم بھی کبھی ہوتی ہے محکوم؟ .... کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟

مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ .... کیوں تیرہ ہے اب تیرا وہ آئینۂ ادراک؟
کیوں دیدۂ بے خوف سے جاتی رہی ہیبت؟ .... کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟

اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں .... پر سرد ہے وہ صورتِ اشکِ دلِ غم ناک
وہ جوش نہ وہ عزم نہ وہ قوتِ احساس .... نے گرمیِ افکار نہ اندیشۂ بے باک!

روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی .... اور دیکھتی ہے صرف جہاں کے خس و خاشاک
جس عقل کی قسمت میں نہیں جلوۂ عرفاں .... جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری .... عشرت نے کیا چاک ترا دلقِ فقیری
پھر عشق کی سوزش سے ذرا روح کو گرما .... اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

روحِ تبسّم، جگر

(از جناب سید مختار حسن صاحب مختار بی اے ال ال بی - ہیڈ ماسٹر)

نام ور شاعر دنیائے آب و گِل میں اپنی ممتاز شخصیت لے کر نمودار ہوتا ہے۔ نوعِ انسانی کو اپنی دماغی رنگ آفرینیوں سے، تخیل کی نزاکتوں سے، جذباتِ لطیفہ کی گل افشانیوں سے، حسین الفاظ کی نمائشوں سے مسحور کرنے کے بعد اس گلستاں سے رخصت ہوجاتا ہے۔ اور اپنی کبھی نہ مٹنے والی یاد کے غیر فانی نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ دنیا والے اس کے گیتوں سے اپنی روحوں کو مترنّم کرتے ہیں۔ قنوطیت پسند شعرا نے دنیا کا تاریک اور ظلمت آگیں رُخ دیکھا۔ اس کو غم و اندوہ، کلفت و اضطراب کا گہوارہ سمجھا اپنی زندگی کو وقفِ غم کردیا اور نم آلود آنکھیں لیے موت کی آغوش میں جا لیٹے۔ برخلاف اس کے بعض شعرا نے جذباتِ غم سے متاثر ہوکر آنسو بہانا انسانیت کی ذلت سمجھا۔ وہ مسکراہٹیں لیے ہوئے پیدا ہوئے اور مسکراہٹوں سے تازیست کھیلتے رہے۔ اس کا نمونہ ہمارا عظیم المرتبت شاعر جگر ہے جسے ہم بجا طور پر "روحِ تبسم" کہہ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ شعرا کی قنوطیت کے چند خاص اسباب یہ ہوتے ہیں:۔

(۱) شاعر محسوس کرتا ہے کہ قوانینِ اخلاق قوتِ ماورا کے نافذ کردہ ہیں اور انسان مجبوری و بے اختیاری کے عالم میں یہ سب کچھ سہا ہوا دیکھا کرتا ہے اور اس کے قوائے ذہنی انھی قوانین کے تحت کام کرتے ہیں تو یاس اس کے دل پر حزن و ملال کا کوہِ گراں گرادیتی ہے، اس کی آنکھوں سے اشکِ خونی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

(۲) یا جب شاعر کے ذہن میں قربِ الٰہی کا تصور مکمل نہیں ہوتا بلکہ وہ یہ تصور کرتا ہے کہ خدا ضمیر کی آواز کی شکل میں احکام صادر کرتا اور دھمکاتا رہتا ہے گویا کہ غیر متناہی فرض فانی انسان کے دوش پر رکھ دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں شاعر مغموم ہوکر رونا شروع کردیتا ہے۔

(۳) شاعر راہبانہ فلسفۂ اخلاق سے متاثر ہوکر انسان کو خود اس کی ذات سے علاحدہ کردیتا ہے اور پھر

یہ محسوس کرکے کہ وہ اور اس کی ذات دو مختلف چیزیں ہیں گھبرا اٹھتا ہے۔ غم میں ڈوب کر نغماتِ درد و غم الاپنا شروع کر دیتا ہے۔

(۴) یا جب شاعر کی سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آتا کہ کائنات کا مقصدِ اصلی اخلاق ہے اور اس کی آخری قوت نیکی ہے اور انسان کا فعل یہ ہے کہ کائنات کے اس مقصد کو سمجھے اور اپنے ارادوں کی تشکیل اسی مقصد کے مطابق کرے اپنے افعال کو اسی سرچشمے سے سیراب کرے اور اسی کو حقیقی اصولِ زندگی گردانے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اِن حقائق سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے شاعر یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ محدود و لامحدود، مذہب و اخلاق میں ایک ہی رشتۂ یگانگت موجود ہے۔ اور فکر کی اس نارسائی سے دنیا اسے بے ترتیبیوں کا ایک مجسمہ نظر آنے لگتی ہے اور یہ خیالی بے ترتیبیاں اسے رونے پر مجبور کرتی ہیں۔

لیکن جب ہم جگرؔ کی شگفتہ روئی اور کشادہ بینی کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نظریات، زندگی، خدا اور کائنات کے متعلق نہایت مستحکم اور استوار ہیں۔ اس کی شگفتگی اس بات کا پتا دیتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ قوتِ ماورا کا اخلاقی ارادہ صرف خارجی طور ہی پر کارفرما نہیں ہے بلکہ خود انسان کے وجود میں اسی کی جلوہ آرائی ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے ؎

تمام اصل و حقیقت کا آئنہ ہوں میں
خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں

اب تک ہم نے جو جگرؔ کے نظریۂ حیات کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے نزدیک خیر کامل ہے اور یہی خیر حیاتِ انسانی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔ اسی خیر سے جگرؔ انسان، دنیا، خدا اور خود میں رشتۂ یگانگت پیدا کرتا ہے۔ خیر میں اس کا اعتماد اور بھی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے جب وہ دنیا میں دُکھ اور شر دیکھتا ہے۔ لیکن ہماری دقتیں اس وقت بڑھ جاتی ہیں جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ شر ایک قسم کا خیر ہے۔ جگرؔ اس مسئلے کا حل پیش کرتا ہے اس کے نزدیک خیر دنیا کی ہر شے پر حاوی ہے اور شر اتنا بے اختیار ہے کہ خیر سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ جگر اس حقیقت کو نہایت بلند و حکیمانہ انداز میں اس طرح بے نقاب کرتا ہے ؎

ہوشیار او شکوہ رنجِ زندگی		زندگی انعام ہی انعام ہے

وہیں سے ہم کو بلا ہو سکونِ دل کیا کیا جہاں سے لوگ بہت ہو کے ناصبور آئے

کفر ہی کا آگے انسان کو عرفاں ہو جائے جس جگہ ٹیک دے سر کعبۂ ایماں ہو جائے

یکایک دل کی حالت دیکھ کر میرا تڑپ اٹھنا اسی عالم میں پھر کچھ سوچ کر مسرور ہو جانا

لیکن ہم فوراً معترض ہوتے ہیں کہ اگر دنیا میں ہر چیز پر خیر ہی خیر مستولی ہو تو پھر اس میں باہمی امتیاز و فرق کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ دُنیا کی تمام خوب صورتی اور قیمت ختم ہو جائے گی۔ مخصوص چیزوں کا وجود بالکل خیالی ہو کر رہ جائے گا اور انسانی تخیل کے پیدا کیے ہوئے معیار خواب سے زیادہ وقعت نہ رکھیں گے۔ اس نظریے کے مطابق قادرِ مطلق مجبور پر حکمران ہو۔ ایسی صورت میں ہمیں ان سوالوں کا جواب نفی میں ملتا ہو کہ ہم کیا ہو سکتے ہیں اور کیا جان سکتے ہیں۔ گویا انسان کا وجود بالکل ناکارہ اور بے حس و حرکت ہو کر رہ جاتا ہو۔ اسی نظریے کے تحت اگر ہم کائنات کی تشریح کرنا چاہیں گے تو کائنات مٹ جائے گی۔ اس کا مفہوم ہی مفقود ہو جائے گا اور ذاتِ خداوندی جس کا ہر ذی روح میں مظاہرہ ہو بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ جگر ہمیں اس کا جواب دیتا ہو۔ وہ خدائے سمیع البصیر کی قوتوں کا معترف ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہتا ہو کہ دنیا میں کوئی ناکامیابی کوئی غلطی، کوئی شر، کوئی دُکھ اور تاریخ انسانی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جس میں اس کی ذات کی جلوہ ریزی نہ ہو۔ لیکن اس پر بھی انسان کی اخلاقی زندگی میں آزادی ہو: ؎

ہونے دیا تعلقِ اصلی نہ منقطع مجبوریاں بھی ساتھ چلیں اختیار کے

تجھ سے اے دوست کوئی شکوۂ بیداد نہیں دل ستم ساز ہو خود تو ستم ایجاد نہیں

شانِ رحمت کو نہیں درکار کوئی پیش کش احتیاطاً اکتسابِ کفر و ایماں کیجیے

خدا کی قدرتوں پر حد عائد کرنا خدا کے وجود سے انکار کرنا ہو اور انسان کو بالکل مجبور سمجھنا انسان کو مجسمۂ ثواب سمجھنا ہو جگرؔ صحیح طور پر یہ سمجھتا ہو کہ قوت خدا لامحدود ہو لیکن اس قوت لامحدود پر حرف نہیں آتا اگر وہ اپنے بندے کو کسی شو پر پورا اختیار دے دے اس صورت میں اجازت اور اخلاق ایک دوسرے سے برسرِ جنگ نظر نہیں آتے بلکہ دونوں میں ایک لطیف رشتہ پیدا ہوجاتا ہو۔ گویا ہمارا شاعر جگرؔ اجازت سے اخلاق کی طرف بڑھتا ہو، اخلاق سے فلسفے کی جانب اور فلسفے سے مذہب تک پہنچ جاتا ہو۔

لیکن ابھی یہ سوال پھر تشنہ رہ جاتا ہو کہ آخر وہ کونسا اصول ہو جو خدا اور انسان میں مضبوط تعلق پیدا کرتا ہو۔ کیا چیز اس بات کی توضیح کرتی ہو کہ انسان کی زندگی خدا ہی کی ذات کا مظاہرہ ہو اور فطرتِ انسانی جس اخلاق کے آئیڈل (Ideal) کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہو ان مقاصد کی تکمیل ہو جن کو مقاصدِ خداوندی کہا جاسکتا ہو۔ جگرؔ کے پاس اس سوال کا ایک جواب ہو جس کو وہ پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرتا ہو یعنی خدا اور بندے میں تعلق پیدا کرنے والی شو محبت ہو۔ محبت ہی اخلاق اور مذہب کا بہت اہم اصول ہو، محبت ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مذہب و اخلاق کی متضادیت دور کرکے دونوں میں رشتۂ یگانگت پیدا کرتی ہو۔ محبت ہی وہ پاکیزہ ترین تخیل ہو جس تک انسان پہنچ سکتا ہو۔ اس جذبۂ محبت میں وہ اکملیت مضمر ہو کہ جب یہ باشعور انسان کے ادراکات میں نمایاں ہوتا ہو اور ذی شعور انسان کے ارادے کا محرک ہوتا ہو تو یہ انسان کو بلندترین پاکیزگیوں سے ہم کنار کردیتا ہو جس وقت جگرؔ محبت کے بارے میں لکھتا ہو تو اس کا زورِ کلام قیامت کی بلندی پر ہوتا ہو۔ محبت کی قوتوں پر اسے گہرا اعتماد ہو۔ یہی وجہ ہو کہ وہ بڑی جواں مردی و استقلال سے دُنیا میں شر کا مقابلہ کرتا ہو اور اس کی ہر کراہ سے ترنم پیدا کرتا ہو اس کے نزدیک سارا عالم محبت ہی سے قائم ہو اور دنیا کا ہر ذی روح اسی راہ پر گام زن ہو۔ محبت و عقل دو قوتیں وہ ہیں جو دُنیا کی تعمیر کے وقت انسان کو بخشی گئی تھیں۔ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے پر اپنی اپنی جلوہ پاشیاں کرتی ہیں ایک دوسرے کو اپنے اپنے اثرات سے قوی بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ علم محبت کو ترقی دیتا ہو اور محبت علم کو۔ انھی دو قوتوں کا

اتصال ہے جو واقعاتِ زندگی کو دل چسپ و بامعنی بناتا ہے اور نظامِ عقل و اخلاق میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ جگر نے محبت کو وہ جگہ دی ہے جو انسان کو صحیح انسانی معیار پر لے آتی ہے محبت اس کے نزدیک سب سے بڑا خیر ہے جس نے محبت کو سیکھ لیا گویا اس پر رازہائے خداوندی وا ہوگئے۔ جگر یہ سمجھتا ہے کہ محبت تمام قوانین اور تمام حسن کا سرچشمہ ہے۔ محبت ہی انسان کو دنیا اور نسلِ انسانی میں صحیح رابطۂ اتحاد دکھاتی ہے اور انسانی زندگی کی تمام اُن بدصورتیوں کو فنا کردیتی ہے جن کا وجود زیستِ انسانی کو غم گیں، بدصورت بناتا ہے لیکن محبت کی روشنی میں انسان شر میں خیر دیکھتا ہے اور ناامیدیوں میں امید۔

جگر بالکل جدید اور اپنے مخصوص انداز میں محبت کی کارفرمائیاں دکھاتا ہے۔ محبت شر کو خیر بناکر انسانی نفس کو احساسِ خودی عطا کرتی ہے ؎

عشاق پا رہے ہیں ہر جُرم پر سزائیں
انعام بٹ رہے ہیں مغرور ہیں خطائیں

جگر کہتا ہے کہ محبت عقل کی مخالف نہیں بلکہ دونوں میں اشتراکِ عمل ہے ؎

اِس حسنِ برق وش کے دِل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں

حُسن بھی محبت کا محتاج ہے ؎

اب ہاتھ مل رہے ہیں وہ خاکِ عاشقاں پر
برباد کرچکے جب اپنی ہی کچھ ادائیں

دوسری جگہ اسی مفہوم کو یوں ادا کرتا ہے ؎

عشق گر حُسن کے جلوؤں کا ہے مرہونِ کرم
حُسن بھی عشق کے احساں سے سبک دوش نہیں

محبت حسنِ ازل کا انسان کو ایک ایسا تعلق عطا کرتی ہے جو فہم و عقل کی رسائی سے باہر ہے ؎

کرشمے ذات و صفات کے ہیں جمالِ قدرت دکھا رہے ہیں کہ ہر تصور سے دور رہ کر وہ ہر تصور میں آرہے ہیں

اسی خیال کو مولانا رومیؒ نے یوں ادا کیا ہو ؎

ہست ربّ الناس را باجان ناس
اتصالِ بے گمان و بے قیاس

عالم کی دلچسپی اس کی رنگینی کی رہینِ منت ہو مگر خود اس کی رنگینی کہاں سے آئی جگر کہتا ہو ؎

جو دل سے اُٹھتے ہیں شعلے وہ رنگ بن بن کر
تمام منظرِ فطرت پہ چھائے جاتے ہیں

محبت انسان میں احساسِ خودی پیدا کرتی ہو جو اخلاقی زندگی کا سرچشمہ ہو۔ اس سے انسان اپنی صحیح قدر و قیمت پہچانتا ہو ؎

نہ وہ مستیاں ہیں نہ سرشاریاں ہیں — خودی کا ہو احساس خودداریاں ہیں

کیا غرض مجھ کو ترے دل پہ اثر ہو کہ نہیں — مَیں پرستارِ محبت ہوں خبر ہو کہ نہیں

نہ ہو جو حُسن کی ہم پر کوئی نگاہ نہیں — ہم اہلِ عشق ہیں پابندِ رسم و راہ نہیں

محبت عقل کی معاون ہو مگر اس کی کلیتہً محتاج نہیں ؎

پاؤ اُٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

محبت میں بھی ایک حُسن ہو جس سے حُسن بھی متاثر ہوتا ہو ؎

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں — حُسن خود لینے لگا انگڑائیاں
حُسن کی جانِ توجہ بن گئیں — بڑھتے بڑھتے عشق کی رسوائیاں

جگر کے نظریۂ محبت کو سمجھنے کے لیے غالباً یہ میری کوتاہی ہوگی اگر مَیں اس کے چند اور اشعار نہ پیش کروں۔ لیجیے مَیں یہاں پر جگر کے چمنستانِ شعر سے چند گل ہائے رنگا رنگ حاضر کرتا ہوں۔ محبت کے

نازک اور لطیف نغمات سے دل و جان کو مسرور کیجیے ؎

محبت میں جدھر دیکھو بہارِ جاودانی ہی   ہجوم رنگ و بو ہی حُسن و نغمہ ہی جوانی ہی

ہوگا تری محفل میں کوئی اور بھی جلوہ   مجھ کو تو محبت ہی محبت نظر آئی

اک سازِ محبت ہی کُل عالمِ امکاں ہی   تو چھیڑ تو دے ظالم ہر تار رگِ جاں ہی
تو رازِ محبت کو سمجھا ہی نہیں ورنہ   پابندیٔ انساں ہی آزادیٔ انساں ہی

محبت اصلِ حقیقت محبت اصلِ مجاز   وہ کم نظر تھے جو بیگانۂ مجاز رہے

ابتدا عشق کی ہی فطرتِ انساں کی نمود   انتہا عشق کی تکمیل ہی انسانوں کی

یوں محوِ فنا ہو جا ای دل رہِ الفت میں   ہر سانس سے پیدا ہو اک نغمۂ منصوری

بے کسانِ رہِ الفت کو سمجھتے کیا ہو   عرش ہل جائے اگر دل سے یہ فریاد کریں

میں جگر کو فلسفی کہہ کر اس کی قیمت کم کرنا نہیں چاہتا۔ وہ بلبلِ شیریں نوا ہی اور یہی وہ تازیست رہے گا۔ جگر زندگی میں اخلاق کے ساتھ جذبات کو بالکل فراموش کر دینے کا قائل نہیں ہی۔ اس قسم کا خشک اخلاق اس کا مطمح نظر نہیں بلکہ وہ جذبات کی قدر و قیمت سے واقف ہی اور ان دونوں کے فطری تعلق و رابطے سے روشناس اسی میں ڈوبا ہوا ہی اور دوسروں کو اسی میں غرق کر دینا چاہتا ہی۔

سہ ماہی تبصرہ

یوپی میں اُردو

(جناب حیات اللہ انصاری صاحب)

[محکمۂ توسیع تعلیم کے کتب خانے اور دارالمطالعے ۔ بچوں میں اَدبی ذوق، کہانیاں، ڈرامے کا نوجیون ، نئے رسالے ، نئے لکھنے والے ، نئی کتابیں ۔]

محکمۂ توسیع تعلیم کے کتب خانے اور دارالمطالعے

فیض آباد سے پورب کی طرف ایک سیدھی سڑک جاتی ہو۔ جس پر ۵ میل چل کر فصیل کے اندر بسا ہُوا ایک خوب صورت سا گاؤں ہو درشن نگر فصیل سے باہر نکل کر گاؤں کا پرائمری اسکول ہو ۔ اس میں محکمۂ توسیعِ تعلیم کا کتب خانہ بھی ہو ۔ یہ کتب خانہ دو بڑے بڑے اسٹیل کے بکسوں میں بند رہتا ہو۔ کتب خانے کے پاس چار چھوٹے چھوٹے بکس بھی ہیں ۔ ان میں کتابیں رکھ کر مہینے کے شروع میں کتب خانے کی چاروں شاخوں کو جو دو دو تین تین میل کے حلقے کے اندر ہیں، بھیج دی جاتی ہیں۔ پھر مہینے کے آخر میں وہ کتابیں انھی بکسوں میں واپس آجاتی ہیں۔ کتب خانے کے نگراں پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اور شاخوں کے نگراں مقامی اسکول کے ماسٹر صاحبان یا اور ذمے دار اشخاص ہیں ۔

کتب خانے میں ۶۱۲ کتابیں ہیں جن میں سے ۱۹۴ اردو اور ۴۱۸ ہندی کی ہیں ۔اُردو کتابوں میں حسبِ ذیل علوم کی کتابیں ہیں :-

(۱) افسانے و ناول (۲) نظمیں (۳) تاریخ (۴) زراعت و نباتات (۵) حفظانِ صحت (۶) جدید معلومات (۷) ملکوں کا حال (۸) سیاست (۹) مذہب (۱۰) بچوں کی کتابیں ۔

پریم چند کی ناولیں اور افسانے ہیں جو یہاں کے لیے بہت موزوں ہیں ۔کتابوں کی شکل اور رجسٹر سے پتا

چلتا ہے کہ سب سے زیادہ وہی پڑھی گئی ہیں ۔ اصغر مرحوم کی وہ کتابیں جن میں انھوں نے غیر ملکوں کا حال لکھا تھا، یہاں ہیں، اور پڑھی جاتی ہیں ۔ ایک اور قابلِ تعریف چیز منظوم تاریخِ اسلام ہے جو ''آلھا'' کے طرز میں لکھی گئی ہے افعال تو ''کھانے'' ''کان لگانے'' کے طرز کے دیہاتی بول چال کے ہیں مگر مجموعی طور پر زبان اچھی ہے۔

بستر سے ...ور مختلف لوگوں سے بات چیت کرنے سے پتا چلا کہ چار سال کے اندر اندر جب سے یہ لائبریریاں کھلی ہیں، لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا کافی شوق پیدا ہوگیا ہے۔ پہلے حالت یہ تھی کہ مڈل پاس اور انٹرنس پاس لوگ جو دیہاتوں میں رہتے تھے ان کو سال پر سال بیت جاتے تھے اور ایک کتاب بھی نظر سے نہیں گزرتی تھی۔ بہت سے گاؤں ایسے تھے جہاں کسی گھر میں بھی کوئی کتاب سوائے بچوں کی کورس کی کتابوں کے، نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اب پڑھے لکھے لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو سال میں ایک آدھ کتاب نہ پڑھ لیتا ہو۔

''زیادہ کتابیں کیوں نہیں پڑھتے؟''

میرے اس سوال کے بہت سے جواب ملے ۔ مگر سب جواب آکر ایک مرکز پر ملتے تھے ۔ وہ یہ کہ لوگ صرف وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو ان کے مطلب کی، ان کی دل چسپی کی ہوں اور سہل ہوں۔

ایک ڈپٹی انسپکٹر صاحب جن کے ذمے کتب خانوں کا معائنہ ہے، کہتے ہیں کہ سال میں جب نئی نئی کتابیں آتی ہیں تو ایک دم سے پڑھنے والے ٹوٹ پڑتے ہیں ۔ مگر پھر رفتہ رفتہ ان کا مطالبہ کم ہوجاتا ہے۔ اس بیان کی تائید درشن نگر کے کتب خانے کے رجسٹر نے کی ۔ اس سے ایک خاص زمانے میں پڑھنے والوں کی کثرت ظاہر ہوتی ہے۔

جو لوگ کتب خانے سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان سے بات چیت کرو تو اس بیان کی اور تصدیق ہوجاتی ہے۔ کسی کو صرف غزلوں کا شوق ہے تو کسی کو صرف ناولوں اور افسانوں کا ۔ کوئی ہے جس کو صرف مذہبی کتابوں سے شغف ہے۔ ایک صاحب کو شکایت تھی کہ یہاں ''تسخیرِ ہم زاد'' کی کوئی کتاب کیوں نہیں رکھی گئی۔ جس وقت وہ شکایت کر رہے تھے، ان کا چہرا کہہ رہا تھا کہ ہم کو اس کی سخت ضرورت ہے۔

ان شکایتوں میں مناسب شکایتیں بھی تھیں ۔ مثلاً یہ کہ خط و کتابت سکھانے والی کوئی کتاب نہیں ہے۔

امورخانہ داری سکھانے والی کوئی کتاب نہیں ہو۔ سب سے زیادہ معقول شکایت یہ تھی کہ ریلوے کا ٹائم ٹیبل اُردو میں نہیں ہو۔

ضرورت اس بات کی ہو کہ دیہات والوں میں پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ جن لوگوں میں شوق ہو اس کو صحیح اور مفید راہوں پر لگایا جائے۔ ان کو مشورہ دیا جائے کہ تم کون کون سی کتابیں پڑھو۔ دراصل یہ کام کتب خانے کے نگراں کا ہو اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر نگراں ہوتا ہو اسکول کا ہیڈ ماسٹر۔ اس کے ذمّے اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اِدھر پوری توجہ نہیں کرسکتا ہو۔ ایک بات یہ بھی ہو کہ عام لوگوں کے ذوق کا اندازہ کرنا، لائبریری کو اس ڈھب کا بنانا، پڑھے لکھے لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا مشورہ دینا یہ ایک مستقل فن ہو۔ ایک پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر بلا سکھائے ان باتوں کو کیسے جان سکتا ہو۔ راہ کا سب سے بڑا کانٹا یہ ہو کہ نگران کو ڈر لگا رہتا ہو کہ کبھی کتاب غائب نہ ہوجائے جو مجھے اپنے پاس سے دام دینا پڑیں۔ اس سبب سے کتاب دینے میں وہ آنا کانی کرتا ہو۔

مدرّسین میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جو ہندی کو ہندستان کی مشترکہ زبان بنانے پر تُلے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہو کہ وہ اُردو کتابوں کو کس ڈھب سے رائج کرتے ہوں گے۔

توسیعِ تعلیم کے کتب خانوں میں بچّوں کی کتابوں کا ذخیرہ کافی ہو۔ درشن نگر میں اُردو کے ایسے طالب علم ملے جو ان کتابوں کے پڑھنے کے شوقین ہیں۔ لیکن یہ ذوق دو وجہوں سے نہیں ترقی کرسکا ہو۔ ایک تو یہ کہ کتابیں جیسا چاہیے ویسی نہیں۔ (جس پر ہم آگے بحث کریں گے) دوسرے یہ کہ لڑکے گھر لے جاکر کتاب کھو دیتے ہیں۔ اور اسکول میں پڑھنے کا ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔

ایک بچّہ جو کتاب غائب کرنے کا مجرم ہوچکا تھا میرے سامنے آیا۔ اس کو سال بھر سے کوئی کتاب نہیں ملی تھی۔ مَیں نے اپنی ذمّے داری پر ایک کتاب دلادی۔ اس کی باچھیں اتنی کھل گئیں کہ صرف اس خوشی کے انعام میں میرا بس چلتا تو پورا کتب خانہ دے دیتا۔

"یہاں اُردو کی کتابیں ہندی سے کم کیوں ہیں؟"

"کیوں کہ اُردو پڑھنے والے ہندی پڑھنے والوں سے کم ہیں۔"

معقول! اس جواب نے مجھے ایک یونی ورسٹی کا ایک واقعہ یاد دلادیا۔ وہاں مجلسِ انتظامیہ میں جب لائبریری کے لیے کتابیں منگوانے کا سوال اُٹھا تو ایک معاملہ فہم ممبر نے کھڑے ہوکر سوال کیا۔

"پارسال جو کتابیں منگوائی گئی تھیں کیا وہ سب کی سب لڑکوں نے پڑھ لیں ہیں جو اب اور منگوائی جائیں!" اگر سوال یہ ہوتا کہ ایک مخصوص کتاب کی کتنی جلدیں منگوائی جائیں تب یہ جواب درست ہوتا۔ لیکن سرِدست اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جو ہندی پڑھنے والا ہے اس کو تو سال میں بیس ناولیں پڑھنے کو ملیں اور جو اُردو پڑھنے والا ہے اس کو صرف دس۔ یعنی اگر اُردو دان کی تعداد پچیس فی صدی ہوتی ہے تو ان میں سے ہر شخص کو علم میں بھی ہندی دان کے مقابلے میں پچیس ہی فی صدی رہنا چاہیے۔

محکمۂ توسیع تعلیم نے اُردو کی جگہ مجموعی طور پر پچیس فی صدی مقرر کی ہے۔ اور مجموعی طور پر اُردو کی کتابیں بھی اتنی ہی ہیں۔ تقسیم یوں کی گئی ہے کہ جن مقاموں پر اُردو دان زیادہ ہیں وہاں ان کی مقدار پچیس فی صدی سے بڑھ کر پچاس اور ساٹھ فی صدی تک پہنچ گئی ہے۔ جہاں کم ہیں وہاں گھٹ کر ۵ فی صدی بلکہ صفر تک پہنچ گئی ہے اسی تناسب اور تقسیم کا سوال محکمۂ تعلیم میں اُردو ہندی کی جگہ اور اس کے بجٹ سے متعلق ہے۔ یعنی اس کا حل ادب کے میدان میں نہیں۔ سیاست کے میدان میں ہے۔

اب ذرا کتب خانے کا ایک جائزہ لیجیے۔

اُردو میں کبھی عام پسند ادب تھا۔ مثلاً نورتنامہ، آرایشِ محفل، قصہ چہار درویش، قصہ بہرام گور بہت سی عام کتابیں تھیں۔ اس کے بعد جاسوسی کی ناولیں عام ہوئیں۔ لیکن اب ان کتابوں کا چلن گیا۔ کیوں کہ علم کا حلقہ جو بڑھا تو ایسے لوگ بھی آگئے جن کے لیے یہ زبان بھی کافی مشکل ہے۔ نئے آنے والوں کی زندگی اور مسائل بھی مختلف ہیں۔ عام ذوق بھی بدل گیا ہے۔ اب ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو ان تمام باتوں کو سموکر نئی طرز پر تیار کی جائیں۔ ایسی کتابیں فی الحال اُردو میں بہت کم ہیں۔ ایسی حالت میں ایک دیہاتی کتب خانے کے لیے کتابوں کا انتخاب کرنا آسان کام نہیں۔

دوسری بڑی دشواری ہے نقطۂ نظر کا اختلاف۔ اس وقت ملک میں جتنی سیاسی جماعتیں ہیں سب کا کتب خانوں کے بارے میں ایک خاص نظریہ ہے۔ یہ اختلاف اسی حد تک ہے کہ ایسی کتابیں بھی ہیں جن کے رکھنے

پر ایک جماعت بے حد مُضر ہوگی تو دوسری نہ رکھنے پر۔

کتابوں کے انتخاب میں غالباً اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہو کہ جہاں تک ممکن ہو یوپی کے اشاعت گھروں ہی سے خریدی جائیں۔ کیوں کہ پڑھنے والوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشاعت گھروں اور لکھنے والوں کی سرپرستی بھی تو مدنظر ہو۔

ان تمام دشواریوں کو پیشِ نظر رکھ کر بھی اگر کتب خانے کا جائزہ لو تو بھی انتخاب بے حد ناقص ہو۔ مثلاً افسانے اور ناولیں جن کی کثرت ہونا چاہیے تھی بے حد کم ہیں۔ اور جو ہیں ان میں سے آدھے سے زیادہ محض بھرتی کے ہیں۔ ایک ناول ہو بزمِ طلعت۔ افسانوں کے مجموعے ہیں 'گراہ چوڑ' اور 'نصیرالدین حیدر' افسانہ نگاری اور ناول کا فن اُردو کے موجودہ دور میں جتنا ترقی کر گیا ہو اس کو دیکھتے ہوئے یہ کتابیں منزلوں پیچھے ہیں۔ ایک ناول ہو 'اسیرِ قفس'، جو پردے کے خلاف بیس پچیس سال اُدھر لکھی گئی تھی۔ شاید بازار میں اسے کوئی ردی کے بھاؤ بھی نہ خریدے گا۔ شعرِ منثور کی ایک کتاب ہو 'نغمات' یہ اس نوعیت کی چیز ہو:-

"اب بلبل اپنی نوائے مرتعش سے اس کا نوحہ ماتم پڑھ رہی تھی۔ ماہ تاب کے اشکِ سیمیں اس کے غم میں سارے باغ کو نم آگیں بنا رہے تھے۔"

"رنگینیِ بہار کا نقشِ اولیں، تتلی کی نگہِ واپسیں ہو۔"

ایسے عالی ادب کے سمجھنے اور لُطف لینے والے مصنّف ہوں گے۔ اور شاید چند لوگ اور ہوں۔ دیہاتی کتب خانے میں ایسی کتابوں کو رکھنا ان کی بے وقعتی نہیں تو اور کیا ہو؟

ایک کتاب دیکھنے میں آئی 'کارخانۂ عالم'، یہ نول کشور کی سنہ ۲۵ء کی چھپی ہوئی ہو۔ اس میں جدید صنعتوں مثلاً کاغذ وغیرہ بننے کا حال بتایا گیا ہو۔ یہ صنعتیں اب پُرانی ہوگئیں نئی صنعتیں ان سے زیادہ حیرت ناک وجود میں آگئیں۔ اندازِ بیان نہ جانے کتنا ترقی کر گیا۔ کتاب کی سجاوٹ کا حال یہ ہو کہ خراب کاغذ اور خراب لکھائی چھپائی ہو۔ جا بہ جا کثرت سے غلطیاں ہیں۔ بازار میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہو۔ مگر لائبریری میں خریدی گئی ہو۔ اور شاید ردّی کے داموں بھی نہیں، پورے دام دے کر۔

اکثر کتابیں ہائی اسکول کے معیار کی، بلکہ اس سے بھی اونچی ہیں۔ کچھ تو ایسی ہیں جو صرف اسی شخص کے

کام کی ہوسکتی ہیں جو اپنے خاص مسائل کے حل کی تلاش میں لائبریری آئے۔

یہ کہنا بے ضرورت ہو کہ ایسی سب کتابیں ویسی ہی کی ویسی کوری رکھی ہوئی ہیں۔ کتابوں کا انتخاب محکمۂ توسیع تعلیم کرتا ہو۔ وہ خراب انتخاب کا ذمےدار بھی وہی ہو۔

دارالمطالعہ درشن نگر کی بستی کے اندر یعنی بازار کے بیچ بیچ میں ایک خوب صورت کمرے پر ایک سائن بورڈ لگا ہو جس میں اُردو ہندی میں لکھا ہو محکمۂ توسیع تعلیم کا دارالمطالعہ۔ یہ کمرا ایک دکان دار کا ہو جس نے دارالمطالعہ کے نگران کے کہنے سننے سے دارالمطالعے کے لیے کمرے کا ایک کونا خالی کردیا ہو۔ اس جگہ ایک چھوٹی سی الماری ایک میز اور دو کرسیاں ہیں۔ دارالمطالعے میں "دنیا باتصویر" ماہ وار، ہفتے کی خبریں، ہفتہ وار، "اودھ"، "حقیقت لکھنؤ سنڈے اڈیشن" آتا ہو۔

درشن نگر شہر فیض آباد سے بہت قریب ہو۔ لوگ روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اخبار بھی آجاتے ہیں اور زبانی روزانہ کی خبریں بھی۔ اسی وجہ سے ہفتہ وار اخباروں میں جو دیر کو بھی پہنچتے ہیں کوئی خاص کشش نہیں پھر بھی پڑھنے والے آجاتے ہیں۔ اور اخباروں پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔ ایک صاحب کو ہم نے دارالمطالعے میں بیٹھے ہوئے کچھ نقل کرتے دیکھا۔ کسی دوا کا پتا تھا۔ جو کچھ بھی ہو۔ تھا تو۔ قلم کاغذ اور اخبار کا استعمال چار سال پہلے دیہات کی دنیا میں بالکل عنقا تھا۔

دارالمطالعے کے بارے میں بھی لوگوں کی ویسی ہی شکایتیں اور فرمائشیں ہیں جیسی کتب خانے کے بارے میں۔ نوجوانوں کی بالاتفاق فرمائش ہو کہ سنیما کا پرچہ آنا چاہیے۔ مگر ایک بزرگ کا خیال ہو کہ جو اخبار آتے ہیں ان میں سنیما کی باتیں ہوتی ہیں، اسی لیے ان کو بند کردینا چاہیے۔

ایک بے ضرورت بات یہاں کہہ دینا ضروری ہو۔ وہ یہ کہ کتب خانے کا رجسٹر دیکھنے سے پتا چلتا ہو کہ اُردو کتابوں کے پڑھنے والے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

یوپی میں محکمۂ توسیع تعلیم کے کتب خانے ۱۰۴۰ اور دارالمطالعے ۳۶۰۰ ہیں جن میں ۲۵ فی صدی اُردو کتابیں ہیں۔ ان سے کافی فائدہ پہنچ رہا ہو۔ لیکن بدرجہا زائد فائدہ پہنچ سکتا ہو اگر پبلک انجمنیں اس میں دلچسپی لینے لگیں۔ وہ دیہات والوں میں پڑھنے اور لائبریری سے فائدہ اٹھانے کا ذوق پیدا کریں۔ کتب خانوں کے

...نوں کا ہاتھ بٹائیں۔ اس بات کا انتظام کریں کہ اگر کسی پڑھنے والے سے کوئی کتاب ضائع ہوجائے اور وہ
...ں کی قیمت نہ ادا کرسکتا ہو تو دوسری کتاب فراہم کردی جائے۔

بچّوں کا ادبی ذوق

مَیں۔"کیوں میاں۔ یہ کہانی کی کتاب تمھارے ہاتھ کیسے آگئی؟"
بچّہ۔"(فخر سے) میری ہو۔ ساڑھے چار آنے کی خریدی ہو۔"
"وہ پیسے کیا ابّا نے دیے تھے؟"
"جی نہیں۔ چار آنے عید میں ملے تھے۔"
"مگر کتاب تو ساڑھے چار آنے کی ہو؟"
"دو پیسے کتاب والے کے اُدھار رہے۔ ابّا ہر جمعے کو دو پیسے دیتے ہیں۔ جب جمعہ آیا تو ادا کردیے۔"

ادب کا یہ متوالا لکھنؤ میونسپلٹی کے کسی اسکول میں پڑھتا ہو۔

یوپی میں اُردو کا مستقبل کیسا ہو؟ اس کا پتا چلانے کے لیے مَیں نے اسکول کے انسپکٹروں اور ...سٹروں سے بات چیت کی، بچّوں سے اور ان کے سرپرستوں سے مِلا۔ جن سے ملاقات نہ کرسکا ان سے ...کر کچھ سوالات پوچھے۔ لڑکوں سے بھی بات چیت کی۔ اسی میں سے ایک کا خلاصہ اوپر درج ہو۔

ایک بچّہ مجھ سے کہانی کی ایک کتاب لے گیا۔ تیسرے دن اس نے واپس کردی۔ اس کو اب کتاب ...ں حاجت نہ تھی۔ کیوں کہ کہانی کا لفظ لفظ نوکِ زبان تھا۔

ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول کا ایک بچّہ مجھ سے کہانی کی ایک کتاب لے گیا۔ جب واپس لایا تو مَیں نے ...وچھا کہ

"کس کس نے کتاب پڑھی تھی؟"
"مَیں نے پڑھی اور سب لڑکوں نے سُنی۔"

"سُننے والوں میں ہندی سکشن کے لڑکے بھی تھے۔"

"جی ہاں۔ وہ کیوں نہ سُنتے؟"

تو ابھی ہندی رسم الخط پڑھنے والے معصوموں کو یہ کسی نے نہیں بتایا ہو کہ تُم اُردو نہیں سمجھتے ہو؟ یہ ہو بچوں کا ذوق اور یہ ہو اُردو زبان کا مستقبل۔ اور یہ حالت اس وقت ہو جب کہ اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی ہو۔

ہمیں یاد ہو وہ زمانہ تھا کہ بچے کہانی کی کتاب چھونے پر پیٹے جاتے تھے۔ وہ زمانہ اب نہیں رہا۔ لیکن اب بھی سرپرستوں اور اُستادوں کو بچے کے ہاتھ میں قصہ کہانی کی کتاب دیکھ کر بے چینی محسوس ہوتی ہو۔ ان کو منع تو نہیں کرتے۔ مگر ایسا ضرور کرتے ہیں کہ جہاں بچے نے کہانی کی کتاب اٹھائی اور انھوں نے حکم دیا اس وقت نصاب کی کتاب پڑھو۔ یہ "اس وقت" ہر وقت رہتا ہو۔

بچوں میں ادبی ذوق خود بہ خود بڑھ رہا ہو۔ کلاس کے ایک بچے کے پاس اگر کہانی کی کوئی کتاب آگئی تو اس کو مانگ مانگ کر سب بچے پڑھتے ہیں۔ کورس کی کتاب چاہے بُری طرح رکھیں اٹھائیں مگر کہانی کی کتاب نادر تحفے کی طرح بہت ادب و لحاظ سے چھوئی جاتی ہو۔ جس طرح بچے کو دوسرے بچے کے اچھے کپڑوں اور کھلونوں پر رشک آتا ہو اسی طرح کہانیوں کی کتاب پر بھی۔

وہ زمانہ تو تقریباً چلا گیا جب تعلیم یافتہ اور باحیثیت لوگ اپنے بچوں کو شروع ہی سے انگریزی کی تعلیم دلاتے تھے۔ اب ایسے لوگ بچوں کو بلا کسی اندیشے کے کہانیوں کی کتابیں منگوا دیتے ہیں۔ ان کے گھروں میں "پیامِ تعلیم"، "غنچہ"، اور "پھول" کے نئے اور پُرانے پرچے نظر آجائیں گے۔ مگر یہاں کے بچوں کا حال دوسرا ہوتا ہو۔ کچھ دنوں کے بعد ان چیزوں کی طرف سے ان کا دِل ہٹ جاتا ہو۔ مجھ کو جہاں ادب کے متوالے بچے ملے وہاں ایسے بھی ملے جن کے پاس کہانیوں کی مجلّد کتابیں موجود ہیں۔ مگر وہ پڑھتے نہیں۔

اب وہ زمانہ گیا جب بچوں کی بے شوقی دیکھ کر ہم یہ کہہ کر الگ ہو جاتے تھے کہ کیا کریں ان میں شوق ہی نہیں۔ اگر بچے کتابیں نہیں پڑھتے ہیں تو ضرور کتابوں میں کوئی خرابی ہو۔

بچوں کے ڈراموں پر تو ہم نے آگے "ڈرامے کا احیا" کے سلسلے میں بحث کی ہو۔ یہاں کہانیوں پر

بحث کریں گے۔ بچوں کی تاریخی اور علمی کتابوں پر کسی اور موقع پر تبصرہ کیا جائے گا۔

کہانی کا فن اور جگہوں کی طرح یوپی کے گھرانوں میں بھی بچوں کو کہانیوں کی نعمت بڑھیوں سے ملتی تھی۔ رات کو کھانے سے فراغت ہوئی اور بچوں نے دادی اماں یا نانی اماں کو گھیر لیا۔ انھوں نے فرمایشوں سے مجبور ہوکر کہانی شروع کردی۔ آہستہ آہستہ اور تھم تھم کر، جیسا کہ سن کا تقاضا تھا، ان کی زبان سے الفاظ نکلتے تھے۔ لیکن اس دھیمی رفتار سے وہ غیر محسوس طور پر ایک صنعت پیدا کردیتی تھیں۔ وہ تھا ڈراماپن۔ جو الفاظ سے زیادہ لہجے سے ادا ہوتا تھا۔ اگر جنگل کا سناٹا دکھانا ہو تو یہ الفاظ ہوتے تھے "وہ سنسان جنگل، ہُو کا عالم، نہ آدم نہ آدم زاد، بس خدا کی ذات"۔ اس میں سنسان کا کھنچاؤ ایسا سناٹا پیدا کردیتا تھا کہ بچوں کی سانس دھیمی پڑجاتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں نہ کوئی آدمی ہو اور نہ روشنی۔ ہُو کا عالم میں "ہُو" میں وہ سانس ہوتی تھی کہ جی سنسنا جاتا تھا۔ "نہ آدم نہ آدم زاد" میں دونوں فقرے اس طرح تہ در تہ آتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا جیسے دُنیا کی ساری آبادی انھی دونوں سے ہوتی ہو جب یہ نہیں رہے تو پھر کیا رہ گیا۔

ان لفظوں اور فقروں کے معنی بچے بھلا کیا سمجھ سکتے تھے۔ مگر لہجہ سمجھ لیتے تھے۔ اور وہ لہجہ الفاظ کی جذباتی جگہ بتادیتا تھا۔ جب الفاظ کی جذباتی جگہ مل گئی تو سب کچھ مل گیا۔ بڑے ہونے پر جب ان لفظوں کے معنی معلوم ہوتے تھے تو ایسا خیال ہوتا تھا جیسے جانی بوجھی بات ہو۔

ایک کہانی میری بُوا کہتی تھیں۔ جتنا حصّہ یاد ہے اس سے پانچوں پانڈووں کی سی کہانی معلوم پڑتی ہے۔ اس میں ماں اپنے بیٹوں کو بُلاکر پوچھتی ہے کہ نولکھا ہار کس نے توڑا؟

پہلا بیٹا: اماں جان مجھ سے ٹوٹا۔

دوسرا بیٹا: نہیں اماں جان مجھ سے ٹوٹا۔

تیسرا بیٹا: نہیں اماں جان مجھ سے ٹوٹا۔

اسی طرح پانچوں بیٹے یہی جواب دیتے ہیں۔ اسی ایک فقرے کو وہ اس طرح ادا کرتی تھیں کہ بڑے بیٹے منجھلے بیٹے اور چھوٹے بیٹے کا کردار آنکھوں تلے آجاتا تھا۔

بچوں تک جو کہانی پہنچتی تھی وہ محض الفاظ کے روپ میں نہیں۔ جیتے لہجے کا بھی سہارا لے کر۔ کہانی ایک زبان سے دوسری پر اور دوسری سے تیسری پر چلتی تھی۔ ہر شخص اپنے لہجے پر اس کو ڈھالتا تھا۔ اس طرح ثقیل الفاظ چھٹ جاتے تھے۔ جو فقرہ موزنیت کے ڈرامائی پن کو ادا کرنے والے لہجے پر پوری طرح چڑھتا ہو، وہ ڈوڈتا تھی۔ ان پر چڑھ کر سڈول ہو جاتا تھا۔ یوں زبان میں غضب کی شیرینی اور روانی آجاتی تھی

کہانیاں چھوٹے بچوں کے لیے اور ہوتی تھیں، بڑے بچوں کے لیے اور، اور ان سے بڑوں کے لیے اور۔ ایسی بھی کہانیاں ہوتی تھیں جن کو بڑے اور بوڑھے سب سنتے تھے اور مزے لیتے تھے۔

بہت چھوٹے بچوں کے لیے چڑیا چڑے کی کہانیاں۔ اس سے بڑے کے لیے شیخ چلی کی کہانیاں تھیں۔ ان میں بھدے، بے تکی باتوں کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا کہ بچہ تک اس کے بے تکے پن کو محسوس کرتا تھا۔ ان سے بڑوں کے لیے شاہزادے اور پریوں کی کہانیاں تھیں۔ سیانوں کے لیے "الہ دین کا چراغ" اور "علی بابا چالیس چور" تھا۔

ان سب کہانیوں میں مقصد ہوتا تھا۔ یعنی وہ زندگی کے مصالح اور اخلاق کی خوبیاں سمجھاتی ہیں۔ کبھی تو رنڈے کو سوتیلی ماں سے ہوشیار کیا جاتا ہے، کبھی سوتیلی ماں کو برے انجام سے ڈرایا جاتا ہے۔ کچھ کہانیاں تقدیر پر صابر و شاکر رہنا سکھاتی ہیں۔ کچھ تقدیر کے ہوتے ہوئے تدبیر کو اہمیت دیتی ہیں۔ بعض کہانیاں ہمت و جرأت کو کامیابی اور ترقی کی کلید ثابت کرتی ہیں۔

عام طور پر جو کہانیاں رائج ہیں یا تھیں ان میں مقصد چھپ گیا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک مفرد کہانی نہیں بلکہ کئی چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے مرکب ہوتی ہیں۔ کہنے والے دلچسپی بڑھانے کے لیے ایک کہانی میں دوسری جوڑتے چلے گئے۔ ضرورت کے موافق کہیں کہیں ذرا ذرا سی کتر بیونت بھی کر دی۔ مثلاً اس وقت ہمارے سامنے اشرف صبوحی صاحب کی کتاب 'شہزادۂ فی نواز' ہے۔ اس میں ایک کہانی 'دنیا کی شہزادی' ہے۔ یہ کہانی کئی طرح سے میں نے سُنی ہے۔ اس کہانی کا پہلا قصہ شاہ زادی اور شاہ زادے کا ہے۔ شاہ زادہ شہزادی پر عاشق ہوتا ہے۔ پھر اس کے حاصل کرنے میں کام یاب ہوتا ہے اور شادی قرار پاتی ہے۔ دوسرا قصہ وزیرزادے کا ہے۔ اس کو پتا چلتا ہے کہ شاہ زادے اور شاہ زادی پر مصیبتیں آنے والی ہیں۔ وہ ان کی روک تھام میں

اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ ہیرو بدل جانے سے دونوں قصّے صاف دو معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں قصّے الگ الگ کہانیوں کی شکل میں بھی پائے جاتے ہیں اور دوسری کہانیوں کا جز ہو کر بھی۔

لیکن پُرانی کہانیاں اچھی ہوں یا بُری، اب پُرانی ہوگئیں۔ تعلیم کا حلقہ بڑھ رہا ہے ہر بچّے کو ڈرامائی انداز میں کہانی کہنے والی نانی دادی نہیں مل سکتی ہے۔ عام بچوں کو اگر کہانیوں کی نعمت مل سکتی ہے تو صرف کتاب کی شکل میں۔ بچوں کے لیے کہانی لکھنے والے کا کام بہت سخت کام ہے۔ اوّل تو اسے ڈرامائی پن کی کمی کو جو کہنے والیاں لہجے سے پیدا کرتی تھیں قلم کی جنبش سے پورا کرنا ہے۔ وہ مشکل الفاظ جو محض لہجے کے دباؤ میں آکر معنی دے جاتے تھے تحریر سے نکال دینا ہے اور ان کی جگہ آسان الفاظ لانا ہے۔ پہلے مناظر، کردار، قلبی کیفیات کے بیان کا ہر جگہ ایک ڈھرا تھا۔ مثلاً جہاں کہیں جنگل ہوگا اس کا سناٹا مذکورہ بالا الفاظ میں بیان ہوگا۔ ان الفاظ میں جو کچھ تنوع پیدا ہوتا تھا وہ کہنے والے کے جذبات سے۔ اب اگر لکھنے میں بھی ہر جگہ یہی الفاظ آئیں گے تو دم اُلجھ جائے گا۔ ان میں تنوع پیدا کرنا ہے۔

ریل، لاریاں، سنیما، تصویروں، وغیرہ وغیرہ چیزوں سے بچّے کا ماحول زیادہ تعلیم دہ ہوگیا ہے۔ اب وہ پہلے کے بچوں سے زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ اس لیے شیخ چلّی کی باتوں میں اسے مزہ نہیں آنے کا۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوگئی ہے کہ تدریس بدل گئی ہیں۔ اس وجہ سے کہانیوں کے مقصد بے کار بلکہ کہیں کہیں مضر ہو گئے ہیں۔ مثلاً "شہزادۂ ذی نواز" کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک لڑکی ہمایوں کے مقبرے سے رات کو بلّی کا کالا بچّہ اٹھا لاتی ہے۔ بالآخر بعد کو پتا چلتا ہے کہ وہ جن ہے۔ کہانی پڑھنے کے بعد رات کی کالی بلّی سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ موجودہ علوم کی روشنی میں یہ مقصد نہ صرف بے ضرورت بلکہ مضر ہوگیا ہے۔ اب ہم بچّے کی اس بات کو "ڈر انھیں نہیں لگتا" زیادہ سے زیادہ پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔

کہانیوں میں جیسا کہ ہونا چاہیے کلچر کا رنگ بھی ہوتا تھا۔ "قناتوں سے گھرا ہوا نہایت وسیع زربفتی شامیانہ کھنچا ہوا ہے۔ ڈوریاں ریشم اور کلابتوں سے بٹی ہوئی ہیں۔ جھالریں رنگ برنگ کے آویزے لٹک رہے ہیں" اب نگاہیں اس تصویر سے مانوس نہیں ہیں۔ اب موجودہ کلچر کا نقشہ ہونا چاہیے۔

سنیما اور اخباروں وغیرہ کا بھی اثر پلاٹ پر پڑ رہا ہے۔ اب بچّہ پلاٹ کی ان کمزوریوں کو دیکھ لیتا ہے جن پر

پہلے نگاہ نہیں پڑتی تھی۔

بچوں کی کتابیں

بچوں کے ادب کا رواج یو پی میں بہت پرانا ہے۔ 'پھول' اور 'غنچہ' بہت مقبول رہ چکے ہیں۔ ان رسالوں کی کہانیاں زیادہ تر انگریزی سے لی جاتی تھیں۔ ان کہانیوں کے کردار، رسم و رواج سب انگریزی ہوتے تھے۔ بعض جگہ سمجھ میں ہی نہ آتے تھے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ ہونے سے تو اچھا ہی تھا۔

بچوں کے ادب کی اصلاح کی باقاعدہ کوشش مکتبۂ جامعہ نے کی۔ اس نے بدیسی باتوں کو یک قلم چھوڑ دیا۔ شاہزادوں اور شاہزادیوں کے قصے چھوڑ کر عام زندگی کے قصے لیے۔ کلچر میں ہندستانی پن پیدا کیا۔ کہانی کی زبان میں جو انگریزی پن آگیا تھا اس کو دور کر کے اس کی جگہ روزمرہ کی بول چال داخل کی۔

مجھے یاد ہے کہ جب ایسی کتابیں لکھنؤ میں آئی ہیں تو بڑے لوگ کیسی مسرت بھری حیرت سے ان کو دیکھتے تھے۔ بار بار دیکھتے تھے اور اردو کی ترقی پر خوش ہوتے تھے۔ بچوں کی خوشی کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔

اب تو جامعہ کے راستوں پر چلنے والے بہت سے اشاعت گھر ہیں۔ انڈین پریس الہ آباد، انوارِ احمدی پریس الہ آباد نے بہت سی کتابیں تیار کرائی ہیں۔ دو چار کتابیں دانش محل نے بھی شائع کی ہیں۔

بچوں کی کہانیوں کے شائع کرنے کا کام انوارِ احمدی پریس بہت بہادری سے کر رہا ہے۔ اس کی خدمات ہر طرح سے ہمت افزائی کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک تنقیدی قلم رہبری نہ کرے ادب صحیح راستے پر لگ نہیں سکتا ہے۔ انوار احمدی پریس کے سات سات کتابوں کے دو سٹ ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب سو سوا سو صفحے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تیاری میں کتنی محنت اور لاگت آئی ہوگی۔

ان دونوں سٹوں میں بہت سی فروگذاشتیں تو ایسی ہیں جو معمولی توجہ سے دور ہو سکتی تھیں۔ مثلاً قصوں کی ترتیب خراب ہے۔ اکثر پیراگراف ضرورت سے زیادہ طویل ہوگئے ہیں۔ "الف لیلہ کی کہانیاں" میں جا بجا اشعار کھپائے گئے ہیں۔ ان سے کہانیاں بوجھل، بدمزہ اور مشکل ہوگئی ہیں۔

دوسرا سٹ 'اخلاقی کہانیاں' ہے۔ ایک زمانہ تھا جب خیال کیا جاتا تھا کہ بچے اخلاق اور معرفت کے رموز و نکات خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو گلستاں، بوستاں، کلید رمز اور اخلاقِ جلالی وغیرہ پڑھائی جاتی

تھیں۔ مگر اب تو وہ زمانہ نہیں رہا۔ لیکن یہ کتابیں ابھی تک اسی نقطے پر ہیں۔

مثال میں جلد (۶) کی ایک کہانی "بقال اور لومڑی" لیجیے اس کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک بقال کے پاس ایک ہوشیار لومڑی تھی۔ وہ ایک دن بقال کی غیر موجودگی میں دکان کی حفاظت کر رہی تھی۔ ایک اُچکّا چوری کی نیت سے آیا مگر لومڑی کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ اچکّا چالاکی سے سوتا بن گیا۔ اب لومڑی دھوکے میں آگئی اور اسے سوتا جان کر سوگئی۔ اچکّا بقال کی اشرفیاں لے کر چمپت ہوا۔ اب جو بقال آیا تو اشرفیاں غائب تھیں۔

کہانی یہاں پر ختم ہوجاتی ہے۔ حالاں کہ بچّہ چاہتا ہے کہ ابھی معلوم ہو کہ اُچکّے کو کیا سزا ملی۔ کیا دُنیا میں مجرم یوں ہی بے کھٹکے گھوما کرتے ہیں؟

کہانی اِن سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیتی ہے۔ بلکہ کہتی ہے کہ ادھر سے ایک عارف کا گزر ہوا انھوں نے فرمایا:۔

"دنیا والو! اس چور سے سبق حاصل کرو۔ یہاں جو کوئی غافل ہوجاتا ہے وہ نقدِ جان اور دولتِ ایمان کو اسی طرح کھو بیٹھتا ہے جس طرح اس بقال نے تھیلی کھوئی"

کہانی اور عارف کے قول میں جو عقلی اور جذباتی تعلق ہے اس کو بچہ نہیں محسوس کرسکتا ہے۔ بچّے کے لیے کہانی پہلے ہی ختم ہوگئی۔ عارف کی کہانی ایک دوسری غیر دل چسپ کہانی ہے۔

ڈرامے کا احیا

سنیما کا بولنا تھا کہ تھیٹر غائب ہوگیا۔ کیوں کہ پُرانے طرز کے تھیٹر میں جتنی باتیں تھیں وہ توسب سنیما میں آہی گئیں، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دل چسپ چیزیں شامل ہوگئیں۔ فلم تھیٹر سے بہت زیادہ دل چسپ ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھیٹر کی کمپنیاں بند ہوگئیں۔ دو چار جو چھوٹی موٹی کمپنیاں زندہ رہ گئیں انھوں نے جاکر میلوں ٹھیلوں میں پناہ لی۔ پتا نہیں اب بھی کوئی زندہ ہے یا نہیں۔

کالجوں اور اسکولوں میں بھی ڈرامے کا رواج بہت پُرانا ہے۔ پہلے شکسپیر کے ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ سمجھ آنے لگی۔ یہ نظر آگیا کہ آغا حشر کے ڈرامے تمام عیبوں پر بھی انگریزی ڈراموں سے زیادہ

پُر اثر ہوتے ہیں۔ مگر جب سنیما بولنے لگا تو یہ ڈرامے بھی ہاتھ سے گئے۔

بولتے سنیما کے ساتھ تماشائیوں کی دنیا کا اور کالج کی دنیا کا ڈراما تو ختم ہوگیا، لیکن اس زمانے میں اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے ڈرامے نے جنم لیا۔ ان ڈراموں کی کتابیں عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب نے لکھیں اور مکتبۂ جامعہ نے چھاپیں۔ پھر یہ کتابیں یوپی میں آئیں اور لڑکوں نے ان کو جا بجا تمثیل کیا۔ لیکن جب ان میں تمثیل کی جان پڑی تو یہ زیادہ جان دار ثابت نہ ہوئیں۔ مثال کی طور پر ایک ڈراما ،محنت، (مصنفہ عبدالغفار مدھولی مکتبہ جامعہ) لیجیے۔ یہ اس طرح شروع ہوتا ہی:-

(انور کا باغیچہ۔ انور پودوں کو پانی دے رہا ہی۔ انور کا دوست اشرف داخل ہوتا ہی)

اشرف محنت۔ محنت۔ دن رات محنت۔

انور "اخاہ۔ اشرف صاحب تشریف لائیے۔"

(پھر پانی دیتا ہی)

"انور۔ کیوں نہیں۔ خیر اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں توکل والی بحث کا فیصلہ چاہتا ہوں۔"

"ہاں۔ آپ کرسی پر تشریف رکھیے۔ بس ایک کام اور رہ گیا ہی۔ کوئی پانچ منٹ اور صرف ہوں گے۔ بس میں ابھی آیا۔"

(گملے کی مٹی کو نرم کرتا ہی)

[اشرف کرسی پر بیٹھ کر اخبار ،مزدور، کا مطالعہ کرتا ہی۔ انور ہاتھ منھ دھوکر چہرے کو تولیے سے صاف کرکے آتا ہی۔]

اس کی حیثیت ایک اچھے مکالمے کی ہی۔ یہ ڈراما نہیں ہی۔ ڈرامے کے لیے پہلی ضروری چیز جذبات کی شدت ہی۔ ایسی شدت جس کے تار و پود پر تمثیل کرنے والے کردار خود بخود اپنے لہجے اور بدن کے حرکات و سکنات کو ڈھال سکیں۔ یعنی پوری طرح اس وقت کے جذبے میں جذب ہوسکیں۔ دوسری طرف تماشائی اپنی تمام ضروری باتوں کو بھول کر اِدھر متوجہ ہوجائیں۔

کوئی اچھا ڈراما نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کا یہ مشغلہ یوپی کے اسکولوں میں کامیابی سے نہ چل سکا۔

لیکن اب ڈرامے نے نیا جنم لینا شروع کیا ہے۔ اس کی پہل دو سال ہوئے جب ہوئی۔ رشید جہاں صاحبہ نے پریم چند کے افسانے 'کفن' کی ڈراما بندی کر کے لکھنؤ میں تمثیل کیا۔ اس کی تحریر اور تمثیل دونوں ان مبالغہ آرائیوں اور غیر حقیقی حرکات و سکنات سے خالی تھیں جو آغا حشر کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ ساتھ ساتھ جذبات کی شدت بھی تھی۔

فاربس ہائی اسکول فیض آباد نے اسی سال جنوری میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا 'مشاعرہ' تمثیل کیا۔ مگر اس کی قیمت علمی زیادہ ہے تمثیلی کم۔ اس وجہ سے تماشائیوں پر فتح نہ حاصل ہو سکی۔ بیسک ٹریننگ سنٹر فیض آباد کے بچوں نے ایک ڈراما 'بھوت گھر' کھیلا۔ یہ کافی کام یاب رہا۔ سب سے کام یاب ڈراما 'سونے کا گھونٹ' رہا جو بیسک سنٹر کے اسٹاف نے دو مرتبہ پیش کیا۔ اس کے پس منظر میں ایک سیاہ پردا تھا۔ کرداروں کی سجاوٹ بھی قدرتی تھی۔ ڈرامے کا موضوع عشق و محبت نہ تھا۔ ان تمام غیر معمولی باتوں کے باوجود کام یاب رہا۔ کیوں کہ ڈراما عمدہ لکھا ہوا تھا اور تمثیل بھی اچھی طرح کیا گیا تھا۔

زبان کی ترقی کی بہت سی راہیں کھل رہی ہیں۔ اور کام یاب رہیں۔

نئے رسالے

کچھ نئے رسالے بھی دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر مضروب لکھنؤ اور ترکش لکھنؤ ہیں۔ اپنی سجاوٹ میں کسی اچھے رسالے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کم سرمایے سے نکلے ہیں اور رفتہ رفتہ ترقی کی امید پر زندہ ہیں۔ پہلے تبصرے میں آ چکا ہے کہ اب حالات سازگار ہو رہے ہیں۔ اگر محنت اور دوڑ دھوپ کی جائے تو رسالے کام یاب ہو سکتے ہیں۔ نئے رسالوں کے مضامین امید افزا ہیں۔

نئی کتابیں

مداوا مصنفہ غلام احمد فرقت۔ مطبع یوسفی لکھنؤ۔ موضوع ہے ادب کی نئی راہوں مثلاً نظم بے ردیف و قافیہ کی مخالفت۔ اس میں بہت اچھے اچھے اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین ہیں، اور مصنف کی پچاس طنزیہ نظمیں ہیں جن میں بے ردیف و قافیہ نظموں کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے نرالی چیز ہے۔ ادبی اُپج کی پیداوار ہے۔

نئے لکھنے والے

نئے لکھنے والوں سے وہ لکھنے والے مراد ہیں جو اب تین چار سال پرانے ہو چکے ہیں۔ اور ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

احتشام حسین صاحب۔ تنقید و تبصرے کے میدان میں باعزت جگہ حاصل کر لی ہے۔ متعدد رسائل میں مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ خیالات کا تجزیہ خوب کرتے ہیں۔ بات سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ نگاہ میں جدت تحریر میں روانی ہے۔

چودھری محمد علی۔ یہ کسی طرح نئے نہیں ہیں۔ پرانوں میں بھی پرانے ہیں۔ کبھی 'اودھ پنچ' میں "بوانصیبن کے فلسفیانہ خیالات" نکلا کرتے تھے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ وہ رہ رہ کر ادبی میدان میں آتے ہیں۔ اور جب آتے ہیں نئے بن کر آتے ہیں۔ اب کئی برس کے بعد 'منزل' لکھنؤ میں آئے ہیں۔ اور اب کی پرانے ڈھنگ کی طویل تمہید اور گھما کر بات کہنا چھوڑ کر جدید طرز کا اعجاز اور پھرتی لے کر آئے ہیں۔ انتہائی سنجیدہ تیوروں سے قہقہے کی بات کہہ جانا انہی کا حق ہے۔ اپنے ایک مضمون یادِ احباب میں کہتے ہیں :-

> "محلے میں ایک عورت کے لڑکا ہو پڑا۔ شوہر اس کا برسوں سے باہر تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ لوگوں نے ایسا تعجب کیا گویا اَن ہونی بات ہوئی۔ ہمدرد عورتیں جو آڑے وقت کام آتی تھیں، ماں کی ہمدردی میں بچے کو کوسنے دینے لگیں۔"

ان چند فقروں میں بلا کی جان ہے۔ منظر، کردار، ظرافت، فضا، سب کچھ ہے اور جدید خوبیوں اور اسلوب کو لیے ہوئے۔

——— ⁕ (※) ⁕ ———

تبصرے

ادبیات

اُردو کے ہندی ادیب (مؤلفہ سید قاسم علی صاحب ساہتیا النکار۔ صفحات تقریباً ۱۵۰۔ قیمت چھ روپے۔ جعفری برادرس مالک انوار احمد پریس الہ آباد)

یہ کتاب مؤلف نے ہندی زبان اور ناگری رسم خط میں لکھی ہے۔ یہ بھی اُردو کی خدمت ہے اگر سلیقے اور صحت کے ساتھ کیا جائے۔ لیکن افسوس کہ زبان اور واقعات کی بہ کثرت غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً مولانا شبلی کے تذکرے میں ان کی تصانیف میں "شاعراجیم" ایک کتاب بتائی گئی ہے اور قوسین میں اس کے معنے لکھے ہیں "مہاں کوی" یعنی بڑا شاعر۔ یہ شعرالعجم کی خرابی ہے۔ ان کی دوسری کتاب کا نام "سیرت النغان" لکھا ہے۔ یہ سیرت النعمان ہے۔ نون کا نقطہ عین پر سمجھ کر نعمان کو غان لکھ دیا ہے۔ تیسری کتاب "مواجنا اُن یسنا ودبیر" یہ موازنۂ انیس و دبیر ہے۔ مولانا کی تصانیف پر کیا اچھی راے دی ہے "شبلی کی کتابوں سے علمی، ساہتیہ (ادب) وصیات، نظر، مذاق اور تنقید اور ساہتیہ (ادب) کا پتا لگتا ہے" نہ معلوم "وصیات" کیا بلا ہے۔ ایک جگہ "الف لیلہ" لکھ کر اس کے معنی قوسین میں "بڑی کہانی" لکھے ہیں۔ مولانا عبدالماجد کی ایک کتاب کا نام "فلاصفی عزت عام" لکھا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ایک کتاب "جواہر سخن" بتائی ہے اور لکھا ہے کہ "آپ کی کتابوں میں سنسنی سی پیدا ہوجاتی ہے" ڈاکٹر عابد حسین کے متعلق لکھتے ہیں "تلاش حق جیسی قومی کتابوں کے برابر ترجمے کرتے چلے جاتے ہیں" مولوی مفتی برہان الحق کے متعلق لکھتے ہیں "آپ قومی لیڈر اور حکیمی کرکے اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں" ڈاکٹر اعظم کریوی کو میرٹھ کا باشندہ بتایا ہے حالاں کہ ان کے نام کے ساتھ "کریوی" لکھا ہوا ہے۔ ثاقب کو قومی شاعر لکھا ہے۔ حفیظ جالندھری کی ایک تصنیف تاریخ ہند بھی لکھی ہے۔

نواب محسن الملک کے حالات میں لکھا ہو کہ "آپ کی لڑکی بھی طیبہ بیگم ادیب تھی جس نے " انوری بیگم "، " احمدی بیگم " ناول لکھے ہیں"۔ نواب صاحب کے کوئی بیٹی نہ تھی۔ طیبہ بیگم نواب خدیوجنگ کی بیگم اور نواب عمادالملک کی بیٹی تھیں۔ مولوی نذیر احمد کی تصانیف کے ناموں کی بڑی مٹی پلید کی ہو۔ مثلاً "نواتوشش"، "موزہنسا" وغیرہ۔ احسن مارہروی کے تذکرے میں لکھتے ہیں "دیوانِ ولی کو آپ نے مفید جذبات کے ساتھ چھپایا ہو"۔ اس قسم کے عجیب، غریب واقعات اور دل چسپ عبارتوں سے کتاب بھری پڑی ہو۔

ایک تصویر جس کے نیچے مولانا شبلی کا نام لکھا ہو بہت ہی عجیب ہو۔ غالباً یہ منشی امیراحمد مینائی کی تصویر ہو۔ کتاب کی زبان بہت ناقص اور حالات بہت تشنہ اور بعض اوقات غلط ہیں۔ ہندو ادیبوں کے حالات تو بہت کم ہیں البتہ کلام کے اقتباسات بہت طویل ہیں جن سے کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہو۔ ادیبوں کے کلام پر ادبی اور تنقیدی رائیں گول مول غیرواضح اور بعض اوقات بےمحل ہیں۔ افسوس کہ ایسے اچھے موضوع پر ایسی ناقص کتاب لکھی گئی ہو۔

ماڈرن پرشین پائٹری

از ڈاکٹر محمد اسحاق بی ایس سی۔ پی ایچ ڈی لکچرار عربی فارسی۔ کلکتہ۔

انگریزی زبان میں یہ ایک مقالہ ہو جس کو فاضل مصنف نے لندن یونی ورسٹی میں پیش کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہو۔ اس سے پیشتر وہ اسی موضوع پر ایک جامع کتاب "سخن ورانِ ایران در عصرِ حاضر" شائع کر چکے ہیں جس میں ایران کے معاصر شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

موجودہ کتاب میں جدید فارسی شاعری کی پیدایش اور اُس ماحول پر بحث کی گئی ہو جس میں اُس نے پرورش پائی ہو۔ اس بحث میں جدید شاعری کی نئی زبان اور نئے موضوعات شامل ہیں۔ یہ بتایا گیا ہو کہ شروع سے اب تک فارسی شاعری میں زبان نے کیا کیا شکلیں بدلیں اور اب آخری شکل کیا ہو، عروض میں عہد بہ عہد کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور سیاسی تغیّرات کے ساتھ ساتھ موضوعاتِ شعر کیوں کر بدلتے رہے۔

مصنف کا یہ کہنا بالکل بجا ہو کہ فارسی میں جدید شاعری کا آغاز سنہ ۱۹۰۶ء سے سمجھنا چاہیے۔ جب کہ

ایران میں آئینی حکومت قائم ہوئی۔ اُس وقت سے لے کر سنہ ۱۹۲۵ء تک (جو رضا شاہ پہلوی کی تخت نشینی کا سال ہے) ایرانی شعرا ایسے مضامین پر نظمیں لکھتے رہے جو ایران کی اقتصادی معاشرتی اور سیاسی اصلاحات سے متعلق تھے، ان نظموں میں بعض اچھی ہیں لیکن اکثر و بیشتر کے بارے میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ "کلام موزوں" کے تحت میں آسکتی ہیں، رضا شاہ کا زمانہ استبداد کا دور تھا جس میں شاعروں کو سیاسی یا اجتماعی موضوعات پر کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایران اپنی شاعری کا ورثہ کھو چکا ہے۔ فاضل مصنف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے اور ہم بھی ان سے متفق ہیں کہ مولانا جامیؒ کے بعد ایران میں شاعری کا انحطاط شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ دورِ مغلیہ میں فارسی شاعری کا مرکزِ ثقل ایران سے منتقل ہو کر ہندوستان میں آگیا اور نسلِ حاضر کے زمانے تک وہ یہیں رہا۔ بلا خوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ فارسی کا آخری بڑا شاعر اقبال ہے۔

ایران میں جدید شاعروں کی کثرت ہے۔ کتاب زیرِ بحث میں ۸۳ شاعروں کے نام گنوائے گئے ہیں جن میں سے اکثر زندہ موجود ہیں۔ بعض وہ ہیں جو ایران کی گزشتہ عظمت کے گیت گانے والے ہیں بعض اخلاقی اور اجتماعی اصلاحات کے محرک ہیں۔ بعض قومی جذبات کے اُبھارنے والے ہیں اور بعض سیاسی حالات پر نکتہ چینی کرنے والے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی حالیؔ یا اکبرؔ یا اقبالؔ نہیں ہے۔

لیکن ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ فارسی میں اُردو کی جدید شاعری کی طرح اوزان کو توڑنے پھوڑنے اور قافیوں کو غیر ضروری قرار دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بعض کم درجے کے شاعروں نے اگر ایسا کرنا چاہا بھی ہے تو ان کی کوششوں کے نتیجے جاذبِ توجہ نہیں ہوسکے۔ اسی طرح بعض ایسے شاعروں کی کوششیں بھی جنھوں نے فارسی کو بزعمِ خود "خالص" بنانا چاہا ہے ناکام رہی ہیں۔

کتاب زیرِ بحث جدید فارسی شاعری پر ایک مختصر لیکن عمدہ تبصرہ ہے جس کو پڑھنے سے ایک شخص اس موضوع سے خاصا واقف ہوسکتا ہے۔ تعدادِ صفحات ۲۲۶، طباعت نہایت دیدہ زیب ہے، قیمت کتاب کے اوپر کہیں نہیں لکھی گئی لیکن کسی فہرستِ کتب میں ہم نے پندرہ رُپے لکھی دیکھی ہے۔ اگر واقعی یہ قیمت ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ضخامت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے، مقامِ اشاعت کلکتہ۔ سنہ ۱۹۴۲ء (م - ا)

حرب و ضرب

انگریزی میں ایک مثل ہو کہ کسی کی نقل کرنا بھی اُس کی تحسین کا ایک پیرایہ ہو۔ اقبال مرحوم کی اُردو شاعری پر یوپی والے ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے بعض نئے شاعر اب اُن کی تقلید میں سرگرم ہیں۔ اس کا ایک تازہ نمونہ حضرت رآز یزدانی، رام پوری کا یہ مجموعۂ نظم ہو، جو رام پور کے ایک مطبع سے بہت صاف اور خوش خط چھاپ کر شائع کیا گیا ہو۔ شروع میں نوجوان مصنف کی رنگین تصویر بھی موجود ہو اگرچہ وہ کچھ بہت اچھی نہیں چھپی۔

حضرت رآز سے باہر کے لوگ زیادہ واقف نہ ہوں گے۔ ان کی عمر بھی غالباً ابھی کہولت کی منزل تک نہیں پہنچی ہو، لیکن ایک عزیز نے ہمیں لکھا ہو کہ رام پور میں ان کا کلام خاصی طرح مشہور و مقبول ہوگیا ہو اور زیرِ نظر مجموعے سے بھی ظاہر ہو کہ وہ بڑے پُرجوش اور پُختہ مشق سخن گو ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سیاسی خیالات کے باعث انھیں حکومت رام پور نے قید کردیا ہو اور کتاب کے ایک قطعے سے، جس کا عنوان ہو "والدہ کی خدمت میں جیل سے" (صفحہ ۸) اس خبر کی تصدیق ہوتی ہو۔ کتاب کے آخر میں لائق مصنف کے دستخط اور ۳۱ر جنوری سنہ ۴۰ء؛ تحریر ہو اگرچہ یہاں بھی پورا یا اصلی نام نہیں لکھا اور نہ شروع میں کوئی تمہید یا تعارف شامل ہو جس سے رآز صاحب کے مزید حالات کا علم ہوتا۔

کتاب کے آخر میں قدیم طرز کی غزلیں ہیں ان کے آغاز میں سرورق کے نیچے لکھا ہو: ع

اُنچہ در تقلید یاراں گفتہ ام

لیکن غزلیات کے اس مجموعے کو تین ابواب میں تقسیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔

کتاب کے چھ باب یعنی بڑا حصہ قطعات اور مختلف نظموں پر مشتمل ہو اور صاف معلوم ہوتا ہو کہ حضرت رآز اسی کو اپنے خاص نتائج فکر کی حیثیت سے اہلِ نظر کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس حصے میں "اعترافات"۔ "عصریات"۔ "اسلامیات"۔ "عرفانیات" وغیرہ چھ ابواب ہیں۔ اور قریب قریب ہرجگہ اقبال مرحوم کے خیالات بلکہ طرزِ بیان اور الفاظ تک کی گونج سُنائی دیتی ہو۔ کتاب کا پہلا عنوان آیۂ کریمہ "اقرا باسم ربك الذی خلق" اور پہلا شعر یہ ہو ؎

اپنی صفات دیکھ کر سمجھا تری صفات میں ۔۔۔ خالقِ کائنات تو، شورشِ کائنات میں

س شعر میں بندش کی خوبی اور فکری قوت موجود ہو لیکن تخیل پوری طرح روشن اور واضح نہیں اور نہ دونوں مصرعوں
ں کوئی صاف ربط پایا جاتا ہو۔ یہی شعر رازؔ صاحب کی ساری شاعری کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہو۔ کم سے کم
یر تبصرہ مجموعے میں ہم جگہ جگہ محسوس کرتے ہیں کہ شاعر اس قدر اونچا اُڑتا ہو کہ اکثر غائب ہوجاتا ہو۔
پھر اقبالؔ کا طرزِ سخن خود ہی اغلاق سے خالی نہیں اس کی تقلید میں خواہی نہ خواہی لفظی اور معنوی تصنع کا رنگ
یدا ہوجاتا ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ؎

دلیل، دستِ قوی کے لیے ہو قبضۂ تیغ
نشاطِ نغمۂ مرداں ہو جوشِ نعرۂ جنگ
ص۱۷

محشرِ وارد رہن سے جو نظر واقف ہو   اس کو آساں ہو تماشائے مقامِ منصور
زحمتِ خار سے ہو منزلِ گل وابستہ   اس میں کلیوں کی خطائیں ہیں نہ پھولوں کا قصور
ص۱۹

”تقدیر“

”جو خون بہاتی ہو جواں مرد کی شمشیر   لکھ دیتے ہیں اس خون سے کم زور کی تقدیر
زندانِ تہذیب و تمدن کی مصیبت   محکومی و توفیقِ توکل کی ہو تعزیر
شاہیں کے لیے ننگ ہو اُن دانوں پہ گرنا   فطرت نے بنایا ہو جنھیں رزقِ عصافیر
کیا غم، جو فضاؤں میں کبوتر نہیں ملتے   ہو طاقتِ پرواز تو افلاک کا دل چیر“
ص۲۱

کچھ شبہ نہیں کہ رازؔ صاحب شعرگوئی کی فطری صلاحیت اور عمدہ مذاق رکھتے ہیں لیکن بلند پروازی اور فلسفیانہ شاعری کو مقبول و پُراثر بنانے کے لیے، جب کہ وہ حقائق سے بحث کرتی ہو، بہت وسیع اور باقاعدہ مطالعے کی ضرورت ہوتی ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ رازؔ صاحب نے فکرِ سخن کے ساتھ ساتھ اس طرف توجہ فرمائی تو وہ ایک وقت میں خود صاحبِ طرز یا کم سے کم اقبال مرحوم کے بہت اچھے معنوی

جانشین ہو جائیں گے۔

کتاب کی ضخامت ۴۰۰ صفحات، قیمت دو رُپے اور حضرتِ مصنّف سے "بزریا ظریف، رام پور" کے پتے سے طلب کی جا سکتی ہے۔

سلسلۂ مطبوعات عبدالحق اکیڈمی - حیدرآباد۔ دکن عبدالحق اکیڈمی، اُردو گلی، حیدرآباد دکن کی طرف سے تیرہ چھوٹی چھوٹی کتابوں کا سٹ شائع ہوا ہے جو بچّوں کی معلومات بڑھانے کے لیے مرتّب کی گئی ہیں۔ کہانیوں، قصّوں، ڈراموں اور بچّوں کی آپس کی بات چیت اور سوال و جواب کی شکل میں بچّوں کو نہ صرف اخلاقی اور ذہنی سبق دیے گئے ہیں بلکہ موجودہ زمانے کے بعض مسائل اور اس جنگ کے متعلّق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں اور ڈرامے زیادہ تر ایسے ہیں جو نشرگاہِ لاسلکی حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں۔ نشری مسالا یوں ہی "مختصر مفید" کے اصول کا پابند ہوتا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں میں موضوع کے انتخاب کے ساتھ ہی حُسنِ ادا اور آسان زبان کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعض جگہ خاص حیدرآباد کی مقامی بولی ہندستان کے لیے ذرا اجنبی ہوگی مگر یہ چٹخارے کا کام دیتی ہے اور مطلب خبط نہیں ہونے پاتا۔ اس لحاظ سے یہ کتابیں ہندستانی بچّوں کے لیے بھی مفید ہو سکتی ہیں۔ موضوع اور نام بھی ایسے منتخب کیے گئے ہیں کہ بچّوں کو خاص طور سے سُننے کی رغبت ہو اور یاد رکھنے اور سمجھنے میں سہولت ہو مثلاً:

(۱) کھٹّی میٹھی بتیاں (کہانیاں)	قیمت	۱۰/	(۸) چھتری فوج (بات چیت)	قیمت	۳/
(۲) لاڈلا اکبر (کہانی)	"	۱۰/	(۹) دسترخوان	"	۳/
(۳) رابن سن کروسو (ڈراما)	"	۱۰/	(۱۰) سادہ زندگی	"	۳/
(۴) چھومنتر کا دھاگا (")	"	۴/	(۱۱) کپڑے	"	۳/
(۵) عید (")	"	۸/	(۱۲) پڑوس	"	۳/
(۶) سمندری جہاز (")	"	۴/	(۱۳) جنگ کے بعد کیا ہوگا	"	۳/
وصول نہیں ہوئی (۷) زمین گول ہے (")	"	۸/			(د۔ ا)

سیاسیات و معاشیات

پارلیمانی طرزِ حکومت

ریاست حیدرآباد کی مجلسِ اتحادالمسلمین کی طرف سے ایک " دارالاشاعت سیاسیہ" کا شعبہ قائم کیا گیا ہو اور اُس نے چند کتابیں اور سیاسی تقریروں کے مجموعے شائع کیے ہیں۔ اس شعبے کی غالباً چھٹی کتاب یہ ہو جو ناظم صاحب دارالاشاعت کے الفاظ میں " مولوی منظورالحسن صاحب ہاشمی بی۔ اے کے وسیع مطالعے اور طویل مشقت کا نتیجہ ہو۔" موضوع کے اعتبار سے کتاب کے باموقع اور ضروری ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اُردو میں اب سیاسی آئین اور حکومت کی مختلف صورتوں پر دس پانچ کتابیں پہلے سے لکھی ہوئی مل سکتی ہیں۔ ماہانہ رسائل میں بھی اس بحث پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور خود جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد نے اپنے درسی نصاب کے واسطے سیاسیات پر کئی مشہور کتابوں کا ترجمہ کرایا ہو۔ اس نظر سے اگر یہ توقع کی جائے کہ نئی کتابیں سابقہ مطبوعات سے زیادہ جامع یا طرزِ بیان کے اعتبار سے، زیادہ شگفتہ اور واضح ہوں گی تو کچھ بے جا بات نہ ہوگی۔ پارلیمانی طرزِ حکومت کوئی سو صفحے کی چھوٹی سی کتاب ہو اور اس میں زیادہ تر برطانیہ کے آئین سے بحث کی گئی ہو۔ اجمالاً فرانس اور سوئیٹزرلینڈ کے طرزِ حکومت کا بھی بیان آگیا ہو۔ ضخامت کے اعتبار سے دیکھیے تو کتاب متوسط درجے کے اُردوخواں طبقے کے لیے لکھی گئی ہو لیکن طرزِ تحریر و ترتیب پر نظر کیجیے تو وہ ایسے شوقیہ پڑھنے والوں کو غالباً مشکل اور غیر دلچسپ معلوم ہوگی۔ ضرورت یہ تھی کہ کم سے کم بنیادی اصول کو بہت ہی صاف اور سلیس عبارت میں دل نشین کرایا جائے۔ فاضل مؤلف نے شاید اس صریح ضرورت کو محسوس نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر تمہید ہی میں لکھتے ہیں کہ اقتدارِ اعلیٰ کی آسٹین نے یوں تعریف کی ہو: " ایک متعین بالادست انسان جو کسی ہم رُتبہ بالادست انسان کا تابع نہ ہو اور موجودہ معاشرہ کی اکثریت سے اطاعت حاصل کرتا ہو، تو وہ متعین بالادست انسان معاشرہ کا اقتدارِ اعلا ہو اور وہ معاشرہ بہ شمولِ بالادست سیاسی اور آزاد ہو۔" پہلا خیال ہو کہ اس عبارت میں کتابت کی بھی دو غلطیاں ہوگئی ہیں لیکن چوں کہ معنی پوری طرح سمجھ میں نہ آئے اس لیے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہو۔

فاضل مولف نے اصطلاحات کے جو مرادف، موقع اور بے موقع بھی تحریر کیے ہیں ان سے عبارت بوجھل ہوگئی ہے۔ دوسرے بعض اصطلاحات نہ صرف بے ڈھنگی بلکہ ہمارے خیال میں نادرست ہیں۔ جیسے جابۂ چندسری راج، انبوہ شاہی وغیرہ، جو معنوی اعتبار سے ناقص اور صوری اعتبار سے بدنما ہیں۔ انگریزی لفظ "وی ٹو" کے لیے "مخالفت" استعمال کیا گیا ہے حال آں کہ پہلے سے (حقِ) "تنسیخ" بولا جاتا ہے اور معناً زیادہ صحیح ہے۔ کتاب کے مآخذ کی فہرست یا کتابیات کو شامل نہیں کیا گیا البتہ وزرائے اعظم اور شاہانِ جلیلہ کی فہرستیں آخر میں لگادی ہیں۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۹۷ صفحات پر صاف چھپی ہے اور بارہ آنے میں دارالاشاعتِ سیاسیہ، اُردو گلی، حیدرآباد کے پتے سے طلب کی جاسکتی ہے۔

مشرقِ بعید

دارالاشاعتِ سیاسیہ، حیدرآباد دکن ہی کی ایک اور کتاب "مشرقِ بعید" ہے جسے شاہ حسین صاحب رزاقی ایم اے نے تالیف اور مشرقِ بعید کے مسلمانوں کے نام معنون کیا ہے۔ پہلے "ابتدائیہ" کے عنوان سے ایک مجموعی تبصرے میں بتایا گیا ہے کہ یورپی اقوام نے کس طرح ایشیا کے ان بعید علاقوں میں رفتہ رفتہ اپنا اثر جمایا اور ہندستان سے آگے بڑھ کر بحرالکاہل کے بہت سے جزائر اور ساحلی ممالک پر قابض ہوگئے۔ گزشتہ صدی میں ان کی ساری کوشش اس پر مرکوز رہی کہ سلطنتِ چین کو کم زور کرتے کرتے بالآخر اس کے حصے بخرے کرلیے جائیں۔ چناں چہ زیرِ تبصرہ کتاب میں بار بار انھی ریشہ دوانیوں اور بدنصیب چین کی بربادیوں کے مناظر ہمارے سامنے سے گزرتے اور ہر دردمند دل کو غم زدہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہوسِ مُلک گیری کا یہ خوں چکاں تماشا آج بھی دنیا کے سب سے وسیع اور سب سے سرسبز و آباد مُلک میں کھیلا جارہا ہے کہ آخرکار اُسے سب سے نیا تباہ و برباد کرکے چھوڑے۔

کتاب کے حصۂ اوّل میں مشرقِ بعید کے تمام ممالک اور بڑے جزائر کے الگ الگ حالات بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں دوبارہ سلطنتِ چین کے اپنے قوی دشمنوں کے ساتھ جو معاملات پیش آئے، انھیں جداگانہ عنوانات کے تحت تحریر کیا ہے کہ تاریخِ حاضرہ کی یہ الم ناک داستان اچھی طرح ناظرین کے ذہن نشین ہوجائے۔

فاضل مولف نے محنت اور سلیقے سے کتاب مرتب کی ہے۔ ملی جذبات اور انسانی ہم دردی کا جوش بھی جا بجا نمایاں ہے لیکن کتاب اگر عام ناظرین کے واسطے لکھی گئی ہے تو ہمارے خیال میں اسے اور زیادہ سلیس بنانے کی ضرورت تھی۔ اشخاص و مقامات کے نامانوس اعلام زرا جلی قلم سے اعراب کی پوری صحت کے ساتھ لکھے جاتے اور اعداد و شمار بھی تازہ ترین فراہم کرنے ضروری تھے۔ مثلاً آس ترے لیا کی آبادی ۶۴ لاکھ چند ہزار بتائی گئی ہے (صفحہ ۸۸) حال آں کہ اب اس کا شمار ایک کرور کے قریب پہنچ گیا ہے۔ کتابت کی بھی غلطیاں رہ گئی ہیں اور بعض اوراق کا خط زیادہ گنجان ہوگیا ہے۔ آیندہ طبع کی نوبت آئے تو ان اسقام کا احتیاط سے ازالہ ہوجانا چاہیے تاکہ یہ مفید کتاب زیادہ مقبول ہوسکے۔

صفحات ۱۴۴۔ قیمت سوا رُپیہ۔ ملنے کا پتا، دارالاشاعتِ سیاسیہ۔ اُردو گلی۔ حیدرآباد دکن۔

سلسلۂ مطبوعات بزمِ معاشیات جامعۂ عثمانیہ

جامعہ عثمانیہ کے فاضل اساتذہ میں جو اپنی لیاقت کے سبب بیرونِ حیدرآباد کیا بیرونِ ہندستان بھی مشہور ہیں، ایک ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب پروفیسر معاشیات ہیں۔ پروفیسر صاحب نے طلبہ میں عملی معاشیات کا بڑا اچھا ذوق پیدا کردیا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم پانے کے بعد کیسا دقیق مضمون کیوں نہ ہو اتنا ضرور پلے پڑ جاتا ہے کہ اپنی زبان میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکے۔ اسی استعداد، ذوق اور جذبے کی بدولت بزمِ معاشیات جامعہ عثمانیہ کی طرف سے چند مختصر مگر بہت مفید اور برمحل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بڑی قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ کتابوں میں تازہ معلومات اور صرف ضروری باتیں دی گئی ہیں۔ یہ بیش تر خود جامعہ عثمانیہ ہی کے فارغ التحصیل اور موجودہ طلبہ کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ زبان سب کی صاف اور سلیس ہے اور ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے کہ علمی اصطلاحات کو بھی عام فہم بنایا جائے۔ یہ گویا جامعہ عثمانیہ کے اس اولین مقصد کو حاصل کرنے کی پہلی سعی ہے کہ سارا ہندستان اپنی زبان میں مغربی علوم اور ان کی پیچ در پیچ باریکیوں کا مطالعہ کرسکے۔ اور یہ سعی بہت کام یاب رہی ہے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی کتب کے برعکس ان کی قیمت، حجم اور تقطیع اس قدر مختصر ہے کہ ملک میں جلد ہی ان کتابوں کو قبولِ عام حاصل ہوجانا چاہیے۔

(۱) "ہندستان کے زر پر جنگ کے اثرات" مؤلفہ محمد احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) ۱۰۸ صفحے قیمت ۱۲ ۔اس مختصر رسالے میں معاشیات اور معاشی زندگی کے سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے یعنی زر کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ روپے پیسے کے معاملات کا تعلق تو ہر فرد بشر سے ہو لیکن اس کی علمی بلکہ یوں کہیے کہ کاغذی اور حقیقی قدر اپنی چند در چند پیچیدگیوں کی وجہ سے صرف معدودے چند کا اجارہ بن کر رہ گئی ہو۔ قابل مؤلف نے ایک طرف تو ان پیچیدہ مسئلوں کو صاف سیدھی زبان میں اس طرح بیان کر دیا ہو کہ پڑھنے والا بڑی اچھی طرح سمجھ سکتا ہو بلکہ عجب نہیں جو لوگوں کو تعجب ہو کہ یہ مسئلے اب تک کیوں صرف معاشین کا اجارہ بنے رہے۔ اور دوسری طرف یہ ثابت ہوتا ہو کہ اردو زبان میں بڑے سے بڑے پیچیدہ علمی مسئلوں اور معاشی و تجارتی کوائف کے بیان کی کیسی صلاحیت موجود ہو صرف بیان کرنے والا ایسا ہو کہ زبان بھی جانتا ہو اور موضوع پر بھی عبور رکھتا ہو۔

(۲) "حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات" ـــــ (حجم ۸۸ صفحے قیمت ۸/) مؤلفہ نظام الدین احمد صاحب (عثمانیہ)، پچھلے دس بارہ سال سے حیدرآباد نے صنعتی لحاظ سے بڑی ترقی کی ہو۔ موجودہ جنگ نے سمند ترقی پر ایک تازیانے کا کام کیا اور حکومت حیدرآباد کے ساتھ ساتھ حکومت ہند نے جو دلچسپی لی اس کی بدولت حیدرآباد جو اپنی وسعت، وسائل اور دیگر سہولتوں کی وجہ سے یوں ہی مالا مال تھا اب اور زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے دوش بہ دوش چلنے کا دم بھر رہا ہو۔ دکن میں ہن اور کنچن برسنا تو ایک زبان زد محاورہ تھا مگر زیر تبصرہ کتاب میں حیدرآباد کے صنعتی اور کاروباری شعبوں کے جو مصدقہ اعداد و شمار دیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہو کہ خام اشیا کی برآمد، سونے چاندی کے معمولی کام اور بٹن سازی اور پارچہ بافی کے علاوہ اب وہاں خام اشیا کو خود کام میں لاکر مصنوعات کی برآمد کرنے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہو۔ کوئلے، لوہے کی کانیں نیز کاغذ، سیمنٹ اور ادویات کی صنعت کافی ترقی پذیر ہو۔ ادویات میں کھاد کی صنعت بہت امید افزا ہو۔ مختلف مصنوعات کے لیے کئی سو کارخانوں اور کمپنیوں کا ذکر ہو جو سرکاری مراعات سے بھی بہرہ اندوز ہو رہی ہیں۔ اس سے توقع کی جا سکتی ہو کہ جنگ کے پیدا کردہ حالات کی وجہ سے کچھ "تاہین" بھی میسر آجائے گی جو ہماری صنعتی زندگی کے لیے آب حیات ہو۔ حیدرآباد کی صنعتی ترقی سارے

ہندستان پر اثر انداز ہوگی اور اس لحاظ سے ہندستانی صنعت گروں کے لیے یہ معلوماتی ذخیرہ بڑے کام کی چیز ہے۔

(۳) ' حیدرآباد اور قیمتوں کی گرانی ' [حجم ۴۷ صفحے ، قیمت ۸ ۔ مولفہ احمد عبدالماجد صاحب (عثمانیہ)]

موجودہ جنگ کی طوالت کی بدولت جو دن بہ دن بڑھتی ہوئی گرانی سے ہم کو سابقہ پڑ رہا ہے اگر اسے بہ قول ڈاکٹر سر اقبال صاحب " روزافزوں بڑھتی ہوئی گرانی " کہہ دیا جائے تو قیمتوں میں اس روزافزوں اضافے کو دیکھتے ہوئے زیادہ بے جا نہ ہوگا ۔ گرانی کی بدولت سارے ملک میں ایک انتشار برپا ہے اور کیا حکومتِ ہند اور کیا صوبائی حکومتیں اور دیسی ریاستیں ، سب قیمتوں پر نگرانی قائم کرنے کی بہتیری تدبیریں سوچنے اور ان کو کام یاب بنانے کے لیے طرح طرح کے جتن کر رہی ہیں ۔ زیرِ تبصرہ رسالے میں ان مساعی کا ذکر ہے جو حکومتِ حیدرآباد نے کی ہیں ۔ اس مختصر رسالے میں ابتداءً کچھ نظری بحث کی گئی ہے جو اس حیثیت سے بہت مفید اور عوام کے لیے ضروری بھی ہے کہ ایسے معاملات میں حکومتی کوششیں صرف اسی وقت بارآور ہوسکتی ہیں جب کہ عوام تعاون کریں اور عوام اسی وقت تعاون کرنے پر پوری طرح آمادہ ہوتے ہیں جب وہ منصوبے کی بھلائی برائی کو سمجھ سکیں اور اس کی ضرورت کا احساس کرلیں ۔ امن اور جنگ کی معیشت کا فرق ، اخراجاتِ جنگ کے اثرات ، رسد و طلب کا تناسب اور توازن ، یہ ایسے موضوع ہیں جو حکومتِ ہند اور حکومتِ حیدرآباد کے نظام میں فرق کے باوجود سارے ہندستان پر یک ساں اثرانداز ہوتے ہیں ۔ اور ان موضوعوں کو سارے ہندستان میں سمجھی جانے والی زبان میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ جنگی گرانی کے اسباب سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

سلسلے کی حسبِ ذیل کتابیں بھی لکھی حیدرآباد میں گئی ہیں مگر سارے ہندستان کے لیے مفید ہیں اور بین الاقوامی حالات و کوائف کا بڑا اچھا اندازہ پیش کرتی ہیں :-

(۴) ' جنگ اور غذا کا مسئلہ ' ۔ از شفیق الرحمان صاحب (عثمانیہ) حجم ۴۲ صفحے قیمت ۱۲ار

(۵) ' جنگ اور راشن بندی ' از سعید احمد خاں مینائی (عثمانیہ) قیمت عمر (یہ کتاب ابھی موصول نہیں ہوئی۔)

(۶) ' جنگ اور ہندستان کا قومی قرضہ ' ۔ از محمد احمد خاں صاحب بی ۔ اے (عثمانیہ) حجم ۷۰ صفحے ، قیمت عمر

(۷) ' انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ' ۔ مترجمہ جناب محمد احمد خاں صاحب بی ۔ اے (عثمانیہ)

حجم ۵۲ صفحے، قیمت ۸ر۔

(۸) "امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے" مترجمہ عطاء الرحمان صاحب علوی، بی اے (عثمانیہ)، حجم ۲۸ صفحے قیمت ۶ر

(۹) کنیڈا اور بین الاقوامی زر کے منصوبے۔ مترجمہ خواجہ محمد شمس الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ) حجم ۴۴ صفحے، قیمت ۸ر

(۱۰) ہندستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے۔ از جناب سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) حجم ۵۲ صفحے قیمت ۸ر۔

(۱۱) "محصول منافع زائد"۔ از جناب سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) حجم ۷۴ صفحے، قیمت ۸ر

(۱۲) "ہندستان کی معاشی ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل"۔ (سر پرشوتم داس ٹھاکر داس، جے۔ آر۔ ڈی ٹاٹا، جی۔ ڈی۔ برلا، سر آر دیشر دلال، سر شری رام، کستور بھائی لال بھائی، اے۔ ڈی۔ شروف اور جان متھائی کے مضامین کا ترجمہ) از جناب سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۰ صفحے قیمت ۱۲ر۔ (ر۔ا)

چوبینہ کی ہوائی پختگی (مولفہ سید عبدالواحد صاحب بی اے (آکسن) بی۔ ایس سی (الہ آباد) آئی۔ ایف۔ ایس، ناظم محکمۂ جنگلات ریاست حیدرآباد)۔ یہ چھوٹا سا تیس صفحے کا رسالہ مطبوعات سررشتۂ جنگلات ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی (ریاست حیدرآباد) کی پہلی قسط ہے۔ یہ بہت بروقت اقدام ہے۔ ہندستان پچھلی دو تین صدیوں سے جس دورِ ابتلا میں گرفتار رہا اس کا ایک بڑا مہلک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے فنون اور ہماری صنعتیں کچھ ایسی پامال ہوئیں کہ اب اگر اپنی زبان میں ہم ان کے متعلق کچھ لکھنا بھی چاہیں تو فنی اصطلاحات کے لیے ہم کو اربابِ مغرب کی طرف ہی رجوع ہونا پڑتا ہے یا پھر از سرِ نو "نئے" ترجمے کرنے پڑتے ہیں کیوں کہ صنعتوں اور فنون کے ساتھ وہ فنی اصطلاحات اور خاص خاص نام بھی فراموش ہو چکے ہیں۔ ہندستان ہمیشہ سے ایک زرعی ملک رہا ہے اور یہاں کی زمینی پیداوار ہی ملک کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات بنی رہی۔ یہ آہنی دور تو انگریزوں کے آنے کے بعد شروع ہوا ورنہ عمارتی کاموں میں ملکی چوبینہ ہی استعمال ہوتا تھا جس کی پرداخت اس طرح کر لی جاتی تھی کہ بیرونی لوہے کی ضرورت باقی نہ

پاتی تھی۔ لکڑی کا طرح طرح کا کام ہوتا تھا جو آج بھی نوادرات و عجائبات کی شکل میں ارباب ذوق کے گھروں کی زینت ہو۔ مگر اب صرف یہی مصرف رہ گیا ہو کیوں کہ لوہے کی بہتات کے علاوہ اچھا چوبینہ خود ناپید ہوگیا تھا۔ اب جنگ کے باعث لوہے کی قلت نیز اچھے چوبینے کی اشد ضرورت کی بدولت اس صنعت کے دن پھرے اور ازسرنو ایک فن کی حیثیت سے چوبینے کو مضبوط اور پائے دار بنانے اور اس کو طرح طرح سے مفید مطلب کرنے کی تدبیریں شروع ہوئی ہیں۔ زیر تبصرہ رسالے میں انھی تدبیروں کے عملی تجربوں سے بحث کی گئی ہو کہ چوبینے کو ہوا میں رکھ کر پختہ کرکے نہایت سہل الحصول، مفید اور مجرب طریقے کیا ہوسکتے ہیں۔ چوبینے کی قسمیں اور ان کی خصوصیات بھی بتائی گئی ہیں اور جدولوں اور نقشوں کے ذریعے تدابیر کو زیادہ سے زیادہ عمل پزیر بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اخیر میں انگریزی اصطلاحات اور ان کے اُردو ترجموں کی ایک فہرست بھی ہو۔　　　(ر-ا)

تذکرۂ دارالعلوم

قیمت ایک رُپیہ۔ ملنے کا پتا: حبیب کمپنی، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن۔

نصیرالدین ہاشمی صاحب مولف "دکن میں اُردو" وغیرہ کی تالیف ہو۔ مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد دکن کی قدیم درس گاہ ہو جہاں علوم مشرقی کو مرجح رکھ کر مغربی علوم کی تعلیم و تدریس کا بڑے اعلا پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کا عظیم الشان ادارہ اسی مدرسہ دارالعلوم کی ترقی یافتہ اور وسیع تر شکل ہو گر دارالعلوم اپنی جگہ پر اب بھی ایک مدرسۂ فوقانیہ کی حیثیت سے قائم ہو۔ اس مدرسے میں جو سنہ ۱۸۵۶ء میں ایک بہت بڑے مقصد کے ساتھ قائم ہوا جب کہ مدراس اور بمبئی کی یونی ورسٹیاں بھی تشکیل پزیر نہیں ہو پائی تھیں، علوم مشرقی و مغربی کا ذریعۂ تعلیم اُردو کو قرار دیا گیا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب اس مدرسے کی "نودسالہ" سرگزشت ہو۔ ضمنی طور پر ہندستان کی سماجی حالت، اور حیدرآباد کی سماجی، سیاسی اور تعلیمی تاریخ کا بھی خاصا ذکر آگیا ہو جو بیرون حیدرآباد کے لوگوں کے لیے بھی کافی سبق آموز اور دل چسپ ہوسکتا ہو۔ خصوصیت کے ساتھ وہ تقریر بہت نظرافروز اور کئی حیثیتوں سے نہایت اہم ہو جو اپریل سنہ ۱۸۸۰ء میں نظام سادس میر محبوب علی خاں مرحوم نے حیدرآباد کی خصوصاً اور ہندستان تمام کی عموماً تعلیمی حالت کے متعلق فرمائی تھی۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی والیٔ ریاست نے جلسۂ عام میں تقریر کی اور

ایسے خیالات کا اظہار کیا۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے تذکرے حیدرآباد کو ہندستان کے دوسرے علاقوں سے روشناس کرانے کے لیے بہت مفید اور اس لیے بہت ضروری ہیں۔ بہتر ہوتا کہ افراد سے بہت زیادہ بحث نہ کی جاتی اور زبان کی صحت کا بھی لحاظ رکھا جاتا۔ اگرچہ شخصیتوں کے تذکروں اور افراد کی فہرست نیز جزوی امور کی بحث نے اس مختصر رسالے میں خاص افادیت پیدا کردی ہے۔ جب ایک عرصے کے بعد ضرورت پڑتی ہے اور کتب تواریخ ان حوالوں سے معرّا اور ضرورت پوری کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں تو ایسے مقالات ارباب تحقیق کے زیادہ کام آتے ہیں۔

سال نامے

'چنگاری' باوجود کاغذ کی قلت کے 'چنگاری' نے بڑی تقطیع پر تقریباً ڈیڑھ سو صفحے کا سال نامہ شائع کیا ہے۔ مضامین بھی مختلف نوعیت کے اور دل چسپ ہیں۔ ادبی، تاریخی مضامین کے علاوہ افسانے اور نظمیں بھی کافی تعداد میں ہیں۔ فلموں اور فلموں کے مشہور اور مقبول کرداروں کے متعلق بھی مفصل معلومات درج ہیں۔ نام ور اور مشہور لوگوں کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ فرصت کے وقت پڑھنے کی اچھی چیز ہے۔

'ادبِ لطیف' یہ سال نامہ ادبی حیثیت سے نہایت قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے۔ اور اس میں اکثر لکھنے والے اُردو کے قابل ادیب ہیں۔ شروع میں کئی مضمون جدید ادب کے متعلق ہیں۔ پہلا مضمون جو قاضی عبدالغفار صاحب کا ہے اس میں صرف لفاظی ہے۔ ان سب میں بہتر احتشام حسین صاحب کا مضمون ہے اور اسے سب سے پہلے جگہ دینی چاہیے تھی۔ سوا آثر لکھنوی صاحب کے سب نے ترقی پسند یا جدید ادب کی حمایت کی ہے لیکن یہ حمایت کچھ اس قسم کی ہے جیسے کوئی اپنا بچاؤ کر رہا ہو یا معذرت کے پردے میں اپنی تائید کے پہلو نکال رہا ہو۔ یہ کیوں؟ ۔ فسانوں میں کرشن چندر کا "ان داتا" بہت خوب ہے۔ کرشن چندر لکھنا جانتے ہیں۔ انھیں زبان اور ادائے خیال پر پوری

قدرت ہے اور موقع و محل کو خوب سمجھتے ہیں اور اس سے اثر پیدا کرتے ہیں۔ بعض افسانے اس میں ایسے آگئے ہیں جو بہت ہی کھلے ڈلے ہیں۔ ایساً معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے جنسی جذبات اور شہوانی خیالات سے مغلوب ہیں اور یہ موضوع ان کا تکیۂ خیال ہوگیا ہے۔ سب سے آخر میں ایک مضمون "اہلِ زبان" پر ہے۔ یہ کسی نے بہت ہی جل بھن کر لکھا ہے۔ خوش مذاقی کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔



انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی کی تازہ ترین مطبوعات

کیفیہ — قیمت مجلد چار رُپے (للعہ)، بلا جلد تین رُپے (سے)

کتاب الہند (حصہ دوم) — قیمت مجلد چار رُپے (للعہ)، بلا جلد تین رُپے (سے)

نظریۂ تعلیم (حصہ دوم) — قیمت مجلد چار رُپے (للعہ)، بلا جلد تین رُپے (سے)

مکالماتِ افلاطون — قیمت مجلد پانچ رُپے (صہ)، بلا جلد چار رُپے (للعہ)

حیوانیات — قیمت مجلد تین رُپے چار آنے (سے؎)، بلا جلد دو رُپے چار آنے (عہ؎)

الف لیلہ و لیلہ (جلد سوم) — قیمت مجلد پانچ رُپے (صہ)، بلا جلد چار رُپے (للعہ)

ہمارے بینک — قیمت مجلد دو رُپے بارہ آنے (عہ؎)، بلا جلد ایک رُپیہ بارہ آنے (عہ؎)

مشاہیرِ یونان و روما (حصہ اول) — مجلد چار رُپے آٹھ آنے (للعہ؎)، بلا جلد تین رُپے آٹھ آنے (سے؎)

ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ — قیمت مجلد چار رُپے آٹھ آنے، بلا جلد تین رُپے آٹھ آنے

تنقیدِ شعر العجم — قیمت مجلد چھ رُپے (ستے)، بلا جلد پانچ رُپے (صہ)

دیوانِ بہرام — مجلد دو رُپے چار آنے، بلا جلد عہ؎

پودے اور اُن کی زندگی — مجلد تین رُپے (سے)، بلا جلد دو رُپے (عہ)

فردوسی پر چار مقالے — مجلد تین رُپے آٹھ آنے (سے؎)، بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے (عہ؎)

چند ہم عصر — قیمت مجلد ڈھائی رُپے (عہ؎)، بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے (عہ؎)

اصطلاحاتِ پیشہ وراں (جلد ششم) — مجلد دو رُپے بارہ آنے، بلا جلد ایک رُپیہ بارہ آنے

حکایاتِ اغانی (جلد اول) — مجلد پانچ رُپے (صہ)، بلا جلد چار رُپے (للعہ)

مانڈو — قیمت مجلد تین رُپے (سے)، بلا جلد دو رُپے (عہ)

بُدھ اور اُس کا مت — مجلد دو رُپے آٹھ آنے (عہ؎)، بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے (عہ؎)

اخبارِ مجموعہ — مجلد تین رُپے آٹھ آنے (سے؎)، بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے

دیوانِ نظیر اکبرآبادی — مجلد سے؎، بلا جلد سے

مینیجر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نمبر (۱) دریا گنج، دہلی

رسالۂ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ع سے رسالۂ "سائنس" بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوئے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:—

معتمد مجلس ادارت رسالۂ "سائنس"

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:— رسالۂ سائنس (سہ ماہی) کے پرانے پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ع) تک دفتر انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی سے بہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 24 APRIL 1944 No. 2

THE URDU

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Delhi.

جلد ۲۴ جولائی ۴۴ء نمبر ۳

اُردُو

انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:— عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) دہلی

اُردُو

جلد ۲۴ | جولائی سنہ ۱۹۴۴ء | نمبر ۳

انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) دہلی

کا

سہ ماہی رسالہ

مقامِ اشاعت : دہلی

سید صلاح الدین جمالی مینیجر انجمن نے جید پریس بلی ماران دہلی میں چھپواکر
دفتر انجمنِ ترقیٔ اردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

اُردو

جلد ۲۴ —— جولائی سنہ ۱۹۴۴ء —— نمبر ۳

فہرستِ مضامین



تصویر خاندانِ لوہارو، ۱۸۸۱ء

فخرالدولہ نواب میرزا علاءالدّین احمد خاں بہادر علائی

(بہ قلم جناب خان بہادر مرزا شمس الدین احمد خاں سابق ناظم لوہارو)

[غالب شناس طبقے میں علائی کا نام بار بار سنا جاتا ہے، مگر کلام کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ وہ مرزا مرحوم کے سب سے عزیز و رشید تلامذہ میں تھے اور انھی کو اُستاد نے جانشینی کی سندیں لکھ کر دیں۔ لیکن غالب کے کئی شاگرد اُستادی کے مرتبے کو پہنچے صاحبِ دیوان ہوئے۔ ان کی تصانیف مطبوع و مقبول ہوئیں اور علائی صرف اُردوئے معلّا کے مکتوب الیہ رہے۔ غالب کے سوانح نگاروں نے ان کی نسبت کچھ لکھا تو وہ بھی زیادہ تر اِس تعلق سے کہ مرزا رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ نواب علاءالدین احمد خاں سینتیس سال کی عمر میں مسندنشینِ ریاست ہو گئے اور پھر ان کی ادبی مشاغل کی طرف زیادہ توجہ نہ رہ سکی۔ لیکن اُن کے کلام کا مجموعہ اور بعض علمی تحریریں لوہارو میں موجود ہیں، جن کی طبع و اشاعت کی نوبت نہیں آئی اور وہ اہلِ طلب کی نظر سے ابھی تک دُور یا مستور ہیں۔ ہم صاحب زادہ مرزا شمس الدین احمد خاں بہادر کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے بہ ظاہر سب سے پہلے، یہ اقدام کیا کہ اپنے دادا کے مختصر حالات کے ساتھ ان کے کلام کا نمونہ اربابِ ذوق کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ علائی مرحوم کے فرزندِ سومیں ہیں اور ایک زمانے تک ریاست لوہارو میں دیوان کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ مضمون کے ساتھ مزید عنایت یہ کی کہ علائی مرحوم کی بیاض کی نقل بھی انھوں نے ہمیں مستعار مرحمت فرمائی کہ ضرورت ہو تو کچھ اور اشعار کے انتخاب و اقتباس میں اس سے کام لیا جائے۔ مدیر ''اُردو'']

نواب صاحب موصوف ۲۰ر اپریل سنہ ۱۸۳۲ء (مطابق ۴ر ذالحجہ سنہ ۱۲۴۸ھ) ''درطالعۂ جوزا'' [دہ]لی میں پیدا ہوئے۔ آپ خلف الرشید فخرالدولہ نواب امین الدین احمد خاں بہادر والیٔ ریاست لوہارو ہیں۔ [ا]ن کے لیے غالب نے اپنی مثنوی ابرِ گہربار میں یہ شعر لکھا ہے ~

بہ دریائے محبت بے بہا دُر امین الدین احمد خاں بہادر

نواب علائی کا عہدِ طفلی شہر دہلی میں گزرا تھا۔ دہلی، مصر اور ایران کے اہلِ کمال سے تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی۔ علم تفسیر، حدیث، فقہ، تجوید، قرأت اور معقولات میں اُس زمانے کے علما و فضلا میں شمار ہوتے تھے۔ خوش نصیبی سے ادبیاتِ فارسی میں مرزا غالب جیسا یگانۂ روزگار اور شفیق اُستاد مل گیا تھا۔ جن کی ذاتِ باکمالات محتاجِ تعریف نہیں۔ نواب موصوف نے انگریزوں سے انگریزی بھی پڑھی اور پنڈتوں سے سنسکرت۔ چناں چہ ان دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔

اپنے پدرِ بزرگوار کی حیات میں ریاست کے کاروبار کو سرانجام دینا شروع کردیا تھا۔ مرزا غالب کے مندرجہ ذیل شعر میں یہی اشارہ ہے ؂

ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

جن اصحاب نے مرزا غالب کی سوانح کا مطالعہ کیا ہے وہ علائی کو اُن کے باپ کو، اُن کے دادا اور اُن کے چچا نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے نواب علاءالدین خاں کسی تفصیلی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ نواب موصوف کو عنفوانِ شباب سے استحصالِ علم ادب کا بڑا شوق تھا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں مسندنشین ہوتے ہی دارالریاست میں ایک مدرسے کی افتتاح کی۔ حاجی مرزا نظر محمد بیگ صاحب نے اس کام کے لیے بہ طیبِ خاطر اپنا بنگلہ وقف کیا۔ ساعتِ مشتری میں ۱۵ر ستمبر ۱۸۷۰ء کو یہ پہلا مدرسہ خاص لوہارو میں جاری ہوا نواب صاحب نے جلسے میں خود تقریر فرمائی اور تاریخِ عرب کے حوالے دے کر علم کے فضائل بیان کیے۔ اس کے بعد ایک مطبع کی بُنیاد رکھی، جس کا نام فخرالمطابع تھا۔ اس مطبع سے مہینے میں دو دفعہ اُردو میں ایک اخبار نکلتا تھا جس کا نام امیرالاخبار تھا۔ سب سے پہلی کتاب جو مطبع سے طبع ہوئی وہ مثنوی ہمائے ہمایوں تھی یہ نادرِ وجود مثنوی خواجہ کرمانی کی تصنیفِ لطیف ہے۔ اسی طرح سے دانش نامۂ جہاں کا قدیم نسخہ جو بدخشاں میں تالیف ہوا تھا اور جس کا مصنف شیخ بو علی شانی اصفہانی تھا، طبع ہوا۔ اس کی طباعت پر مولوی عبدالسلام صاحب ساکن سنبھل نے عربی و فارسی

میں تاریخیں کہی تھیں۔ فارسی تاریخ یہ ہے

در لوہارو چو ایں کتابِ لطیف　　　قابلِ صد مدیح طبع شدہ
گفت تاریخِ طبع۔ طبعِ سلام　　　خوب صاف و صحیح طبع شدہ

—۱۲۹۱—ھ

نواب علائی ایک ضخیم ترکی لغت کو بھی ترتیب دے گئے ہیں۔ جس کا قلمی نسخہ آج ریاست کے کتب خانے میں موجود ہے۔ تحقیقِ لغت کے اس فن میں اُستاد غالب بھی علائی کی قابلیت کو مانتے تھے۔ نواب صاحب موصوف نے شرح دیوان امیرالمومنین حضرت علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی سنہ ۱۲۹۳ھ میں طبع کرائی تھی۔ معلوم ہوتا ہے حدیقۂ سنائی رحمہ کی خود ایک شرح بھی نظم میں لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن بیاض میں صرف پہلے باب کی ابتدا اور آخر کے اشعار درج ہیں۔ جن کا نمونہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

عنوان شرح حدیقہ سنائی رح
از حضرت علائی

"جلوہ کناں فیضِ حق اندر دِلم　　　شعشعۂ انداختہ تا در گِلم
خامہ بہ جادو شکنی کرد ساز　　　طبع بہ اعجاز فرد خواند راز
نقش نخستیں کہ دل آویز رفت　　　طبع برآں نقش چنیں تیز رفت
کز اثر فیض سروش است ایں　　　نز خطا بلکہ نہ ہوش است ایں
گفتنِ ناگفتہ کہ مشکل بُوَد　　　از اثر فکرتِ کامل بُوَد
من کہ دریں راہ بہ سر تاختم　　　وقت گراں مایہ دریں باختم
ہم سفرم خود دل من بود و بس　　　راہ نموں جز دلِ من ہیچ کس
بادل و بادیدہ شدم عذر خواہ　　　مرحلۂ چند نوشتیم راہ
تا بہ سر گنج اہم اوفتاد　　　چشم بہ آرام گہم اوفتاد

شوق بیار است پر و بالِ خویش طبع فرو ماند ز اشغالِ خویش
قطرہ بہ دریا نہ شود چوں شود کم بہ فزوں رفت چو افزوں شود
دیدہ کہ نور از رخِ خورشید یافت صیقلئ خویش شد و دید یافت
غیر مبیں غیر مباش از خدا ے غیر گر غیر شود واے واے
آتشِ رخشندہ چہ داری ہوس خیز سپندی کن و دریاب بس
گر تو چو پرواز بہ سر تاختی جاں بہ سرِ شعلہ ہمی باختی
سوزِ نہانی ز برش دم زند شمع صفت کارِ تو برہم زند
ہستئ پروانہ ز شمع است و بس محرم ایں راز جز او نیست کس
ہاں نہ رہی تا تو ازیں دام گاہ راہ نہ یابی بہ سر گنج شاہ
چوں کہ سرِ شعلہ زبانم گرفت وقتِ ادب دستِ عنانم گرفت

قطعہ بر خاتمہ باب اوّل (حدیقہ)

" الحمد اللہ ربّی الاعلا الشکر اللہ حسبی المولا
گفتہ شد سرّ و نکتۂ توحید نطق و جاں یافت دولتِ تحمید
خامہ از سجدہ ریختن پرداخت در رہ نعت قامتش خم ساخت
از احد تا بہ احمد ای ناداں نیست راہی درازتر چنداں
چہل پایہ بہ شوق بشتابی اندر احمد احد ہمی یابی
گر بہ بالا شود ازیں پایہ احدت بخشد از احد مایہ
فخرِ آدم صفی امام بشر اوّل اندر شرف بہ خلق آخر
فندقی سرے ز رتبتِ او قاب قوسے دمے ز قربتِ او
ای علائی چو از احد گفتی دُرِ معنی بہ شرح در سفتی

گفتہ آید کنوں ز نعتِ نبی — سرورِ انبیا خلیل و صفی
جان و عالم فدائے نامش باد — صرفِ وقتم بہ اہتمامش باد"

مرزا غالب نے نواب موصوف کا تخلص تسیبیؔ قرار دیا تھا۔ بعد میں علائیؔ پسندیدہ تر رہا۔ غالب بھی علائی مولائی لکھنے لگے۔

نواب علاء الدین خاں کی اعلیٰ قابلیت اور زبانِ فارسی و اُردو میں فوقیت کا درخشاں ثبوت مرزا اسداللہ خاں غالب کا اُن کو فارسی اور اُردو میں اسنادِ جانشینی عنایت کرنا ہے[1] مرزا غالب کا ایک خط نواب موصوف کے نام ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء کا محفوظ ہے اس میں یوں درج ہے:۔

(خلاصہ) . . . . "توقیعِ جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ خرقہ پایا۔ سبحہ اور سجادے کا یہاں تھا نہیں ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔"

اس کے بعد وہ خط ہے جو غالب نے ۱۱ر جون سنہ ۱۸۶۸ء کو بھیجا تھا۔ (اس خط کے آٹھ ماہ بعد غالب کا انتقال ہوا تھا)

". . . . . . . فنِ اُردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو۔ مَیں نے دبستانِ فارسی کا تم کو جانشین و خلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے[2]"

مرزا غالب، نواب علائی کی تحریروں کے تصوّر ہی سے لطف اندوز ہوتے تھے جیسا کہ ان کے بعض خطوں سے ثابت ہے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو اگر میرا صُلبی بیٹا اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو مَیں اُس کو اپنا یارِ وفادار و ذریعۂ افتخار جانتا۔"

---

[1] فارسی سند پر باقاعدہ مرزا صاحب کی مُہر ثبت کی گئی ہے اس کا عکس مولانا مہرؔ کی کتاب "غالب" میں بھی چھپا ہے (مقابل صفحہ ۳۰۸) آخری جملے یہ ہیں:۔ "نمی نگری کہ برادر زادۂ نام ور روشن گہر میرزا علاء الدین خان بہادر بہ فرّ باب خرد خداداد۔ راہ سخن بہ رہ نمائی من رفت و در پیری من و برنائی خویش بہ بزستان سخن گستری جاے من از من گرفت الخ"

[2] خطوطِ غالب کے لیے ملاحظہ ہو "اُردوے معلّا"، حصۂ اوّل مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۸۹۹ء

اس عبارت سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نواب موصوف کس پائے کی قابلیت رکھتے تھے غالب مرحوم کے شاگردانِ رشید نواب ضیاءالدین خان نیر رخشاں (علائی کے حقیقی عم مکرم) میر مہدی مجروح، سالک، حالی، شیفتہ، ذکی اور تفتہ تھے مگر ان میں سے کسی کو غالب نے اپنا جانشین نہ بنایا۔

ذکی (نواب سید محمد ذکریا خاں رضوی دہلوی) چوں کہ ایک مدت تک مرزا غالب کے سامنے رہے اُن کو بہ راہِ بندہ نوازی آخر وقت میں ایک " سرٹیفکیٹ " عنایت فرمایا تھا۔ مگر وہ سندِ جانشینی نہیں ہے اس میں صرف یہ درج ہے :-

" شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں اس فن میں میرے شاگردِ رشید ہیں "[1]

اربابِ نقد و نظر کو اصل واقعات سے آگاہ کرنا یہاں میرا اصل مقصد ہے۔ مسٹر رام بابو سکسینہ کی تصنیف " اے ہسٹری اوف اُردو لٹریچر" مطبوعہ سنہ ۱۹۲۷ء میں ہم نواب ضیاءالدین خاں نیر رخشاں کو غالب کا فرسٹ خلیفہ اور " ایڈجوٹنٹ " لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ ایسا ایک خط 'اُردوے معلا' میں ضرور موجود ہے[2] مگر وہ پہلے کی تحریر ہے اور مابعد کے خطوط علائی کے حق میں فیصلہ کن ہیں۔ آزاد نے بھی 'آبِ حیات' میں یہ سہو کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بابو صاحب نے آزاد کی پیروی کی ہے۔ غالب نے ایک قصیدے میں نیر رخشاں کی بڑی تعریف کی ہے۔ شاید اپنے سے بھی بہتر بتایا ہے۔ مگر اہلِ تنقید اسے ذاتی تعلقات پر محمول کرتے ہیں۔ مرزا سعیدالدین احمد خاں طالب دہلوی جو خود نیر رخشاں کے پسر تھے۔ اور جنھوں نے اپنے باپ کا کلام " جلوہ صحیفۂ زریں " کے نام سے طبع کرایا ہے۔ اپنے باپ نواب ضیاءالدین خاں نیر رخشاں کو غالب کا شاگرد اور یارانِ طریقت میں سے ہونا بیان کرتے ہیں۔

---

[1] - اس خط کے لیے ملاحظہ ہو، 'دیوانِ ذکی' اُردو مطبوعہ مطبع رضوی دہلی صفحہ ۷ سنہ ۱۳۱۲ھ

[2] - خط کی محولہ عبارت یہ ہے :-

" مولانا نسیمی خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں اگر نیر خلیفۂ اول ہے تم خلیفۂ ثانی ہو اس کو عمر میں تم پر تقدمِ زمانی ہے۔ جانشین دونوں، مگر ایک اول ہے ایک ثانی ہے . . . . "

چند ابیات جو شعرائے سربرآوردہ کی نسبت ناظم ہروی کے مشہور ہیں اور ان میں سلسلۂ سخن گوئی کو جامی پر ختم کیا ہے[1] اس میں یہ شعر غالب نے اضافہ کیا تھا ؎

زجامی بہ عرفی و طالب رسید

زعرفی و طالب بہ غالب رسید

اور غالباً غالب کے انتقال کے بعد علائی نے اس پر یہ حاشیہ چڑھایا ؎

" علائی چو بر جاے غالب نشست ورق بر درید و قلم در شکست "

نواب علاءالدین خاں کے کمال اشتیاق و اصرار کے باوجود مرزا غالب کبھی لوہارو تشریف نہ لائے۔ مولانا غلام رسول مہر نے یہاں اُن کا آنا سہواً لکھا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ لوہارو کا قصد کرتے تھے مگر اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے سفر کو ملتوی کر دیتے تھے۔ علائی اور غالب کے منظوم اُردو خطوط لوہارو آنے نہ آنے کی بابت طبع ہو چکے ہیں مگر ان خطوط کے ساتھ فارسی قطعات بھی ہیں جن کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی۔ ذیل میں دونوں قطعے تمام و کمال نقل کیے جاتے ہیں :—

---

[1]

ناظم ہروی کا قطعہ

شنیدم کہ در دورگاہ کہن شدہ عنصری شاہ صاحب سخن

چو اورنگ از عنصری شد تہی بہ فردوسی آمد کلاہ مہی

چو فردوسی آورد سر در کفن بہ خاقانی آمد بساطِ سخن

چو خاقانی از دارِ فانی گزشت نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت

نظامی چو جام اجل در کشید سر چتر دانش بہ سعدی رسید

چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار سخن گشت بر فرق خسرو نثار

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید زجامی سخن را تمامی رسید

از غالب بہ نام علائی

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کی / پییں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں اندھے[1] ہیں ہم / کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مطلوبِ جاں / نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں / ابھی جاکے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹّے کہاں پائیں املی کے پھول / وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار / کہو اس کو ہم کھاکے کیا حظ اٹھائیں

قطعہ

خوانی بہ سوے خویش و نہ دانی کہ مُردہ ام / دانی کہ مُردہ را رہ و رسم خرام نیست
نے شیخ سدّو ام نہ الٰہ بخش، مرگِ من / از عالمِ جنابت و مرگِ حرام نیست[2]

جواب از علائی

خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کی / کہ باہم پییں بادہ اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں کیا خوب ہے / کہ دلّی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجب لطف ہے یاں کی برسات میں / کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرولی کے وہ ڈاک پر سبز آم / وہ دلّی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں / ابھی جاکے ہر چیز جلدی پکائیں
وہ لیں باغ سے جاکے املی کے پھول / وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحم طری / کہ کیا کیا اُسے کھاکے ہم حظ اٹھائیں

---

[1] بعض صاحبوں نے اِس لفظ کو لوہارو کی مناسبت سے "آندھی" پڑھا ہے کیوں کہ وہاں ریگستان ہے اور خوب آندھیاں چلتی ہیں۔ بہرحال غالباً ایہام ضرور ہے۔

[2] عوام میں مشہور ہے کہ شیخ سدّو اور ناموں الٰہ بخش "حالتِ جنابت" میں بغیر غسل مر گئے یا اپنے موکلوں کے ہاتھ سے مارے گئے لہٰذا بھتنے بن گئے اور اب لوگوں کے سر پر آتے اور ہنگامہ مچاتے رہتے ہیں۔

کہیں اُن کو پے مہر و کاہل اگر　　　جو اس بات پر بھی لوہارو نہ آئیں

قطعہ:
خواہمت سوے خویش دگر چند مُردہٗ　　　دانم کہ ہیچوں تو تیٔ منع خرام نیست
پندارمش چو حُسن تجلیٔ لال بیگ　　　مرگش چو شیخ سدو ز راہِ حرام نیست[1]

بات یہ ہو کہ مرزا غالب نواب علائی سے بہت محبت کرتے تھے اور اسی طرح ڈرتے بھی تھے۔ علائی کے ایک خط کا جواب لوہارو نہ آنے کے سلسلے میں غالب نے یہ دیا تھا:۔

"واہ کیا کہنا ہو رام پور کے علاقے کو گاشنگ (دآر) اور مجھ کو بیل یا اس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنایا وہ علاقہ اور پیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مزاحم کیوں ہو۔"

اور یہ بھی لکھا تھا کہ نومبر دسمبر میں قصد کروں گا۔ نومبر دسمبر میں حملہ چل گیا بہتر ورنہ ع

اے وائے زنجروئ دیدار دگر ہیچ

بہرحال غالب لوہارو نہ آسکے اور سوے عدم گئے مگر علائی کو آخر وقت میں یہ دُعا دے گئے اور لکھ گئے ع[2]

نہ کرد ہجر مدار ابہ من سرِ تو سلامت

مولانا احمد حسن موسوا[3] نے نواب علائی کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ اور اُن کے علم و فضل خُلق و مروّت کی بہت تعریف کی ہو۔ چند شعر یہاں درج کیے جانے مناسب متصور ہیں ؎

ہُنر شناس و سخن ور دقیقہ سنج کلام　　　رموز دانِ معانی یم سخن دانی
بش چو در سخن آید کشند خط بہ زمیں　　　ہزار جوہرِ گل باہمہ زباں دانی
بہ عہدِ تُست لوہارو نمونۂ دہلی　　　بہ ہند بُرد تفوّق ز جملہ امصار

---

[1] شعر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہو کہ جس طرح مہتروں کا پیر لال بیگ ہر جگہ تجلی دکھا سکتا ہو آپ کی آمد بھی مرجانے کے باوجود ہر جگہ ہو سکتی ہو اس کے لیے شیخ سدو کی طرح مرگِ حرام ہونا لازم نہیں۔

[2] 'یادگار غالب' مصنفہ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

[3] 'دیوانِ موسوا'

زشعرِ تُست ہویدا کہ عرفی و طالب حضور تو نہ تواند بوند دعوے دار
رواست گویمت از شاہِ شاعرانِ زماں دریں خطاب نہ باشد تکلفے درکار"

صاحبِ گل زار شاہی اپنی تصنیف میں لکھتا ہے :۔

"نواب علاء الدین خاں بڑے لئیق، ہشیار، کارگزار، عالم فاضل، عربی فارسی انگریزی میں طاق بلند حوصلگی میں شہرۂ آفاق۔ اس رئیس کی توجہ سے علم و ہنر کی طرف لوگ راغب ہوئے"

کتاب حالاتِ فرماں روایانِ ہند مسمی بہ مرات الاشباہ[۱] میں علائی کو یوں دِکھایا گیا ہے :۔

"بلبلِ خوش لہجہ گل زارِ سخن وری طوطیٔ خوش بیاں شکر زارِ ہنر پروری رشک افزاے کلام ظہوری حسرت گزاے مضامینِ انوری وحید العصر و زماں نواب علاوٗالدین احمد خاں بہادر۔ ان کے کمالات کے لکھنے کی زبانِ قلم میں کہاں طاقت ہے کلام معجز نظام آپ کا ہمہ تن فصاحت و بلاغت ہے۔ نثر ایسی کہ نظم ثریا اس پر نثار۔ اور نظم ایسی کہ سلکِ جواہر شرم سار۔ علاوہ اس کمال کے علم عربی و انگریزی و تواریخ میں طاق ہیں۔ بہ ایں ہمہ اوصاف خُلق و مروّت میں شہرۂ آفاق"

نواب علائی کو اپنی شاعری پر زیادہ فخر نہ تھا۔ فرماتے ہیں ؎

شاعر نیم کہ مدح پئی جائزہ برم
طامع نیم کہ خواستہ اَم کیسہ پُر بہ زر

اس قدر فرصت کب ملتی تھی جو وہ اپنا وقت شعر و سخن میں گزارتے۔ ریاست کے کاموں میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے بہ قول ؏

آں را کہ عقل بیش غمِ روزگار بیش

مگر اُن کے فضل و کمال میں کسی کو کلام نہیں تھا۔

افسوس ہے کہ ان کی دولتِ سخن اربابِ شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ اور نثر بھی زیورِ طبع سے عاری رہی

---

[۱] مطبوعہ سنہ ۱۸۶۸ء مصنف محمد ارتضا خاں دہلوی۔ یہ کتاب ترجمہ ہے احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ مدار المہام بہادر شاہ بادشاہِ دہلی کی فارسی کتاب کا۔

ایک فارسی قطعہ ملکہ وکٹوریا کے اعلان لقب قیصری کے موقع پر لکھا تھا، جو لندن میں طبع ہوا۔ اور جس کا ترجمہ مسٹر وِلسن شاہی ایکاڈیمی اوف آرٹ نے کیا تھا[1] اس کا نمونہ آیندہ صفحات پر فارسی کلام میں درج ہو۔ایک اُردو قطعے میں خود لکھتے ہیں :-

جادو لفظی نام ہو اندازِ بیاں کا
سب جانتے ہیں اس میں جو ہو مجھ کو مہارت

اور حق یہ ہو کہ فارسی شاعری سے ان کو خاص مناسبت اور اس زبان میں واقعی مہارت حاصل تھی۔ نواب ممدوح کے قصائد، غزلیں، رباعیاں اُن کی بیاض میں موجود ہیں۔ اور فارسی کی ڈائریاں قابلِ دید ہیں۔ ہر ڈائری میں نئی صبح دکھائی ہو۔

نمونہ کلامِ فارسی

وقت است کہ در عرضِ مطالب بہ تبرّک　　　از بالِ ملک تازہ کنم سازِ قلم را
وقت است کہ از جوشِ مسرّت بہ خراشم　　　جان و جگر و ہم و غم و روئے الم را
وقت است کہ زیں شیوہ بہ احباب دہم یاد　　　آئینِ نواسنجیٔ سحبانِ عجم را
پیداست کہ خود پیشۂ من نیست دبیری　　　بخشم شرف اما بہ قلم خط و رقم را

کرنل اسکو نے شراب کے چند شیشے حضرت غالب کو تحفۃً ارسال کیے۔ اس کے ساتھ یہ منظوم رقعہ ان کی طرف سے علائی نے لکھا تھا ؎

دریوزۂ کلام دبیرِ فلک کند　　　از فیض جنبش لب جاں بخش تو مدام
آبی کہ خضر در ہوسش جانِ ہمی دہد　　　اسکندرش بہ جُست ولے ماند تشنہ کام
آبی چناں کہ گر فتدش قطرۂ بہ خاک　　　صد گل دمد بہ روئے زمیں آفتاب نام
آتش مزاج، آب فرح بخش، خوش گوار　　　سرمایۂ نشاط مئے ناب اولڈ ٹام
. . . .　　　. . . . .

---

[1] رسالہ انگریزی و فارسی "النخل" لندن۔ طبع سنہ ۱۸۷۸ء

مرزا نے اس تحفے کے شکریے میں جو قطعہ لکھا اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

از دوست بہر بندہ بی شیشہ ہای — از بندہ سوی دوست بہر شیشہ یک سلام

اور اُن کی فارسی کلیات میں چھپ گیا ہے۔

اعلان لقب "قیصرِ ہند" کے موقع پر ڈاکٹر لٹز کی تحریک سے حضرت علائی نے ایک قطعہ لکھا تھا جو انگریزی ترجمے کے ساتھ لندن کے رسالے "النحلہ" میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

فرخندہ ساعتی کہ رسانند صبح و شام — از زہرہ آفرین و تحیت بہ مشتری
بر مہر و ماہ گنج نشانانہ بر دہند — انفاسِ عطربیز بصد مہر گستری

دانی کہ سحرکاری سحر نگار کلک — کامروز یافت منصبِ اندیشہ پروری
اندوخت از کجا سرو برگ رقم چناں — در حرف دل نوازی و در لفظ دل بری
آوازۂ مبارکی و تہنیت دمید — صد جانِ تازہ در تن عالم بہ برخوری

از حق شناسی تہنیت غیب و بر شمر — فرخندگیٔ روز نخستینِ جنوری
روزے خجستہ کہ بہ ہندوستان آمی — خوانند از شرف لقبش روزِ قیصری
بگزر ز ذکر سکندری و ذکر جولئیس — بگزار یادِ جامِ جم و چترِ سنجری

زیں پس من و علائی و ہم لٹز در جہاں — باشیم جملہ قیصری و قوم قیصری
برگوی ہند را کہ بہ بالد بہ خویشتن — از نسبتے کہ گفتہ شود مُلکِ قیصری!

عنوانِ خط

آمد بکفم نامۂ مشکیں رقم دوست
کز حرف و سوادش دل و جاں عطر شمام است

بہ کشادم و برخواندم و بوسیدم و دیدم
کز دوست بہ سوئی منِ بدل خستہ سلام است
ہر سطرے ازاں تابِ دو زلف سمن بوئی
ہر حرفے ازاں سطر خطِ غالیہ فام است

رباعی

از جود تو خلقت حیاتم شاہا
از لطف تو ایں ذات و صفاتم شاہا
چوں مشکلِ من بجز تو کشاید نہ کسے
زیں رنج کہ ہست دہ نجاتم شاہا

دیگر

رنجے کہ علاجش نبود آں منست
دردے کہ دوا نخواست مہمانِ منست
یارب المی کہ چارہ بہ پزیر بود
آں امرِ قضا مگر جز جانِ منست

دیگر

ای چرخ چرا ستیزہ با ما داری
دانم کہ غلط نہٗ نہ بے جا داری
خواہی کہ دہے نقش و جودم برباد
آری کہ مرا بہ دہر یکتا داری !

حکام انگریز کی مدح میں چند عمدہ قصیدے لکھے ہیں ۔ دو تین پُر درد قطعے ایک محبوب بیوی کے انتقال پر آنسو کی طرح قلم سے ٹپک پڑے ہیں، بعض لوگوں سے ناراض ہوکر ہجو کہی ہی ۔ ایک مختصر مثنوی "نیچر" کے عنوان سے شاملِ بیاض ہی، جس میں فرنگ زدہ ملحدانہ خیال کے لوگوں کا خاکہ اُڑایا ہی ۔ غزلیں کم ہیں اور معلوم ہوتا ہی کہ اس صنف کی طرف چنداں توجہ نہ تھی ۔ لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ فارسی شعر پر پوری قدرت رکھتے تھے بلکہ مجموعی طور پر ان کا فارسی کلام اُردو پر فوقیت رکھتا ہی ۔ اُردو میں بھی غزلیں کم ہیں ۔ لیکن نظم کے بعض نمونے پیش کرنے سے پہلے ہم ان کے چند

مضامین میں سے جو بیاض میں محفوظ ہیں، ایک مضمون اقتباسًا نقل کرتے ہیں۔ جس سے اسی برس پہلے کی اردو عبارت اور خود نواب علاءالدین خاں کی طرزِ تحریر اور خیالات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے :-

نقل اوس خط نثر کی جو نواب علاءالدین احمد خاں صاحب بہادر نے حسبِ ارشاد کمشنر صاحب بہادر دہلی لکھی اور بہ تاریخ ۵ مئی ۱۸۶۶ء بمقام دہلی سوسائٹی میں پڑھی اور نہایت مطبوعِ حکام ہوئی

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نستعینہٗ علیٰ ما یکون و نحمدہٗ علیٰ ما کان ......

رسم ہو کہ حمد و ثنائے باری کے بعد نامہ نگار اپنے عنوانِ صحائف کو سجّل بہ مدحت حاکمِ عہد کرتے ہیں پس لازم ہوا کہ گزارشِ مدعا سے قبل اور حمد و نعت کے بعد اپنے بادشاہِ وقت کی ستایش و ثنا کروں۔ ہاں کہ نقشِ مطلب دل پزیر ہو گر نظر بہ تنگیٔ میدانِ گفتار، ادب ناطقہ کا عناں گیر ہو ؎

دل زکجا دیں پر و بال از کجا
من کہ و تعظیم جلال از کجا

ہاں تبرکًا صرف ادائے رسم التعظیم، نام مبارک اپنے شہنشاہِ خورشید کلاہ، مہر چہر، مریم جناب، بلقیس نقاب، عیسیٰ دم کلیم کلام کا لیتا ہوں ؎

ہزار بار بشویم دہاں ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ہست

ملکہ معظمہ آسمان اورنگ، آیۂ رحمتِ کبریا کوئن وکٹوریا ؎

سرورِ شاہاں بہ توانا تری 	نام ور دہر بہ دانا تری

خلّد اللہ ظلالہٗ علیٰ مفارق الانام الیٰ یوم القیام، کہ جس کا دامانِ عاطفت آج پنزوسائے بانِ ساکنانِ ہندستان ہو۔ مجھ کو اور تمام اہلِ ہند کو اپنا وجود اس عہد میں موجبِ شرف و افتخار اور مستوجب شکر ایزد منان ہو۔

بدیں عبارت کہ یہ دولتِ جاوید طراز درۃ التاج اعصار و دہور اور انواع راحت کا اس میں وفور ہو اگر ہم اپنے زمانے کو ماحیٔ آثار اسلاف و باعثِ نازش اخلاف کہیں تو بجا ہو۔ یہ کون کہتا ہو کہ مُلکِ ہندستان کبھی آباداں نہ تھا۔ لیکن بہ اعتبارِ آبادی و آراستگی و امن و کثرت تجارت کے جو آج اس اقلیم کو رونق حاصل ہو۔ فی الاصل نام اس کا ہندستان جنّت نشان تھا جب سے

اس ملک کی وسعت و فسحت اعتبار میں ہو، اختلاف السنہ و مذاہب و لغات شمار میں ہو۔ مگر زمانۂ باقی میں اس اقلیم کے لوگوں کی زبانِ شاستر معتبر تھی اور دفاتر حساب و نجوم و ہیات و اخلاق، و انشا و طب اس میں منضبط اور مروّج اکثر تھے۔ زبان سنسکرت ایک وسیع و فصیح زبان ہو بے مشقت اس کا حاصل ہونا دشوار اور بے تعلیم اس میں تکلّم و تلفّظ دور از کار ہو۔ افسوس قصور ہم و کمی اشواق و بے التفاتیٔ خواطر سے اکتساب و اشتغال میں وہن واقع ہوا اور شدہ شدہ یہ زبان حاصلۂ مکتبی رہ گئی . . . . . .

افسوس اس مملکت میں کچھ بوجہ انقلابات پے بہ پے اور کچھ بوجہ عیش دوستی و کامرانی کے سلاطینِ سلامی و نایانِ ہند میں ایسا جہل شائع ہوا کہ علم و عقل کا نقصان ہوتا گیا حتیٰ کہ اپنی خاص زبان سے سواے معدودے خواص کے اور پھر وہ بھی جو شائق و مائل الی التہذیب بالطبع ہوئے، جمیع فرق و امم ہند اُن سے بیگانہ ہوگئے کہ سب نے زبان اصلی ملکی مادری اپنی چھوڑ دی مختلف لغات موضوعی اختراعی پر تکلّم و تلفّظ اختیار کیا اور یہ اختلاف ایسا اثربخش ہوا کہ ایک گروہ دوسرے کی زبان سمجھنے پر قادر نہ رہا تا بہ اخذ مطلب و گفتار چہ رسد۔ چناں چہ زبانِ بنگالہ، زبانِ اوسط ہند سے اور زبانِ مارواڑ زبانِ پنجاب سے اور زبانِ سندھ زبانِ کرناٹک سے ایسی متغائر ہیں کہ یہ اقوام باہم گفتگو میں عاجز و متحیّر ہیں۔ باآں کہ یہ تمام اضلاع ایک ہی قلم رَو میں داخل ہیں مگر ایسے اختلافات رسوم و مذاہب و لغات جیسے اس قلم رَو میں بہ کثرت ہیں اور اقالیم میں حاصل ہیں۔ یہاں سے مجھ کو گزارش کرنا لازم ہوا کہ بعد ترک سنسکرت اہلِ ہند کے زبان بھاکا اس کے نام نے شہرت فی الامصار پائی کیوں کہ سنسکرت معنی لغوی آراستہ و مزیّن کے ہیں اور اصطلاحی زبان آسمانی و لسان اللہ سبحانہ اور بھاکا بولی کو کہتے ہیں . . . .

. . . .

پھر اسلامی سلاطین کی حکومت میں ہندی رعایا اور بیرونی حکّام کے میل جول سے "اُردو" زبان کے بننے اور عہدِ عالم گیر بادشاہ انار اللہ برہانہٗ میں "ترقی پذیر ہوکر قریات و بلادِ ہند میں شائع" ہونے کا ذکر کیا ہو۔ اسی ضمن میں موسوی خاں معز فطرت، اور ولی اور جعفر زٹلی سے لے کر اپنے زمانے تک مشہور شعراے اُردو کے نام گنائے ہیں۔ اور یہ نظم شاملِ مقالہ کی ہو ؎

نظم

ہاں دلِ نغمہ سنج زمزمہ ساز   کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

بارے اُردو کا کچھ بیاں ہو جاے — خامہ طوطیٔ خوش بیاں ہو جاے

ہے وہ وہ درجِ بیاں ، اُردو — زیور شاہدِ زباں اُردو

ہے زباں ایک اور چار مزے — اس کی ہر بات میں ہزار مزے

یوں تو ہر قوم کی زباں ہے خوب — اس کا اس رنگ میں بیاں ہے خوب

پر یہ ترکیبِ دل پسند کہاں — لفظ و معنی [illegible] کہاں

دل ربا اس کے بذلہ ہاے عجیب — جاں فزا اس کے نکتہ ہاے غریب

معنی و لفظ اس کے جاں پرور — حسنِ ترکیب خود جہاں پرور

میں کہوں کیا کہ یہ زباں کیا ہے — لطف کیا وسعتِ بیاں کیا ہے

آسمانی زباں سے ملتی ہے — دبنے[1] میں آسماں سے ملتی ہے

لیک مانے نہ دیدہ ور اس کو — آسمانی کہیں اگر اس کو

ملکوتی کی یہ زباں کب ہے — اس کا یہ [illegible] بیاں کب ہے

خاصہ یہ اُردوے جہاں آباد — متمتع کی ہو جس سے جہاں آباد

آسماں پر اگر فرشتہ جائے — یہ زباں کے مزے کہاں سے لائے

لاکھ عالی ہو ہم سے شانِ فلک — ایسی سُتھری کہاں زبانِ ملک

ہم بنے خاص اس زباں کے لیے — نہ بنے یہ زباں جہاں کے لیے

یا خدا تا رہے زمین و زماں — تا رہے ہند کا زمیں پہ نشاں

اہلِ دہلی کی یہ زبان رہے — حُسنِ تقریر اور زبان رہے

لطفِ حکّام عہد سے یہ زباں — رونقِ تازہ پاے اے منّان !

مضمون میں اہلِ دہلی کی اُردو دانی میں فضیلت اور خصوصاً مرزا غالبؔ کی نئی طرزِ نگارش کی بھی

---

[1] مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی گری حالت میں یا کم سے کم بھی آسمان کے برابر بلند ہے ۔

بڑی تحسین کی ہو اور آخر میں حکام انگریزی کی دعا پر اسے ختم کیا ہو۔

نمونہ کلام اردو

بڑی تقطیع کی وصلی پر لفظ اللہ کے طغرے کے ساتھ حضرت علائی نے ایک قطعہ لکھ کر اپنے والد ماجد نواب امین الدین خاں بہادر کی علالت میں پیش کیا تھا:-

میں درد جگر کی دوا بھیجتا ہوں
(نہ دریافت کیجے؟) کہ کیا بھیجتا ہوں
میں اک نسخۂ کیمیا بھیجتا ہوں
خداوند کو میں "خدا" بھیجتا ہوں

دیگر۔ قطعہ

اللہ رے بے ثباتیٔ عمرِ فنا پسند — بجھتا ہو یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ
شکوہ ہو کیوں، قبول میں گر ہو مضائقہ — آخر کسی کا نام تو لوں میں دعا کے ساتھ
درماں پذیر درد اگر ہو تو خاک ہو — دیں جان کیوں نہ درد کے بدلے دوا کے ساتھ

رباعی

دولت اسے دے کہ ہووے طامع و لئیم — ملک اس کو عطا کر کہ ہو خواہانِ نعیم
سُن لے کہ ہو کہ آرزو نہایت آساں — دے مجھ کو تو بس رضا خداوندِ کریم

غزل (نوشتہ سنہ ۱۸۸۱ء)

مشت خاکستر ہو وہ بلبل کہ گلشن میں نہیں — داغ ہو وہ دل کہ خوں کے ساتھ دامن میں نہیں
ہو فراغ اہلِ زنداں اپنی ضعف و لاغری — ورنہ کوئی منع دیواروں کے روزن میں نہیں

(سلہ قوسین کے الفاظ قیاساً لکھے گئے ہیں۔ طغرے میں صاف پڑھے نہیں جاتے۔)

جوشِ وحشت سے اُبھر آئے ہیں کچھ تارِ نفس تم جو سمجھے ہو گریباں، میری گردن میں نہیں

ہو علائیؔ یہ غزل کچھ فیضِ غالبؔ ورنہ میں
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

قطعہ

کل عالمِ اسرارِ عبرت کی نظر سے گل گشت کا موقع مجھے اک یار بن آیا
دیکھا کہ عجب وادیٔ پُرخار ہی دُنیا رہرو جو پھرا واں سے سو وہ خستہ تن آیا
جو صبح کو گل گونہ قبا راہ سے گزرا وہ شام کو پژمردہ بہ زیرِ کفن آیا
موسم کی طرب خیزی سے آشفتہ سرانہ بُلبل نے کہا گل سے کہ وقتِ چمن آیا
سُن کر یہ کہا گُل نے کہ او بے خبرِ راز کیا تیری طبیعت میں (یہ) دیوانہ پن آیا
اس عہد میں کب تک (کی) ہو (یہ) زمزمہ سنجی نزدیک ہے لے عہدِ خزاں دل شکن آیا

اُردو میں زیادہ تر قطعات، مثنویاں یا منظوم رقعے شاملِ بیاض ہیں اور مجموعی طور پر نہ صرف مقدار میں زیادہ بلکہ قوت و قدرتِ بیان کے اعتبار سے بھی بہتر کلام فارسی کا پایا جاتا ہے۔ افسوس ہے زیادہ عمر نہ پائی ورنہ امید تھی کہ علم و ادب کی اور خدمت کرتے۔ آخرکار وہ بلندخیال امیر جو دعوا کرتا تھا کہ ؎

منم کہ شہرتِ فضلم رسیدہ تا آفاق
منم کہ صیتِ کمالم رسیدہ بر اخراب

۳۱، اکتوبر سنہ ۱۸۸۴ء روزِ جمعہ کو اسی زمین میں جہاں پیدا ہوا تھا، پیوندِ خاک ہوا۔ قبر قطب صاحب (مہرولی) میں ہے۔ منشی امیر احمد صاحب مینائی نے تاریخِ رحلت کہی :

"مزار سایۂ یزداں علاء الدین احمد خاں"

(معلوم ہوتا ہے اس میں منشی صاحب مرحوم نے "علاءُ الدین" کی مشدّد د کو دو دفعہ شمار کرنا جائز

رکھا جس سے سنِ وفات ہجری ۱۳۰۲ برآمد ہوتا ہی)۔

مضمون کے آخر میں ہم خاندانِ لوہارو کی ایک تصویر شامل کرتے ہیں جو سنہ ۱۸۸۱ء میں لی گئی تھی ۔ اس میں نواب علاءالدین احمد خاں وسط میں نشستہ ہیں ، بائیں جانب اُن کے بھائی نواب علی حسین خاں لبادہ اوڑھے بیٹھے ہیں اور دائیں ہاتھ پر عم زاد بھائی سعیدالدین احمد خاں طالب (خلف نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر) اور اُن کے بعد نواب امیرالدین احمد خاں ولی عہدِ ریاست ہیں ۔ جیسا کہ تصویر سے ظاہر ہوتا ہی ۔حضرت علائی ، شکل صورت میں امرائے مغل کا نمونہ تھے ۔ کشیدہ قامت ، مضبوط بدن ، سینہ کشادہ اور چوڑی ہڈی رنگ گندمی ، ستواں ناک۔ اور آنکھیں روشن تھیں ۔ سرکاری ، درباری لباس وہی تھا جیسا اس تصویر میں ہی ۔یعنی چوگوشیہ زرکار ٹوپی ، اُس پر زری کا طرّہ ۔ مخمل کی قبا اور اُس پر کارچوبی حاشیے کا نیمہ آستین ۔ چوڑی موری کا سیدھا پاجامہ اور پاؤں میں سیاہ فُل بوٹ ۔ زرّیں پیٹی میں مرصّع دستے کی تلوار یا کرچ اور نیم آستین کی جیب میں اکثر طلائی گھڑی لگاتے تھے ۔ روزمرّہ کے لباس میں انگرکھا ، سوزن کاری کی ٹوپی یا سادہ مخمل کی چوگوشیہ اوڑھے رہتے تھے ۔

لباس و معاشرت میں نہایت صفائی پسند اور نفیس مزاج امیر تھے ۔ کھانا اعلا درجے کا ہوتا تھا اور گرمیوں میں اس قدر برف پیتے تھے کہ اپنے بھائی کو ایک خط (مورخہ ۲۴ر جون سنہ ۸۴ء) میں لکھا ہی کہ " ان دنوں برف کو پگھلا کر میں پیتا ہوں ، اس قدر سرد پانی ہوتا ہی کہ گلاس ٹوٹ جاتے ہیں ۔ اس پر بھی مجھ کو تسکین نہیں ہوتی " حکمت بھی بیان کی ہی کہ اس سے امراضِ معدہ کو نفع ہوتا ہی ۔

ہمیشہ بہت صبح بیدار ہوتے اور ضروریات سے فارغ ہوکر کاروبارِ ریاست کو پوری ذمّہ داری کے ساتھ انجام دیتے ۔ اگرچہ ان کے مزاج میں غصّہ بہت تھا اور مشہور ہی کہ بعض اوقات فرطِ غضب میں اپنی قبا پھاڑ ڈالتے تھے ۔ لیکن عدل و انصاف اور حق رسی کا جذبہ سب پر غالب تھا اور اس باب میں سعیِ بلیغ فرماتے تھے کہ ان کی رعایا میں کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے ۔ ایک مقفّل صندوق

بستی کے بازار میں رکھا رہتا تھا کہ جو کوئی فریادی ہو اپنی عرضی اس میں ڈال دے ۔ صندوق کی کنجی خود نواب صاحب کے پاس رہتی تھی ۔ ہر صبح چپراسی صندوق لاکر کچہری میں پیش کرتا اور خود بدولت اسے کھول کر سب عرضیاں پڑھتے اور اپنی قلم سے حکم تحریر فرماتے تھے ۔ ان کی انصاف پسندی کا یہ واقعہ ایک مثل میں محفوظ ہے کہ کسی جلسے کے لیے اہل کاروں نے مٹھائی منگائی اور بہت روز تک قیمت ادا نہیں کی ۔ مٹھائی خود نواب صاحب کے ایما سے منگائی گئی تھی ۔ لہٰذا حلوائی نے عرضی میں مطالبہ پیش کیا تو اس پر حکم لکھا کہ چوں کہ اس مقدمے میں خود میں فریق ہوگیا ہوں اس لیے فیصلہ مرزا محمد علی بیگ ناظم ریاست کے سپرد کیا جاتا ہے . . . .



ترقّی پسند ادب پر ایک نظر

(بہ قلم جناب عزیز احمد صاحب اُستاد ادبیاتِ انگریزی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

(۱)

حقیقت نگاری

اُردو ادب کی وہ جدید تحریک جو ترقّی پسندی کے نام سے موسوم ہے، دراصل دو عناصر ترکیبی سے بنی ہے۔ دو دھارے ہیں، جو اس میں مل کر بہتے ہیں۔ لیکن اُن کا تجزیہ آسانی سے ممکن ہے۔ کیوں کہ ابھی تک وہ آپس میں بالکل مل جُل کر، بالکل خلط ملط ہوکر ایک نہیں بننے پائے۔ اِن دو دھاروں میں سے ایک حقیقت نگاری ہے، اور دوسری انقلابی تحریک۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ اِن میں سے پہلا دھارا اسلوب ہے اور دوسرا موضوع یا نفسِ مضمون۔ لیکن یہ توضیح غلط ہے۔ حقیقت نگاری اور ادب کی انقلابی تحریک دونوں اپنی اپنی جگہ الگ اسلوب اور الگ موضوع رکھتی ہیں۔ اُردو ادب کی ارتقائی اور انقلابی ضرورتیں کچھ اِس طرح اِس زمانے میں ہم آہنگ ہوگئی ہیں کہ ترقّی پسند ادب میں ان دونوں کا جمع ہونا ناگزیر تھا۔

پہلے ہمیں حقیقت نگاری کا مطالعہ کرنا ہے۔ آپ میں سے بعض حضرات یہ سوال کریں گے کہ صاحب یہ حقیقت نگاری کیا بلا ہے؟ کیا آج تک کوئی بھی تحریر دُنیا میں ایسی لکھی گئی ہے جس میں حقیقت نہ ہو۔ اگر اس میں کوئی حقیقت نہ ہو تو وہ تحریر بے معنی ہوگی اگر وہ بے معنی ہوگی تب بھی وہ اپنے لکھنے والے کی دماغی حالت کی کسی نہ کسی کیفیت کو ظاہر کرے گی، کیوں کہ وہ ایک طرح کا رمز ہوگی جو اپنے مصنف کی دماغی حالت کا کچھ نہ کچھ پتا اسی طرح دے گی، جیسے کسی بڑے شاعر کا کوئی شعر۔

اور یہ چیز جسے آپ حقیقت نگاری کہتے ہیں کیا اس سے پہلے دنیا بھر کے ادب میں نہیں موجود تھی ؟ کیا دُنیا بھر کا ادب "ادب برائے زندگی" نہیں رہا ہے ؟ اچھا مثال کے طور پر میں بلا ارادہ کلیاتِ ولیؔ کو کھولتا ہوں ۔ دیکھیے یہ شعر نکلا ؎

گلی میں اُس ستم گر کی نہ جا اے دل ، نہ جا اے دل

کہ جاں بازی میں آفت ہے، قیامت ہے، خرابی ہے

اس شعر کے مضمون کو فارسی اور اُردو شاعری کی صدیاں پامال کر چکی ہیں ۔ غالباً یہ شعر ولیؔ نے ذاتی تجربے کی بنا پر بھی نہیں لکھا ہے ۔ ممکن ہے کہ اُس کا معشوق جس گلی میں رہتا ہو ، وہاں جانے میں سر پھٹّول کا بھی اندیشہ نہ ہو ، جاں بازی تو ایک طرف رہی ۔ پھر بھی کیا آپ اِنکار کر سکتے ہیں کہ یہ شعر اس زندگی کی طرف ، اس تمدن کی طرف اِشارہ کر رہا ہے، اس تمدن کی پیداوار ہے جس میں ولیؔ پیدا ہوا، زندہ رہا اور مرا ۔ یہ خاص حقیقت نہ سہی ، عام حقیقت تو ہے ۔ پھر آخر حقیقت نگاری کون سی نئی چیز ہوئی؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ بے شک کوئی تحریر جس کے معنی بھی ہوں ، زندگی اور حقیقت سے خالی نہیں ہو سکتی ۔ لیکن بہت سی تحریروں میں ، بہت سی تصنیفوں میں ، یہاں تک کہ کسی مُلک کی صدیوں کی شاعری یا ادب میں زندگی اور حقیقت کا اظہار ——— خصوصیت سے طبیعی زندگی کا اظہار ——— تشنہ اور نامکمل رہ سکتا ہے ۔ چناں چہ غدر سے پہلے تک کی اُردو شاعری میں حقیقت تو یقیناً ہر جگہ ، ہر شعر ، اور شاید ہر لفظ میں موجود ہے، لیکن حقیقت کے بہت سے پہلو ، بہت سے پرتو ایسے ہیں جو موجود نہیں ۔

(۱) قدیم اُردو شاعری عام حقیقتوں کو بیان کرتی ہے ، اور خاص حقیقتوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتی ۔

(۲) وہ "روایاتِ ماضی" کی بہت زیادہ پابند ہے ۔ ظاہر ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کی بُنیاد ماضی پر ہے ، لیکن حال اور مستقبل زندگی کے اہم تر حقائق ہیں ۔

(۳) حال اور مستقبل سے بے توجہی کی وجہ سے اِس شاعری میں مجموعی طور پر سکونیت ہے ، جمود سا ہے ۔ یہ شاعری ساکن ہے، حرکی نہیں ۔ اس میں جوش یا حرکتِ حیات کم ہے ۔

(۴) یہ شاعری طبیعی (Physical) زندگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی ۔ یہ جب حقیقت

سے قریب تر ہونا چاہتی ہو تو بجائے طبیعی زندگی کے روحانی یا ادائی زندگی سے قریب تر آتی ہو۔ اس لیے اس میں رمزیت زیادہ ہو، اور اشیا، ماحول اور اجسام کا بیان کم ہو۔ ممکن ہو اس بات کو نقص نہ مانا جائے۔ صدیوں تک یہ بڑی خوبی سمجھی جاتی رہی۔

موجودہ حقیقت نگاری جو ہندستان میں یورپ سے آئی ہو، قدیم شاعری اور ادب کے ان چاروں رجحانات کو اُلٹ دینا چاہتی ہو۔ لیکن اس کی وجہ جواز دراصل یہ ہو کہ حقیقت کا جو اظہار قدیم ادب اور شاعری میں نہ ہوسکا، وہ بھی ہوجائے۔ خاص حقیقتیں بھی بیان کی جائیں۔ ادب حال کا خاکہ کھینچے، اور مستقبل کی تدبیریں سوچے۔ طبیعی زندگی سے، اشیا اور اجسام سے دل چسپی لے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو حقیقت نگاری کی جدید تحریک، قدیم ادب کی دراصل مخالف نہیں، گو وہ بظاہر مخالف معلوم ہوتی ہو۔ وہ پہلے کی کمی کو پورا کرنا چاہتی ہو، زندگی کے جو جو پہلو تشنہ ہو گئے ہیں، جدید حقیقت نگاری اب ان کو تفصیل سے پیش کرنا چاہتی ہو۔ جہاں تک ادبی روایت شکنی کا تعلق ہو وہ بے شک پُرانے ادب سے بغاوت پر مجبور ہو۔ مگر ذرا اور زیادہ آگے بڑھ کے دیکھیے تو دونوں کا مدعا ایک ہو۔ راستے الگ الگ ہیں۔

حال ہی میں بعض مغربی تعلیم پائے ہوئے نوجوان مصنفوں نے "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث اُٹھائی ہو۔ یہ مسئلہ جدید حقیقت نگاری کی روایت شکنی سے ذرا مختلف ہو۔ بعض نوجوان اُردو مصنفین پُرانے اُردو ادب کو "ادب برائے ادب" قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کی غلطی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اُردو شعرا نے "زبان" کو بہت اہمیت دی ہو۔ لیکن بجز تیسرے درجے کے شعرا کے محض زبان کی خوبیاں کبھی کسی اچھے شاعر کے لیے مقصود بالذات نہیں بننے پائیں۔ "زبان" یا اظہار (نُدرتِ بیان، جدّتِ بیان، مضمون بندی) سب کا مدّعا دراصل یہی ہو کہ وہ نفسِ مضمون، مطلب کے ساتھ اِس طرح گھل مل جائے، اِس طرح ایک ہوجائے کہ پھر بیان اور مطلب میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ محض زبان کا چٹخارہ بھی کسی کسی زمانے میں — انتہائی عیش پرستی یا زوال کے زمانے میں — ضرور مقبول رہا ہو۔ لیکن اِس میں اُردو کی قید نہیں، ہر مُلک میں

بھی ہوتا آیا ہے۔

اگر کوئی ناسخ یا جرأت یا امیر سے یہ کہتا کہ صاحب آپ ادب برائے زندگی نہیں ادب برائے ادب لکھ رہے ہیں تو وہ بے حد پریشان ہوتے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا، اور نہ آج کسی کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ زندگی اور ادب الگ کیسے ہوسکتے ہیں۔ ادب کے اجزاے ترکیبی کیا ہیں۔ زبان، کیا زبان میں زندگی نہیں؟ الفاظ میں معنی نہیں؟ اور معنی ہیں تو زندگی بھی ہے۔ بیان، کیا شاعر نے زندگی کی حرکت کے بغیر بیان پر قدرت حاصل کی؟ یہ ناممکن ہے۔ خیال، یہ تو سراسر زندگی کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے۔ اُردو زبان میں کوئی ایسا شعر نہیں جو حیاتی یا حیوانی حرکت کے بغیر لکھا گیا ہو۔ اِس لیے ہر شعر میں، ہر جملے میں زندگی ہے۔ اب رہ گیا یہ اعتراض کہ صاحب زندگی ہوگی مگر اس زندگی کا مقصد انسانی زندگی کے حرکات و سکنات بیان کرنا نہیں، انسان کی زندگی کے اِفادی پہلو پر نظر ڈالنا نہیں، بلکہ محض الفاظ کے اُلٹ پھیر سے ایک طرح کی ادبی شعبدہ بازی کا تماشا دِکھانا ہے۔ یہ اعتراض دوسرے درجے کی شاعری پر غالباً صحیح اُترے، لیکن اُردو کے اعلاترین شعرا نُصرتی، ولی، میر، درد، آتش، غالب پر تو یہ اعتراض عائد نہیں ہوسکتا۔

لیکن اصل میں "ادب برائے زندگی" اور "ادب برائے ادب" کی بحث قدیم اور جدید ادب کی بحث نہیں ہے۔ یہ دونوں نظریے یورپ کی جدید ادبی تحریکات سے مستعار لیے گئے ہیں۔

"ادب برائے ادب" کی تحریک فرانس میں شروع ہوئی۔ وسلر (Whistler) نے انگریزی ادب کو اس سے روشناس کرایا۔ آسکر وائلڈ نے اِس کی سرپرستی کی۔ انیسویں صدی کے آخری دس سال میں انگریزی ادب ایک لحاظ سے رجعت پسندی کی طرف مائل تھا۔ یہ تحریک بہت مقبول ہوئی اس زمانے میں ایک بڑا فیشن ایبل ادبی رسالہ (Yellow Book) نکلتا تھا۔ اس میں اِس تحریک کو بہت اُچھالا گیا۔ اپنی تنقیدی بنیاد کے استحکام کے لیے اِن لوگوں نے والٹر پیٹر کے نظریوں کو اُلٹے سیدھے معنی پہنائے۔ اِن تمام مباحث میں جانے کی ضرورت نہیں۔ انیسویں صدی کے آخری دس سال میں انگلستان کا ادب اپنے بعض بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے اثر سے محروم ہوچکا تھا جو وکٹوریائی

عہد کے ادبی سرتاج تھے، اور بیسویں صدی کے بڑے بڑے ادیب ابھی تک اپنی پوری عظمت حاصل نہیں کرنے پائے تھے۔ اس درمیانی وقفے میں یہ تحریک مقبول بھی ہوئی اور ختم بھی ہوگئی۔ آسکر وائلڈ نے دوسرا لارڈ بائرن بننا چاہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اعلا سوسائٹی کو برافروختہ کردینا اس کے لیے کافی ہو۔ بائرن جمہوریت پسند تھا۔ آسکر وائلڈ اس لیے اشتراکی نہ بن سکتا تھا کہ ولیم موریس اس کھیل میں اس سے کہیں زیادہ مشاق تھا۔ سیاسی نہ سہی ادبی شعبدہ بازی سہی۔ اعلا اخلاقی اور حیاتی اقدار کا اُس نے مذاق اڑایا اور زندگی کو آرٹ کا مقلد بنانا چاہا۔ یہ تحریریں ضرور بہت دنوں تک فیشن ایبل رہیں۔ خصوصاً ہندستان کے کالجوں میں جہاں یورپ کے کلاسیکی ادب سے زیادہ فیشن ایبل تحریکیں مقبول ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ ہمارا احساسِ کم تری ہو۔

آسکر وائلڈ کا نوجوان ادیبوں پر جو اُردو کے بےشمار رسالوں میں مضامین لکھتے تھے، اچھا خاصا اثر تھا۔ اسی زمانے میں نیاز فتح پوری نے یونانی علم الاصنام اور انسائیکلو پیڈیا بریٹے نیکا کو دریافت کیا۔ خدا کے وجود اور زندگی کے تمام اخلاقی اقدار سے اِنکار کرنے کے بعد انھوں نے رسالۂ نگار کو معلوم نہیں بالارادہ یا بلا ارادہ —— ادب برائے ادب یا ادب برائے "حُسن" کی آماج گاہ بنایا۔ اگر جدید اُردو ادب میں واقعتاً ادب برائے ادب کسی کا مسلک رہا ہو تو نیاز فتح پوری کا اور اِس کا نتیجہ دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو "شاعر کا انجام" کا تمہید:-

> "تقاضائے مصلحت تو یہ تھا، کہ میں اِن اوراق کو کسی معزز وجود کے ساتھ منسوب کرتا، اور اُسی کے پُرشوکت نام کو ان کا عنوان بتاتا، لیکن —— ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ جنوں خروشی، یہ ہذیانِ محبت، دولت کے نزدیک خراشِ سامعہ نہ ثابت ہو، اِس لیے
>
> اے دلِ دیوانہ
>
> تیرے نالہائے شکستہ، تیرے پارہ ہائے آہ، تیرے ہی سازِ بےخودی کے سامنے پیش کرتا ہوں، خدا کرے یہ عرضِ نغمہ، تیری ہستیِ متالم کے حضور میں خجلتِ کاوش نہ ثابت ہو۔"

بہرحال جس زمانے میں نیاز فتح پوری صاحب عبدالماجد دریا آبادی اور اُن لوگوں سے لڑ رہے تھے جو مذہب کے قائل ہیں اور علم فراست الید (غالباً دلِ دیوانہ کے سازِ بےخودی کی مدد سے) تالیف

فرمارہے تھے ، ترقی پسند ادب نے آہستہ آہستہ ان کی مقبولیت کو گھن کی طرح کھانا شروع کیا۔ جو شکست انھیں پُرانے خدا پرستوں کے ہاتھوں نصیب نہ ہوئی تھی اِن نوجوان دہریوں نے دی ۔ " خجلتِ کاوش " " ہستیِ متالم" کو آہستہ آہستہ قعرِ گمنامی کی طرف لے گئی اور اُردو ادب کو ان کی " ٹیگوریت " ان کی یونانیت ان کے نیم علم ــــــ سے بچا رہی ہو۔

نیاز صاحب کے مکتب کے سوا ، اور کسی ادارے یا فرد کو جو زبانی نہ سہی لیکن اساسی طور پر" ادب برائے ادب" کی طرف مائل تھا ، کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ۔

حقیقت نگاری کی یہ جدید تحریک جو اب اُردو ادب اور شاعری پر اس طرح چھاتی جارہی ہو کہ اِس کا اثر شاید ہی ہٹ سکے ، ادب میں یورپ سے آئی ہو۔ ابھی ہندستان میں اس نے اپنے آپ کو اچھی طرح پہچانا نہیں لیکن اس کی تاریخ بہت دل چسپ ہو۔

"حقیقت نگاری" کی اصطلاح کو (Realism) کے ترجمے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو۔ یہ ادبی اصطلاح تو یورپ میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں پہلی بار استعمال ہوئی ۔ لیکن فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر یہ مدت سے رائج تھی ۔

علمِ منطق میں (Realism) اُس اصول کو کہیں گے کہ تصوراتِ کُلی ، اپنے مطابق ، خارجی حیثیت رکھتے ہیں ۔

علمیات Epistemology. میں Realism یہ اصول ہو کہ خارجی دُنیا ہمارے عملِ ادراک سے آزاد طور پر موجود ہو ، اور واقعی طور پر اس طرح ، جیسے ہم اُس کا اِدراک کرتے ہیں ۔

" حقیقی " یا " واقعی " کے معنوں میں لفظ REAL لاطینی RES (بہ معنی شے) سے مشتق ہو۔ اِس طرح یورپ کی زبانوں میں اِس لفظ کے غیر فلسفیانہ معنی میں " حقیقی " کے ساتھ " اشیا " سے تعلق رکھنے کا مفہوم برابر باقی رہا ہو۔ یہ معنی ایک حد تک قرونِ وسطیٰ کے فلسفیانہ محاکموں کی بھی یادگار ہیں ، ورنہ شاید زبانوں میں معانی کی تبدیلی پُرانے تعلق کو بُھلا دیتی ۔ بہرحال انیسویں صدی میں جب فرانس میں ایک ادبی تحریک کا نام Realisme رکھا گیا تو اس کی بنیاد زیادہ تر لغت کے معنی پر تھی یعنی

حقیقت یا واقعہ نگاری کی تحریک " لیکن اس معنی کے ساتھ اشیا (اور بالخصوص ذی روح مادی اجسام) کے تعلق اور ان کی حقیقت بیان کرنے کے گہرے معنی بھی مضمر تھے ۔ فلسفیانہ طور پر یہ تحریک علیاتی اصطلاح سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علیات کی طرح اس کا بھی جدید سائنس سے گہرا تعلق ہے۔ وہ بھی علمِ انسانی کے ذرائع اور مفاد کی ایک طرح سے خدمت کرتی ہے۔ وہ خارجی دُنیا کو اپنے عمل ادراک سے آزاد طور پر موجود تصور کرتی ہے، اور واقعی طور پر جس طرح وہ اُس کا ادراک کرتی ہے، اس کو ادب کی صورت میں پیش کرتی ہے ۔

فرانس میں Realisme کی تحریک شان فلیوری Champfleury کی تحریروں سے شروع ہوئی اس کی سب سے قابلِ ذکر تصنیف Violon de faience سنہ ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی ۔ بہ حیثیت مصنف کے شان فلیوری کا مرتبہ کچھ ایسا زیادہ اونچا نہیں ۔ مگر یورپ میں " حقیقت نگاری " کی جدید تحریک میں اوّلیت کا سہرا اُسی کے سر رہا۔ فرانس میں یہ تحریک بہت جلد " فطرت نگاری " کی تحریک میں ضم ہوگئی جس کا تذکرہ ہم ذرا دیر ٹھیر کے کریں گے ۔

دراصل شان فلیوری نے ایک ایسے ادبی رجحان کو تحریک کا نام دیا تھا ۔ جو ہر مُلک کے ادب میں اُس زمانے میں نمایاں ہوتی ہے جب تمدّن حقیقتوں اور واقعات کے سچّے بیان سے ہم دردی کرنے لگتا ہے ۔ چناں چہ حقیقت نگاری ' اصول ' نہیں بلکہ ایک رُجحان ہے ۔ سائنس جس طرح سچّائی سے اشیا اور اجسام کے خصائص کا معائنہ کرنا چاہتی ہے، حقیقت نگاری، ادب اور آرٹ کے ذریعے یہی کام کرنا چاہتی ہے۔ اِسی لیے بعض ادبی مورّخوں نے سنہ ۱۸۳۲ء سے سنہ ۱۸۷۵ء تک کے انگریزی ادب کو حقیقت نگاری کا ادب قرار دیا ہے ۔ بہ ہر حال انگلستان میں یہ تحریک ـــــ یا رجحان کہ لیجیے تو زیادہ مناسب ہے ، قریب قریب اُسی زمانے میں مقبول ہوا ، جب فرانس میں اِس کو ایک نام دیا گیا تھا ۔

غزلیّت ـــــ جیسے کہ ہم غدر سے پہلے کی اُردو شاعری کے متعلق کہہ چکے ہیں ـــــ عام حقیقتوں سے بحث کرتی ہے ۔ فطرت کو وہ اُصول کے مطابق ڈھال لیتی ہے ۔ رومانیت خاص حقیقتوں کو

پیش کرتی ہے: لیکن رومانیت کی پرواز عقلی نہیں ہوتی، اس میں ذاتی وجدان کا عنصر ضرورت سے زیادہ غالب ہوتا ہے۔ انفرادیت کو رومانی نقطۂ نظر کی شاعری میں ضرورت سے زیادہ دخل در معقولات کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔

"حقیقت نگاری" اسلوب اظہار میں رومانیت کے برعکس ہے۔ ذاتی وجدان اور انفرادی نظر دونوں کی اہمیت یہاں بالکل گھٹ جاتی ہے۔ مگر رومانیت کی طرح "حقیقت نگاری" میں بھی خاص حقیقت ہی بیان کی جاتی ہے۔ "حقیقت نگاری" کا جوہر "تصوریت" "Idealism" کے برعکس ہے، غزلیت اور رومانیت دونوں میں تصوریت ہوتی ہے۔ حقیقت نگاری تصوریت سے ہمیشہ گھبراتی ہے۔ وہ بھی زندگی کے گہرے سچے اصول کی متلاشی ہے مگر اُس کا راستہ دوسرا ہے۔

حقیقت نگار جتنا ہی باکمال ہوگا اُتنا ہی اُس کا نقطۂ نظر غیر شخصی ہوگا۔ (اس میں رومانی ذاتیت کم سے کم ہوگی) سب سے پہلے وہ ناظر ہے۔ اُس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی نقاشی کرے۔ وہ کچھ پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا، کچھ نہیں چھپاتا۔ نظریاتی طور پر وہ "انتخاب" یا "تراش خراش" کے اُصول کا پابند نہیں۔ غیر متعلق تفصیلات کو البتہ وہ کم کرسکتا ہے۔ اس کا اندازِ بیان بہت صاف سیدھا ہوتا ہے۔ اُس کا اسلوب اس کے موضوع سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی رائے کا بہت کم اظہار کرتا ہے۔ روایت کا وہ پابند نہیں۔ (یہ خصوصیت اسے کلاسیکی سے ممتاز کرتی ہے)۔ واقعی زندگی سے وہ جتنا قریب ہوسکے وہ اتنا ہی بڑا حقیقت نگار ہے۔

تصور نگار (Idealist) کے برعکس وہ روحانی، وجدانی، اخلاقی یا جمالیاتی حدود کا پابند نہیں۔ جو موضوع اُسے پسند آئے، یا زندگی کے جس پہلو سے وہ اچھی طرح واقف ہو، وہ اپنی تصنیف کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ "پستی" کا معیار اس کے نزدیک زندگی کی پستی نہیں، فن کی پستی ہے۔ کیوں کہ زندگی کا گندے سے گندا پہلو بھی اتنا پست نہیں ہوسکتا کہ اُسے وہ بیان نہ کرے۔ وہ دعوا کرتا ہے کہ اُسے غلیظ سے غلیظ باتیں لکھنے کی اجازت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ زندگی کی اس سے اچھی اور اہم حقیقتوں کو زیادہ اہم سمجھے اور پہلے انھی کو بیان کرے۔ یا مرے سے غلیظ چیزوں یا

مخربِ اخلاق باتوں کا ذکر نہ کرے۔

اِس سائنسی دَور میں اِس اسلوبِ تحریر اور اِس طرزِ تنقید کی ترقی ضروری تھی۔ اور حقیقت نگاری کی یہ تحریک پوری طرح کامیاب ہوئی۔ مگر اس میں کچھ ایسی خامیاں بھی تھیں جو یورپ کے اعلاترین ادیبوں اور نقادوں کو فوراً نظر آگئیں۔

(۱) "حقیقت" کی ایک سے زیادہ سطحیں ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ حقیقت نگاری جو خارجی حقیقت پہ مبنی ہو، حقیقت نگاری باقی ہی نہیں رہتی۔ ایک طرح کا منطقی تضاد فوراً قائم ہو کے اس کی تنقیص کرتا ہو۔ انسانی زندگی کی حقیقتیں خارجی بھی ہیں داخلی بھی معاشی بھی ہیں اور وجدانی بھی، جسمانی بھی ہیں اور رُوحانی بھی، نفسیاتی بھی ہیں اور نامحسوس بھی۔ اس لیے اعلاترین ادیبوں نے ان پرتو برتو اور پردہ بہ پردہ حقیقتوں کو بیان کرنے کے لیے کہیں تو نفسیاتِ تحلیلی کی مدد سے تجزیہ شروع کیا، کہیں ہلکی سی رمزیت (Symbolism) کو حقیقت نگاری پر شکر کی طرح چڑھا لیا۔ آخرالذکر خصوصیت جدید ڈرامے میں جابجا نظر آتی ہو۔ اِبسن، چیخوف، یوجین اونیل سب کے یہاں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی رمزیت بھی ہو۔ اِس طرح کہ دونوں ایک دوسرے کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اور بیرونی حقیقت کے ساتھ ساتھ اندرونی حقیقت بھی نمایاں ہوتی جاتی ہو

(۲) "حقیقت نگاری" اور اخلاقیات کی کش مکش ــــ یہ دراصل آزادی کا مسئلہ ہو۔ حقیقت نگاری کا یہ دعوا کہ اُسے اخلاق یا کسی اور بیرونی قدر کے استبداد سے انحراف کا حق حاصل ہو، اس لیے جائز ہو کہ سائنس کا اس قِسم کا دعوا بھی جائز ہو۔ آزادیِ رائے میں ہرج ہی کیا ہو۔ لیکن آزادی کی ہمیشہ ایک حد ہوتی ہو۔ ہر فرد کی طرح، ہر تحریک اور ہر رُجحان کی اصلی آزادی یہ ہو کہ وہ دوسرے فرد، دوسری تحریک یا دوسرے رُجحان کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو۔ کیوں کہ پھر سیاسی یا ذہنی یا عقلی امن قائم نہیں رہ سکتا۔

اگر سائنس کی طرح، جس کے بل بوتے پر وہ پروان چڑھی ہو، حقیقت نگاری کا مقصد بھی انسانوں کی خدمت ہو، تو علمِ اخلاق بھی انسانوں ہی کی خدمت کے لیے، ان میں انصاف،

اعتدال اور مساوات کے لیے بنا ہو۔ حقیقت نگاری کو اُس سے بے جا بگاڑ بھی نہیں کرنا چاہیے۔
اور یہ مشکل نہیں۔ حقیقت نگاری بُرے سے بُرے فعل کا نقشہ کھینچنے کی مجاز ہو، لیکن اگر وہ
اخلاقیات کے ساتھ رہ کے اِنسانوں کی خدمت کرنا چاہتی ہو تو اُس کا فرض یہ ہو کہ یہ نقشہ اِس طرح
کھینچا جائے کہ اس سے اس بُرے فعل کی ترغیب نہ ہو۔ بلکہ اُس بُرے فعل سے منافرت معلوم
ہو۔ یہاں یہ اعتراض کیا جائے گا کہ کیوں مُنافرت معلوم ہو؟ اس کا جواب یہ ہو کہ اخلاقیات انسانوں
کے ہزاروں سال کے عملی تجربے کا نچوڑ ہو، انھیں آپس میں اچھی طرح رہنا سکھاتی ہو، اگر اُس نے
کسی فعل کو بُرا قرار دیا ہو، تو یہ اِتنے ہزار سال کے ہم درد انسانوں کا فیصلہ ہو۔ اِس فیصلے کا ساتھ
دینا بھی ایک طرح کی حقیقت نگاری ہو۔

ہمارے بعض ترقی پسند ادیب اخلاقیات کو اضافی قرار دیتے ہیں۔ مَیں اُن سے یہاں یہ کہوں گا
کہ وہ اُصول جو اخلاقیات کے جوہر ہیں، دُنیا بھر کی ہر قوم، ہر مِلّت، ہر طرزِ خیال میں یک ساں
موجود ہیں۔ جو اچھائیاں یا بُرائیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ صرف اُنھی کی حد تک اختلاف ہو۔ اخلاقیات
کی بنیادی اچھائیوں اور بُرائیوں کو اِضافی قرار دینا بڑی غلطی ہو۔ اِس غلطی کے مرتکب جرمن فلسفی ہی ہوسکتے ہیں،
جن کے نزدیک حاکموں کے اخلاق *Herrenmoral* اور ہوتے ہیں اور محکوموں کے اخلاق
Heerdenmoral ان سے بالکل الگ۔ دُنیا کے تمام بڑے مذہبوں، اور بڑے فلسفوں کی طرح
اشتراکیت کے اخلاق کا اساس بھی اُن تمام اچھائیوں پر ہو جن میں اِنسان کی اجتماعی بھلائی ہو۔
اور اُن تمام بُرائیوں کی ممانعت پر ہو جس سے انسانوں میں انتشار، تفرقہ، یا تنازع پیدا ہونے
کا خوف ہو۔

(۳) حقیقت نگاری اور تصوّریت (*Idealism*) کی کش مکش۔ حقیقت نگاری اگر محض مصوّری ہو کر
رہ جائے، جیسا کہ بالعموم اس کا رجحان ہو تو اُس کی '' انسانی '' قدر و قیمت گر جاتی ہو۔ وہ ایک حد
تک بے مطلب سی ہوجاتی ہو۔ لیکن حقیقت نگاری اور تصوّریت تو ایک دوسرے کے بالکل متضاد
ہیں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب اگر لایا جاسکتا ہو تو اس طرح کہ حقیقت نگاری زندگی کے

عظیم الشان منظر کے صرف ایسے پہلوؤں کی نقاشی پر توجہ کرے جو انسان کے ارتقا، اُس کی خوشی، اُس کی تسکین، اس کے علم، اور اُس کے عمل کی ترقی کے لیے زیادہ ضروری ہوں ۔ تصوریت کی ضرورت کو یورپ میں بہت محسوس کیا جارہا ہے ۔ چناں چہ متعدد ادیب جنھیں نوبل پرائز دیا گیا، ان کے متعلق نوبل پرائز کے اعلان میں یہ صراحت بھی کی گئی کہ ان کی تصنیفات میں اعلا درجے کی تصوریت موجود ہے۔ تصوریت کے قریب آنے میں حقیقت نگاری خود بخود اخلاقیات اور نفسیاتی رمزیت کے بھی قریب آجاتی ہے ۔ حقیقت نگاری کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ حقیقت کوئی دائمی شے نہیں، وہ زمان و مکان کا ایک ایسا نقطہ ہے جس سے زندگی کے بےشمار امکانات پیدا ہوتے ہیں ۔

اب ہم یورپ کی حقیقت نگاری کی اور دو شاخوں کا تذکرہ کریں گے ۔ یہ دونوں تحریکیں الگ الگ اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ تو اُردو ادب تک شاید نہیں پہنچیں مگر حقیقت نگاری کے عام اُصولوں میں اِن ضمنی تحریکوں کے بہت سے جُزئی اصول مل جُل کر ضرور پہنچے ہیں ۔ پہلے ہم فطرت نگاری (Naturalism) کا ذکر کریں گے ۔

فطرت نگاری کی تحریک، جس کا آغاز ہر اہم ادبی تحریک کی طرح فرانس میں ہُوا، دراصل حقیقت نگاری کا منطقی ارتقا ہے ۔ فطرت نگاری، حقیقت نگاری کی وہ قسم ہے جو زندگی کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرنا چاہتی ہے جن کو روایتی روحانیت نے عمداً فراموش کردیا تھا ۔ وہ عقلی ثبوتیت کو ادب پر منطبق کرنا چاہتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کو زیادہ تر فروغ فرانس ہی میں ہوا جو ثبوتیت کے فلسفے کا بھی گہوارہ بنا ۔ ادبی فطرت نگاروں میں ممتاز گستاف فلابیر، گوں کور برادران، ایمیل زولا، اور موپاساں ہیں ۔ ان میں سے اکثر کی تصانیف کے انگریزی ترجموں سے ہمارے نوجوان بہت اچھی طرح واقف ہیں ۔ اور اِن میں سے بالخصوص موپاساں کا اُردو مختصر افسانے پر بہت گہرا اثر پڑا ہے ۔

فلابیر کی " مادام بوواری " کا ترجمہ ہندُستان کے کالجوں میں کافی مقبول ہے ۔ یہ ناول جس میں مصنف نے بلا رُو رعایت، بے محابا عشقیہ زندگی کی تصویر کھینچی ہے، حقیقت نگاری کا شاہ کار ہے ۔ اِس لحاظ سے اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے، کہ پوری زبان چھان چھان کے مصنف نے بالکل " صحیح لفظ "

(Mot juste) کو صحیح موقع کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اس کے باوجود اِس کتاب میں اخلاق کا وہ ناقابلِ انکار نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ عشق ہو یا کوئی اور جذبہ، اُس کا حد سے زیادہ گزر جانا نہیں اچھا۔ جو زندہ، چلتے پھرتے لوگ اس ناول کے کردار ہیں، وہ خارجی اخلاقی تلقین کی بنا پر نہیں، بلکہ قصّے کی داخلی حقیقت کی بنا پر تجاوز کا خمیازہ بُھگتتے ہیں۔ فلابیر کا ایک اور ناول جو بہت مشہور ہے، لیکن جو غالباً ہندُستان میں زیادہ نہیں پڑھا جاتا "سلامبو" ہے۔ یہ قرطاجنہ کی زندگی کے متعلق ایک تاریخی ناول ہے، جس کی حقیقت نگاری کی بنیاد تاریخی تحقیق پر ہے، اِس ناول میں مصنّف نے رومانیت کو فطرت نگاری میں بدل دیا ہے۔

فطرت نگاروں کے گروہ میں گون کور برادران کے ناول ہندُستان میں زیادہ مقبول نہیں ہوئے۔ اِن دونوں بھائیوں کا مسلک یہ تھا کہ کسی کردار کی شخصیت کا نقشہ اس وقت تک کام یابی سے نہیں کھینچا جاسکتا جب تک کہ اس کی عادات، اُس کے اندازِ گفتگو، اور اُس کے گرد و پیش کے ماحول سے مصنّف اچھی طرح دماغی واقفیت پیدا نہ کرلے۔

ایمیل زولا کی فطرت نگاری کا نظریہ ذرا مختلف ہے۔ وہ ناول کو ایک سائنسی تجربے کے مماثل قرار دیتا ہے۔ کسی کردار کی سیرت مقرّر کر دیجیے، اُس کی صحتِ جسمانی، اور اُس کے جُثّے کا تعیّن کر لیجیے، تو بس وہ فلاں فلاں موقع پر فلاں فلاں کام کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بہت ناقص ہے۔ اور میرے خیال میں زولا نے زیادہ سنجیدگی سے اس کی پابندی نہیں کی۔ انسانی زندگی اور سائنسی تجربے میں بڑا فرق ہے۔ اسباب و علل، خواہ وہ خارجی ہوں یا داخلی، ان کے سامنے اِنسان کا ردِّ عمل خواہ اُس کی سیرت کتنی ہی متعیّن ہو، اس قدر پیچ در پیچ ہوتا ہے کہ اکثر و بیش تر وہ غیر متوقع کام ہی کر بیٹھتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انسانی زندگی حساب کا سیدھا سا سوال بن جاتی۔ زولا کی ذات کی حد تک اس نظریے سے ایک اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ فطرتاً اس کا رجحان قنوطیت کی طرف ہے، اِس لیے جو کردار وہ پیش کرتا ہے، وہ بالعموم قابلِ نفرت ہوتے ہیں۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زولا انسانی وجدان اور جبلت کو بد قرار دیتا ہے۔

فطرت نگاری کی تحریک فرانسیسی مصوری کی ایک تحریک کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی، جس کا سب سے اہم نمایندہ زولا کا دوست سیزان (Cezanne) تھا۔ اس تحریک کو اثریت (Impressionism) کہتے ہیں۔ اس نام کی ابتدا Monet کی ایک تصویر "ایک اثر" سے ہوئی جو سنہ ۱۸۶۳ء میں ممنوعہ تصاویر کی ایک نمائش میں منظرِ عام پر لائی گئی۔ اس تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ فطرت کی نہایت صحیح نقاشی کی جائے۔ لیکن اس کا اسلوب یہ قرار پایا کہ روشنی اور رنگ اپنے پورے فطری بھدّے پن کے ساتھ استعمال ہوں۔ اسی قسم کا ایک رجحان ہمیں زولا کی فطرت نگاری میں بھی ملتا ہے۔ اثری طرزِ مصوری میں ترتیب نہیں ہوتی۔ رنگ کے ڈھیر کے ڈھیر ہوتے ہیں اور ان میں بھی یک سانیت نہیں ہوتی۔ تصویر میں خطوط نہیں ہوتے، صرف دھبّوں سے، اور موقلم کی کشش سے مُصوّر تصویر بناتا ہے، تاکہ دیکھنے والے پر (لیکن دیکھنے والے کو یہ تصویر ذرا دُور سے دیکھنی پڑتی ہے) وہی اثر ہو جو اصل منظرِ فطرت یا فطری شے کے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ سیزان اشیا کے حجم اور ان کی کمیت میں ان کی اصلی حقیقت محسوس کرتا تھا۔

حقیقت نگاری کی دوسری شاخ نے اطالیہ میں نشو و نما پائی۔ یہ یورپ میں اظہاریت (Expressionism) کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا نمایندہ اطالوی ڈراما نگار لوئی جی پیرا نڈلو (Luigi Pirandello) تھا۔ یہ تحریک، فطرت نگاری کے بعد کی ہے، اور اس کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی، جب یورپ خالص حقیقت نگاری اور فطرت نگاری سے بھی اُکتا رہا تھا اور بہت سی تحریکیں جیسے مابعد اثریت Post-impressionism، مستقبلیت Futurism، تصوریت Imagism وغیرہ محض تنوع، اور ادبی اور دماغی جمناسٹک کے بل بوتے پر پھیلتی جا رہی تھیں۔ لیکن ہم اظہاریت کا ذکر یہاں اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ ایک تو حقیقت نگاری ہی کی وہ بھی ایک صورت ہے، دوسرے یہ کہ اگرچہ اظہاری مصنّفین کی تصانیف اور نظریوں سے ہمارے اکثر ترقّی پسند ادیب شاید ناواقف ہوں لیکن ان کی بہت سی خصوصیات مثلاً ادب کی بے حد و انتہا آزادی کی خواہش ہمارے نوجوان ادیبوں کا بھی عقیدہ بن گئی ہیں۔ یہ غالباً ان جدید انگریزی تصانیف کا اثر ہے جو اس اطالوی تحریک سے متاثر ہیں۔ اظہاریت میں آرٹ کا اصلی مقصد اپنا اظہار ہے۔ ناظر یا حاضر کے جذبات اور احساسات اس سلسلے

ہیں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مصنف یا آرٹسٹ جو لکھتا ہے یا بناتا ہے، اپنے لیے، اپنی مسرت کے لیے۔ ناظرین محض ایک صفر ہیں۔ اس لیے مصنف یا آرٹسٹ کو اجازت ہے، کامل آزادی ہے کہ وہ جو چاہے لکھے۔ اس سے اگر کسی کی دل شکنی ہو تو یہ پڑھنے والے کا قصور ہے، مصنف کو تو پورا حق ہے کہ وہ جو چاہے کرے، ناظر کو تو وہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔

اس نظریے کا اظہاری ادیبوں نے کروچے کے فلسفے کو ماخذ بتایا ہے۔ کروچے کے نزدیک علم دو طرح کا ہوسکتا ہے، وجدانی اور منطقی۔ وجدانی علم کا ذریعہ تخیل ہے، اور منطقی علم کا تعقل۔ وجدان اثرات کا عملی یا موثر اظہار ہے۔ ہر سچا وجدان، اظہار بھی ہے۔ وہ جو اظہار کے لیے اپنی تجسیم نہیں کرسکتا، وجدان نہیں بلکہ محض احساس یا ایک فطری کیفیت ہے۔ کروچے کے نزدیک جمالی فعل، ذہن میں کسی شکل کی تخلیق پر منحصر ہے۔ اس طرح آرٹ محض وجدان یعنی ذہن میں اثرات کا اظہار ہے۔ وجدان اس وقت آرٹ بن جاتا ہے جب نفسِ انسانی اس کے مکمل اظہار کی برابر کوشش کرتا ہے، اور اس طرح اثرات پر تخیل کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ کروچے کے خیال کے مطابق ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ آرٹسٹ اگر چاہے تو اپنے اظہار کو بیرونی طور پر ادا کرسکے۔ لیکن اظہار کا یہ بیرونی طریقہ (مثلاً شاعری، مصوری، سنگ تراشی وغیرہ) آرٹ کے اصلی اور خالص لائحۂ عمل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ کیوں کہ آرٹ تو وجدان کا ایک اندرونی فعل ہے۔ بہ قول کروچے "یہ دوسری حرکت (بیرونی اظہار) اشیا سے پیدا ہوتی ہے، یہ ایک عملی ارتکابِ فعل ہے، یا قوتِ ارادی کا ارتکابِ فعل ..... لیکن آرٹ کی تصنیف (جمالی تصنیف) ہمیشہ اندرونی ہوتی ہے۔ وہ چیز جو بیرونی کہلاتی ہے، آرٹ کی تصنیف باقی نہیں رہتی"

اس طرح تمام نقش کی ہوئی تصویریں، بنائے ہوئے مجسمے، لکھی ہوئی کتابیں کروچے کے نزدیک بیرونی ہوجانے کی وجہ سے خالصتاً آرٹ کی تصنیف باقی نہیں رہتیں۔ وہ محض یادداشت کے لیے ہیں جسمانی محرکات ہیں، جن کی مدد سے آرٹسٹ اپنے وجدان کو دوبارہ پیدا کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کروچے کے نام نہاد مقلدین جو اپنے آپ کو اظہاری کہتے ہیں، اسی بنیاد پر اپنے نظریے کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آرٹ کو اگر تجربے کی خالص اندرونی تعبیر سمجھا جائے تو وہ تنقید سے ماورا ہے،

اور وہ اپنی فطرت کے سوا اور کسی اُصول کا پابند نہیں۔ یہ مان لیجیے تو اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہو کہ ہر موضوع آرٹ کے لیے یک ساں موزوں اور جائز ہو۔ اس طرح ہر عجیب سے عجیب یا غلیظ سے غلیظ مضمون یا موضوع آرٹ کے لیے جائز ہو۔

لیکن جہاں اظہاریوں کا گروہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہو وہاں خود کروچے کا اخذ کیا ہوا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہو۔ کروچے بے شک نقاد کو آرٹ کی اندرونی تصنیف کی تنقید کی اجازت نہیں دیتا۔ (یہ نقاد کے لیے ناممکن بھی تو ہو، نقاد کسی کے ذہن کے اندر کے مجسّمے کو کیوں کر دیکھ سکتا ہو) لیکن جب یہ اندرونی تصنیف، خارجی جسم اختیار کرلے، اور اُس کا اظہار یا اُس کی تجسیم بیرونی ہوجائے، تو یہ بیرونی تجسیم کروچے کے نزدیک نہ صِرف نقاد کی تنقید، بلکہ اخلاقی پابندیوں کی گرفت میں بھی آسکتی ہو کیوں کہ اب یہ اندرونی وجدان کا سوال نہیں رہا۔ اب یہ سوسائٹی کا مسئلہ بن جاتا ہو۔ آرٹسٹ ایک بیرونی جسم بنا کے اپنے اصلی حلقۂ عمل کو چھوڑتا ہو، اور عملی دُنیا میں داخل ہوتا ہو، جہاں معاشیات، اخلاقیات اور سیاسیات سب کی اہمیت ہو۔ اسی لیے کروچے کے خیال میں خارجی تخلیق کے وقت آرٹسٹ کو زندگی کے معاشی حالات اور اخلاقی رجحان کا خیال رکھنا ضروری ہو۔ اِس طرح ایک لحاظ سے کروچے حکومت کی مداخلت کو (یا رائے عامہ کی مداخلت کو) جائز قرار دیتا ہو۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ کروچے سولینی کا ہم عصر رہا ہو، اور اگرچہ توسکانی نی کی طرح اُسے سنہ ۱۹۴۳ء تک اطالیہ سے باہر خاک چھاننی نہیں پڑی، پھر بھی یہ کہنا بڑی زیادتی ہوگی کہ اُس کا یہ فیصلہ کہ آرٹ پر سوسائٹی کی گرفت جائز ہو، فاشزم سے اُس کا اعلانِ صُلح ہو۔ کروچے نے دراصل ایک ایسی حیثیت کی اہمیت واضح کی ہو جس کے بغیر حقیقت نگاری نامکمل رہتی۔ آرٹسٹ کو من حیث الفرد خودمختاری حاصل نہیں۔ آزادیٔ رائے کے یہ معنی نہیں کہ وہ دوسروں کی آزادیٔ رائے پر حملہ کرے۔ ایک قسم کا تحمّل، لحاظ، ٹھیراؤ، ضبط ہی وہ چیز ہو جس سے آرٹسٹ اگر وہ پروپیگنڈا کرنا چاہے، تب بھی، دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگاتا، اور اپنا کام بھی کرجاتا ہو، اپنی بات بھی کہ جاتا ہو۔ سوویٹ روس میں بھی اخلاقی اور معاشی موانع کی بِنا پر ادیبوں پر وہی پابندیاں عائد ہیں، جنھیں کروچے نے جائز

تسلیم کیا ہے۔ ابھی ہمارے نوجوان ادیبوں کو اس سلسلے میں بہت کچھ سیکھنا ہے۔

حقیقت نگاری سے ایک اور بڑا اہم مسئلہ بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہ جنسی موضوع کا مسئلہ ہے۔ یورپ کے جدید ادب میں بھی اس مسئلے کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو بار بار محسوس کیا گیا ہے، اور اگرچہ دنیا کے ہزاروں برس کے ادب کو ایک لمحہ بھی عشق اور عاشقی کے افسانوں یا چرچوں سے خالی نہیں رہا۔ لیکن اب پھر یورپ کے جدید ادب میں جنس کے مسئلے کو وہ اوّلین معاشرتی اہمیت حاصل ہوگئی ہے جو اس سے پہلے صرف قرونِ وسطا میں حاصل تھی۔ اِبسن اور دوسرے تحریکِ حمایتِ نسواں کے سرگرم رہنماؤں نے اس مسئلے کو ادب میں زور و شور سے اُٹھایا ہے۔ جنس کے متعلق اتنی چھان بین اور اتنی سائنٹفک تحقیق ہوئی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ فرائڈ نے نفسیاتِ تحلیلی کو دریافت کیا۔ گزشتہ جنگِ عظیم نے بھی جنس کے مسئلے کی اہمیت کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ الغرض ان تمام حالات کے یکجا ہونے کی وجہ سے اور یورپ کی اس روز افزوں جنسی آزادی کی وجہ سے جس کی شکایت حروبِ صلیبیہ کے زمانے کے عرب سوانح میں بھی ہے، بلکہ اِس جنسی آزادی کے بہت زیادہ بڑھ جانے اور عورتوں کے دعواے مساوات کی وجہ سے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کا پُرانا معیار بڑی حد تک متزلزل سا ہوگیا ہے۔

ہندستان میں پردے، عورتوں سے دوری، اور دبی ہوئی جنسی خواہشات کی وجہ سے کسی نہ کسی پیرایے میں، نقطۂ نظر رجعت پسندانہ ہو یا ترقی پسندانہ، جنس ہمیشہ دِل و دماغ پر حاوی رہی ہے، اور اب جب کہ یورپ سے جواز کا فتوا مل گیا تو پھر کیا پوچھنا۔ اقبالؔ کا یہ شعر کبھی پُرانا نہ ہوگا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس		آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

جنسی مسئلوں اور پیچیدگیوں پر ادب میں ٹھنڈے دِل سے غور کرنا، اور ان پر بحث کرنا، یا اُن کا مطالعہ کرنا تو بے شک اِس عہد اور خصوصاً ہندستان میں ایک بہت مفید اور اہم کام ہے۔ لیکن جنسی موضوع کے طِلسم میں گرفتار رہنا، جنس کو آرٹ یا ادب کے لیے مقصودِ بالذات سمجھنا ترقی پسندی کی نہیں بلکہ انتہا درجے کے تنزّل کی نشانی ہے۔ اور ہمارے ترقی پسند ادب میں ایک

بھی قسم کے جنسی موضوع جس تکرار کے ساتھ بار بار دُہرائے جا رہے ہیں اُن سے یہ اندیشہ پیدا ہو چلا ہو کہ شاید ہم پھر پُرانی داستانوں کے عشقیہ ماحول کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو پڑھنے والے کو شک ہوتا ہو کہ خود مصنف کے نفسیاتی تجزیے کی بڑی سخت ضرورت ہو۔

اُردو ترقی پسند ادب میں یہ جنس پرستی غالباً ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے اثر سے آئی ہو۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں میں یہ ابتذال کی حد تک بڑھ گئی ہو۔ انگریزی تنقید نگار اب ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی تصانیف کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو اب سے چند سال قبل انھیں حاصل تھی۔ کیوں کہ اب نفسیاتِ تحلیلی کا علم بھی ترقی کر چکا ہو۔ اور اب یورپی ادب کی جدید ترین تحریکوں کا رُجحان کُھلّم کُھلّا جنس پرستی کے بجائے رمزیت کے ایسے اسالیب کی طرف ہو جن میں جنسی مسئلوں کو پوری واجبی اہمیت تو حاصل ہو، مگر جنس کا سوال حد سے زیادہ متجاوز نہیں ہونے پاتا۔

یہاں ترقی پسند ادیب (یا اُن میں سے وہ دو یا تین ادیب جو جنسی عریاں نگاری کے بڑے حامی ہیں) یہ کہیں گے کہ اُردو ادب کا دامن جنسی مضامین سے خالی کب تھا؟ داستانِ امیر حمزہ اور باغ و بہار پڑھیے۔ سودا کی مثنویاں، گلِ بکاؤلی، نسیم، زہرِ عشق، بہارِ عشق اور مومن کا کلام پڑھیے۔ آپ کو جنسی ابتذال بھی ملے گا، اور جنسی موضوع مقصود بالذّات حیثیت سے بھی، پھر ہم نے کیا قصور کیا ہو؟ اس کا جواب یہ ہو کہ اِسی وجہ سے تو ترقی پسند ادب کو جنسی موضوعوں کی غلامی توڑنے کی اور بھی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ جس طرح ترقی پسند ادیب بہت سی پُرانی قدروں کو سرمایہ داری کا "افیون" قرار دیتے ہیں، انھیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ جنس میں ہمہ وقتی آلودگی سب سے تیز افیون ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ جنسی موضوعوں کو بالکل ترک کر دیں، نہ اس کا یہ مطلب ہو کہ وہ جنسی اصلاح کی کوشش نہ کریں۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ "لحاف" اور "پھسلن" جیسے افسانوں سے سوسائٹی کی جنسی اصلاح نہیں ہو سکتی، جنسی تخریب ہوتی ہو نہ ناتجربہ کار لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ــــ اور اس قسم کے افسانوں کا اثر یہی ناتجربے کار لڑکے اور لڑکیاں لے سکتی ہیں ــــ یہ افسانے تخریبی ترغیب کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ان کی روحِ عمل اور غالباً ان کی نیت بھی ترقی پسندی کے

مقاصد کے عین خلاف ہو۔

جنسی مضامین میں تفصیلی حقیقت نگاری نہ سائنسی اہمیت رکھتی ہو، نہ ادبی۔ جنس کی تفصیلی حقیقت نگاری کا مقصد محض شہوانی ہوسکتا ہو۔ شہوانیت کا تجاوز قوم کے قوائے عمل پر بُرا اثر کرتا ہو۔ اوّل ہی رُکاوٹوں اور پابندیوں کی وجہ سے ہندستان میں جنسی رُجحان ضرورت سے زیادہ ہو۔ شہوانی ادب سے یہ رجحان اور زیادہ پستی، اور زیادہ رجعت کی طرف مائل ہوجاتا ہو۔

مَیں مانتا ہوں کہ خاندان یا گھریلو زندگی کا تصوّر پُرانے سرمایہ دار دوْر کی قدرْر کا نتیجہ ہو۔ لیکن ہمارے ادیبوں کو یہ تو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ سوویٹ روس یا جدید انگلستان میں نہیں، بلکہ موجودہ ہندستان میں لکھ رہے ہیں۔ ہندستان میں تعلیمِ نسواں کی کمی کی وجہ سے جنس پرستی کے افسانوں کا خطرہ اور زیادہ ہو۔ وہ لڑکیاں جو ابھی اسکولوں ہی میں پڑھتی ہیں لیکن جو اُردو اچھی خاصی طرح پڑھ لیتی ہیں، تعداد میں کالج کی پختہ تر لڑکیوں سے ــــ جو ایسے افسانوں کو بہ حیثیت ادب، یا بہ حیثیت فلسفۂ زندگی زیادہ تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں ــــ بہت زیادہ ہیں۔ یہ نوعمر لڑکیاں اِن افسانوں کے نام نہاد "ترقی پسند" عُنصر کو تو خاک بھی نہیں سمجھ سکتیں، لیکن شہوانی اور جذباتی عناصر اِن پر براہِ راست فوری اثر کرتے ہیں۔ اور یوں بھی سچ پوچھیے تو اگر آزادیٔ رائے، اور جنسی آزادی اور انفرادیت کے عناصر نکال لیجیے تو اِن سب افسانوں میں بجز مریضانہ شہوانیت اور سستی گندی جذبات پرستی کے اور رہ ہی کیا جاتا ہو؟

بعض اُردو افسانوں میں یورپ کی بعض ممنوعہ کتب کی تقلید کی وجہ سے جنسی غلط کاریوں، اور جنسی اصل کی دماغی بیماریوں کا موضوع اختیار کیا گیا ہو۔ کبھی تو ان افسانوں کے لکھنے والے اپنا بہانۂ جواز حقیقت نگاری کو قرار دیتے ہیں، اور کبھی معاشرت کی اُن سخت گیر پابندیوں کو جن کی وجہ سے یہ غلط کاریاں پھیلی ہیں۔ اگر نقطۂ نظر اصلاحی ہو تو شاید ان موضوعوں میں کوئی ہرج نہ ہوتا۔ مگر ان موضوعوں پر افسانے کچھ ایسا مزہ لے لے کے لکھے جاتے ہیں ــــ

ــــ مثلاً سعادت حسن منٹو کا "دھنواں" اور "بلاؤز" عصمت چغتائی کا "لحاف" اور "جال"، محمد حسن عسکری کا "پھسلن" اور ممتاز مفتی صاحب کے افسانے ــــ جو کم و بیش کہیں نہ کہیں سے

ماخوذ معلوم ہوتے ہیں — کہ نوجوان اور ناتجربہ کار ناظر یا ناظرہ پر ان کا اثر جذبات انگیز ہی ہوسکتا ہے، نہ کہ اصلاحی۔ ایسے افسانوں سے جنسی جذبات اور زیادہ مریضانہ ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حقیقت نگاری جو زندگی کو مرض میں تبدیل کردے کس کام کی ہے، اور اس پر حقیقت نگاری کا اطلاق ہی کیسے ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی ادیب یا ادیبہ یہ فرمائیں کہ یہ معاشرت کے ناسور ہیں۔ ہم ان ناسوروں کو دکھا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ناسور کا کوئی علاج آپ کے پاس ہو تو ایک بات بھی ہے، علاج بتائیے۔ ناسور دکھاکے کیا کیجیے گا۔ اور چوں کہ آپ کو علاج کرنا نہیں آتا کیوں آپ ان ناسوروں کو ہوشیار اور ماہر ڈاکٹروں کے علاج کے لیے نہیں چھوڑتے۔ زیادہ چھیڑنے سے ممکن ہے کہ معاشرت کے یہ ناسور بڑھ ہی جائیں۔

حقیقت نگاری اور جنسی موضوع کی بحث کے اس سلسلے میں، آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگرچہ اعلاترین ادب کا موضوع بھی کبھی جنس کا کوئی مسئلہ ہوسکتا ہے (جیسے اتھیلو میں) لیکن بالعموم اعلاترین ادب، اور اعلاترین حقیقت نگاری کے موضوع اکثر مسائلِ جنس (جن کا اہم ترین پہلو مسئلۂ افزائش و تعلیمِ نسل ہے) سے ماورا اور بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ اب سے نہیں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ زندگی کی اور بہت سی قدور ہیں۔ ایسی قدور جو انسان کو جنس کی محض حیوانی حدود سے بہت پرے لے جاتی ہیں۔ جنس کو بھی اس کی واجبی جگہ بے شک حاصل ہے۔ ہومر کا اصل موضوع ہیلن کا اغوا نہیں، بلکہ دو تمدنوں، دو طرزِ خیال، دیوتاؤں کے دو متضاد گروہوں، مسئلۂ جبر و قدر کے عمل اور ردِّ عمل، انسان کی خارجی اور داخلی شجاعت کی آویزش ہے۔ دانتے کا موضوع جنس نہیں، جنس سے بہت بلند ہے اگرچہ کہ بیاترچے فردوس میں بھی اس کی رہنمائی کرتی ہے، اور وہ شعلہ پوش جہنم میں پاولو اور فرانچسکا کو ہم آغوش دیکھتا ہے۔ شکسپیر کے ڈراموں میں "اوتھیلو"، "انتونی اور کلیوپٹرا"، اور "رومیو اور جولیٹ" کے سوا عشق کسی اور ڈرامے کا مرکزی موضوع نہیں۔ اور ان تینوں ڈراموں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اور کسی چیز کی طرح عشق کا حد سے زیادہ تجاوز کس قدر خطرناک ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے اعلاترین شعرا نے جس عشق کو سراہا ہے اُس میں جذباتِ جنسی کو صرف ایک مناسب جگہ حاصل رہی ہے۔ اور جس قوم پر جذباتِ جنسی اور جنسی مصروفیتیں ضرورت سے زیادہ حاوی ہوتی ہیں، اُس کا زوال یقینی ہے۔ رومۃ الکبرا اور بغداد اور خود اپنے زمانے میں

فرانس کی تباہی ہماری نظروں کے سامنے ہی۔

(۲)

انقلابی قدریں

انقلاب انسان کی ارتقائی زندگی کا سب سے بڑا مُصلح ہی۔ جب زندگی آنکھوں پر پٹیاں باندھے کسی پُرانی روایتی روش پر چلتے چلتے اُکتا جاتی ہی، تو انقلاب آنکھوں کی پٹیاں کھول کے ایک نیا راستہ دکھلاتا ہی۔ اگر انقلاب اس قسم کا ہو کہ اس سے انسان کی اکثریت کو فائدہ پہنچے، تو وہ اپنے اندر بے شمار انسانی خوبیاں بھی رکھتا ہی۔ ایسا ہی انقلاب دراصل صحیح ہی۔

ادب جو زندگی کا پابند ہی، جو زندگی سے گریز کر ہی نہیں سکتا، انقلاب سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہی۔ کبھی کبھی وہ انقلاب کا پیش رو بھی بن جاتا ہی، کیوں کہ وہ صاحب دماغ آدمیوں کا آلۂ کار ہوتا ہی۔

ادبی روایتیں[1] (قدیم اسالیب ادب) جن کی جگہ کوئی ادبی انقلابی تحریک خالی کرانا چاہتی ہی۔ روایتوں کی شکل میں کبھی ظہور میں نہیں آتیں۔ پہلے وہ بھی انقلابی اسالیب ہوتی ہیں، جن کو قبولیتِ عامہ اس قدر رواج دیتی ہی کہ وہ بالآخر ادبی روایات بن جاتی ہیں۔ اور اپنی قدامت، اور رائے عامہ کی سرپرستی کی وجہ سے وہ کبھی کبھی ماضی کو حال پر، اور زندگی کے نفی پہلو کو افادی پہلو پر ترجیح دیتی ہیں۔

شروع شروع میں جب روایاتِ شاعرانہ میں جان ہوتی ہی تو اُن میں بڑی ملایمت، ڈھلنے کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ روایات سخت ہوتی جاتی ہیں، اور جب وہ زندگی جو ان کو اندر سے ڈھالتی تھی، بہ جاتی ہی تو وہ صرف خالی سانچے بن کے رہ جاتی ہیں۔ بہت سے شعرا جو پُرانی روایات میں جان باقی دیکھتے ہیں، نئی ترکیبوں، اور ترتیبوں سے اور ان سانچوں میں نئی جان ڈال کے انھی روایات کو نباہتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسرت موہانی کا تغزل ملاحظہ ہو۔ جس کی اندرونی دھڑکتی ہوئی زندگی سے

---

[1] ادبی روایتوں اور بغاوتوں کے سلسلے میں Lowes کی کتاب Convention and revolt in Poetry بہت دل چسپ ہی۔

انکار کیا ہی نہیں جاسکتا۔ لیکن جدت پسند شعرا، اِن پُرانے سانچوں کو نئی ادبی زندگی کی تخلیق کے لیے ناموزوں، اور ناکافی، اور کبھی کبھی سخت مضر سمجھتے ہیں، اور وہ ادب میں انقلاب کی تحریکیں شروع کرتے ہیں۔ کبھی پُرانے روایاتی اسالیب میں نئے مضامین نئے موضوع متعارف کیے جاتے ہیں۔ کبھی پُرانے موضوعوں اور مضامین کے لیے نئے قالب ڈھالے جاتے ہیں۔

بہرحال اسلوب ہو یا مضمون، جب ایک بار انقلاب آجاتا ہی، تو یہی انقلاب آہستہ آہستہ اپنی ملایمت کھو بیٹھتا ہی، روایت بن جاتا ہی، اور پھر ایک نئے انقلاب کی ضرورت ہوتی ہی، جو اور نئی انقلابی قدریں لائے۔ اِس طرح ارتقا کا کھیل جاری رہتا ہی۔

پُرانی ادبی روایات کی اندرونی زندگی کثرتِ استعمال سے فنا ہوجاتی ہی۔ ایسے شعرا اور ادیب جن میں حرکتِ حیات کم ہوتی ہی ــــ وہ نسلاً بعد نسلٍ، متقدمین کے ڈھالے ہوئے سانچوں میں جو اب خالی ہوچکے ہیں، اپنی تحریریں ڈھالتے جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہی کہ روایات کی فنا کے بعد، ادب میں خلا کی وجہ سے خود بہ خود انقلاب آتا ہی، لیکن اس انقلاب کو ایک محرک کی تلاش ہوتی ہی، اور یہ محرک زیادہ تر بیرونی اثر ہوتا ہی۔ مثلاً کسی اور ملک کے ادب کی مثال، سیاسی یا وجدانی ہیجان۔

جدت پسند قوتِ تخلیق کا دار و مدار، کسی بالکل نئی چیز کی ایجاد پر ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ پُرانی چیزوں کی ارتقائی تجدید پر ہی۔ کیوں کہ زندگی کا سلسلہ کہیں منقطع نہیں ہوتا۔ ادب کا سلسلہ بھی کبھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ کہ مستقبل ماضی سے بہت آگے ہی، لیکن ماضی کے حاصل سے فائدہ اٹھائے بغیر مستقبل میں کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جدید نظریہ کہ ایجاد ہی اعلا درجے کی تخلیقی قوت کا مظہر ہی ایک بڑی پست غلطی ہی۔ قوتِ تخلیق ایجاد سے آزاد ہی۔ وہ امکانات کی تلاش اور اُن پر عبور کا نام ہی۔ قوتِ تخلیق نہ روایت کی غلامی کرتی ہی نہ ایجاد کی۔ اُس کا سب سے بڑا امتیاز اس کی انفرادی خصوصیت ہی۔

ایک انقلابی قدر البتہ ایسی ہی جو کبھی پُرانی نہیں ہوسکتی، جو کبھی روایت نہیں بن سکتی۔ کیوں کہ اُس کا اور انسانی ارتقا کا ساتھ کبھی، نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ انقلابی قدر ادب کی "انسانیت" ہی۔ یہ نہ اسلوب ہی، نہ موضوع بلکہ ایک طرح کا حُسنِ نیت ہی۔ یہ ادب کی یہ نیت ہی کہ جو کچھ لکھا جائے اس کا مقصد انسان

کی فلاح و بہبود، انسانوں کے لیے ایک اقتصادی انصاف کا تصور ہو۔ یہ انقلابی تحریک لازوال ہے۔ ہر بڑے ادبی انقلاب میں یہ کسی نہ کسی طرح ضرور شریک رہی ہو۔ اسی وجہ سے نشاۃ ثانیہ کی ادبی تحریک کو انسانیت پرستی بھی کہتے ہیں۔ یہی تحریک جدید رومانیت کی سیاسی روح عمل بن چکی ہو۔ اسی کی وجہ سے یونانی ڈرامے کی عظمت لافانی ہو۔ اسی کی وجہ سے بہت سے اشتمالی اخباروں کے نام "انسانیت" رکھے گئے ہیں۔ جب تک انسان اس دنیا میں ہو، اور ترقی کررہا ہو اس وقت تک یہ تحریک کبھی پرانی نہ ہوگی۔ یہی موجودہ انقلابی تحریک کی جان ہو۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ ادب کبھی زندگی کے راستوں سے فرار نہیں کرسکتا۔ لیکن جو ادب انسانی تمدن کا دوست ہو، وہ زندگی کا ممد و معاون ہو۔ وہ زندگی کا محسن ہو۔ وہ اگرچہ کہ ماحول کی پیداوار ہو، لیکن ماحول کے قیود سے آزاد ہو۔

ادب کی "انسانیت" کا نظریہ بہت پرانا ہو۔ تمام تر اخلاقیات کی اسی پر بنیاد ہو۔ اشتراکیت میں "انسانیت" کا اساس "معاشی مواقع کی یکساں فراہمی" اور یہ اصول ہو کہ "کوئی انسان کسی اور انسان کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے"۔ پرانا نظریۂ "انسانیت" انسان کی اکثریت کے معاشی اور اقتصادی مفادات کو بڑی حد تک فراموش کرتا آیا تھا۔ یہ "انسانیت" کا ایک نیا پہلو ہو، اور اس لیے بہت اہم ہو۔

اشتراکی نقادوں کا یہ نظریہ کہ ادب "معاشی ماحول" کا پابند ہو، کوئی نیا نظریہ نہیں۔ ادب اور اقتصادی حالات کے تعلق کا تین Taine اور سینٹ بیوو دونوں نے اچھا خاصا مطالعہ کیا ہو۔ اور اب تو ادب کی معاشی توجیہ بھی من جملہ اور طریقوں کے تنقید کا ایک اہم طریقہ بن چکی ہو۔ بورژا نقاد بھی سیاسی اور معاشی اثرات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن دستِ چپ کے نقادوں کی تنقیدیں اور بورژا معاشی توجیہ میں بنیادی فرق یہ ہو کہ اول الذکر ادب کو طبقاتی کش مکش پر منطبق کرتے ہیں۔ یعنی سرمایہ داروں کا ادب، مزدوروں کے حقوق کے مقابل سرمایہ دارانہ اختیارات کی حمایت کرے گا۔ یا مزدوروں کی اہمیت اور ان کے حقوق کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی لیے اشتراکی نقاد ادب کے خالص "جمالیاتی" نظریوں، اور آرٹ برائے آرٹ کے نظریوں کو رجوع الحقیقت بے بنیاد

ہیں) بہت اشتباہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی "ادبی افیون" ہے تاکہ مزدور کا ذہن اہم اقتصادی اور معاشی مسئلوں کی طرف منتقل نہ ہو۔ اسی لئے اشتراکی تنقید جو اپنے آپ کو "تاریخی اصولِ تنقید" بھی کہتی ہے، طبقاتی کش مکش کے مطالعے کے اصول کو اپنی خاص محرک قرار دیتی ہے۔

تاریخی اصولِ تنقید، تاریخِ تمدنِ عالم کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتمالی نظام۔ یہ تقسیم تاریخِ یورپ پر بھی اچھی طرح منطبق نہیں ہوتی، تاریخِ عالم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ مشرق کی معاشی تاریخ جب واقعی تاریخ اور تجسس کے بعد لکھی جائے گی تو معلوم ہوگا کہ اس معاشی ارتقا کے نظریے میں مزید اصلاح کی کتنی گنجایش ہے۔ لیکن بہرحال اس سوال کی اقتصادی یا سیاسی صحت سے یہاں ہمیں براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ ادب کی حد تک یہ تقسیم محض نیم صحیح ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سرمایہ دارانہ ادب، جاگیردارانہ ادب کے مقابلے میں ہمیشہ ترقی پسند ہو۔ مثال کے طور پر تامس مور اور بیکن کے سیاسی خیالات کا مقابلہ کریجیے۔ اُسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ سرمایہ دارانہ دور کے ادب کے مقابلے میں انقلابی دور کا ادب زیادہ ترقی پسند ہو۔ مثال کے طور پر انقلاب سے پہلے کے روسی ادب کا انقلاب کے بعد کے روسی ادب سے موازنہ کریجیے۔

کارل مارکس کی سی معاشی، اقتصادی اور سیاسی مساوات کی تعلیم، اپنے اپنے زمانے کی قیود کے باوجود افلاطون، مزدک، اور تامس مور بھی دے چکے ہیں۔ اِن تمام مثالوں سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں اشتراکی نظریۂ تنقید پر اعتراض کروں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قطعی اعتراضات سے پہلے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہمدردی کے ساتھ قدیم ادب کا پھر مطالعہ کیا جائے، اس میں ترقی پسندی اور "انسانیت" کے بہت سے جوہر ملیں گے۔ اِس پورے ادب کو طبقاتی کش مکش کی کسوٹی پر رد کردینا ٹھیک نہیں۔ جہاں سے جتنی مدد مل سکے لینی چاہیے۔ اور مستقبل کی تعمیر میں ماضی کے انسانی اور ترقی پسندی کے جوہروں سے برابر اعانت حاصل کرنی چاہیے۔

[1] یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ابتدائی مارکسی نظریے نے ادب کو معاشی توجیہ کی حدوں میں ہرگز قید

---

[1] اِس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو نوجوان انگریز اشتراکی ادیب Philip henderson کی کتاب The poet and Society

نہیں کیا۔ دستِ چپ کی تنقید معاشی عناصر کے علاوہ، دوسری قوتوں کی بھی قائل ہے۔ اینگلز نے سنہ ۱۸۹۰ء میں لکھا تھا: "میں اور مارکس ایک حد تک اس امر کے لیے موردِ الزام ہیں کہ نوجوان مصنفین (ادب کے) معاشی پہلو کو واجبی حد سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں"۔ اینگلز نے یہ بھی لکھا ہے "لاتعداد قوتیں ہیں جو ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں۔ متوازی الاضلاع طاقتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ایک مجموعی موصل پیدا کرتا ہے ـــــ یعنی تاریخی واقعہ"۔

لینن نے یہ بھی کہا ہے "حقیقت کے کسی مظہر کے تمام پہلوؤں کی کلیت ہی سے سچ ترتیب پاتا ہے"۔ اس طرح یہ کہنا کہ اشتراکی تنقید تصوراتی، وجدانی یا دوسرے غیر معاشی پہلوؤں کے لیے کوئی گنجایش نہیں رکھتی بڑا غضب ہے۔ اگر محض انقلابی موضوع ہی ادب کی عظمت کا واحد معیار ہوتا تو غالباً "کمیونسٹ مینی فسٹو" ادب کا سب سے بڑا شاہ کار سمجھا جاتا۔ دستِ چپ کی تنقید، اور اب سوویٹ روس کی تنقید بھی ایک حد تک، معاشی توجیہ کو ادب کا واحد زاویۂ نگاہ نہیں بناتی۔ مگر اس کا شمار اہم ترین زاویہ ہائے نگاہ میں ضرور کرتی ہے۔ اور طبقاتی کش کش اور اس کے ادبی اثرات کی طرف بھی پوری توجہ کرتی ہے۔

فرائڈ کی تحریریں یقیناً بورژوآ ہیں۔ جان اسٹریچی نے انھیں بار بار بورژوآ قرار دیا ہے۔ لیکن اشتراکی ادیبوں اور تنقید نگاروں پر نفسیاتِ تحلیلی کے اماموں فرائڈ، ینگ، آڈلر کی تحریروں کا بڑا اثر ہے۔ اس اثر کی وجہ سے اشتراکی ادب کو وہ باطنی قدریں بل گئی ہیں جو غالباً محض معاشی توجیہ میں نہ ملتیں۔ دوسری طرف اشتراکی صحت مندی، نفسیاتِ تحلیلی کے اس مریضانہ رجحان کو کم کرتی ہے جو بورژوآ ادیبوں خصوصاً یوجین اونیل کی تصنیفوں میں موجود ہے۔ اسی لیے صحیح ترقی پسندی کے لیے جنس کا موضوع اسی حد تک جائز ہے، جب تک یہ صحت مندانہ اور اصلاحی ہو۔ جب ادب مریضانہ جنس پرستی میں مبتلا ہو جائے تو ظاہر ہے کہ وہ رجعت پسند ہو جائے گا۔ جنس کا مسئلہ نسلِ انسانی کی افزایش اور برومندی کا مسئلہ، انسانِ جدید کی تعمیر کا مسئلہ ہے۔ مریضانہ جنس پرستی کا جو رجحان ہمارے ترقی پسند ادب میں بالعموم بڑھتا جارہا ہے، وہ ایک سخت مضر عنصر ہے۔ اس کی بنیاد راہ گم کردہ بدنامیت پر ہے، اور

اس کو نفسیاتی تحلیل کے ہاتھوں صحیح نہیں بلکہ غلط پرورش نصیب ہوئی ہے۔ لیکن یہ شکر کا مقام ہے کہ کم سے کم بعض ادیبوں کے یہاں جنس کی آزادی کے معنی فطرت سے ایک ہمدردانہ، صحت مند تعاون کے ہیں۔ پرانی حدبندیوں، اور معاشری خامیوں کے مریضانہ ردِعمل کے نہیں۔ یہ آخرالذکر ردِعمل اس حالت میں جب کہ ہندستان پر ناگزیر معاشری مجبوریاں عائد ہیں، حقیقی آزادی کی نہیں، بلکہ اور زیادہ مریضانہ جنسی گمراہی، اور جنس پرستی کی ترغیب دیتا ہے۔ اور اس لیے ترقی پسندی کی روحِ عمل کے لیے مسموم ہے۔ جتنی تفصیل سے اس مریضانہ ردِعمل کو اُجاگر کیا جائے گا، اتنی ہی شدت سے اصلاحی نہیں بلکہ مریضانہ اور ترغیبی پہلو بڑھتا جائے گا۔

ایک بار جب ہم معاشی توجیہ کے ساتھ ساتھ ادب کی دوسری قدروں کا وجود تسلیم کرلیں تو آزادیٔ رائے کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ ہندستان میں تو پھر ایک حد تک آزادیٔ رائے ہے بھی، لیکن یہ مسئلہ پرولتاری آمریت کے لیے بڑا اہم ہے۔ اگر ادب پرولتاری آمریت کی آزادی کے ساتھ مدد کرے، تو وہ محکومانہ مدد کے مقابلے میں بہت اہم ہوگی۔

ایک اور اہم اصول، یعنی ارتقا بالضد کا اصول، ادب اور خیالات دونوں کی حد تک، آزادیٔ رائے کا پابند ہے۔ آزادیٔ رائے ہی سے ہر نظریے یا دعوے کا تضاد بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ اور تضاد کے بغیر ترکیب و امتزاج synthesis ناممکن ہے۔ اگر ادب کو آزادیٔ رائے کی اجازت نہ دی جائے تو ارتقا بالضد کا قانون جو اشتراکی اصول میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، عمل میں نہیں آسکتا ــــ لیکن آزادیٔ رائے، اسی وقت صحیح آزادی بن سکتی ہے، جب وہ کسی اور کی آزادی میں سدِ راہ نہ ہو۔ اس طرح نہ صرف سیاسی، بلکہ ذہنی خود ارادیت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اور ذہنی خود ارادیت، انفرادیت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن آزادیٔ رائے، اور ہر طرح کی آزادی کی طرح مجبور ہے کہ وہ ایسے رُجحانوں کو ہرگز اُبھرنے نہ دے جو آزادی اور انسانیت کے دشمن ہیں، لامتناہی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی ــــ بالخصوص انسانوں کی سماجی زندگی میں، جہاں آزادی کے معنی دوسروں کی آزادی کے احترام کے بھی ہیں۔ ایسی آزادی جو دوسروں کی آزادی میں مخل نہ ہو، فی الحقیقت آزادی ہوگی، اور وہ اس کی پابند بھی ہوگی کہ آزادی چھیننے والی ہر تحریک کی دشمن

ہو۔ اس طرح وہ ادب جو اِس اصولِ آزادی کا حامی ہو، ہمیشہ آزاد، صحت مند ادب ہوگا اور اس رجعت پسندی کا مقابلہ کرتا رہے گا جو آزادی اور انسانیت کی دشمن ہو۔ ادب کی اتنی آزادی بہت فروعی ہو۔ اور پھر کسی میاکووسکی کی خودکشی کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اکتوبر کے انقلاب سے بہت پہلے لینن نے آرٹ اور ادب کی "آزادی" کا مضحکہ اُڑایا تھا۔ مگر اِس سے اُس کا مقصد طبقاتی کش مکش سے آرٹ کی آزادی کا وہ نام نہاد دعویٰ تھا، جس کی آڑ میں حکمران طبقے پرولتاری ادب اور تنقید میں براہِ راست مداخلت کرتے تھے۔ لینن نے دراصل آرٹ کی آزادی کی نہیں بلکہ آرٹ کی آزادی میں خلل اندازی، اور اس کے گمراہ کرنے کی کوششوں کی مخالفت کی تھی۔

لینن نے لکھا ہو "بورژوا ادیب، آرٹسٹ یا اداکار کی آزادی، زر، رشوت اور سرپرستی کی پوشیدہ (یا ریاکارانہ) محکومی کے سوا کچھ نہیں۔ ہم سوشلسٹ اِس ریاکاری کی قلعی کھولیں گے، اِن غلط نشانوں کو پھاڑ پھینکیں گے ـــ اِس لیے نہیں کہ ہم بے طبقہ ادب یا آرٹ حاصل کریں (یہ تو صرف بے طبقہ اشتراکی سماج میں ممکن ہو) بلکہ اس لیے کہ ہم اِس آزاد ادب کا، جس کی آزادی ریاکاری کی ہو، اور جو درحقیقت سرمایہ داروں سے وابستہ ہو ـــ اُس حقیقی آزاد ادب سے مقابلہ کرسکیں جس کا پرولتار سے بہت گہرا تعلق ہو"۔

لینن کی اس رائے کی روشنی میں ایک سوویٹ نقاد لکھتا ہو[1] "لینن کے یہ الفاظ اُس اساسی فرق کو بالترتیب بیان کرتے ہیں جو سرمایہ داری کے آرٹ اور اُن حالات کے آرٹ میں جب کہ اشتراکی سماج کی تعمیر ہورہی ہو، موجود ہو۔ سرمایہ دارانہ حکومت میں آرٹ بڑی زحمت سے سرمایہ داری کے میسی ناس سے "آزادی" حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ لیکن اُسے صرف فریب وہ آزادی، آرٹسٹی بوہیمیا کی دکھاوے کی آزادی ہی مل سکتی ہو۔ پرولتاری آمریت میں آرٹ کا تاریخی طور پر اُبھرتے ہوئے طبقے یعنی پرولتار سے کھلم کھلا اور براہِ راست تعلق ہو۔ اور وہ سچے معنوں میں آزاد ہوجاتا ہو۔ ہمیشہ کے

---

[1] Painting, sculpture and graphic art in the USSR, moscow, 1934

ملے گی اُسے اُس (نام نہاد) "آزادی" سے نجات مل جاتی ہے، جو آرٹسٹ کو سرمایہ دارانہ سماج کے حالات میں حاصل ہے۔"

یہاں ہمیں بہت ادب سے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ محض اس قدر آزادی کافی نہیں۔ پرولتاری آمریت کو چاہیے کہ آرٹ اور ادب کو اِس سے زیادہ آزادی دے۔

سوویٹ ادب اور آرٹ کا نظریہ دستِ چپ کے ادب اور آرٹ کے نظریوں سے مختلف ہے۔ اکتوبر کے انقلاب کے بعد نشوونما کے پہلے دور میں سوویٹ یونین کا آرٹ لینن کے الفاظ میں "دستِ چپ کی طفلانہ سوزش" کے زمانے سے گزر رہا تھا۔ سوویٹ ادب کی سچی تاریخی نشوونما دستِ چپ کی تحریکوں سے الگ ہی رہی۔ اور اگرچہ کہ ابتدائی زمانے میں عملی طور پر بھی دستِ چپ کے ادیبوں اور فن کاروں نے انقلاب کی اور عوام النّاس میں انقلابی تحریکیں پھیلانے کی، بڑی مدد کی، پھر بھی سوویٹ آرٹ اور ادب کے بانی اور پیرو اپنی تحریک کو دستِ چپ کی شاگردی سے آزاد سمجھتے ہیں۔ سوویٹ تھیٹر پر البتہ دستِ چپ کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جب سوویٹ روس کا منظر بدلا۔ نئے حرفتی شہر ظہور میں آئے۔ ویران پہاڑوں میں برقی کارخانے قائم ہوئے۔ ذرائع حمل و نقل میں مشینیت بہت بڑھ گئی۔ شہروں کی زندگی بدل گئی۔ زراعت میں اجتماعیت پیدا ہوئی۔ تو ظاہر ہے کہ سوویٹ آرٹسٹ پر یہ فرض بھی عائد ہُوا کہ وہ سوویٹ یونین کی متعدد اقوام کے ترقی کرتے ہوئے قومی تمدن کی بھی ترجمانی کرے ــــــ ان کو "عجیب اور غیر" سمجھ کر اُن کی جمالی توجیہ نہیں، بلکہ اِن مختلف قومی تنبیہوں کی سچی خصوصیتوں کی گہرائی اور سچائی کے ساتھ نقاشی کرے۔

اِس طرح سوویٹ حقیقت نگاری کا آغاز ہُوا ـــــ حقیقت کی انقلابی ترقی کی سچی، تاریخی، ٹھوس تصویرکشی، جو مزدوروں کی تعلیم و تربیت میں، اشتراکی روحِ عمل کے ساتھ، مدد بھی دے سکے۔ یہ سوویٹ حقیقت نگاری روس کے آرٹ کا بنیادی تخلیقی اصول ہے۔ یہ اشتراکی حقیقت نگاری جمالی وجدان کو یا جمالی تشبیہ اور استعارے یا تخلیقی تخیل کو ہرگز رد نہیں کرتی۔ یہاں پھر سوویٹ نقاد لینن

کا ایک اور قول دُہراتا ہے " سخت گیر سے سخت گیر سائنس میں بھی تخیل کے عمل اور اس کی طاقت سے انکار کرنا حماقت ہوگی " گورکی نے بھی اسی لیے اس پر زور دیا تھا کہ اشتراکی حقیقت نگاری میں انقلابی رمانیت بھی شامل ہو۔

یہ اشتراکی حقیقت نگاری اپنی افادیت، اپنی حرکت، اپنی مشکلات پر غالب آنے والی قوت ارادی کی بدولت اس روایتی حقیقت پرستی سے بہت مختلف ہے جو بورژوا تصوریت کی خصوصیت بن گئی ہے۔ کم سے کم اس سوویٹ نقاد[۱] کا یہی خیال ہے جس کے خیالات ہم یہاں دُہرا رہے ہیں یہ نقاد انفرادیت کے حقوق بھی ایک طرح سے تسلیم کرتا ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری مختلف راستوں پر چلتی ہے، اور ہر آرٹسٹ کی جداگانہ تخلیقی خصوصیتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اشتراکی آرٹ کا ایک واحد اسلوب پیدا کرنے کے لیے انفرادی تخلیقی اصولوں کا یہ باہم مقابلہ سوویٹ نقاد کے نزدیک ایک بالکل نظری بات ہے۔ یہاں ہم پھر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اشتراکی حقیقت نگاری کو اس سے زیادہ وسعت کی ضرورت تھی۔ سنہ ۱۹۳۶ء سے یہ وسعت بھی پیدا ہونے لگی۔ ابھی مزید وسعت اور آزادی کی گنجایش ہے۔

اس موقع پر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ کیا تمام تر روحانی ادب " افیون " ہے، کیا وہ محض گریز ہے۔ اگر روحانی ادب زندگی کی تمام معاشی اور اقتصادی قدروں کو ہیچ سمجھتا ہے تو یقیناً وہ ایک طرح کا گریز ہے زندگی سے منھ موڑنا ہے۔ لیکن اگر یہ روحانیتِ مجاز یعنی عالمِ رنگ و بو کے پورے تجزیے اور پورے مطالعے کے ساتھ ساتھ ہے تو یقیناً وہ ایک وجدانی کیفیت ہے۔ اور اُس کو جائز قرار دینا انقلابی ادب کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انقلابی ادب وجدانی قدروں کی طرف توجہ کرے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وجدانی زندگی پر پہلے ہی سے ضرورت سے زیادہ توجہ ہوتی رہی ہے۔ لیکن اگر انقلابی ادب وجدانی ادب کی قدروں کو رد کردے، ایسی قدروں کو جو وجدانی ہونے کے ساتھ ساتھ اقتصادی دنیا کو نہیں بھولی ہیں، یا انھی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ ایسی قدروں کو بلا تجزیہ و امتحان مردود قرار دے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی عیسائیت مذہبی زندگی کے تین مدارج قرار

[۱] Painting, Sculpture and graphic Art in the USSR, Moscow, 1934.

دیتی تھی ۔ عملی زندگی ، جس میں محنت کرنے والا آدمی اپنے پورے دنیاوی اور سماجی فرائض ایمان داری سے انجام دیتا ہے ۔ دوسری فکری زندگی یا گیان دھیان کی زندگی جس میں وہ اعلا رُہبانی اور روحانی فرائض ادا کرتا ہے ، مگر تیسری اور اعلا ترین زندگی مشترک زندگی ہے ، جس میں عملی اور روحانی یا وجدانی قدریں باہم مل جاتی ہیں ۔ یہ زندگی خیرِ کثیر کے استحکام کے لیے شر کو ہٹانا چاہتی ہے ۔

انسان کا ہزارہا سال کا وجدانی تجربہ محض دھوکا نہیں ہو سکتا ۔ برگسان کی مقبولیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ بھی وجدان کی انسان کو اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ہمیشہ رہی ہے ۔ اور میرا تجربہ ہے کہ اشتراکی مُلک کا رہنے والا نیا اِنسان بھی جب تمام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی ، اندرُونی خلا محسوس کرے گا جس کے لیے وجدانی احساس کی ضرورت ہوگی ۔

(۳)

اُردوُ ادب اور جدید تحریک

اُردوُ ادب میں جدید عناصر کی ضرورت اب سے بہت پہلے محسوس ہوئی ۔ روایتی مضامین کی زندگی جب کم زور پڑ گئی تو ایک نئے راستے کی ضرورت تقریباً ہر بڑے شاعر نے محسوس کی ۔ میرؔ کی انفرادیت غالباً اُردوُ شاعری میں ایک نئی زندگی کی پہلی نشانی ہے ۔ یہ انفرادیت پُرانے رسُوم و آئین کی پابند ہے ۔ لیکن ان رسُوم و آئین کو ، اور اِن کے ساتھ پُرانے سانچے کو وہ ایک نئے شخصی جذبے سے مملوٗ کرتی ہے ۔ یہ جذبۂ یاسیت ، یاس انگیز رومانیت کا ہے ، جس میں عشق اور موت مِل کر ایک ہو جاتے ہیں ۔ جس کی نوعیت مریضانہ ہے ۔ پھر اس جذبے کی کیفیتیں انفرادی ہیں ۔ ان میں ایک طرح کی قنوطی انسانیت ہے ۔ میرؔ اپنے ماحول کی قنوطیت اور اپنے افتادِ طبیعت سے مجبور تھے ، اس کے باوجود ان کی شاعری میں جان ہے ۔ اس سے انکار ہو ہی نہیں سکتا ۔

یہ انفرادیت غدر کے زمانے سے کچھ پہلے غالبؔ اور مومنؔ میں پھر اپنی پوری شان و شوکت سے نمایاں ہوتی ہے ۔ مومنؔ کی عشقیہ شاعری کسی لحاظ سے بھی پامال اور پیش پا اُفتادہ نہیں ۔ اُن کے

اپنے تجربے، ان کے انفرادی تجربے سے اُن کے شاعری کے خمیر کی تعمیر ہوئی ہو۔ اسی لیے اُن کی عشقیہ شاعری میں اُن کا ذاتی سوز و گداز رُوح کی طرح طاری و ساری ہو۔ کبھی کبھی وہ پُرانی روایتوں کو بھی نظر انداز کرجاتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں، اپنی ظاہری اور باطنی عشق کے ایسے رموز اور نکات بیان کر جاتے ہیں، جن کے بیان کرنے کی اجازت نہیں۔

غالبؔ کی شخصیت باوجود تنگنائے غزل میں محصور رہنے کے ہر طرح آزاد ہو۔ وہ پُرانی روایتوں کو، عشق اور رشک کے "مضامین" کو بھی "باندھتے" ہیں لیکن محض روایتوں کی طرح۔ اور جب حقیقی شاعری کی طرف توجہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہو کہ شاعری کا کوئی کوہکن ایک ایسا پہاڑ کاٹ رہا ہو جو ماضی اور حال کو مستقبل سے جُدا کرتا ہو۔ اُن کے حکیمانہ اشعار، اُن کے تصوّف، اُن کی موعظت، اُن کے طنز، اُن کے مذاق، ہر چیز میں ایک ذوقِ نمو، ایک جوشِ حرکتِ حیات کی جھلک ہو۔ جو اندرونی، داخلی طور پر مستقبل کی طرف، ایک آنے والے دوَر کی طرف اِشارہ کرتا ہو۔ وہ ایک طرح کے شاعرِ آخرالزّماں ہیں، جن پر ہزارہا سال کی پُرانی فارسی اُردو شاعری کا خاتمہ ہوتا ہو، اور جن سے ایک نئے، گہرے، باطنی، بارمز، باحقیقت اساسِ ادب کا آغاز ہوتا ہو۔ غالبؔ کی شاعری میں وہ حرکت ہو جو اِس سے پہلے کے صدہا سال کے سکُون کو ختم کرتی ہو۔ مثال کے طور پر دیوانِ غالبؔ کی ابتدائی تین چار غزلوں میں یہ شعر ملاحظہ ہوں:-

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہو دم شمشیر کا
بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا — موے آتش دیدہ ہو حلقہ مری زنجیر کا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری — حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں رجائیت زیادہ نہیں۔ اتنی بھی رجائیت نہیں جتنی حافظ شیرازی کے کلام میں ہے۔ لیکن غالب کا زمانہ ہی یاسیت اور قنوطیت کا تھا۔ ہر طرف ادبار، زوال، تباہی تھی۔ لیکن اس رجائیت کے نقدان کے باوجود غالب میں پست اور مریضانہ قنوطیت بھی بہت کم ہے۔ سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی وہ ایک قابلِ تعریف خودداری کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کے اظہارِ تکلیف میں بھی ایک طرح کی آن بان ہے۔ اس کا بہترین نمونہ ان کا وہ فارسی ترجیع بند ہے جو انھوں نے قید کے زمانے میں لکھا۔ اس کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شمع ہرچند بہ ہر زاویہ آساں سوزد — خوش تر آں ست کہ بر نطع در ایواں سوزد
عودِ من ہرزہ مسوزید وگر سوختنی ست — بگزارید کہ در مجمرِ سلطاں سوزد
خانہ ام ز آتشِ بیدادِ عدو سوخت دریغ — سوختن داشت زِ شمعے کہ شبستاں سوزد
منم آں سوختہ خرمن کہ زِ افسانۂ من — نفسِ راہ رو و رہ زن و دہقاں سوزد
منم آں قیس کہ گر سوئے من آید لیلہ — محمل از شعلۂ آوازِ حُدی خواں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ روشن نہ شود در شبِ تار — جُز بداں خواب کہ در چشمِ نگہباں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ در وے نہ تواں یافت ہوا — جُز سمومے کہ خس و خارِ بیاباں سوزد

اے کہ در زاویہ شب ہا بہ چراغم نگری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم نگری

یہاں "مجمرِ سلطان" بھی سخن گسترانہ بات ہے۔ غالب اپنی اصل رائے کا یوں اظہار کر چکے تھے ؎

بہیں زِ دولتِ تو مجو قربِ شہ کہ منظر را — دریچہ باز و بہ دروازہ اژدہا خفتہ است

یہی وجہ ہے کہ باوجود دربار سے تعلق رکھنے کے وہ دربار کو خوش نہ رکھ سکے۔ اُن کے قصائد اور مدحیہ

اشعار پھیکے ہیں۔ بار بار وہ گستاخیاں کرجاتے ہیں اور مجبوراً گستاخیوں کی معافی مانگتے ہیں۔ غدر کے بعد انھوں نے ملکۂ معظمہ وغیرہ کی تعریف میں فارسی قصائد بھی لکھے۔ مگر وہ بھی سب روکھے پھیکے ہیں۔ یہ ایک کٹھن سلل' تلخ ایام شاعر کی مجبور کوشش تھی۔ جو نہیں جانتا تھا کہ اپنے نئے مالکوں کو کس طرح خوش کرے۔

نظیر اکبرآبادی کو ترقی پسند شاعر متفقہ طور پر اپنے پیش رووں میں تسلیم کرتے ہیں۔ نظیر کا سب سے بڑا کارنامہ ٹھوس زندگی کی طرف توجہ تھی۔ اب تک اُردو شاعری میں حقیقت' روح یا جوہر کی شکل میں پیش کی جاتی تھی۔ وہ مجرد، ذہنی اور خیالی تھی۔ زندگی کے "عام" حقائق ہی سے اب تک اُردو شاعری ملوّ تھی۔ نظیر اکبرآبادی کی ٹھوس شاعری میں جیتا جاگتا، ہنستا بولتا روتا ہوا ہندستان سہ العبادی شکل میں نظر آتا ہے۔ ٹھوس مادّی زندگی پہلی مرتبہ اپنی بوقلموں اور رنگارنگ پیچیدگیوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ نظیر کے اخلاقی، جمالی اور وجدانی محسوسات (ان کی غزلوں سے قطع نظر) اسی ٹھوس زندگی سے اُبھرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

آزاد اور حالی نے مغربی شاعری کا کھلم کھلا استقبال کیا۔ حالی کا "مقدمۂ شعر و شاعری" اُردو تنقید کے جدید دور کا، اور اُن کا کلام اُردو شاعری کے نئے دور کا باقاعدہ آغاز کرتا ہے۔ سیاسی تصورات اب کھلم کھلا اُردو شاعری کے موضوع بن گئے۔ اور اِن کے ساتھ معاشی اور اقتصادی مسائل کا زیرِ بحث آنا بھی ضروری تھا۔ اکبر کی شاعری ایک طرح کا تضاد (Anti thesis) ہے، کامل امتزاج . Synthesis اقبال کی شاعری میں رونما ہوتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ نظم کی مقبولیت کی وجہ سے نئے اسالیب سخن میں تجربے ہونے لگے۔ طباطبائی مرحوم نے نظمِ عاری لکھنے کی کوشش کی، اور نوجوان شعرا نے اور بہت سے اوزان اور مغربی طرز کی نظم کے بہت سے طریقوں کو تجربتاً استعمال کرنا شروع کیا۔

اُردو نثر میں بھی انقلاب آیا۔ "باغ و بہار" ہی سے اِس انقلاب کے آثار نظر آرہے تھے سرسید نے اس کی تکمیل کی۔ سرسید کے یہاں نہ صرف مقفّیٰ اور مسجع اسلوب کا کوئی سُراغ نہیں بلکہ ایک نیا نثری وزن قائم ہوجاتا ہے، جس کی بُنیاد روزمرّہ کی بول چال پر ہے، جو دماغی اور ذہنی تصورات

کے اظہار کے لیے مغربی نثر سے قریب تر کھنچ آیا ہے، اور جس کا نفسِ مضمون بالکل بدل چکا ہے۔ سر سیّد کی اِس نئی اُردو کا ساتھ تنقید میں حالی اور شبلی نے، ناول میں نذیر احمد، سرشار اور شرر نے دیا۔ اور مقفا نگاری جو تقریبًا ایک ہزار سال سے عربی، فارسی اور اُردو نثر سے چمٹی ہوئی تھی۔ اب ہمیشہ کے لیے دفن کردی گئی۔

نظم اور نثر کے اِس انقلاب کی انتہا اقبال کی شاعری اور پریم چند کے افسانے ہیں۔ اِن میں سے پریم چند نے سرشار اور شرر کی ماضی پرستی کو بالائے طاق رکھ کے سیدھی سادی مگر بہت پُر اثر زبان میں گرد و پیش کی زندگی کا مطالعہ شروع کیا۔ اُن کے نقطۂ نظر میں قوم پرستی، اور وہ جذبۂ اصلاح ہے جو قوم پرستی کی پیداوار ہے۔ یہ جذبۂ اصلاح کبھی کبھی پریم چند کی حقیقت نگاری میں مخل بھی ہوجاتا ہے۔ مگر اپنے افسانوں اور ناولوں میں قصّے کو انھوں نے پہلی بار سیاسی اور قومی اصلاح کے لیے آلۂ کار بنایا ہے۔ اگر پریم چند نے اُردو افسانہ نگاری کو اتنی ترقّی نہ دی ہوتی تو ترقّی پسند افسانے کا یہ کام یاب دور تصوّر میں نہیں آسکتا تھا۔ آخر آخر میں پریم چند نے ترقّی پسند تحریک کا ساتھ بھی دیا۔ پریم چند دو دنیاؤں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ ماضی کی متانت، اور دورِ جدید کا انقلابی جوش و خروش دونوں ان کے یہاں موجود ہیں۔

جس طرح پریم چند دو تمدنوں کو ایک پُل کی طرح ملاتے ہیں۔ اُسی طرح اقبال کی شاعری دو تمدنوں کو نہیں ملاتی، بلکہ دُنیا کے ہر تمدن کا جوہر اپنے اندر رکھتی ہے، اور اسی لیے بے زمان اور لازوال ہے، ترقّی پسند شاعری کی سب سے بڑی محرّک بنی۔ اقبال کی شاعری کے ترقّی پسند عنصر سے ہم بعد میں بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اقبال کا آرٹ اور ادب کا نظریہ، ترقّی پسند ادب کے نظریے سے بہت قریب ہے، اور اُس کا ایک بہت اہم رہنما ہے۔

تاریخی ارتقا اور ارتقا بالضد، دورانِ محض کی حرکت کے ساتھ ساتھ وجود میں آتا ہے۔ دورانِ محض اِس ارتقا کو پرکھتا بھی ہے۔ اور کم عیار واقعوں اور حیثیتوں کو ختم کرتا جاتا ہے۔ کیوں کہ دورانِ محض در اصل دن اور رات یا کسی اور خارجی پیمانے سے ناپا نہیں جاسکتا۔ اِس لیے ہُنر کے صرف وہی کارنامے باقی

ہیں گے جنھیں انسانِ کامل نے (جس کی حکمت خیرِ کثیر ہی) اپنے عشق، یعنی سچے جذبۂ تخلیق سے بنایا ہی ؎

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات — سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ — جس سے بناتی ہی ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہی ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہی یہ، مجھ کو پرکھتا ہی یہ — سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، مَیں ہوں اگر کم عیار — موت ہی تیری برات، موت ہی میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہی کیا — ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہی نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہُنر — کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہان ثبات

ہی مگر اُس نقش کو رنگِ ثباتِ دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام "... (مسجدِ قرطبہ)

تمام ادب، ہُنر کی تمام پیداوار، دورانِ محض کی رَو میں نیست و نابود ہوجائیں گے، مگر مردِ خدا کی بنائی ہوئی چیزیں باقی رہیں گی۔ یہ مردِ خُدا، وہی اقبال کا مومن اور فقیر، عبدالکریم جیلی کا انسانِ کامل، برگساں کا (نیٹشے کا نہیں) کا ارتقا یافتہ انسان ہی۔ اُس کا تصوّر سوّیتی جدید انسان سے بہت قریب ہی۔ انسان قدرت پر جتنا قابو پائے وہ اُتنا ہی برگزیدہ ہی۔ فطرت کی قوّتِ حافظہ اس کا راستہ مستقبل کے لیے کُھلا رکھے گی۔ قوّتِ حافظہ اس کے فن کو مٹنے نہیں دے گی۔ کیوں کہ اس کے فن کا محرّک عشق ہی، عشق جو روحانی اور جسمانی حیات کا جوہر ہی، اور جس کو موت نہیں آسکتی ؎

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ — عشق ہی اصلِ حیات، موت ہی اس پر حرام
تند و سبک سیر ہی گرچہ زمانے کی رَو — عشق خود اک سیل ہی، سیل کو لیتا ہی تھام

عشق، ہزاروں سال سے انسان کا محرّکِ تخلیق ہی۔ یہ تقریباً وہی چیز ہی جسے برگساں نے جوشِ حرکت

حیات سے تعبیر کیا ہو۔ عشق زمانے کی قیود سے آزاد ہو (" جاوید نامہ " میں اقبال نے یہ بحث کی ہو کہ وہ مکان کی حدود سے بھی آزاد ہو) ؎

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا　　اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

آرٹسٹ کے اس انفرادی جذبے کو جو عشق کی وجہ سے متحرک ہوتا ہو اقبال نے "خونِ جگر" کا نام دیا ہو۔ میری رائے میں یہ محض خلوص نہیں۔ اس میں فن کار کے تخلیقی جذبے کی پوری کلیت شامل ہو۔ فن کار کی اعلا ترین تصوریت، اور سخت ترین محنت، اور اس کی سچی انسانی ہمدردی، بھی خونِ جگر ہی ہیں۔ اُن کی وجہ سے پتھر، موم کی طرح آرٹسٹ کی ذہنی تصویر ہی نہیں اختیار کرتا وہ دل کی طرح دھڑکنے بھی لگتا ہو ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت　　معجزۂ فن کی ہو خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہو دِل　　خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

لیکن سِل، دِل کیسے بن سکتی ہو، کس طرح انفرادی جذبۂ تخلیق یہ [illegible] کر سکتا ہو، اس کے لیے خودی کے ساتھ ساتھ نئی افکار اور نئی قدروں کی ضرورت ہو ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہو نمود　　کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہو　　جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں　　ہُوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

لیکن اُنھیں آنے والی نسل سے ان نئی افکار، نئی قدروں کے پیدا کرنے کی توقع ہو، ایک طرح سے وہ آنے والے ارباب کا خیر مقدم کرتے ہیں ؎

ہوائے دشت سے بوے رفاقت آتی ہو　　عجب نہیں ہو کہ جلد میرے ہم عناں پیدا

"ادبیات" میں اقبال 'عشق'، (جس سے یہاں عشقیہ شاعری مراد ہو) کے موضوع کے لیے یہ تبدیلیاں تجویز کرتے ہیں ؎

عشق اب پیرویِ عقلِ خداداد کرے　　آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے

کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے   یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

کیا بالکل یہی تصورِ ترقی پسند شاعری کا نہیں ہے؟ ماضی کی وہ قدریں جو زمانے کی قید سے آزاد ہیں، اور ہمیشہ باقی رہیں گی اُن کا احترام بھی اقبال کے نزدیک ضروری ہے، لیکن اب جمود و زوال کا عالم ہے، اس لیے فن کار کو مشرق اور مغرب دونوں سے کچھ نہ کچھ سیکھنا ہے۔ اِس امتزاج سے اگر زندگی کی شبِ تاریک سحر ہو سکتی ہے تو اس کی اجازت ہے ؎

اِس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی   جن کے لیے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب

بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن   تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

آرٹ کا کمال، فطرت کی پابندی نہیں، فطرت کی تسخیر ہے ؎

اس دشتِ جگرتاب کی خاموش فضا میں   فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک   کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہُنر کو   صیّاد ہیں مردانِ ہُنرمند کہ نخچیر

("اہرام مصر")

ہندستان کے موجودہ آرٹ میں رجعت، بےجان جسم پرستی، مریضانہ رمزیت اور تنزّل کے جو آثار ہیں اُن کے متعلق اقبال کا فیصلہ یہ ہے ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل اُن کا   اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں   زندگی سے ہُنر اِن برہمنوں کا بیزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند   کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس   آہ! بےچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

آرٹسٹ کے لیے جہد و جہد ضروری ہے، تب ہی وہ تسخیرِ فطرت کرسکتا ہے، اِسی صورت میں وہ نئی دنیا

کی تعبیر کرسکتا ہو ؎

نادان ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے		اسبابِ ہُنر کے لیے لازم ہو تگ و دو
فطرت کے نوامیں پہ غالب ہو ہُنرمند		شام اُس کی ہو مانندِ سحر صاحبِ پرتو
وہ صاحبِ فن چاہے تو فن کی برکت سے		ٹپکے بدنِ مہر سے شبنم کی طرح ضَو

وہ آرٹ ہی کیا جس میں حرکت نہ ہو؟

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں		جو جذبِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

اور ؎

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر		بُرا نفس ہو اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

سب سے آخر میں اُن کا نظریہ اُس آرٹ کو غلط اور مُضر بتاتا ہو جس میں "انسانیت" نہیں ؎

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل		کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تاب ناک نہیں
نوا کو کرتا ہو موجِ نفس سے زہرآلود		وہ نَے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

روسی ناول ہندُستان میں ہمیشہ بہت مقبول رہا۔ انقلاب سے پہلے کا روسی ادب ہندُستان کے کالجوں میں نصف صدی سے برابر مقبول ہو۔ انقلاب کے بعد اشتراکی تحریکیں نوجوانوں میں بہت مقبول ہونے لگیں۔ ان تحریکوں کو قوم پرستی کی تحریک سے بھی بہت تقویت پہنچی۔ لیکن قوم پرستی کی تحریک ہندُستان کے ماضی کو عقیدت مندی اور پرستش کی نظروں سے دیکھتی تھی، اور اشتراکی تحریکِ انقلاب جو اپنے ابتدائی جوش و خروش کے عالم میں تھی، ماضی کی ہر قدر، سرمایے، مذہب، سماج کی قید، خاندان، ہر چیز کی دشمن تھی۔ تعمیر سے پہلے وہ تخریب کی ضرورت سمجھتی تھی۔ اقرارِ کامل کی طرح انکارِ کامل بھی، انقلاب کے لیے ضروری ہو۔ جب تک پُرانی قدروں کے مقابلے میں نئی قدریں اپنا مخالفانہ محاذ نہ قائم کریں، ان کے دبا دیے جانے کا اندیشہ ہو۔ بہرحال اُردو میں اس انقلابی تخریب کا پہلا اہم کارنامہ ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہوا، جس کا نام "انگارے" تھا۔ اِس کتاب میں ہزار نقائص سہی لیکن اِس کی

اہمیت سے انکار نہیں۔ اس کی اشاعت سے نئے ادب نے خود مختاری کا عَلم بلند کیا۔ یہ سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ تھا۔ اور اگرچہ کہ اِس حملے میں غیر ضروری خوں ریزی بھی بہت تھی، جس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کئی سال تک پنپ سکی۔ لیکن جیسے کہ ہم کہہ چکے ہیں اِس کتاب کا مقصد نئی قدروں کی تعمیر سے زیادہ پُرانے اصولوں کی تخریب تھا۔ قدامت پرستی، اور اس کی تحریک پر حکومت نے اِس کتاب کو ضبط کرکے، اس کتاب کی اہمیت کو دہ چند کردیا۔

"انگارے" کو بندۂ مزدور کی اوقات سے کچھ ایسا زیادہ تعلق نہیں۔ یہ متوسط طبقے کے شباب کا اعلانِ جنگ ہے۔ اس میں سجّاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں نے اُن تمام اساسی اُصُول پر حملے کیے جو بزرگوں کے نزدیک قابلِ تعظیم تھے۔ جنسی مسائل نے وہ جگہ حاصل کرلی، جس کا انھیں ایک حد تک حق تھا۔ پُرانی تہذیب کی ہزاروں سال کی جھوٹی قلعی جگہ جگہ سے کھولی گئی۔ مُلّاؤں کی جھوٹی مذہب پرستی ـــ ایسی جس میں ایمان کو دخل نہیں، اور جو اپنے نفس کو، اور دوسروں کو دھوکا دیتی ہے، جس کی اقبال نے بھی جابجا شکایت کی ہے ـــ بڑی شدّ ومد سے واضح کی گئی۔

"انگارے" کا سب سے بڑا نقص احتیاط کا فقدان اور بے اصول انتہا پسندی تھی۔ اِسی وجہ سے اس کتاب کا تخریبی مقصد تو پورا ہوگیا، لیکن یہ کوئی تعمیری کام نہ کرسکی۔ مذہب کو سرمایہ داری کی آڑ بنالینا تو بےشک رجعت پسندی ہے، لیکن مذہب پر بے اصول حملے، جن کو اشتراکی عقلیت بھی کسی طرح جائز قرار نہیں دے سکتی۔ اور ذاتِ باری (جس کو کسی نہ کسی نام سے اکثر فلسفی ماننے پر مجبور ہیں جس سے لا ادریت انکار نہیں کرتی، اور دہریت یا مادّیت اگر اس کو نہیں مانتی، تو دوسرے انسانوں کا احترام کرکے اس کو گالیاں نہیں دیتی) کی اہانت کسی طرح جائز نہیں تھی۔ سجّاد ظہیر صاحب اسی انتہا پسندی، اور عدم توازن کی وجہ سے آخر تک اچھے ادیب نہیں بن سکے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "انگارے" کے مصنّفین، اور ان کے بعد بعض ترقی پسند مصنّفین نے محض حدِ اعتدال سے تجاوز (جو غیر ضروری تھا) اور عدم توازن کی وجہ سے مُلک کے بہت سے عناصر کو اپنا دشمن بنالیا، جو غالباً اُن سے ہمدردی کرتے اور اُن کا ساتھ دیتے۔

لیکن "انگارے" کا سب سے اہم کارنامہ خاندان، اور جنسی زندگی کے تعفن کا اشتہار تھا۔ اس میں انھوں نے "کمیونسٹ مینی فسٹو" کے ان بیانات کی روشنی میں ہندستان کی خانگی زندگی کی واقعی سچی تصویریں کھینچیں۔

"موجودہ خانمان، بورژوآ خاندان کن بنیادوں پر قائم ہو؟ سرمایے پر، ذاتی منافع پر ...... بورژوآ اپنی بیوی کو محض ایک آلۂ پیداوار سمجھتا ہو ...... ہمارے بورژوآ اپنے پرولتاریوں کی بیویوں اور بیٹیوں کو اپنے استعمال میں رکھنے پر قانع نہیں، عام بیسواؤں کا تو ذکر ہی کیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کی بیویوں کی عصمت ریزی میں انتہائی لذت محسوس کرتے ہیں۔"

مجھے یاد ہو سنہ ۱۹۳۵ء میں ملک راج انند نے انگلستان میں مجھ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کی ضرورت کا کئی بار ذکر کیا تھا۔ جب انگلستان میں یہ انجمن قائم ہوئی تو اس کے دو ایک جلسوں میں میں ان کی دعوت پر شریک بھی ہوا۔ اسی زمانے میں ہندستان میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی، اور اس سلسلے میں "انگارے" کے مصنفین پیش پیش تھے۔ بہت سے پرانے ادیبوں اور رہنمایانِ قوم مثلاً مولوی عبدالحق صاحب، منشی پریم چند اور پنڈت جواہرلال نہرو نے اس کی ہمت افزائی کی۔ اور پھر ترقی پسندی کی تحریک ہندستان میں اس تیزی سے بھڑک اٹھی کہ اسے کسی انجمن کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

(۴)

ترقی پسند شاعری

اب ہم اہم ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی انفرادی خصوصیات کا مجمل ذکر کریں گے۔ شاعری میں ترقی پسندی کی روح عمل بہت عرصے سے سرگرم تھی۔

ان شاعروں میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ مقدس نام اقبال کا ہو۔ اختر حسین صاحب رائے پوری نے اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں اقبال پر فاشسٹی ہونے کا الزام لگایا ہو۔ مسلسل نکتہ چینیوں پر بھی اختر صاحب نے اپنی غلطی نہیں تسلیم کی بلکہ ایک [illegible] تحریر فرمایا ہو۔

" اقبال کا فلسفۂ زندگی کہتا ہے کہ دنیا کو سائنس اور مشینی صنعت سے منھ موڑکر قدیم مذہبی نظام کی طرف آنا چاہیے جس کی تدوین مومنوں کے ہاتھ ہوگی ۔ یہ نظام قائم کرنے کے لیے شاہین کی مثال پر عمل کرنا ہوگا یعنی بہ وقتِ ضرورت جبر سے کام لینا ہوگا ۔ ظاہر ہے کہ مغربی سائنس اور صنعت کی مخالفت اور ایک بہتر اخلاقی نظام کے نام پر ایک اقلیت کی ڈکٹیٹری فاسی زم کے بنیادی عناصر ہیں ۔ قالب میں فرق ہوسکتا ہے لیکن روح وہی ہے ۔ اقبال کے کلام میں مشرق و مغرب کا تنازعہ کوئی ترقی پسند خیال نہیں " (" ادب اور انقلاب " ص ۱۱۰) ایک جگہ وہ اور بھی زیادہ تنگ نظری سے اقبال کی رحلت ' کو اپنے ایک مضمون کی اشاعت اور چند ترجموں کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادب کے فروغ کے اسباب میں شمار کرتے ہیں ۔ اختر صاحب کی یہ غلطی اور بھی زیادہ افسوس ناک اس وجہ سے ہے کہ ان کا مضمون ' ادب اور زندگی ' فی الواقعہ بہت دل چسپ اور چند جزئیات سے قطع نظر بہت مفید ہے ۔ لیکن ان کی اس اقبال دشمنی کی تین ہی وجوہات سمجھ میں آتی ہیں (۱) یا تو انھوں نے غور سے اقبال کا مطالعہ نہیں کیا ہے ۔ (۲) یا وہ اقبال کے کلام کے پورے اسلامی اور انقلابی امتزاج کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں ۔ (۳) یا وہ محض ہٹ دھرمی سے اپنی پرانی رائے پر قائم ہیں ۔ بہرحال پہلے تو میں ان کے اعتراضات کا جواب دیتا ہوں پھر اقبال کے کلام سے میں ان کی ترقی پسندی کے تصورات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا ۔

(۱) اقبال نے سائنس اور مشینی صنعت کی مخالفت نہیں کی ہے ۔ بلکہ " مشینوں کی حکومت " کے خلاف ان کی شکایت یہ ہے کہ انسان اگر مشین کا محکوم ہوجائے تو زندگی کے اعلا انسانی قدروں کو بھول جاتا ہے ۔ یہ شعر لینن کی زبانی سرمایہ دارانہ حکومت پر معترض ہے جو مشینوں کے زور پر قائم ہے ۔

(۲) کسی قدیم مذہبی نظام کی طرف رجعت کا اقبال نے کبھی پیغام نہیں دیا ۔ جس طرح سوویٹ روس میں ہر قوم اپنے تمدنی خصائص کو فروغ دینے کی مختار ہے ' اسی طرح کے اصول پر اقبال ایک تمدنی خود اختیاری ' اسلامی دنیا کے لیے بھی چاہتے ہیں ۔ تمدنی خود اختیاری میں دماغی اور ذہنی خود اختیاری بھی شامل ہے ۔ جس چیز کی طرف اقبال بار بار توجہ مبذول کراتے ہیں وہ اسلامی شہنشاہی یا سلطنت کا کوئی نظام نہیں ، بلکہ اسلامی روحِ تمدن ہے ۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ روحِ تمدن ، دنیاوی اور معاشی اصولوں

کی حد تک تقریباً بالکل وہی ہو، جو اشتراکی جمہوریت[1] کے نام سے موسوم ہو۔ اِس اسلامی روحِ تمدّن، اِس مملکتِ الٰہی اور اشتمالیت میں فرق محض روحانی اور وجدانی تصوّرات کا ہو، جو اسلام میں اس لیے ہیں کہ وہ ایک مذہب ہو، اور جو اشتمالیت میں اس لیے نہیں کہ وہ مذہب نہیں۔

(۳) اقبال کے "مومن" کے تصوّر کو سمجھنے میں بھی اختر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ اقبال کا مومن، یا جیلی کا انسانِ کامل، یا افلاطون کا پختہ کار فلسفی یا برگسان کا ترقی یافتہ انسان، جس کی حیاتیات بھی اسی قدر قائل ہو جس قدر عیسائیت یا اسلام، کوئی محض مذہبی مخلوق نہیں۔ وہ دراصل سوویٹ کے انسانِ جدید سے بہت قریب ہو کیوں کہ اس کی حکمت خیرِ کثیر ہو۔ وہ خیر کا سخت پابند ہو (اِسی لیے نیٹشے کے فوق البشر سے اُس کا کوئی ناتا نہیں) وہ فقیر بھی ہو۔ اُس کا فقر اُس کی بے نیازی، اُس کا خلوص، اس کی جدّ و جہد، قصّہ مختصر اُس کی "انسانیت" ہو۔ کیا اشتراکیت کے جدید انسان کا فلسفیانہ تصوّر اِس سے مختلف ہو؟

(۴) اقبال کی "شاہینی" کو جبر قرار دینا بڑی غلطی ہو۔ جبر ایک ایسے فلسفے کے لیے جو خیر و شر دونوں کا قائل ہو (اور اقبال قبلِ اسلام کے ایرانی فلسفے کے اثرات کی وجہ سے خیر و شر کے تنازعے کے عام مسلمانوں سے زیادہ قائل ہیں) ایک ہی معنی رکھ سکتا ہو یعنی دوسروں کے حقوق چھیننا، یا دوسروں کی محنت سے فائدہ اُٹھانا۔ لیکن اقبال کا شاہین جو آسمان کو زیرِ پر رکھتا ہو، کبھی کبوتروں پر جھپٹنا نہیں سکھاتا۔ وہ بلند پروازی، اور خیر کی طاقت کا رمز ہو، جبر کا نہیں۔ طاقت اِس لیے ضروری ہو کہ اس سے انسان مظلوم نہیں بن سکتا۔ اور مظلوم بننا ایک ایسی کمزوری ہو جس کو اقبال اور قدرت دونوں بہت حقارت سے دیکھتے ہیں۔ کہیں اقبال نے دوسری قوموں، یا دوسرے تمدّنوں، یا دوسرے مذہبوں کے حقوق پامال کرنے کی ہدایت نہیں کی ہو۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے بے انتہا طاقت مہیّا کرنے کی البتہ ضرور تلقین دی ہو اور اگر یہ شاہینی طاقت نہ ہوتی تو کیا اسٹالین گراڈ کا تحفظ ممکن تھا۔ کیا آج سوویٹ فوجیں روونو اور لسک تک دُشمنوں کا پیچھا کرسکتیں؟

---

[1] ملاحظہ ہوں اقبال کے خطوط، جناح کے نام

(۵) "اقلیت کی ڈکٹیٹری" اختر صاحب کی تصنیف ہے۔ اقبال کی "پان اسلامی" تحریک کبھی غیر اسلامی علاقوں پر حکومت کرنے یا انھیں اپنا سیاسی یا معاشی غلام بنانے کی تلقین نہیں کرتی۔ اقبال اپنے اور ساری انسانیت کے لیے آزادی کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ ہاں اسلامی ممالک کے لیے وہ ضرور ایک سیاسی، معاشی، تمدنی حقِ خود ارادیت مانگتے ہیں۔ سوویٹ یونین بھی اس حق کو جائز سمجھتی ہے۔ اب تو یونین کی چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں افواج بھی رکھ سکتی ہیں، اور دوسروں سے براہِ راست سیاسی تعلقات بھی قائم کر سکتی ہیں۔ اقبال اسلامی علاقوں کے لیے خواہ وہ ہندستان میں ہوں یا باہر یقینی طور پر خود ارادیت کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا اشتراکی نظام بھی چاہتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے جناح کے نام اقبال کے خطوط ملاحظہ ہوں۔ جن سے اس مسئلے کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

(۶) اقبال کے کلام میں مشرق اور مغرب کا تنازع دراصل خالص وجدانی اور خالص مادّی قدروں کا تنازع ہے۔ مشرق میں ذوقِ عمل نہیں، جس کی شکایت انھوں نے بارہا کی ہے۔ مغرب کے مادّی تصورات میں سے اگر اشتمالیت اور چند اور فلسفیانہ مکاتب کی انسانیت پرستی نکال لی جائے تو محض جھوٹی چہل پہل باقی رہ جاتی ہے۔ یہی جھوٹی چہل پہل اقبال کا پیہم نشانہ ہے۔ مغرب نے سارے مشرق کو غلام رکھا ہے۔ اپنے خاکوں سے بغاوت کا رجحان تو غالباً ترقی پسندی ہی ہے۔

اختر صاحب کے اور اعتراضات کا جواب ہمارے مضمون کے آیندہ حصے سے مل جائے گا۔
یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ تقریباً تمام صاحب دماغ ترقی پسند شعرا اور اکثر ادیبوں نے اقبال کی رہنمائی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے مثال کے طور پر دیویندر ستیارتھی کا افسانہ "میری زندگی کا ایک ورق" ملاحظہ ہو جس میں اقبال کی ذہنی شخصیت، اُن کا کھرا انسانی نقطۂ نگاہ، ایک قنوطی کو ذہنی اور جسمانی خودکشی سے بچا لیتا ہے۔ یا فیض کی نظم "اقبال" ؎

اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما — اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے — اور اُس کی لَے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال　　　　اس کا وفور، اُس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تند و تیز　　　　اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز

مخدوم محی الدین نے "اقبال" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، جس میں یہ شعر بھی ہیں ؎

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا　　　　زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا
وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا　　　　کو بہ کو، کوچہ بہ کوچہ در بہ در گاتا گیا
گیت سننے کے لیے خلقِ خدا آنے لگی　　　　گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی
نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں　　　　صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں
عرش کی قندیل ہے، اِک آسمانی راگ ہے　　　　راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

اقبال پر فاشسطیت کا اتہام لگانے کی ہمت غالباً ان کی نظم "مسولینی" کی وجہ سے ہوئی، جو بالِ جبریل میں شائع ہوئی تھی۔ سکندر اور مسولینی میں اقبال کو جو چیز پسند آئی وہ ذوقِ حرکت اور ذوقِ انقلاب ہے۔ ندرتِ فکر و عمل ذوقِ انقلاب کا نام ہے اور اس سے معجزاتِ زندگی پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فاشسطیت سرمایہ داری کی آخری پناہ گاہ ہے، لیکن جب اقبال نے یہ نظم لکھی تھی اس وقت تک فاشسطیت نے شہنشاہی نہیں شروع کی تھی۔ محض حرکت اور ذوقِ انقلاب سے مسحور اقبال نے اس نظم کے آخری دو شعروں میں مسولینی کی تعریف کی ہے۔ اور بھی بہت سے ترقی پسند شاعر اور ادیب کمزوری کے کسی گزرتے ہوئے لمحے میں ہٹلر یا مسولینی سے مسحور ہو چکے ہیں۔ مثال کی طور پر برنارڈشا کا "جنیوا" پڑھیے۔ لیکن محض اس نظم کی بنیاد پر اقبال کو فاشسطت قرار دینا ایسی ہی سخت غلطی ہوگی جیسے برنارڈشا پر فاشسطی ہونے کا الزام۔ "ضربِ کلیم" میں بھی ایک نظم "مسولینی" کے عنوان سے ہے جس کا طرزِ استدلال بالکل وہی ہے جو جوش کی اس نظم کا ہے جو "جنگِ یورپ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" کے عنوان سے شائع اور ضبط ہوئی تھی۔ یہ سامراج اور سامراج کا مقابلہ ہے۔ اقبال نے یہ نظم ۲۲ اگست سنہ ۱۹۳۵ء کو لکھی تھی۔ اُس سے چار دن قبل انھوں نے ابی سینیا کے

متعلق یہ نظم لکھی ہے

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش[1]
ہونے کو ہے یہ مُردۂ دیرینہ قاش قاش

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سرِبازار پاش پاش
پیرِ کلیسیا یہ حقیقت ہے دل خراش

مجھے تو یہ نظم کسی فاشسٹی کی نہیں معلوم ہوتی۔

برخلاف اس کے سوویٹ یونین کے عروج سے اقبال کو ہمیشہ بہت دل چسپی رہی۔ جس کا تکملہ اس نظم میں ہوتا ہے جو "لینن" کے عنوان سے "بالِ جبریل" میں شائع ہوئی۔ یہ لینن کے کردار کی شاعری اور وجدانی ترکیبِ مکرّر ہے۔ تاریخی کرداروں کی اس طرح کی ترکیبِ مکرّر براوننگ نے بارہا کی ہے اور غالباً براوننگ ہی سے اقبال نے یہ طرز مستعار لیا ہے۔ یہ نظم اشتالیت اور مذہبی تصوریت کے امتزاج کی کوشش ہے۔ اس طرح لینن اس مکرّر ترکیب یافتہ کردار کی حیثیت سے خُدا کے وجود کا قائل ہے

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اشتراکیت کی اصلی لڑائی مذہب سے نہیں بلکہ اُس توہّم پرستی سے ہے جس کو مذہب کے جھوٹے پیشوا، عوام کے لیے افیون بنا کے پیش کرتے ہیں۔ اس توہّم پرستی اور ریاکاری سے دنیا کا ہر بڑا سچّا شاعر ہمیشہ برسرِپیکار رہا، اور اقبال اور دانتے سب سے زیادہ۔ مذہب اگر حرکی

---

[1] اقبال کی یہ پیشین گوئی سنہ ۱۹۴۳ء میں پوری ہوئی۔ آج نہ اطالوی فاشسطیت باقی ہے نہ مسولینی کا راج۔

نہ ہو، اگر وہ آزادی نہ چاہتا ہو تو وہ مذہب باقی ہی نہیں رہتا۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سودیٹ لادینیت اساسی طور پر مذہب کے الہیاتی عنصر کی مخالف بھی نہیں ہو۔ دوسری تبدیلی لینن کی اس ترکیب کُلّی میں یہ پیدا کی گئی ہو کہ مادی، معاشی اور طبیعی قدروں کی طرح وہ روحانی قدروں کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہو کیوں کہ اس کے بغیر انسان کی حیات متخیلہ متوازن نہیں ہوسکتی۔ جانور اور انسان میں یہی فرق ہو کہ وہ پیٹ کے علاوہ عقل اور وجدان بھی رکھتا ہو۔ اگر محض مادیت ہی اشتراکیت پر حاوی رہتی ـــ شروع شروع میں یقیناً اس کی بڑی ضرورت تھی ـــ تو زندگی کا دوسرا پہلو، زندگی کا باطن بھی، اسی طرح تشنہ رہ جائے گا۔ جس طرح مشرق اور مغرب کے صدیوں کے استبداد کے دور میں عوام کی اکثریت کی معاشی اور مادی زندگی کا ایک پہلو تشنہ رہ گیا تھا۔ اسی لیے برق و بخارات کے ساتھ فیضان سماوی کی بھی ضرورت ہو۔ اقبال نے مشینوں کو نہیں بلکہ "مشینوں کی حکومت" کو دل کے لیے موت قرار دیا ہو ؎

ہو دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت　　احساسِ مُروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

مشینوں سے خدمت لینا ترقی کا راز ہو، لیکن اِن معنوں میں مشینوں کا محکوم ہوجانا کہ مشینی پیداوار میں اپنے سرمایے کے فائدے کو پیشِ نظر رکھ کے دُنیا بھر کو اپنا بازار بنایا جائے، محکوم بنایا جائے، بنی نوع انسان کا خون بہایا جائے، اپنی خود غرضی کی وجہ سے تمام تر انسانی مروت کو کھو بیٹھنا ہو۔ یہ تو سرمایہ دارانہ اور مہاجنی نظام کی نشانیاں ہیں۔ اِس شعر کو اقبال کی فاشسطیت کی مثال کی طور پر پیش کرنا بڑی ہی وحشت ناک غلطی ہو۔

لیکن جہاں تک اصل اور اساسی سوال کا تعلق ہو اقبال اور لینن ہم زبان ہیں ؎

تو قادر و عادل ہو مگر تیرے جہاں میں　　ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟　　دُنیا ہو تری منتظرِ روزِ مکافات

"پیامِ مشرق" میں ایک نظم "موسولینی اور قیصرِ ولیم" ہو جس میں قیصر کا یہ اعتراض کہ ؎

"شمائد نازِ شیریں بے خریدار　　اگر خسرو نباشد کوہ کن ہست"

دراصل آمریت (ڈکٹیٹرشپ) پر ہے۔ پرولتاری آمریت کا تخیل اُس وقت تک نیا تھا، اور اقبال کو یہ ڈر تھا کہ کہیں انقلاب روس کا بھی وہ حشر نہ ہو جو دانتوں، روبس پیر اور نپولین کے ہاتھوں انقلاب فرانس کا ہوا۔ اُس وقت تک اقبال نے انسانِ کامل کے تصور پر زیادہ توجہ بھی نہیں کی تھی۔ بعد میں وہ ایک طرح کی خیر پرست آمریت کے خوش قائل ہو گئے تھے۔ اکثر وہ ایسے رہنما کے لیے اپنے کلام میں دُعا مانگتے ہیں۔

"صحبتِ رفتگاں" "پیامِ مشرق" کی بڑی اچھی نظموں میں ہے۔ ٹالسٹائے، مارکس، ہیگل، مزدک (اشتراکیت کا قدیم ایرانی پیغمبر) ایک چھوٹے سے مباحثے میں حصہ لیتے ہیں قولِ فیصل کوہ کن کی زبانی سنایا گیا ہے جو ایسا مزدور ہے جس میں عشق کی روحانی تصوریت بھی موجود ہے۔ پھر بھی وہ دنیا بھر کو دعوتِ انقلاب دیتا ہے ؎

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد هنوز گردشِ گردوں بہ کامِ پرویز است
ز خاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیما ست قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

کوہ کن کی طرح یورپ کا جدید مزدور بھی اپنے لُٹ جانے کی فریاد کرتا ہے ؎

ز مُزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش نصیب خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
ز خوے فشانیٔ من لعلِ خاتمِ والی ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
ز خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را بہ زورِ بازوے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

لیکن مزدور ندائے انقلاب بلند کرتا ہے ؎

بیا کہ تازہ نوا می ترا دو از رگِ ساز مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

سرمایہ دار فلسفے کے اُن نظریوں کو جو حکمت کے نام سے سرمایہ داری کے جواز کی طرح طرح کی تاویل پیش کرتے ہیں اقبال بھی اسی قدر شک اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے اشتالی رہنما۔ اگست کومت کی ثبوتیت پر "محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور" میں اقبال نے

ثبوتیت کے فلسفے کے سرمایہ دارانہ محرک کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا ہے۔ کومت کا "تین منازل" کا قانون، انسانی تاریخوں کو تین ادوار یعنی (۱) مذہبی دور جو اشیا پرستی، کثرت پرستی اور وحدانیت کے تین زمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ کومت کے نزدیک بنی نوع انسان کی اشتراکیت کا دور تھا (۲) دوسری منزل مابعدالطبیعی دور کی ہے جو روشن خیالی کے عہد سے مطابقت رکھتا ہے۔ اِس منفی یا مابعدالطبیعی منزل کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے قلب و ذہن میں ایک نمایاں فرق ہے۔ (۳) تیسرے یعنی ثبوتی دور یا منزل کا تعلق صرف تجربوں اور ان کے نتیجوں سے ہے۔ ثبوتیت میں مذہبی اور مابعدالطبیعی منازل باہم مل جاتی ہیں۔ آزادیِ ضمیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ ترقی کا رجحان عسکری بنیاد سے صنعتی بنیاد کی طرف ہے۔ انقلابی "مساوات" کے لیے اس تمدن میں کوئی جگہ نہیں۔ سرمایہ دار حکومت کی باگ ڈور "صنعت و حرفت کے کپتانوں" کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اور اس کی چوٹی پر مہاجن کا مقام ہے۔ سرمایہ داری کے "خطروں" کا کومت نے یہ علاج سوچا ہے کہ سماج کو اخلاقیات کی تعلیم دی جائے، اور پُرامن ہڑتالوں کے ذریعے اس کے خلاف احتجاج کیا جائے (سرمایہ دارانہ عمومیتوں کے لیے اس سے زیادہ خوش آیند اور کون سا فلسفہ ہوسکتا تھا؟) چناں چہ کومت مزدور سے کہتا ہے ؎

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"　　　ہماں نخل را شاخ و برگ و بر اند
دماغ ار خرد زاست از فطرت است　　　اگر پا زمیں ساست از فطرت است
یکے کار فرما، یکے کارساز　　　نیاید ز محمود کارِ ایاز

ظاہر ہے کہ مزدور فوراً پہچان لیتا ہے کہ ثبوتیت کے فلسفے کی آڑ میں سرمایہ دار اپنا اُلّو سیدھا کررہا ہے۔ وہ اس فلسفۂ تسلیم کو فوراً رد کردیتا ہے۔ اقبال نے مزدور کی زبان سے یہ شعر اِس زور و شور سے ادا کیے ہیں کہ فردوسی کا انداز یاد آجاتا ہے ؎

کُند بحر را آبنایم اسیر　　　ز خارا بُرد تیشہ ام جوے شیر
حقِ کوہ کن دادی اے نکتہ سنج　　　بہ پرویز پُرکار و نابردہ رنج
خطا را بہ حکمت مگر داں صواب　　　خضر را نہ گیری بہ دامِ سراب

بہ دوشِ زمیں، بار، سرمایہ دار ندارد گزشت از خور و خواب کار

جہاں راست بہروزی از دستِ مُزد ندانی کہ ایں ہیچ کار است دُزد

اِسی طرح اقبال جب جمہوریت کو ایک ایسا نظام بتاتے ہیں جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" تو ان کا اشارہ سرمایہ دارانہ عمومیت کی طرف ہے اور جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

"نہ امام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا طریقِ کوہکن میں بھی حیلے ہیں پرویزی"

تو اس سے پرولتاری حکومت مُراد نہیں، اور نہ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ "اقبال مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا۔" یہ انگلستان کی لیبر پارٹی کی طرف اشارہ ہے، جس کا ہندستان کی قومی تحریک کو اچھا خاصا تجربہ ہے۔

معاشی شہنشاہی پر وہ اکثر روشنی ڈالتے ہیں ؎

یا رب یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن کیوں خوار ہیں مردانِ صفاکیش و ہُنرمند

گو اُس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اِسی لیے دورِ جدید کا وہ انسان جو اِس مہاجنی نظام کی پیداوار ہے اپنے پیدا کیے ہوئے بڑے نازک اور مہلک مرحلے سے گزر رہا ہے ؎

"عشق ناپید و خِرد می گزدش صورتِ مار" عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

فرشتے بھی ذاتِ باری میں اِس مہاجنی سماج کے داؤ پیچ کی شکایت کرتے ہیں ؎

خلقِ خُدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر تیری جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست　　　بندہ ہی کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

لیکن اس تمدّن کے مِٹ جانے کا زمانہ زیادہ دور نہیں ؎

خبر ملی ہی خدایانِ بحر و بر سے مجھے　　　فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہی

لیکن یہ سیل اُسی وقت کام یاب اور کارگر ہوسکتا ہی، جب محکوم، خواہ وہ معاشی غلام ہو یا سیاسی، اپنی خودی کو اتنا بلند کرے کہ اپنی تقدیر خود بدل سکے۔ کسی قسم کے مذہبی یا فلسفیانہ نظریۂ جبریت کا اقبالؔ قائل نہیں ؎

غلط ہی شکوۂ تقدیرِ یزداں　　　تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہی

اِس انقلاب کے معنی کسی پُرانے سیاسی نظام، کسی پُرانے مکتبِ فلسفہ کی طرف واپس جانے کے نہیں بلکہ نئی بستیاں بسانے کے ہیں، فرنگ کی خارجی طبعی زندگی کے عیش و سرور سے بلند ہونے کے ہیں۔ اقبالؔ فلسفی اور مُلّا دونوں سے غرض نہیں رکھنا چاہتا۔ مُلّا کا تو وہ خاص طور پر دُشمن ہی۔ وہ دنیاوی اور مذہبی دونوں علوم میں آزادی چاہتا ہی۔ اور آزادی کے لیے ستیاگرہ کی نہیں بلکہ عصا اور ہتھیار کی ضرورت پر زور دیتا ہی ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد　　　مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سرور و رعنائی　　　انھی کے دم سے ہی میخانۂ فرنگ آباد

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہی غرض مجھ کو　　　یہ دِل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے　　　کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　　　عصا نہ ہو تو کلیمی ہی کارِ بے بنیاد

لیکن اقبالؔ کے نزدیک حقیقی انقلاب وہی ہی جو معاشی کے سوا وجدانی بھی ہو۔ اِس وجدانی انقلاب سے من کی دُنیا آزاد ہوگی۔ من کی دُنیا اصلِ انسانیت کی دُنیا ہی۔ اگر یہ دنیا موجود ہی، تو اس پر کسی کا راج نہیں ہوسکتا، اس میں کوئی تفریق نہیں ہوسکتی، یہ انسانیتِ مکمل ہی۔ لیکن جہاں کوئی غُلام بنا اور اپنا سر

جھکا دیا۔ تو من کی دنیا باقی ہی نہیں رہتی۔ تن کی دنیا معاشی سامراج کی دنیا ہے ؎

من کی دنیا؟ من کی دنیا، سوز و مستی، جذب و شوق تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن، جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات تو جھکا جب غیر کے آگے تو من تیرا نہ تن

لیکن یہ وجدانی حقیقت بھوک کے شعلے نہیں بجھا سکتی۔ اس لیے فرشتوں کے نام خدا کا اہم ترین فرمان یہ ہے کہ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

اس بات کے لیے سوزِ یقین کی ضرورت ہے ؎

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اس انقلاب کو، پرولتاری جمہوریت کے غلبے کو وہ اس قدر ضروری سمجھتا ہے کہ اگر اس کے پہلے سیلاب میں قدامت کے تمام نقوش مٹ جائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

سماجی انصاف، اور انتقام کی اس سے زیادہ پرشور تعلیم اور کیا ہوگی کہ ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لامذہبیت نہیں، مگر مذہبی "افیون فروشوں" کے استیصال کی بڑی ضرورت ہے ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

پھر ایک اعلیٰ تر منزل خود بہ خود آجائے گی ــــ کیوں کہ اقبال کا تصورِ انقلاب وجدانی اور باطنی قدروں کو نہیں بھولا ہے ــــ کہ ظاہری عبادات اور انسانوں میں کسی مذہبی تفریق کی ضرورت نہیں رہے گی، اور اگر عبادت باقی بھی رہی تو اس میں فطری سادگی پیدا ہوجائے گی ؎

حق را بہ سجودے، صنماں را بہ طوافے بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لیے مٹی کا حرم اور بنادو

اِدھر خدا کا یہ فرمان ہی، اُدھر انسانوں کی اکثریت کی زبوں حالی دیکھ کر شاعر خدا سے پوچھتا ہی، کہ کیا اور جانوروں کی طرح اِنسان کی زندگی بھی کسی بند، اندھی گلی میں بھٹک گئی ہی، اور اب بجائے ارتقا کے نسلِ انسانی کی افزائش کا مقصود محض تکرار ہی سے

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل　　کیا تجھ کو خوش آتی ہی، آدم کی یہ ارزانی

اِس عرصے میں کارل مارکس کی آواز سرمایہ دار معاشی حکیم کی توجیہوں پر اعتراض کر رہی ہو سے

یہ علم و حکمت کی مُہرہ بازی، یہ بحث و تکرار کی نمایش
نہیں ہو دُنیا کو اب گوارا، پُرانے افکار کی نمایش
تِری کتابوں میں ای حکیم معاش رکھا ہی کیا ہی آخر
خطوطِ خم دار کی نمایش، مریز و کج دار کی نمایش
جہانِ مغرب کے بُت کدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہی، عقلِ عیار کی نمایش

روس کے انقلاب میں اقبال اِنسانِ جدید کی نئی زندگی دیکھ رہا ہی، اب وہ مسلمان سے مخاطب ہوتا ہی کہ تیرے مذہب کی تعلیم بھی تو اِسی سے ملتی جُلتی ہی تو بھی جدتِ کردار کے ذریعے اِسی قسم کے انقلاب کا سامان کر سے

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہی یہ معلوم　　بے سُود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہُوا شوخیٔ افکار پہ مجبور　　فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہُوا بیزار
اِنساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپاکر　　کھُلتے نظر آتے ہیں بہ تدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن ای مردِ مُسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

اب ہم اقبال کی "روحانی اشتراکیت پسندی" کے اس نازک مرحلے کا ذِکر کرتے ہیں جہاں ان کی روحانیت اور مارکس کی مادہ پرست اشتمالیت میں تھوڑا سا بنیادی اختلاف ہی۔ اقبال ایک لمحے

لیے بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ مذہب سماجی اور معاشی حالات کی پیداوار ہے۔ یہ وہ ہمیشہ مانتے آئے ہیں کہ سرمایہ دار، مذہبی پیشواؤں اور ملاؤں کو رشوت دے کے اپنی اغراض کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ اگر مذہب میں حرکت باقی نہ رہے اور اس کی جگہ جمود اور سکون لے لے تو یہ مذہب کی روحِ عمل، اور زندگی دونوں کے لیے مُضر ہے۔ اقبال کا مومن روح و بدن دونوں کی ضرورتوں کو نہیں بھولتا ؎

سکوں پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار　　　فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

پسند روح و بدن کی ہے وانمود اس کو　　　کہ ہے نہایت مومن خودی کی عُریانی

"اشتراک و ملوکیت" (جاوید نامہ) کی بحث میں اقبال کا لہجہ ذرا سخت ہے لیکن اِس سلسلے میں چند باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔

(۱) یہ پوری بحث جمال الدین افغانی کی زبانی ہے، جن کی حیثیت یہاں ایک تمثیلی کردار کی سی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ خیالات بجنسہٖ اقبال کے ہوں۔ (جاوید نامہ، میں ایک "نوحۂ ابوجہل" بھی ہے)

(۲) اعتراض صرف کارل مارکس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مادہ پرستی پر ہے، جس میں روحانی اور تصوراتی قدروں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے جن کی وجہ سے اِنسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے ؎

"در شکم جویند جانِ پاک را

رنگ و بو از تن نہ گیرد جانِ پاک　　　جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس　　　بر مساواتِ شکم دارد اساس

روحانی اور غیر معاشی قدروں کے فقدان کے باعث اشتراکیت پر بھی مغربی سرمایہ داری کی طرح یزداں ناشناسی کا الزام تو ممکن ہے کہ صحیح ہو مگر "آدم فریبی" کا الزام اقبال سے زیادہ افغانی کا ہے۔ اِسی طرح یہ اعتراضات بھی ذرا سخت ہیں ؏

این بہ علم و دین و فن آرد شکست

اور ملوکیت اور اشتراکیت دونوں پر یہ الزام ؏ ہر دو را تن روشن و تاریک دِل۔

(۳) آگے بڑھ کے جمال الدین افغانی نے حکومتِ الٰہی اور الارض للّٰہ کے مسئلے پر بحث کی ہو؛ حکمت کو خیرِ کثیر قرار دیا ہو۔ وہ انقلاب جس میں محض "جلالِ بے جمال" ہو اُس سے پناہ مانگی ہو۔ اور آخر میں ملتِ روسیہ سے خطاب ہو جس میں وہ کہتے ہیں کہ روس کی تقدیر مشرق سے وابستہ ہو ؎

بستہ ایامِ تو با ایامِ شرق　　　　باز می آئی سوئے اقوامِ شرق

لیکن جب تک وجدانی انقلاب بھی نہ ہو معاشی انقلاب کو اثبات حاصل نہیں ہوسکتا۔ اِسی لیے وہ روس سے کہتے ہیں ؎

کردۂ کارِ خداوندانِ تمام　　　　بگزر از لا جانبِ اِلّا خرام

درگزر از لا اگر جویندۂ　　　　تا رہِ اثبات گیری زندۂ

(۴) آخر میں افغانی نے روسیوں سے یہ کہا ہو کہ اشتراکیت کے تمام اساسی اصول اسلام میں ہیں ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　　　دست گیرِ بندۂ بے ساز و برگ

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست　　　　ایں 'متاع' بندہ و مِلکِ خداست

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ　　　　ہرچہ از حاجت فزوں داری، بدہ

(۵) اِسی وجہ سے رومی نے ابتدا ہی میں مارکس کو "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہہ کے یہ رائے ظاہر کی تھی ؎

زاں کہ حق در باطلِ اُو مضمر است　　　　'قلبِ او مومن دماغش کافر است'

یہی بحث اقبال نے "ارمغانِ حجاز" میں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں پھر چھیڑی ہو۔ اِس نظم میں ابلیس رومانی ہیرو نہیں، فی الحقیقت شر کا دیوتا اہرمن ہو سرمایہ داری کا پورا نظام وہ اپنا کارنامہ بتاتا ہو ؎

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب　　　　میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا　　　　میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اور اس اہرمن کا مشیر کہتا ہے ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام ‏ ‏پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود ‏ ‏ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج ‏ ‏صوفی و ملّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی ‏ ‏ورنہ "قوالی" سے کچھ کم تر نہیں "علمِ کلام"

اِس مشیر کی زبانی یہ بھی صاف صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ جس جمہوریت پر اقبال کو اعتراض ہے وہ مہاجنی عومیت ہے ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ‏ ‏جب ذرا آدم ہوا ہے خودشناس و خودنگر
مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو ‏ ‏ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام ‏ ‏چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

اس دنیا کے تمام سیاسی طرزہائے حکومت، ابلیس کی شرانگیزی کے شکار ہیں، مگر ایک راج، مزدور کا راج ایسا ہے کہ وہ اہرمن کے شر کے قلعے کو مسمار کرتا ہوا نظر آتا ہے، اِس لیے ایک مشیر پوچھتا ہے ؎

ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟

وہ[1] کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب ‏ ‏نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز ‏ ‏مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد ‏ ‏توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیمے کی طناب

ابلیس کا چوتھا مشیر اشتراکیت کے توڑ پر فاشسطیت کو پیش کرتا ہے، مگر تیسرا مشیر جو سیاست کے کھیل سے زیادہ واقف معلوم ہوتا ہے فاشسطیت کو اشتراکیت کا علاج تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے ؎

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں ‏ ‏جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

پانچواں مشیر شر کے دیوتا اہرمن سے اشتراکیت کا علاج پوچھتا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں مساوات

---

[1] کارل مارکس کی اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہوسکتی ہے۔

پھیل رہی ہے، قبائے دولت چاک چاک ہو رہی ہے، انسانیت کا مشتِ غبار کائنات بھر پر چھایا جا رہا ہے ؎

وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز — ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے، ہم سرِ شاہین و چرغ — کتنی سُرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہوکر وسعتِ افلاک پر — جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غُبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغ زار و جوئے بار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

لیکن شیطان اس لیے وہ کہ انسان کی باطنی، داخلی، وجدانی زندگی کا دُشمن ہے اسلام یعنی اسلامی اشتراکیت کو روسی اشتراکیت سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہے ؎

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک — مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

شیطان کی کامرانی کی بس ایک ہی صورت ہے کہ اشتراکی مسلمان مذہب کی اصلی روح کو بھول کر، جو اُسے احتسابِ کائنات، انسانی مساوات، معاشی ہم آہنگی کی تعلیم دیتی ہے، مذہب کی "افیون" کے نشے میں سرشار رہے، عالمِ کردار سے بیگانہ رہے۔ شعر و تصوف اور مزاجِ خانقاہی اُسے تماشائے حیات سے محروم رکھیں۔ ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

ابنِ مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے ؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم ؟
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مذاقِ خانقاہی میں اسے

اسلامی اشتراکیت کا تصور غلط ہی سہی، لیکن رجعت پسند تو نہیں ۔ اور اگر اقبال روحانی قدروں کا بھی قائل، اور اُن کا بھی پیغمبر ہے تو اس طرح ہے کہ اُس سے اِس دنیا کے معاشی اور سماجی انصاف ، اور عالمگیر مساوات اور اُخوت کے تصور کو مدد پہنچتی ہے ۔ ایسے شاعر کو اگر ترقی پسند ادیب اور شاعر بیگانہ سمجھیں تو یہ ان کی کتنی بڑی غلطی ہے ۔

(باقی دارد)

مُغلوں سے پہلے ہندُستان میں فارسی ادَب پر ایک نظر

(جناب محمد ابراہیم صاحب ڈار اُستاد اسمٰعیل کالج، بمبئی)

شمسُ العلما پروفیسر عبدالغنی صاحب اس سے پہلے بابر، ہُمایوں اور اکبر کے عہد کی فارسی زبان اور ادَب پر تین کتابیں لکھ کر اربابِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، ان کتابوں کی حوصلہ افزا مقبولیت نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مغلوں کی آمد سے پہلے ہندُستان کے فارسی ادَب و شعر کا جائزہ لیں اور اپنی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات پایۂ تحقیق تک پہنچائیں کہ ایران اور ہندُستان کے درمیان سیاسی، تجارتی، تہذیبی اور معاشرتی تعلقات زمانۂ قدیم سے قائم ہیں اور بالخصوص غزنویوں کی ہندُستانی فتوحات کے بعد یہ روابط اس درجہ استوار ہوگئے کہ گویا ہندُستان کے ان علاقوں میں جو مسلمانوں کے زیرِنگیں تھے ایرانی تہذیب اپنی تمام دل کشیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی اِس سلسلے میں شمسُ العلما صاحب کا سب سے اہم علمی کارنامہ یہ ہے کہ وہ بعض مستشرقین کی اس غلط فہمی کو دُور کرنا چاہتے ہیں کہ "ہندُستان کے فارسی ادب میں صحیح فارسی چاشنی یک سر مفقوُد ہے اور بنابریں درخورِ اعتنا و توجّہ نہیں"۔ یہ کھُلی ہوئی بات ہے کہ یہ مغربی علما اپنی رائے میں دورِ حاضر کے بعض ایرانی مصنّفین اور محققین کے خیالات سے متاثر ہیں۔ اس غلط فہمی کا ازالہ کتاب زیرِبحث کا سب سے بڑا مقصد ہے اور کتاب کے مقدمے میں قابل مصنّف نے نہایت خوبی سے اپنے اس دعوے کو پیش کیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں ہندُستان کا فارسی ادَب کسی حیثیت سے بھی ایرانی ادَب سے کم تر درجہ نہیں رکھتا، ہر انصاف پسند شخص کو فاضل پروفیسر کے اِس دعوے سے اتّفاق ہونا چاہیے اور ہم شروع ہی میں اس بات کا اظہار کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم خود بھی اس معاملے میں ان کے ساتھ پُورے طور پر متفق ہیں لیکن جو بات ہمیں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ ان کے

دماغ پر کچھ اس طرح مسلط ہو کہ وہ اسے ثابت کرنے کے لیے بعض اوقات تحقیق کے دامن کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں اور نہایت ہی کم زور دلائل کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہو کہ وہ مناظرانہ شان سے اپنے حریفوں کو مقابلے کی دعوت دیتے ہیں اور پھر بڑے فخر سے اپنی فتح مندی کا اعلان کرتے ہیں، اس قسم کی روش جدل و مناظرے میں کارآمد ہو تو ہو کم از کم علمی تحقیق کے میدان میں اس کی افادیت مشکوک سی ہو، اس کے علاوہ بعض تاریخی امور کی تحقیق میں شمس العلما صاحب نے دقتِ نظر اور احتیاط سے کام نہیں لیا۔

کتاب کا ایک معتدبہ حصّہ غیر متعلقہ مباحث کی نذر ہوگیا ہو مثلاً پہلے اور دوسرے باب میں جو صفحہ ۵ سے لے کر صفحہ ۱۵۴ تک پھیلے ہوئے ہیں ایسے امور سے بحث کی گئی ہو جن کا کتاب کے اصلی موضوع سے دور کا تعلق بھی نہیں، طاہریوں، صفاریوں اور سامانیوں کے زمانے میں فارسی ادب کی حالت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہو، اس چیز کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اصل سوال یہ ہو کہ یہ تفصیلی بحث اِس موقع پر کہاں تک مناسب ہو، عربی ادب و شعر پر فارسی زبان کا اثر بہ ذاتِ خود ایک دل چسپ اور مفید موضوع ہو لیکن کیا مصنّفِ علام بتا سکتے ہیں کہ اسے یہاں زبردستی ٹھونسنے میں وہ کہاں تک حق بہ جانب ہیں۔ غزنویوں کے دور کا آغاز ابوریحان بیرونی کے تذکرے سے کیا جاتا ہو، اس کے علمی کمالات پر کئی صفحے وقف کر دیے جاتے ہیں۔ اس کی مشہورِ عالم عربی تصانیف کا ذِکر کیا جاتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ یہ بلند بانگ دعوا بھی کیا جاتا ہو کہ فارسی ادب میں اس کا درجہ بہت بلند ہو حالاں کہ قابل مصنّف یہ بات ثابت کرنے سے یک سر قاصر رہے ہیں کہ بیرونی نے فارسی زبان میں اپنی کوئی تصنیف یادگار چھوڑی، شمس العلما صاحب نے اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ بیرونی کا درجہ فارسی میں بھی ویسا ہی بلند ہو جیسا کہ عربی ادب میں، بڑی عجیب و غریب دلیلیں پیش کی ہیں، فاضل پروفیسر کا ارشاد ہو کہ "بیرونی خوارزم کا ایک باشندہ ہونے کی حیثیت سے نسلاً ایرانی تھا، ایران کے فضلا سے اس کے گہرے تعلقات تھے اور خوارزم میں اس نے وہاں کے ممتاز اساتذہ سے عربی بہ ذریعے فارسی زبان سیکھی تھی، چوں کہ سلاطین غزنہ کی درباری زبان فارسی تھی ابوریحان اسی زبان میں لوگوں سے بات چیت کرتا ہوگا، اپنے بلند منصب کی بنا پر

اسے سلطان محمود اور اس کے جانشین مسعود کا قرب حاصل ہوگا اور ان سے ملنے اور ان سے اپنی اور ان کی مادری زبان فارسی میں گفتگو کرنے کے بہت مواقع ہوں گے، مزید براں وہ اسی زبان میں غزنین کے باشندوں اور پڑھے لکھے لوگوں اور پنجاب کے مسلمان بیوپاریوں سے تبادلۂ خیالات کرتا ہوگا . . . . فارسی زبان اور ادب میں ابُوریحان کی اُستادی اس بات سے ہویدا ہو کہ وہ ایک ایرانی تھا اگرچہ اس نے اپنی کسی ادبی تصنیف میں فارسی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بنایا۔"

یہاں فاضل مصنف نے یہ ظاہر کیا ہو کہ ابوریحان کی مادری زبان فارسی تھی حالاں کہ صفحہ ۱۶۴ پر وہ اس بات کو تسلیم کرچکے ہیں کہ بیرونی کی مادری زبان نہ عربی تھی نہ فارسی بلکہ اس کی مادری زبان ایسی تھی جس کو کبھی ادبی تصنیفات کی زبان بننے کا شرف حاصل نہیں ہوا، اس تمام اعتراف کے باوجود شمس العلما صاحب ہم سے یہ تسلیم کرانا چاہتے ہیں کہ فارسی زبان ابُوریحان کی ممنون ہو اور اس زبان میں اُس کا درجہ بہت بلند ہو، واقعہ یہ ہو کہ بیرونی عربی کے مُقابلے میں فارسی کو علمی زبان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، وہ فارسی کو محض قصہ کہانی کے لیے موزوں سمجھتا تھا، فاضل مصنف تو فارسی زبان سے بیرونی کی شیفتگی کا ذکر والہانہ انداز میں کرتے ہیں، انھیں شاید بیرونی کی یہ رائے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا:-

[1]- الهجو بالعربية أحب إلىّ من المدح بالفارسية وسيعرف مصداق قولى من تأمل كتاب علمٍ نُقِلَ إلى الفارسى كيف ذهب رونقه وكسف باله واسود وجهه وزال الانتفاع به، إذ لا تصلح هذه اللغة إلّا للأخبار الكسروية والأسمار الليلية ۔

اگرچہ چہار مقالہ[2]، کے حواشی میں میرزا محمد قزوینی نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ ابوریحان کی تصنیفات عربی اور فارسی میں ہیں اور "التفہیم[3]" بہ یک وقت عربی اور فارسی میں لکھی گئی ہو تاہم اس کا کیا جواب کہ بیرونی عربی میں ہجو کو فارسی میں مدح پر ترجیح دیتا ہو اور فارسی کے علمی زبان ہونے کا قائل نہیں۔

---

[1] امراء البیان الجزء الثانی صفحہ ۵۵۱ از محمد کرد علی

[2] چہار مقالہ صفحہ ۱۹۵

[3] " " صفحہ ۱۹۷، ملک الشعرا بہار اپنی کتاب سبک شناسی جلد دوم صفحہ ۴۴ پر فارسی التفہیم کو عربی کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔

کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قابل مصنف نے اپنی کتاب میں فارسی ادب کے اس تمام سرمایے سے بحث کی ہے جو مغلوں کی آمد سے پہلے ہندستان میں عالمِ وجود میں آچکا تھا اور کتاب کے خاتمے میں خود مصنف نے یہ دعوا کیا ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اپنی تصانیف کے ذریعے فارسی ادب میں ہندستانیوں کی ایک ہزار سالہ علمی سرگرمیوں کی منظم روداد پیش کی ہے حالاں کہ کتاب کے سرسری مطالعے سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ مصنف نے ضیاءالدین برنی کے ذکر پر اپنی کتاب ختم کردی ہے اور تغلقوں کے عہد سے وہ آگے نہیں بڑھے۔ دوسری مایوس کن بات یہ ہے کہ مصنف نے نامی گرامی شعرا کے حالات سے تو کتاب کے صفحات مزین کردیے ہیں لیکن نثر کے سرمایے کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں کی، طبقاتِ ناصری اور برنی کی تاریخِ فیروزشاہی کا ذکر ضرور کیا گیا ہے اور ان کے علاوہ بعض نثر کی کتابوں کا ذکر ضمنی طور پر بھی آگیا ہے لیکن فارسی ادب کے ایک معتدبہ حصّے کو یک قلم نظرانداز کردیا گیا ہے۔ حتّیٰ کہ عوفی کے علمی کارناموں پر بھی ایک مستقل عنوان کے تحت میں کچھ نہیں لکھا گیا۔

تعجب ہے کہ فاضل مصنف نے ان کتابوں اور مضامین سے استفادہ نہیں کیا جو اسی موضوع سے متعلق ہندستان میں لکھی گئی ہیں اور ہندستانی علما کی تحقیقات کا نتیجہ ہیں ڈاکٹر اقبال حسین نے سنہ ۳۸ء میں ہندستان کے قدیم فارسی شعرا پر اپنی قابلِ قدر کتاب شائع کی جسے علمی حلقوں میں بہ نظرِ استحسان دیکھا گیا، شمس العلما صاحب نے اپنی ضخیم کتاب میں ایک جگہ بھی ڈاکٹر اقبال حسین کی تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح امیر خسرو پر ڈاکٹر وحید مرزا کی محققانہ کتاب کو شمس العلما صاحب نے قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر ان کتابوں کے شائع ہونے کا فاضل مصنف کو علم نہیں تو یہ افسوس ناک ہے اور اگر اس علم کے باوجود انھوں نے ان کتابوں سے فائدہ نہیں اُٹھایا تو یہ ان جیسے جویلے علم کے شایانِ شان نہیں، دوسری شکایت مصنف سے یہ ہے کہ جہاں انھوں نے دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھایا ہے وہاں انھوں نے ممنونیت کا اظہار نہیں کیا۔ مثلاً فارسی میں قدیم ترین شعر کے سلسلے میں وہ میرزا محمد قزوینی کے مرہونِ منت ہیں لیکن انھوں نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، اسی طرح جہاں تک عربی ادب پر فارسی کے اثر کا تعلق ہے انھوں نے کہیں یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کہاں تک اپنے پیش رووں

کے ممنون ہیں حالاں کہ کامل رہبروں کی رہ نمائی کے بغیر ان کے لیے اس میدان میں قدم رکھنا بہت مشکل تھا۔

پیش تر اس کے کہ فاضل مصنّف کے بعض بیانات سے اختلاف ظاہر کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام اسباب کا اجمالی ذکر کر دیا جائے جو مصنّف کے خیال میں ہندستان میں فارسی کا ذوق پھیلانے میں ممد و معاون ہوئے ہیں۔

"زمانۂ قبلِ از اسلام میں ایرانی مہاجروں نے پنجاب کے شہروں میں آباد ہونا شروع کر دیا، ان کے تعلقات ان کے ایران میں مقیم رشتہ داروں کے ساتھ قائم رہے اور ان کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہا جس کی وجہ سے ایرانی تہذیب کی مشعل پنجاب میں روشنی پھیلاتی رہی، ان کے علاوہ ایرانی علما گروہ در گروہ ہندستان کی قدرشناسی کی وجہ سے یہاں کھنچے چلے آئے۔ یہ تہذیب کوئی مستعار چیز نہ تھی بلکہ خالص ایرانی قسم کی تھی، افراسیاب نے خراسان کے ہزاروں خاندانوں کو جلاوطن کر دیا تھا جو ملتان دہلی اور لاہور کے اضلاع میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان جلاوطنوں کی وجہ سے لاہور کے اطراف میں ایک نیا شہر آباد ہو گیا تھا جہاں سے سلطان محمود غزنوی کا پوتا سلطان ابراہیم ایک لاکھ ایرانیوں کو اپنے دارالسلطنت غزنی کی زینت بڑھانے کے لیے لے گیا تھا، غزنوی سلاطین ایرانی ادب و فن کے دل دادہ تھے اور علما و شعرا کے مربّی اور قدردان، لاہور غزنویوں کی راج دھانی ہونے کے باعث ایرانی تہذیب اور ادب کا مرکز تھا، چوں کہ سندھ کے عرب والیوں کا تقرّر خراسان کے گورنر کے ذریعے ہوتا تھا اور وہیں سے انھیں ہندستان بھیجا جاتا تھا اس لیے اس سے بھی یہاں فارسی کا شوق پیدا ہوا، سندھ اور ملتان میں دیلمیوں (بنی بویہ) کے نام کے فارسی خطبے پڑھے جاتے تھے، غزنویوں کی ہند میں آمد سے پہلے بھی پنجاب اور سندھ کے باشندے فارسی زبان اور تہذیب سے واقف تھے۔ رودکی پہلا ایرانی شاعر ہے جو ہندستان کی فکر و دانش کا گرویدہ ہوا اور جس نے ہندستان میں فارسی شاعری کی نشو و نما پر اثر ڈالا، سلطان محمود غزنوی تھانیسر پر حملہ کرنے کے ارادے سے راجا انند پال کے علاقے میں سے گزرتا ہے، راجا سلطان کو خوش کرنے کے لیے کئی ہزار نوکر اور بنجارے شاہی فوج کے ساتھ روانہ کر دیتا ہے، ضروری ہے کہ ہندستانیوں نے ایرانی فوج کے ساتھ خلا ملا ہونے کی وجہ سے فارسی سے کچھ واقفیت حاصل کر لی ہوگی اور ایرانی رسوم و اطوار سے واقف ہو گئے ہوں گے، سالار مسعود غازی

کے ساتھ ایرانیوں کا ایک بہت بڑا گروہ تھا، کارواں سالار کی شہادت کے بعد بہت سے ایرانی اودھ کے شہروں میں آباد ہو گئے، یہی وجہ ہو کہ اس صوبے کے ہندووں میں تھوڑی دیر ہی بعد فارسی زبان اور ادب کا شوق پیدا ہوا اور غزنوی سلطنت کے زوال کے بعد ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے فارسی میں بولنا اور لکھنا شروع کر دیا، سلطان محمود کے لشکر کے ساتھ ہمیشہ چار سو کے قریب شاعر اور عالم ہوتے تھے، ظاہر ہو کہ شعرا کی اتنی بڑی تعداد نے جہاں تک ہندستانیوں میں فارسی پھیلنے کا تعلق ہو بہت اچھا اثر ڈالا ہوگا اور پھر محمود کی قدردانی نے اس شوق کے بڑھانے میں خوب مدد کی ہوگی، غزنویوں کے دور میں ابونصر فارسی نے جو ادیب کے لقب سے مشہور ہیں لاہور میں ایک خانقاہ قائم کی تھی جہاں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، اس خانقاہ نے ہندستان میں فارسی کا ذوق پھیلانے میں بہت بڑا کام کیا، غزنویوں کی زیر نگرانی 'دیوان رسالت' کا قائم ہونا ہندستانیوں کے فارسی سیکھنے کا ایک بڑا اہم سبب تھا۔"

ان مندرجہ بالا اسباب میں سے بعض فی الواقع ایسے ہیں کہ ان کی صحت پر کسی قسم کا شک وارد نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بعض ایسے بھی ہیں جن کا درجہ نہ صرف تاریخی اعتبار سے پست ہو بلکہ وہ حد درجہ مضحکہ خیز بھی ہیں چوں کہ ہمارے ملک کے مشہور محقق قبلہ شیرانی صاحب مدظلہ العالی ان دلائل کی قدر و قیمت پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں اس لیے ہم ان مباحث کو نظرانداز کرتے ہیں اور فاضل مصنّف کے بعض اُن بیانات پر اظہارِ خیال کریں گے جن کا ذِکر قبلہ شیرانی صاحب کے تبصرے میں نہیں آیا۔

"ایران کے ساسانی خاندان کے آخری تاج دار یزدجرد اور عربوں کے درمیان جو فیصلہ کن لڑائی نہاوند میں ہوئی اس میں یزدجرد کی طرف سے پنجاب کے جاٹوں نے دادِ شجاعت دی۔" صفحہ ۸،۷

شمس العلما صاحب کے اس بیان میں کوئی حیرت انگیز بات نہیں، تعجب صرف اس بات پر ہو کہ فٹ نوٹ میں انھوں نے ترمذی کے ابواب الامثال کا حوالہ دیا ہو، بھلا اس موقع پر جاٹوں کی موجودگی کو 'ابواب الامثال' سے کیا سروکار ہو، واقعہ یہ ہو کہ فاضل مصنّف نے مولانا سید سلیمان ندوی کی گراں پایہ تصنیف 'عرب و ہند کے تعلقات' سے خوشہ چینی کی ہو اور صراحۃً یا کنایۃً اس کا کہیں ذکر

سلہ 'عرب و ہند کے تعلقات' صفحہ ۱۱۔

نہیں آسنے دیا۔ سید صاحب تو ترمذی میں سے محض اس مضمون کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی نے آں حضرت صلعم کے ساتھ ایک خاص شکل وصورت کے لوگوں کو دیکھا تھا جن کی نسبت انھوں نے یہ بتایا کہ " ان کا چہرہ جاٹوں کی طرح تھا۔ حدیث کے متعلقہ حصے کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔

"[1]..... فَبَيْنَا أَنَا جَالِسٌ فِى خَطِّى إِذَا أَتَانِى رِجَالٌ كَأَنَّهُمُ الزُّطُّ أَشْعَارُهُمْ وَ أَجْسَامُهُمْ . . . . "

اس حدیث سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ نہاوند کی لڑائی میں یزدجرد کی فوج میں پنجاب کے جاٹ بھی تھے۔ بجائے ترمذی کے ابواب الامثال کے حوالہ دینے کے یہ کہیں بہتر ہوتا کہ شمس العلما صاحب اپنے اصلی ماخذ کا ذکر کر دیتے۔

" بشاری مقدسی اپنے سفرنامہ احسن التقاسیم میں سندھ کے ذکر کے ضمن میں لکھتا ہو کہ اس کے زمانے میں سندھ اور ملتان کی مسجدوں میں دیلمیوں یعنی بنی بویہ کے نام کے فارسی خطبے پڑھے جاتے تھے " صفحہ ۳۹

ایسا معلوم ہوتا ہو کہ احسن التقاسیم فاضل مصنف کے پیش نظر نہیں ورنہ وہ اس قسم کا بے بنیاد دعوا نہ کرتے، یہاں پھر ان کا اصلی ماخذ مولانا سلیمان ندوی کی کتاب 'عرب و ہند کے تعلقات' ہو۔ اگر وہ سید صاحب کے اصل الفاظ نقل کرنے پر اکتفا کرتے تو شاید اس مغالطے میں مبتلا نہ ہوتے، جہاں تک ملتان کا تعلق ہو بشاری صاف طور پر لکھتا ہو کہ ملتان[2] والے شیعہ ہیں اور یہاں مصر کے فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا ہو، اسی کے حکم سے یہاں کا بندوبست ہوتا ہو اور یہاں سے برابر تحفے تحائف مصر کو بھیجے جاتے ہیں۔ اب رہا منصورہ اس کے بارے میں بشاری[3] لکھتا ہو :۔

" منصورہ پر ایک سلطان کی حکومت ہو جو قریش کے خاندان سے ہو لیکن یہاں خطبہ خلیفہ عباسی کا پڑھتے ہیں، اور کبھی عضدالدولہ (دیلمی) کا خطبہ پڑھتے تھے جس زمانے میں ہم شیراز میں تھے اس وقت یہاں سے ایک سفیر عضدالدولہ کے بیٹے کے پاس شیراز گیا تھا "

---

[1] جامع ترمذی مع اُردو ترجمہ جلد دوم صفحہ ۲۹۳ و ۲۹۴ (نول کشور پریس) [2] احسن التقاسیم، صفحہ ۴۸۵۔
[3] احسن التقاسیم، صفحہ ۴۸۵۔

خطبے میں خلیفۂ بغداد کے نام کے ساتھ عضدالدولہ کا نام کیسے داخل ہوگیا، سید صاحب اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ "جب ۳۷۵ ہجری میں مقدسی یہاں پہنچا تو اس نے بھی اپنے پیش رووں کی طرح یہاں بشاری خاندان کے ایک فرد ہی کو حکمران پایا لیکن اس دوران میں دیلمیوں کا ایک شیعی خاندان جو فارس پر حکومت کر رہا تھا اس کا اثر بھی بلوچستان کے راستے سے سندھ تک پہنچ رہا تھا تاہم خلیفۂ بغداد کا نام بھی باقی تھا"[1] یہ توجیہ ایک حد تک صحیح ہو تو ہو ورنہ اس زمانے کی تاریخ کی ورق گردانی سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عضدالدولہ کا عہد بنی بویہ کے انتہائی عروج اور شوکت کا زمانہ ہے، اس کی بے پناہ قوت کے سامنے خلیفہ الطائع مجبورِ محض تھا، اسی مجبوری کے عالم میں سنہ ۳۶۸ ہجری میں خلیفۂ بغداد نے حکم دیا[2] کہ خطبے میں خلیفہ کے نام کے بعد عضدالدولہ کا نام بھی پڑھا جائے۔ اس غیرمعمولی اقتدار کے حاصل کرنے کے بعد ۳۷۲ ہجری میں عضدالدولہ رہ گرائے عالمِ جاودانی ہوجاتا ہے، اس واقعے سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۳۶۸ سے لے کر ۳۷۲ ہجری تک منصورہ میں عضدالدولہ کا خطبہ پڑھا گیا ہوگا، جیسا کہ ہم واضح کرچکے ہیں بشاری صرف عضدالدولہ کے خطبے کا ذکر کرتا ہے لیکن ہمارے شمس العلما صاحب محض ایک عارضی واقعے میں تعمیم کی شان پیدا کردیتے ہیں اور دیلمیوں کو اس امتیاز کا حق دار تسلیم کرتے ہیں، اس سے زیادہ تعجب خیز ان کا یہ دعوا ہے کہ دیلمیوں کے خطبے فارسی زبان میں پڑھے جاتے تھے حالاں کہ اصطخری اور ابنِ حوقل صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ منصورہ، ملتان اور اس اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے اور مکران والوں کی بولی فارسی اور مکرانی ہے، اصطخری کے اصل الفاظ یہ ہیں :-

[3] ولسان اھل المنصورۃ والملتان و نواحیھا العربیۃ والسندیۃ ولسان اھل مکران الفارسیۃ والمکرانیۃ،

اصطخری اور ابن حوقل کے صریح بیان کی موجودگی میں شمس العلما صاحب نے کس طرح یہ عجیب وغریب دعوا

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات، صفحہ ۳۴۴ [2] تجارب الامم الجزء الثانی، صفحہ ۳۹۶

[3] مسالک الممالک، صفحہ ۱۷۷۔

کردیا کہ ان خطبوں کی زبان فارسی ہوا کرتی تھی، ان کے اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے سے یہ گتھی خود بخود سُلجھ جاتی ہو، مولانا سید سلیمان ندوی نے بشاری کے مندرجہ ذیل الفاظ کا ترجمہ یوں کیا ہو:-

...[1] ماءٌ مرئٌ وعيشٌ هنئٌ وظرفٌ ومروةٌ وفارسية مفهومة وتجارات مفيدة و

اجسامٌ صحيحةٌ إلّا أنّما سبخةٌ بليذة ودورٌ ضيقةٌ دهواءٌ حارٌ يابسٌ دهم سمرٌ وسُودٌ

ترجمہ- پانی اچھا، زندگی عیش و مسرت کی اور خوش دلی اور مروت ہو، فارسی زبان سمجھی جاتی ہو، تجارت کا نفع خاصا ہو، جسم میں تن درستی ہو لیکن شہر سیلا ہو، مکانات تنگ ہیں، ہوا خشک اور گرم ہو، رنگ گندم گوں اور سیاہ ہو"

"فارسية مفهومة" میں لفظ مفہومہ کی وجہ سے قدرتی طور پر سید صاحب کا ذہن اس طرف گیا کہ یہاں فارسی زبان سمجھی جاتی ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مفہومہ کے لفظ سے خواہ مخواہ انسان کا خیال فارسی زبان کی طرف منتقل ہوگا حالاں کہ سباق و سیاق اس مفہوم کا موید معلوم نہیں ہوتا۔ بہرحال اگر قبلہ سید صاحب کے بتائے ہوئے معنی ہی صحیح ہوں پھر بھی "فارسية مفهومة" کے مفہوم میں اتنی وسعت کیسے پیدا کی جاسکتی ہو کہ ملتان اور منصورہ کے خطبوں کی زبان فارسی تسلیم کرلی جائے، شمس العلما صاحب ایسے فاضل کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس قسم کے بےبنیاد دعوے کریں۔

"تاریخ کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہو کہ پہلی صدی ہجری کے تقریبًا اختتام سے پہلے عرب مسلمانوں کو ہندستان میں کشور کشائی کا خیال نہ تھا، سب سے پہلے یہاں خلفائے راشدین کے زمانے میں مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تجارت کے خیال سے آئے، یہ لوگ سادہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے، اتفاقًا چند عرب تاجر ہندستان روانہ ہوئے اور سنہ ۱۶ ہجری میں صوبہ بمبئی کے مقام تھانہ میں وارد ہوئے، اس کے بعد دو اور گروہ بھروچ اور دیبل پہنچے" صفحہ ۳۹ و ۴۰

شمس العلما صاحب ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ عرب تاجروں کا ایک دستہ اتفاقی طور پر تھانہ پہنچ گیا

[1] احسن التقاسیم صفحہ ۴۸۰ — [2] عرب و ہند کے تعلقات، صفحہ ۳۳۲

حالاں کہ بلاذری[۵۱] جس کی فتوح البلدان فاضل مصنف کا بڑا ماخذ ہے حکم بن ابی العاص گورنر بحرین کے بارے میں نہایت صاف طور پر لکھتا ہے کہ اس نے ایک فوجی دستہ تھانہ بھیجا (فأقطع جیشًا الی تانه) اور اس کے بعد دوسرا دستہ بھروچ، جب خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا اور اس قسم کی بحری مہموں کو ناپسند کیا۔

"عرب مورخ ابن حوقل جو تیسری صدی ہجری کے ربع دوم میں سندھ میں سیاحت کی غرض سے آیا تھا اپنے سفرنامے میں بیان کرتا ہے کہ سندھ میں عربی اور سندھی عام طور پر سمجھی جاتی ہے" صفحہ ۴۳

شمس العلما صاحب نے بہ یک جنبش قلم تاجر اور سیاح ابن حوقل کو مورخ بنا دیا حالاں کہ فن تاریخ میں اس نے کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی، ابن حوقل بغداد کا ایک سوداگر تھا جو سنہ ۳۳۱ ہجری میں سیاحت کی غرض سے نکلا اور سنہ ۳۵۸ھ کے قریب بغداد واپس[۵۲] پہنچا، فاضل مصنف نے اسے چوتھی صدی کے بجائے تیسری صدی میں لا موجود کیا۔ اس قسم کی بے احتیاطی کی مثالیں ان کی کتاب میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔

"جب محمد بن قاسم کو خلیفۂ دمشق کے حکم سے واپس بلا لیا گیا تو اس کے یہاں سے چلے جانے کے بعد اس کے بیٹے نے سندھ اور ملتان پر پوری طرح قبضہ کر لیا" صفحہ ۶۰

نہ معلوم فاضل مصنف نے یہ بات کن حالات میں لکھ دی، محمد بن قاسم کے بعد جن گورنروں کے ہاتھ میں ہندستان کے اس اسلامی صوبے کی زمام حکومت تھی ان کے نام بلاذری کی فتوح البلدان میں محفوظ ہیں لیکن اس میں کہیں بھی محمد بن قاسم کے بیٹے کا ذکر نہیں، خود بلاذری ایک روایت کی بنا پر لکھتا ہے کہ راجا داہر کے قتل کے بعد محمد بن قاسم سندھ پر قابض ہو گئے، اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

"لما[۵۳] قتل داهر غلب محمد بن القاسم على السند"

اس کے علاوہ جب سنہ ۹۶ ہجری میں فتح سندھ کے بعد محمد بن قاسم یہاں سے گیا تو ظاہر ہے کہ اس کی عمر کسی حالت میں بھی چوبیس پچیس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ صفحہ ۵۱ پر خود فاضل مصنف کا بیان ہے کہ نوجوان جرنیل

---

[۵۱] "فتوح البلدان" (مطبوعہ مصر) صفحہ ۴۲۰۔ [۵۲] "عرب و ہند کے تعلقات" صفحہ ۳۹۔
[۵۳] " " " ۴۲۶

کی عمر ستو برس کی تھی جب کہ اس نے سنہ ۹۲ ہجری میں سندھ پر حملہ کیا۔ اس حساب سے محمد بن قاسم ہندستان سے روانگی کے وقت بیس اکیس برس کا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے ہلاک ہونے کے کئی سال بعد اس کا بیٹا عمرو بن محمد قاسم سندھ کے گورنر حکم بن عوانہ کی معیت میں یہاں آتا ہے، حکم کو اس کی دانش مندی اور حزم پر پورا اعتماد تھا، بلاذری اسی عمرو کو شہر منصورہ کا بانی قرار دیتا ہے۔

"ادبہ پارسی نے جسے تاریخ عبداللہ ابن المقفع کے نام سے جانتی ہے۔ سنہ ۲۳۷ھ کے قریب فارسی میں ایک کتاب 'آئینِ بزرگی' لکھی۔ شاید فارسی نثر کا یہ قدیم ترین نمونہ ہو جو آج دست یاب ہوسکتا ہے؛ مصنف اپنے بزرگوں کے ذکر سے کتاب کا آغاز کرتا ہے۔ ایک فاضل ایرانی آقائی بہروز نے سنہ ۱۳۱۵ ہجری میں ایک مقدمے کے ساتھ اس کو طہران میں شائع کیا۔" صفحہ ۹۵ و ۹۶

یہ یہاں خوب کیا کم تھا کہ شمس العلما صاحب اسے اور زوردار بنانے کے لیے فٹ نوٹ میں نہایت تحکم و اذعان سے اس بے بنیاد دعوے کا اعادہ کرتے ہیں۔

پیش تر اس کے کہ آئینِ بزرگی کے متعلق کچھ تفصیل کے ساتھ عرض کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع کے بارے میں فاضل مصنف کی اس غلط فہمی کو رفع کردیا جائے کہ وہ تیسری صدی ہجری تک زندہ تھا اور اس نے سنہ ۲۳۷ھ میں 'آئینِ بزرگی' تالیف کی، بیچارے ابن المقفع کو دوسری صدی ہجری میں دوسرے عباسی خلیفہ المنصور کے عہد میں موت کے گھاٹ اُتار دیا[1] جاتا ہے، لیکن ہمارے شمس العلما صاحب ہیں کہ اُسے مرنے کے بعد بھی ایک صدی تک زندہ بتاتے ہیں۔

عربی ادب میں ابن المقفع کا درجہ بہت بلند ہے، کلیلہ و دمنہ کے عربی ترجمے نے اسے بقائے دوام کے دربار میں ممتاز جگہ دے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ ایرانی تاریخ سے متعلق اس نے کئی پہلوی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، اس کی 'الادب الصغیر' اور 'الادب الکبیر' بھی اچھی خاصی شہرت کی مالک ہیں، آج تک محققین اس کی کسی فارسی تالیف کا سُراغ نہیں لگا سکے تھے۔ علمی دنیا کو شمس العلما پروفیسر عبدالغنی کا ممنون ہونا چاہیئے اور ان کی خدمت میں اس قیمتی انکشاف پر ہدیۂ تہنیت پیش کرنا چاہیئے کیوں کہ وہ

---

[1] 'الفہرست' (مطبوعہ مصر) صفحہ ۱۷۲۔

پہلے محقق ہیں جنھوں نے فارسی دانوں کی توجہ فارسی ادب کے اس اَن مول موتی کی طرف مبذول کرائی ہے۔

شمس العلما صاحب کی گراں قدر تصنیف میں اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لیے بعض نادر شہ پارے موجود ہیں لیکن پورے یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ علمی انکشاف شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاید فاضل مصنف کو اپنی کتاب کے بعض حصّوں پر نظرِ ثانی کرنے کا موقع نہیں ملا ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ان کے یہاں لاپروائی کی ایسی بھونڈی مثالیں پائی جاتیں۔

'آئینِ بزرگی' کے ایڈیٹر آقای بہروز یا تو زردشتی ہیں یا پھر ایرانیت کے ایسے گرویدہ کہ انھیں عرب اور اسلام سے خدا واسطے کا بیر ہے، سرورق کے بعد دوسرے ہی ورق پر ایک آتش کدے کی تصویر دی گئی ہے جس کے باہر ابن المقفع کھڑا یہ کہہ رہا ہے۔[۶]

تن بروم و دل نہادم ایں جا بدرون

قابل ایڈیٹر نے اپنے مقدمے میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابن المقفع کو زبردستی حلقۂ اسلام میں داخل کیا گیا تھا ورنہ درحقیقت وہ اپنے آبائی مذہب ہی پر قائم تھا، باوجود اس کے کہ ایڈیٹر ابن المقفع کی موت کا اصلی سبب اس ذاتی رنجش کو بتاتا ہے جو اس میں اور بصرہ کے حاکم سفیان بن معاویہ میں تھی پھر بھی عربوں کے خلاف فاضل ایڈیٹر اپنے غیظ و غضب کا اظہار اس طریقے پر کرتا ہے ؎

بہ ایران و دانش ورانِ مہاں	نگر تا چہ کردند ایں تازیاں
بہ از دانش ہرگز نیاید ز دست	شتربان کہ بر تختِ شاہی نشست

مقدمے کے آخر میں لکھتا ہے کہ شاید ابن المقفع کی موت کا جاں گداز سانحہ سنہ ۱۴۲ ہجری میں پیش آیا۔

فاضل ایڈیٹر ذ۔ بہروز کی علم پروری اور انصاف پسندی تو اس مقدمے سے عیاں ہے۔ آئیے اب کتاب کے اصل مطالب اور زبان پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ مختصر کتاب ایک دیباچے اور چار گفتار (مقالہ) پر مشتمل ہے، اس کی زبان شدہ فارسی ہے جس میں سے عربی الفاظ کو چُن چُن کر نکالا گیا ہے اور ان کی بجائے غیرمعروف قدیم الفاظ کو جگہ دی گئی ہے۔ ایڈیٹر کو خود اس بات کا احساس ہے کہ عام فارسی داں ان غیرمانوس الفاظ کو نہ سمجھ سکیں گے۔ چناں چہ انھوں نے حاشیے میں ان کے معنی بھی دے دیے ہیں، ان میں سے بعض الفاظ

یہ ہیں :-

ترفند	بہ جائے	محال	استوار ؟ بہ جائے معتمد
ہنگ	»	وقار	گزارش » شرح و تفسیر و عبارت
رسانہ	»	حسرت	پایندان » ضامن

یہ کتاب جدید فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ایرانی بچے اپنے وطن کے ایک "دانائے پیشین" کے حکیمانہ اقوال و نصائح سے بہرہ مند ہوں، ہم اب تک اس راز کے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جناب شمس العلما صاحب نے باوجود ایک فاضل اور تجربہ کار پروفیسر ہونے کے یہ کیوں کر باور کرلیا کہ یہ کتاب فارسی نثر کا قدیم ترین نمونہ ہے حالاں کہ اس کا اسلوبِ بیان اس بات کا اعلان کررہا ہے کہ یہ دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ خود ایڈیٹر نے اسے فارسی نثر کا پرانا نمونہ نہیں بتایا اور نہ ہی ایران کا ملک الشعرا بہار اپنی تازہ تصنیف "سبک شناسی" میں اس کا کہیں ذکر کرتا ہے، ہم گفتار دوم' کے چند ابتدائی جملے محض اس لیے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ بھی شمس العلما صاحب کے اس بے بنیاد دعوے کی حقیقت کو ملاحظہ فرمائیں :-

"اگر شاہان و بزرگان را کارپرداز و ہم نشیں آئی باید ہمارہ ہوشیار و بردبار و آرام و راست کار باشی و بدان جاہ و پایہ دمی فریفتہ و نازاں نگردی و ہر آں گاہت بچشم یگانگی بنگرند بچشم خداوندی شان بنگر و ہرچہ برفرو پایہ ات افزایند بہ فروتنی افزا و ہرروز و ہر جای را روشی درخور و سزا پیش گیر و کاری بگزشتہ مسنج و بہ دریوزہ چیزی مخواہ، زنہار تا کینہ و آزردگی زی شان در دل گیری کہ اگر خویشتن دار و فرزانہ ای آں چہ در دلت گزرد برچہرہ ات پیدا گردد و اگر خام و نادانی بہ زبانت آید و اگر چہرہ و زبان نہانت ہویدا نسازد اندوہت در دل نماند و بی گمان باکسی درمیان آید و بہ خسروان و سران رسد از تو رنجند و تیمار و چاکری دیرینہ ات از یاد دہند و باشد کہ ناں آندوگی سودی نبری و فرو سر در آں نہ برباد دہی"

واقعہ یہ ہے کہ شمس العلما صاحب محض دادبہ فارسی کا نام پڑھ کر پھڑک اُٹھے اور اس غلط فہمی کا شکار ہوگئے کہ یہ فارسی دادبہ یعنی ابن المقفع کی اپنی زبان ہے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اس کتاب کو ابن المقفع کی تصنیف بتاکر ایک بہت بڑی علمی خدمت سرانجام دے رہے ہیں حالاں کہ کتاب کے ایڈیٹر نے کسی جگہ اس کی

طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ابن المقفع کی تصنیف ’الادب الکبیر‘ عربی ادب میں ہمیشہ سے مقبول رہی ہو۔ حال ہی میں طہران کے ’کلالۂ خاور‘ نے اس کتاب کا عربی متن اور اس کا فارسی ترجمہ شائع کیا ہو۔ ترجمہ محمد ہادی بن محمد حسین قاینی بیرجندی کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہو، اب جب ہم ’آئینِ بزرگی‘ کے مطالب کا ’الادب الکبیر‘ کے مطالب سے مقابلہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہو کہ ’آئینِ بزرگی‘ میں ایڈیٹر نے ’الادب الکبیر‘ کے بعض مطالب کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں پیش کیا ہو۔ ہم ’آئینِ بزرگی‘ اور ’الادب الکبیر‘ کے فارسی ترجمے سے دیباچے اور خاتمے کی عبارتیں ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام خود اس بات کا فیصلہ کرلیں کہ شمس العلما صاحب کعبہ کی بجائے ہمیں ترکستان لے جانا چاہتے ہیں۔

’آئینِ بزرگی‘ کا دیباچہ

داد بہ گوید :-

نیاگان ما در اندامِ سترگ و زیبا ہوش و خردی شایان داشتند۔ چوں از ما نیرومند تر بودند و درازتر می زیستند کار و آزمایشِ جہاں بہتر و بیش تر می کردند۔ پارسایان پیشین را پایۂ دین و دانش آں از ما برتر و جہاں داران شان را مایۂ کامرانی از ما فراہم تر بودہ است۔ ہرگز دانش و فرہنگِ خود از کسی دریغ نمی داشتند آں چہ می دانستند و می یافتند مردم را می گفتند و می آموختند و ہم می نگاشتند و آیندگان را می گذاشتند۔ چہ نامہ ہای گراں بہای کہ نوشتند و بسا اندرز ہائی سودمندی کہ بہ یادگاران نہادند و مارا از آزمایش دگر بارہ بی نیاز ساختند۔

چنداں در ایں راہ و روش کوشش داشتند کہ اگر یکی از ای شان چیزی دریافتی دیا بہ دری از دانش رسیدی و در بیابانی بودی از بیم آں کہ مبادا از یاد رود و آیندگان

’الادب الکبیر‘ کے فارسی ترجمے کا دیباچہ

ابو محمد عبداللہ بن مقفع پارسی گوید :-

مردمان پیشین را یافتیم کہ آنان راتن ہابسی سطبرتر از ما بود و با سطبری تن خرد وافرتر و نیرو بسی سخت تر از ما بود و باسختی نیرو اتقان کارہا نیکوتر و عمرہا بسی درازتر و بہ فضیلت تجربہ و حسن اختیار برخوردار تر۔ از پیشینیان آں کس کہ صاحب دین و از حزب روحانیین بود در کار دین علماً و عملاً از روحانیین زمانۂ ما پایۂ بلند تر داشت و آں کس کہ صاحب دنیا بود او را نیز بہ فنون بلاغت و فضیلت از ابنای زمان ما مزیت بود۔ پیشینیان نہ تنہا خویشتن را بہ فنون فضائل آراشتند بلکہ سہمی وافر از علم اول و آخر برای ما گذاشتند، کتاب ہا نگاشتند صحیفہ ہا انباشتند، مارا از زحمت تجارب و صدمت تجاذب بی نیاز کردند، ہرگونہ تجربہ را بہ کار بردند و از برای ہوش مندی و زیرکی ما بہ یادگار گذاشتند۔ پایۂ اہتمام را تا آں جا رسانیدند کہ ہرگاہ مردی از آناں را دری از علم کشادہ گشتی یا

زان آگاه نه گردند دریافته بر سنگ ها نوشتی و تخم دانش در ویران ها کشتی - به راستی نیاگان را مهربان پدرانی توان گفت که همواره در بند و اندیشهٔ فرزندان باشند و مر روز سختی شان را اندوخته ای نهند و روند -

سخنی از صواب دست یاب شدی و اد در ده کده خالی از مردم اهلی بودی یافتهٔ خود را بر سنگی سخت نگار دادی تا مبادا اجل موعودش دریابد و مردم آینده آن علم و صواب را در نیابد - همانا کار و کردار آنان در اندوختن علم و تجربه برای آیندگان مانند کار و کردار پدر مهربان بود در اندوختن مال و منال برای فرزندان تا مؤنت طلب آنان را دوچار تعب نه سازد یا پس از زحمت طلب از درک مطلب درمانده سازد -

اگرچہ مندرجہ بالا اقتباسات ہمارے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں ہم مزید اطمینان کی خاطر خاتمے کی عبارتیں بھی ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے -

'آئینِ بزرگی' کا خاتمہ

"مرا دوست ازجہان رستہ ای بود کہ از ہمہ جہانیانش برتر و گرامی تر داشتمی ، چون کہ آن چہ در وی دیدم در کس نیافتم ، و اکنون نمونہ ای از منشہای ستودۂ وی ترا می شمارم تا بہ شنوی و جانانہ بہ کوشی و چندان کہ توانی فراگیری تا کام یاب و کامران گردی -

بدان کہ ہرگز دربند شکم نہ بود پس چیزی کہ نہ یافتی نہ خواستی و اگر یافتی بسیاری نہ کردی ہیچ گاہ فرمان شرم خود نمی برد چہ دامن بہ کارہای ننگین آلودہ نہ داشتی و آب آزرم خویش در آن رہ نہ ریختی -

ہمیشہ لجام زبان در دست داشت ، از آن کہ نہ دانستہ نہ گفتی و در آن چہ دانستی ستیزہ نہ کردی و باکسی در ستیزہ ہم راہ نہ شدی ، و تا داوری دادار و گواہی پاے دار نہ یافتی داوری نہ خواستی ، و تا درمان در نزد کس بہ جستی درد دل نہ نمودی ، جز با دوستانِ خردمند رای نمی زد و از کسی پند و اندرز دریغ نمی داشت ، بیش تر خاموش بود و اگر گفتی گوی بیشی بردی -

ہم چنیں کسی را سرزنش نہ کردی تا پوزشش نیک نہ دانستی ، کینۂ دوستان در دل نہ گرفتی و در برابر دشمنان ہشیاری از دست نہ دادی ، و بے یاران چیزی بہ خود روا نہ داشتی ، در پیدا بسی سست و ناتوان نمودی و در روز رزم با شیرِ ژیان پنجہ زدی و شکستی ، نہ بستوہ می آمد و نہ خشم گین می شد و نہ از کسی و از چیزی آزردہ می گردید و نہ از بخت و اختر و سختی و تنگی می نالید و می نومید گشت "

الادب الکبیر کا خاتمہ

من تو را خبری دہم از مصاحبی کہ در چشم من بزرگ‌ترین مردمان بود و سرآمد بزرگی ہای او کہ او را در نزد من عظیم می داشت کوچکی دنیا در نزد او بود، از سلطنت شکم خارج بودی، چیزی کہ نہ یافتی نہ خواستی و از آن چہ یافتی بسیار نہ خوردی، دیگر از تحت سلطنت فرج بیرون زیستی، فرج را برو مؤنتی و او را از آن کلفتی نبودی، نہ رای او را برای زشتی بکاری سست رہنمون بودی نہ تن او را در چار کاوش و کاہش داشتی، از سلطنت جہالت بیرون بود پس اقدام نہ کردی مگر بکاری کہ اعتماد را شاید یا منفعتی از و آید، بیش‌تر روزگار او بہ سکوت گذشتی ولی آن گاہ کہ سخن گفتی برہم سخن غالب آمدی، ضعیف نمودی و مستضعف بہ شمار بودی با این ہمہ آن گاہ کہ گاہ جد بود تو گفتی شیر یست حملہ کنندہ، نہ در دعوی داخل شدی نہ در جدل شرکت کردی، تا قاضی عادل و شہودی عدول نہ یافتی حجت نمودی و برہان نیاوردی، ہیچ کس را ملامت نہ کردی بر چیزی کہ امکان عذری در او بودی مگر آن گاہ کہ سخافت عذر را دانستی، از درد شکایت نہ بردی مگر نزد آن کس کہ موجب بُرئی نزد او گمان بردی، مصاحبت نہ کردی مگر آن کس را کہ رجاے نصیحتی برای خود در صحبت او یا برای او در صحبت خود داشتی، اظہار ضجرت نہ کردی، روی سخط نہ نمودی، بہ چیزی تشہی نہ کردی، بہ کسی تشکّی نبردی، از دوست انتقام نہ کشیدی، از دشمن غافل نہ بودی، قوتی کہ داشتی تخصیص بہ خود ندادی بلکہ ہر حیلہ کہ در کار خویش اندوختی و ہر نیرو کہ در کار خود بہ کار بردی در کار یاران و برادران بہ کار انداختی، پس بر تو باد بہ کار بردن این اخلاق اگر تو را طاقت است و ہرگز طاقت نیست، لکن اندکی کہ توانی فراگیر کہ بہتر از ترک جمیع است و توفیق از خدای متعال است۔"

ان عبارتوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہی کہ "آئینِ بزرگی" "الادب الکبیر" کے مطالب کا ایک آسان اور مختصر خلاصہ ہی جسے آقای بہروز نے تیار کیا ہی اور اس کا نام "آئینِ بزرگی" انھوں نے محض اس لیے پسند کیا ہی کہ وہ عربی نام "الادب الکبیر" کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

"یہ خاندان اسد کے باپ سامان کی وجہ سے سامانی کہلاتا تھا، سامان عرب تھا۔" صفحہ ۱۱۵

سامانیوں کے ایرانی ہونے کے متعلق کسی قسم کا شک و شبہ نہیں، وہ اپنے کو بہرام چوبین کی[1] اولاد بتاتے ہیں خدا جانے شمس العلما صاحب نے کس سند کی بنا پر ان کے مورث اعلا کو عرب بنادیا۔

---

[1] "زین الاخبار" صفحہ ۱۵۔

"یاقوت (مصنف معجم الادبار) ابوریحان بیرونی کا ایک عربی قصیدہ محمود غزنوی کی مدح میں نقل کرتا ہو جس میں بیرونی نہایت صفائی سے محمود کی بخشش اور علم و ادب کی قدردانی کا اقرار کرتا ہو۔" صفحہ ۱۹۲

سلطان محمود کا نام دیکھ کر شمس العلما صاحب فوراً اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ہو نہ ہو یہ قصیدہ محمود کی مدح میں لکھا گیا ہو حالاں کہ اگر ان کی نظر سیاق و سباق پر ہوتی تو وہ دیکھتے کہ اس قصیدے میں ابوریحان اپنی دو حالتوں کی کیفیت بیان کر رہا ہو، ایک اقبال و کامرانی کی اور دوسری بےقدری اور کس مپرسی کی، یہ قصیدہ ایک دوسرے لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہو: اس میں وہ ان فرماں رواؤں اور حاکموں کا ذکر کرتا ہو جو اس کے سرپرست اور قدردان رہے ہیں۔ سب سے پہلے وہ آلِ عراق کے لطف و کرم کو یاد کرتا ہو اور ان میں سے خاص طور پر منصور کی قدردانی کی طرف اشارہ کرتا ہو، میرزا محمد قزوینی نے "چہار مقالہ" کے حواشی کے سلسلے میں صفحہ ۲۴۷ پر آلِ عراق کے حالات کے ضمن میں لکھا ہو کہ یہ خوارزم کا ایک قدیم حکمران خاندان تھا، میرزا قزوینی کی تصریح کے مطابق منصور وہی ابونصر منصور بن علی بن عراق مولی امیرالمومنین ہو[له] جس کا شمار چوتھی صدی ہجری کے مشہور ماہرینِ ریاضیات میں سے ہو اور جس نے بارہ کتابیں اور رسالے بیرونی کے نام پر لکھے ہیں، اس امر کا اعتراف بیرونی نے اپنی خودنوشتہ فہرستِ تالیفات میں کیا ہو جسے پروفیسر زخاؤ نے "الآثار الباقیہ" کے مقدمے میں شائع کردیا ہو۔

آلِ عراق کے بعد شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے اشتیاق اور نوازش اور اس سے اپنی بےالتفاتی کا ذکر بیرونی فخریہ انداز میں کرتا ہو، یہ عالم اور ادیب قابوس وہی والی طبرستان ہو جس کے نام البیرونی نے اپنی کتاب "الآثار الباقیہ" معنون کی (ملاحظہ ہو الآثار الباقیہ کے انگریزی ترجمے کا دیباچہ) خوارزم کے مامونی خاندان میں سے بیرونی علی بن مامون کی بندہ پروری اور اس کے بھائی ابوالعباس مامون بن مامون کی عنایات کی تعریف کرتا ہو۔ اب سلطان محمود کے جود و بخشش کی باری آتی ہو۔ یہ دور اس کی خوش حالی کا زمانہ ہو۔

اس کے بعد وہ غزنی میں اپنی بےکسی اور ناقدردانی کا شاکی ہو حالاں کہ وہ اپنے تمام ہم عصروں سے علم و فضیلت میں برتر ہو، مشرق میں اہلِ ہند اس کے کمال کے معترف ہیں اور مغرب والے بھی اس کی

له۔ حواشی، چہار مقالہ، صفحہ ۲۴۶، ۲۴۷۔

علمی کاوشوں سے ناواقف نہیں۔ تسبیدے کے آخر میں وہ ابوالفتح کی خوش اقبالی اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کرتا ہی۔ یاقوت[1] محمد بن محمود نیشاپوری کی کتاب "سرالسرور" کے حوالے سے اس ابوالفتح کو ابوالفتح البستی بتاتا ہی۔

"مسعود سعد سلمان کی ولادت سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ہوئی لیکن اس کی شہرت کا آغاز سلطان ابراہیم کے زمانے سے ہوتا ہی۔ شروع شروع میں بادشاہ نے اسے اپنی عنایتوں سے سرفراز کیا لیکن بعد میں سلطنت سے مزعومہ غداری کی بنا پر اسے قلعۂ نای میں قید کر دیا گیا۔ سلطان ابراہیم کے انتقال کے بعد اسے رہائی نصیب ہوئی لیکن پھر اس کے جانشین سلطان مسعود کے عہد میں قلعۂ سو کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ دوسری بار رہا ہونے کے بعد اس نے سرکاری ملازمت کا خیال ترک کر دیا اور عمر کا باقی حصہ غزنین میں گوشہ نشینی میں گزار دیا۔" (صفحہ ۲۰۱)

مسعود سعد سلمان کے سوانح زندگی بیان کرتے وقت میرزا محمد قزوینی کا محققانہ مقالہ شمس العلما صاحب کے پیشِ نظر رہا ہوگا کیوں کہ وہ خود ایک فٹ نوٹ میں اس کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ ہمیں سخت تعجب ہی کہ فاضل پروفیسر نے اس مقالے سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اُٹھایا اور زیادہ تر اپنی تحقیقات پر اعتماد کیا ہی، معلوم ہوتا ہی کہ انھوں نے مندرجہ بالا سطور نہایت لاپروائی کے عالم میں لکھی ہیں ورنہ وہ ایسی غیر صحیح باتیں نہ لکھتے۔ میرزا قزوینی نے اپنے مقالے میں مسعود سعد کی ولادت کے متعلق ایک مفصل بحث کی ہی اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسعود سنہ ۴۳۸، ۴۳۹ اور ۴۴۰ ہجری کے درمیان اس دنیائے فانی میں وارد ہوا مگر ہمارے شمس العلما صاحب اس کی ولادت سلطان محمود کے زمانے میں قرار دیتے ہیں۔

اس کے محبوس ہونے کے بارے میں بھی فاضل مصنف نے میرزا قزوینی کی رہبری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسی لیے صحیح واقعات سے دُور جا پڑے۔ وہ جا بہ جا دیوانِ مسعود کے ایک مخطوطے کا حوالہ دیتے ہیں حالاں کہ آقائی رشید یاسمی نے بڑی محنت اور کوشش سے مسعود کا دیوان شائع کیا ہی اور اس کے مقدمے میں قزوینی کے مقالے کی مدد سے مسعود کے حالات کو کمال صحت کے

---

[1] "معجم الادبا" (مطبوعہ مصر) جلد ۱۷، صفحہ ۱۸۶۔

ساتھ مرتب کیا ہے۔ مسعود سعد سلطان ابراہیم کے زمانے میں دھک، سو اور نائی میں محبوس رہتا ہے، اس کے اپنے بیان کے مطابق سلطان ابراہیم ہی اسے قید سے رہائی بخشتے ہیں چناں چہ وہ ایک قصیدے میں کہتا ہے ؎

عفوِ سلطانِ نام دار رضی　　　　بر شبِ من فگندہ نورِ قمر

سلطان مسعود کے عہد میں دوبارہ مرنج کے زندان میں اپنی محبوسی کے دن کاٹتا ہے، اس کے حبسِ ثانی کی مدت کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ ایک جگہ وہ کہتا ہے ؎

ہفت سالم بکوفت سو و دھک　　　　پس از آنم سہ سال قلعۂ نائی

در مرنجم کنوں سہ سال بود　　　　کہ بہ بندم دریں چو دوزخ جائی

اور پھر ملک ارسلان کی مدح میں ایک قصیدے میں کہتا ہے ؎

من بندہ سال سیزدہ محبوس ماندہ ام　　　　جان کندہ ام ز محنت در حبس و در حصار

اس حساب سے اس نے کل تیرہ برس قید کی زحمت جھیلی مگر وہ ایک قطعے میں ابوالفرج کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

مر ترا ہیچ باک نامد از انک　　　　نوزدہ سال بودہ ام بندی

آقای رشید یاسمی کے خیال میں سیزدہ سال کتابت کی غلطی ہے اور سیزدہ کے بجائے نوزدہ یا ہیجدہ پڑھنا چاہیے۔

سلطان مسعود کے زمانے میں رہا ہونے کے بعد مسعود سعد گوشہ نشینی اختیار نہیں کرتا بلکہ سلطان کی طرف سے دار الکتب کا مہتمم مقرر کیا جاتا ہے چناں چہ وہ اپنے دیوان میں اس کا ایک سے زائد مرتبہ ذکر کرتا ہے ؎

دار الکتب امروز بہ بندہ است مفوّض　　　　ایں عزّ و شرف گشت مرا رتبتِ والا

سلطان مسعود کی وفات کے بعد وہ ملک ارسلان اور بہرام شاہ کی مدح میں بھی قصیدے لکھتا ہے، بہرام شاہ کو مخاطب کرکے اس کے احسان کا یوں ذکر کرتا ہے ؎

از دادۂ تو اکنوں چنداں کہ بندہ راست　　　　کس را یسار و مال و ضیاع و عقار نیست

معلوم ہوتا ہی کہ بہرام شاہ مسعود پر بڑا مہربان تھا چناں چہ معزی ایک قطعے میں اس کی طرف اشارہ کرتا ہی ۔

شاہ بہرام شاہ بن مسعود　　خواجہ مسعود سعد را بہ نواخت

صفحہ ۴۴۴ ۔ " ادیب صابر خود ستائی کے عالم میں مسعود سعد سلمان کے شاعرانہ کمال کا یوں اعتراف کرتا ہی ۔

گر ایں طرز سخن در شاعری مسعود را بودی　　بہ جان صد آفریں کردی رواں سعد سلمانش "

یہ تو ایک قسم کی شاعرانہ تعلی ہی ، مسعود سے اظہار عقیدت نہیں ۔ البتہ ایک دوسری جگہ ادیب صابر معزی اور مسعود کی برتری کا قائل نظر آتا ہی ۔

زبان وطبع معزی و رودکی است سزا　　ثنای دولت سلجوق و آل ساماں را

بہ عیب خود شعرا را تقدمی ننہم　　گر معزی و مسعود سعد سلماں را

(سخن دانِ فارس جلد اوّل ، صفحہ ۲۵۱ ، فٹ نوٹ ۲)

صفحہ ۴۴۸ ۔ " ابوالفرج رونی کئی تصانیف کا مالک ہی ان میں سے عروض پر ایک رسالہ ہی اور ایک ضخیم دیوان اس نے دیوان اپنے سرپرست سلطان ابراہیم کے نام معنون کیا ، انتساب والے قصیدے کا مطلع یہ ہی ۔

سپہر دولت و دین آفتاب ہفت اقلیم　　ابوالمظفر شاہ مظفر ابراہیم "

یہ قصیدہ مطبوعہ دیوان کے صفحات ۸۶ و ۸۷ پر درج ہی لیکن اس میں کہیں تہدیہ یا انتساب کی طرف اشارہ تک نہیں ، خدا جانے کس بنا پر شمس العلما صاحب ایسی بے بنیاد بات لکھ گئے حالاں کہ اس کے دیوان میں سلطان ابراہیم کے جانشین مسعود کی مدح میں ایک چھوڑ کئی قصیدے ہیں ۔ دیوان میں سب سے پہلے قصیدے کا مطلع یہ ہی ۔

سزد گوارندہ باد شاہ جہاں را　　ناصر دیں راعی زمین و زماں را

چوں کہ اس قصیدے میں ممدوح کا نام بالصراحت مذکور نہیں ، اس لیے روسی پروفیسر چایکین مرتب دیوان نے یہ سوال اٹھایا ہی کہ آخر اس قصیدے کا ممدوح کون ہی؟ آقای محمد علی ناصح جنھوں نے دیوان کے آخر

میں ابوالفرج کے حالات لکھے ہیں اس سوال کا شافی جواب نہیں دے سکے۔ سب سے پہلی مشکل "ناصر دین" کی وجہ سے ہے۔ غزنویوں میں سے سبکتگین اور مسعود اوّل اس لقب کے مالک ہیں، اس مشکل کا حل محمد علی ناصح کے خیال میں یہ ہے کہ یہاں "ناصر دین" کا استعمال کسی بادشاہ کے خاص لقب کے طور پر نہیں بلکہ "راعی زمین و زمان" کی طرح ممدوح کی صفت ہے، یہ توجیہہ بہت حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اصل سوال کا جواب آقائی ناصح کے لیے ایک بہت بڑا معما ہے، وہ ایک طویل بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گرچہ ابوالفرج رونی سلطان محمود غزنوی کا ہم عصر نہیں تاہم اس کی عظمت و شرف کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی مدح سرائی اس طریقے پر کرتا ہے کہ گویا سلطان محمود اس کا معاصر ہے۔ اس قسم کا نتیجہ نکالنا بظاہر مستبعد اور دور از کار ہے لیکن چونکہ اس قصیدے میں فتح قنوج کا ذکر ہے لامحالہ آقائی ناصح نے روسی پروفیسر کے سوال کا وہ جواب دیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

پیش تر اس کے کہ اس گتھی کو ایک حد تک سلجھانے کی کوشش کی جائے یہ نامناسب نہ ہوگا اگر قصیدہ مندرجہ بالا کے وہ اشعار درج کردیے جائیں جن میں قنوج کی طرف اشارہ ہے ؎

روی بہ قنوج کرد شعلۂ حزمش سوی فلک راند شاخ ہای دخان را
رای زنی پیر بود بر در ملہی رای زن پیر گفت رای جوان را

. . . .

رائی بہ تدبیر پیر قلعہ بہ پرداخت خم زد و بی کور (؟) کرد نام ونشان را

اگر ہم مسعود سعد سلمان کے دیوان کی طرف رجوع کریں تو یہ گتھی بہت حد تک سُلجھ جاتی ہے۔ مسعود بھی ابوالفرج رونی کی طرح اپنے ایک قصیدے میں قنوج اور اس کے والی ملہی کا ذکر کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کس طرح والیٔ قنوج نے سلطان کی خدمت میں ایک بھاری رقم پیش کرکے اپنی جان بچائی، یہ قصیدہ سلطان مسعود بن ابراہیم کی مدح میں ہے ؎

بہ ہند شاہا قنوج دارالملک کہ کافری ہمہ بر قطب او گرفت مدار
حدیث و قصۂ آں حال نیست پوشیدہ کہ کعبۂ شمنان بود و قبلۂ کفار

سپاہ و نعمت و پیل و سلیح ملہی را | کہ بود والی آن عاملی دگر پندار

. . . .

بجست بیش وازہم جان چنان پنداشت | کہ ہست افعی پیچانش بر میان زنار

. . . .

نہیب شاہ برو حلقہ کرد گرد جہان | کہ رہ نبودش پیش وپس وبیمن ویسار

شتافت خواست بخدمت زبہر عز وشرف | دو دست کردہ بکش بندہ سان و چاکروار

ولی ببستش سوت کہ یک زمان بدہد | بجالش خنجر زنہار مرا خوار تو زنہار

عزیز جان را آخر بسیم [illegible] بخرید | تو این تجارت نیکو تجارتی انگار

بہ عاملی چو نگر سالانت شد راضی | بہ بندگی چو دگر بندگانت کرد اقرار

(دیوان مسعود سعد سلمان صفحہ ۲۴۷ و ۲۴۸، مرتبہ رشید یاسمی)

ایک اور قصیدے میں بھی جو سلطان مسعود بن ابراہیم کی مدح میں ہو مسعود سعد سلمان فتح قنوج کی طرف اشارہ کرتا ہو ؎

نہ دیر زود شود ہم چو بقعۂ قنوج | بنائی بت کدۂ قندھار از آتش و آب

چوں کہ ابوالفرج رونی اور مسعود سعد ہم عصر ہیں، کوئی تعجب نہیں کہ دونوں ایک ہی واقعے کا ذکر کر رہے ہوں اور ابوالفرج کے پہلے قصیدے کا ممدوح سلطان مسعود بن ابراہیم ہو نہ کہ سلطان محمود غزنوی جیسا کہ آقائی محمد علی ناصح ظاہر کرتے ہیں۔

"سنائی نے اپنی مشہور مثنوی 'حدیقۃ الحقیقۃ' سلطان ابراہیم (غزنوی) کے زمانے میں لکھی اور اسی کی خدمت میں اسے پیش کیا" صفحہ ۲۵۵

یہاں ابراہیم لکھنا غالباً شمس العلما صاحب کا سہو قلم ہو، یہ مثنوی بہرام شاہ کے عہد میں لکھی گئی نہ کہ ابراہیم کے زمانے میں، اس مثنوی کا دسواں باب بہرام شاہ کی مدح میں ہو۔ ایک مقام پر سنائی کہتے ہیں ؎

ای سنائی بگرد رضوان پوی | در آن از ثنای سلطان جوی

شاہ بہرام شاہ بن مسعود   کہ وجود جہان بدو مقصود

کہا جاتا ہو کہ حدیقہ کے بعض قابلِ اعتراض حصوں پر علما کی طرف سے بہت سخت ردّ و قدح کی گئی تھی، سنائی نے اپنی برات میں ایک خط سلطان بہرام شاہ کو لکھا تھا جسے فاضل مصنف نے بدایونی کی منتخب التواریخ سے لے کر اپنی کتاب میں نقل کیا ہو اس میں صاف طور پر بہرام شاہ بن مسعود شاہ بن ابراہیم شاہ بن مسعود شاہ بن محمود شاہ لکھا ہو۔ اس کے باوجود شمس العلما صاحب کی لاپروائی ملاحظہ ہو کہ صفحہ ۲۵۵ پر دو بار بہرام شاہ کے بجائے ابراہیم لکھ رہے ہیں۔

"ایرانی لڑکی شاخِ نبات سے خواجہ حافظ کے عشق کی داستان بہت مشہور ہو، حافظ والہانہ طور پر اسے یاد کرتے ہیں۔" صفحہ ۳۲۶

شمس العلما صاحب ایک سراب میں پھنس کر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے شاعرانہ کمال کے اس درجہ قائل ہیں کہ ان بزرگوار کو بحیثیت شاعر کے خواجہ حافظ پر ترجیح دینے کی خاطر بلبلِ شیراز کے رندِ لاأبالی ہونے کے قصّے کو بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں اور حافظ کی فرضی معشوقہ شاخِ نبات تک کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ شمس العلما صاحب حضرت خواجہ معین الدین کے کمالات کا صور جس بلند آہنگی سے چاہیں پھونکیں لیکن یہ تو کسی صورت میں بھی ان کے شایاں نہیں کہ خواجہ حافظ کو گرانے کے لیے وہ بازاری قصّوں کی پناہ لیں، فرہنگ انندراج تاریخ کی نہیں بلکہ لغت کی کتاب ہو۔ اس کا مصنف شاخِ نبات کے بارے میں لکھتا ہو "..... و نام معشوقہ خواجہ شیراز و این قولِ عوام است" تعجب ہو کہ شمس العلما صاحب اپنے تجربہ و فضیلت کے باوجود اسی قولِ عوام کو بارگاہِ خواص میں شرفِ قبولیت سے مشرّف کرنا چاہتے ہیں، دیوانِ حافظ کے ایک سرسری مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہو کہ خواجہ اپنے قلم کو شاخِ نبات سے تشبیہ دے رہے ہیں چناں چہ اشعارِ ذیل اس دعوے کی دلیل ہیں ؎

حافظ چہ طرفہ شاخِ نباتیست کلکِ تو   کش میوہ دل پذیر تر از شہد و شکر است

کلک حافظ شکریں شاخ نباتیست بچیں که دریں باغ نہ بینی ثمرے بہتر ازیں

شمس العلما صاحب نے اپنی کتاب میں جا بہ جا فارسی شعرا کے کلام کے نمونے نقل کیے ہیں اور بعض مقامات پر پورے کے پورے قصیدے درج کردیے ہیں مثلاً شہاب مہمرہ کے تین قصیدے، عمید سنامی کے چار قصیدے، خان شہید کی وفات پہ امیر خسرو کا طویل مرثیہ، نثر کے اقتباسات دینے میں بھی انھوں نے کافی کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہو مثلاً امیر حسن دہلوی کا مرثیہ منشور یا طبقات ناصری اور برنی کی تاریخ فیروز شاہی کے اقتباسات۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ اور امیر حسن دہلوی خوش قسمت ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی کئی غزلیں مع انگریزی ترجمے کے کتاب کی زینت کو دوبالا کر رہی ہیں، عام طور پر شمس العلما صاحب کے ترجمے صحیح اور برجستہ ہوتے ہیں تاہم بعض جگہ مسامحت کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ہم بہ قید صفحہ بعض مسامحتوں کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ آیندہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح ہو سکے۔

صفحہ ۷۔ صدر الافاضل والکتاب کے معنے The head of the learned & calligraphists دیے گئے ہیں حالاں کہ یہاں کتاب سے مراد خوش نویس نہیں بلکہ دبیر اور منشی ہو۔

صفحہ ۱۲۲۔ "چوں امیر نصر بن احمد مہرگان و ثمرات او بہ دید عظیمش خوش آمد" کا ترجمہ یہ کیا گیا ہو:-

When Amir Nasr bin Ahmad saw its spring and its fruits, he was well pleased with it.

تعجب ہو کہ اس تمام عبارت میں شمس العلما صاحب نے مہرگان کو بہار کا ہم معنی ٹھیرایا ہو حالاں کہ خود نظامی عروضی سمرقندی جس کے 'چہار مقالہ' سے مندرجہ بالا عبارت نقل کی گئی ہو بہار کے بعد مہرگان کا ذکر کر رہا ہو، خزاں کو بہار بنانا بھی خوب رہا، شاید فاضل مصنف کے حافظۂ گرامی میں ادیب صابر کا یہ شعر نہیں آیا ؎

توئی کہ مہر تو در مہرگاں بہار من است که چہرۂ تو گلستاں و لالہ زار من است

پروفیسر براؤن کا 'چہار مقالہ' کا انگریزی ترجمہ موجود ہو، انھوں نے ہر جگہ مہرگان کے اصل لفظ کو قائم رکھا ہو، البتہ فٹ نوٹ میں یہ واضح کردیا ہو کہ ماہ مہر میں یہ جشن خزاں کے موسم میں اس وقت منایا جاتا

ہو جب کہ دن اور رات برابر ہوتے ہیں۔

صفحہ ۲۰۰ ؎ سوی مولد کشید ہوش مرا بویۂ دختر و ہوائی پسر

چون بہ ہندستاں شدم ساکن بر ضیاع وعقار پیر پدر

ان اشعار کا ترجمہ شمس العلما صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہو:۔

"Towards my land of birth drew my thoughts
The fragrant breath of my daughter & the longing for my son;
Since in India I became a sojourner
On the fertile and barren land of my old father."

بویہ سے مراد خوش بو نہیں بلکہ آرزو اور خواہش ہو، انوری اپنے ایک مشہور قصیدے میں کہتا ہو ؎

ای در حرم جاہ تو امنی کہ نیاید از بویۂ او خواب خوش آہوی حرم را

عقار کے معنے بنجر زمین نہیں بلکہ زمین اور جایداد ہو۔ فاضل مصنف نے عقار اور عاقر کے تشابہ کی بنا پر بنجر زمین لکھ دیا ہو۔ مسعود سعد سلمان کے یہاں ضیاع و عقار کا استعمال کئی بار ہوا ہو مثلاً ؎

نہ سعد سلمان پنجاہ سال خدمت کرد بہ دست کرد بہ رنج ایں ہمہ ضیاع وعقار

از دادۂ تو اکنوں چنداں کہ بندہ راست کس را یسار و مال و ضیاع و عقار نیست

صفحہ ۲۴۰ ؎ صاحب قرانِ عالم کافی توئی کہ ہست گل زار دار خلد نمودار شعر تو

اس شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"Thou art the Sahib Qiran of the world; thy presence is enough since it is a fact
That thy verses appear like the garden of paradise."

کافی توئی کے معنے Thy presence is enough نہیں بلکہ کافی سے مراد وہ شخص ہو جو امورِ سلطنت یا دوسرے امور قابلیت اور استعداد سے سرانجام دے۔ بعض سلاطین کے وزرا کافی الکفات اور

شمس انکفات کے لقب سے مشہور ہیں۔ یہاں عالم اور کافی صاحب قران کی صفت ہیں۔

فاضل مصنف نے تقی اوحدی کے حوالے سے ذکی کا شعر کا مندرجہ بالا شعر ابوالفرج بن مسعود رونی کی تعریف میں نقل کیا ہے لیکن تقی کے ماخذ سے بہت پرانا ماخذ عوفی کی ' لباب الالباب' ہے۔ عوفی نے لباب کی جلد دوم میں ایسے دو شاعروں کا ذکر کیا ہے جو ابوالفرج رونی کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک کو آل سلجوق کے شعرائے عراق کے زمرے میں شامل کیا ہے[۵۱] اور دوسرے کو شعرائے غزنہ و لاہور میں، دوسرے ابوالفرج کو وہ ابوالفرج بن مسعود الرونی کہہ کر پکارتا ہے لیکن بہ قول عوفی کے ذکی (یا زکی) مرغی نے مندرجۂ بالا شعر میں پہلے ابوالفرج رونی کو مخاطب کیا ہے ظاہر ہے کہ تقی کے مقابلے میں عوفی کی شہادت زیادہ وزنی ہے۔ اگر 'لباب الالباب' کے یہ الفاظ شمس العلما صاحب کے پیشِ نظر ہوتے: "کافی بافضلی وافی و ذہنی صافی بود" تو وہ کافی توئی کا ترجمہ 'تمھاری موجودگی کافی ہے' ہرگز نہ کرتے۔[۵۲]

صفحہ ۳۰۰۔ سطر ۵ بہ صدر مسند ہر دل خیالش کی زند تکیہ

کہ مُہرِ کبریائی او بہ ہر منظر نمی گنجد

دوسرے مصرع کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:-

"Because the signet of his grandeur does not suffer every sight."

یہاں مُہر کے بجائے اگر مِہر بمعنی سورج پڑھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

صفحہ ۳۰۷۔ سطر ۵ باز دل از شرفِ قصرِ ازل کرد نزول باز پرواز کناں میل بہاں جا دارد

شمس العلما صاحب کا ترجمہ یہ ہے:-

Again, the heart has descended from the heights of the mansion of Eternity.

Again, soaring it has the inclination to go there.

---

[۵۱] لباب الالباب، جلد دوم صفحہ ۲۳۸۔ [۵۲] لباب الالباب، جلد دوم صفحہ ۲۴۱۔

[۵۳] " " صفحہ ۲۳۸۔

یہاں باز دل کے بجائے بازِ دل پڑھنا چاہیے یعنی دل کو باز سے تشبیہ دی گئی ہے، اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

راہ بکشای کہ دل میل بہ بالا دارد | پردہ برگیر کہ جان عزم تماشا دارد

صفحہ ۴۴۳ ؎ ای فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ | تیغ تو مال و ملک ز کفار خواستہ

پہلے مصرع کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے :-

O thou, terror of anarchy terrified has sought shelter from thee, "

یہ ترجمہ بہت پیچیدہ اور مبہم سا ہے، اس مصرع کا تو مطلب یہ ہے کہ ممدوح کے ڈر کے مارے فتنہ پناہ ڈھونڈھ رہا ہے یعنی فتنے نے راہِ فرار اختیار کی ہے۔

صفحہ ۴۴۱ ؎ سر در سرِ سودای بُتاں کرد حسن باز | ای خاک بران سر کہ در و دردسری نیست

اس شعر کا مندرجہ ذیل ترجمہ صفحہ ۴۵۴ پر ہے :-

Hasan has once again given his thoughts to the love of the beautiful.

Oh, dust be on that head which has not the ache for some one's love.

سر در سرِ چیزی کردن مشہور محاورہ ہے جس کا مفہوم کسی کی خواہش اور طلب میں ہلاک ہونا ہے مثلاً شیخ سعدی کہتے ہیں ؎

آن کس کہ بدینار و درم خیر نیندوخت | سر عاقبت اندر سر دینار و درم کرد

صفحہ ۴۴۲ ؎ نگزاری کہ سرت گردم و پایت بوسم | آخر این کار مرا ہیچ سر و پائی ہست

صفحہ ۴۵۵ پر شمس العلما صاحب اس شعر کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں :-

"Thou dost not permit me to go round thee & kiss thy feet,
Is there any beginning or end to my work? "

سرکسی گشتن مشہور محاورہ ہے جس کے معنے قربان ہونا ہیں ، مرحوم اقبال اپنی نظم طلوعِ اسلام میں کہتے ہیں ؎

سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی   کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد

صفحہ ۴۴۶ ؎ نقد جان در ششدر عشق بنہ عیاروار   این چنیں نردے نمی شاید ہراساں باختن

اس شعر کا ترجمہ صفحہ ۱۰۲ پر یوں کیا گیا ہے:-

"*Place the cash of life in the love-chamber having six doors.*

Such a game-piece ought not to be so desperately moved."

حالاں کہ شعر کا مفہوم بالکل اس کے برعکس ہے، شاعر تو یہ کہہ رہا ہے کہ عیار آدمی کی طرح سے اپنے محبوب کے عشق کی بساط پر نقد جان رکھ دے یعنی مردانہ وار اس کے عشق میں نقد جان لٹا دے، یوں ڈر ڈر کے نرد کھیلنا سچے عاشقوں کا شیوہ نہیں، ششدر اصل میں نرد کے چھ خانے ہیں یہ لفظ کنایۃً اس حالت اور جگہ کے لیے بولا جاتا ہے جہاں سے رہائی دشوار ہو۔

شمس العلما صاحب کی قابلِ قدر تصنیف میں جہاں تک فارسی متن کا تعلق ہے طباعت کی غلطیاں بہ کثرت ہیں ، امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان غلطیوں کو دور کردیا جائے گا۔

آخر میں ہم یہ عرض کردینا چاہتے ہیں کہ شمس العلما پروفیسر عبدالغنی صاحب کی تازہ تصنیف کے بعض تاریک پہلوؤں پر ہم نے اس غرض سے روشنی ڈالی ہے کہ یہ قابلِ قدر کتاب ان نقائص اور خامیوں سے پاک ہو اور اس کا دوسرا ایڈیشن دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ساتھ قابل مصنّف کے گہرے غور وفکر کا آئینہ دار ہو۔

تیرھویں صدی کا اُردو ادب

(قسط دوم)

(از جناب عقیل احمد صاحب جعفری)

۲۔ ریاض الاخبار

اے عندلیب رنگ ہمارا اُڑائیو
تقلید میں بھی تا رہے ایجاد کا مزا

" ریاض الاخبار نے اپنے طرز میں جو اعلا مرتبہ کی نمود حاصل کی ہے وہ اس لائق ہے کہ زمانے کو اس پر ناز ہو۔ شاہد پرستانِ سخن سے اس کی قدر پوچھیے اور جو عروسِ مذاق کے نکھار پر مٹے ہوئے ہیں ان کے دل ٹٹولیے۔ شوخیوں نے ہرچند ابھی تیز چٹکیاں نہیں لی ہیں پھر بھی ہلکے ہلکے نیلے سائے نظر آ رہے ہیں۔ چٹکیوں نے ابھی چبھتا اثر نہیں ڈالا ہے پھر بھی کس مزے سے گدگدی اُٹھ رہی ہے۔ سامان وہ فراہم ہوئے کہ طاؤسِ مینا کے رقص کے عوض اس کے ورق بھلے معلوم ہوتے ہیں ــــ جنھیں شعر و ادب سے لگاؤ تھا وہ اس کی پرستش کرنے لگے جنھیں پولٹیکل مضامین کی چاہت تھی وہ اس پر مرمٹے ناول کی شہرت کا وہ شور ہوا کہ ہنگامۂ محشر سمٹ کر یہیں آ رہا۔

اس پرچے کی خواہش ہے کہ اپنی حالت کو اپنے حوصلے کے موافق سنبھالے۔ وہ بات پیدا کرے کہ ملک کو اس کے وجود سے فخر حاصل ہو۔"　　　ریاض الاخبار سنہ ۸۳ء

ریاض الاخبار کیا تھا وہ ایک چمن تھا رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ۔ ایک پھول تھا بھینی بھینی

خوش بو سے بھرا ہوا آؤ اس چمن کی ذرا سیر کریں۔

سیرِ چمنِ ریاض الاخبار کے سلسلے میں قبل اس کے کہ ہم دوسری روشوں (عنوانات۔ نوادر، مشاہیر، مذاکرۂ علمیہ، نقد الادب، لکھنؤ کی ایک "نوآبادی" وغیرہ) کی طرف مڑیں "حسن سرِ رہ گزر" پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیے۔

الف۔ حُسنِ سرِ رہ گزر

۱۔ زرّیں کالم

ریاض الاخبار نے نادہند خریدارانِ اخبار کے خلاف بہ طورِ پروٹسٹ ایک یہ جدت کی تھی کہ ایسے حضرات کے نام مدتِ انتظار گزر جانے کے بعد سیاہ جدول میں بڑے بڑے حرفوں سے شائع کرتا تھا اس کے برعکس خوش معاملہ مربیوں اور معطیوں کو "زرّیں کالم" میں جگہ دیتا تھا —— عنوانِ بالا کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو :۔

"دنیا میں وہ حضرات بھی ہیں جن کے نام خاص کالم کے نذر کیے جاتے ہیں اور کچھ اثر نہیں ہوتا ساتھ ہی بعض ایسے بھی ہیں جو اشخاص مندرجۂ خاص کالم کی تیغ تغافل کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نام جس کالم میں درج ہوں اس کو زرّیں کالم سے تعبیر کرنا مناسب ہے ؎

جو مجھے دیں مرے اللہ خزانے پائیں   کام آتی ہے حسینوں کے کمائی میری

جو لوگ اخباری دنیا سے بہ اعتبار دیسی مذاق کے واقف ہیں وہ زرّیں کالم کی جدت کو بہت ہی نگاہِ قدر سے دیکھیں گے۔ ہم نے آیندہ کے لیے پسند کیا ہے کہ خاص کالم کی ترمیم سیاہ کالم سے کردیں اور وہ سیاہ کالم زرّیں کالم کے دوش بہ دوش رہے کہ . . . . قدمے فاصلہ دارد کا مضمون صادق آئے۔

۲۔ ذیل کی خبر ہرگز قابلِ اعتبار نہیں

اخبار "شحنۂ ہند" میں ایک "سنسنی خیز" خبر شائع ہوئی۔ 'ریاض الاخبار' تعلقات کی بنا پر اس خبر کو اپنے اخبار میں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن خبر اتنی دل چسپ تھی کہ بے شائع کیے

بھی نہ بنتا تھا آخر اس دل چسپ اور معنی خیز مندرجہ بالا سرخی کے ذیل میں وہ خبر شائع کر ہی دی۔

"نواب بہاول پور، راول پنڈی کے افغانی دربار میں حسب دستور گز بھر کا اونچا عمامہ اور مرصّع سرپیچ باندھ کر تشریف لائے۔ لاکھوں روپے کے سونے کے زیور اور جواہر لدے ہوئے انگریز افسر نواب صاحب کو جب امیر کے ڈیرے میں لے گیا تو نواب کا چہرہ زرد پڑ گیا امیر نے کہا السلام علیکم ——— جواب ندارد

امیر نے پوچھا: حالتِ انتظامِ مملکتِ شما چیست ——— جواب میں خاموش۔

امیر نے فرمایا "نواب چہ گونہ و چہ حال داری و ترا چہ شد ——— وہی سکوت

الغرض امیر جھلا گئے اور بہ آوازِ بلند کہا:۔

ایں بے چارہ را راہ گزارید کہ با طفلاں یا زناں بازی و ملاعبت نماید یا بگوے و چوگاں مشغول شود

نواب صاحب بہ زبانِ حال شکریہ ادا کرتے ہوئے خیمے سے نکل آئے ؎

اگر نقوشِ مصور ہمہ ازیں جنس اند   محواہ دیدہ بینا شنگ تنِ اعمیٰ

۳ - تازہ ایجاد

اسپین میں اور اس کی وجہ سے کیوبا میں بلکہ یورپ کے کُل کیتھولک گرجا گھروں میں عبادت کے ساتھ بیہودگیوں کے بھی مرقّع ملتے ہیں۔ اسپین کی عورتوں میں ایک خاص کمال یہ ہے کہ وہ اپنی پنکھیوں کے ذریعے سے عام جلسوں میں اپنے دوستوں سے باتیں کر لیتی ہیں ——— ایک صاحب حال میں کیوبا گئے تھے وہ بیان کرتے ہیں ——— میں گرجا گیا میرے ہم راہ میرے ایک دوست بھی تھے انھوں نے مجھ کو کچھ حال پنکھیا کے ذریعے سے اظہارِ مدّعا کی ترکیب کا سمجھایا۔

وہ کہتے ہیں ہم بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک نوجوان خوش پوشاک خوب صورت لیڈی گرجا میں آئی۔ پہلے تو اس نے کچھ عبادت کی اس کے بعد چاروں طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کرتی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی پنکھیا کو پورا کھولا میرے دوست نے یہ بتایا اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس نے اپنے مطلوب کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے پنکھیا کو آدھا بند کر دیا اس کے یہ معنے ہوئے کہ آؤ مجھ سے ملو۔ پھر اس نے بند پنکھیا کے بالائی نصف حصّے پر چار

انگلیاں رکھیں مطلب یہ کہ ساڑھے چار بجے۔ پھر یکایک اس نے پنکھیا گرادی اس کے معنی مجھ کو یہ بتائے گئے کہ میں اس وقت تنہا ہوں گی۔

ریاض الاخبار۔ پھولوں کے رنگ سے معنی تعبیر کرنا مدت سے ہے، افسانوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔

حرم سرا میں بھی۔

جہاں تک پھولوں کے رنگ سے معنی تعبیر کرنے کا تعلق ہے یہ ایجاد عربوں کی جدت طرازیوں کی یادگار معلوم ہوتی ہے اور جہاں سے بیہودگیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اسپینیوں کی بدمذاقی ہے۔

۴۔ ایک اُپج

ایک شائق شطرنج نے لارڈ کرزن کو صلاح دی ہے کہ دربارِ دہلی کے دنوں میں علاوہ بہت سے دوسرے فوجی کھیل کرتبوں کے شطرنج بازی کا اکھاڑا بھی جمایا جائے جس میں زمانۂ حال کے بڑے بڑے مشہور شاطر شریک ہوں۔ لیکن وہ شطرنج زندہ شطرنج ہو۔ چونسٹھ ٹھیرے سنگ مرمر کے سیاہ اور سفید رنگ کے بنائے جائیں جو خانہ ہائے شطرنج کا کام دیں ان میں سے ہر ایک مربع بیس بیس فٹ ہو۔ نصف مربع سفید اور نصف سیاہ۔ یہ فراخ بساط ۲۵۶۰۰ مربع فٹ رقبہ گھیرے گی ان خانوں میں بجائے بے جان مہرہ ہائے شطرنج کے زندہ ہاتھی اونٹ اور گھوڑے (رخ، پیل، اسپ) کھڑے کیے جائیں اور شاہ، وزیر اور پیادے کی جگہ آدمی ہوں۔ نہایت خوب صورت کرسیاں جن کے نیچے پہیے لگے ہوں تختِ رواں سمجھے جائیں جن پر ہر دو شاہانِ شطرنج تاج پہن کر بیٹھیں اور دو دو سوار مورچھل بردار ان کی اردلی میں ہوں اسی طرح دو چھوٹی کرسیاں وزیروں کے لیے ہوں اور زمین کے نیچے کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ چند آدمی چھپ سکیں جو "چال" چلتے وقت ان کرسیوں کو ایک خانے سے دوسرے خانے میں حرکت دے کر لے جائیں۔ ایک طرف سامان روپہلا اور مدِمقابل کا سنہرا ہو۔ ہر اونٹ ہاتھی اور گھوڑے پر ایک ایک سوار ہو۔ جب چال چلنے کی ضرورت ہو تو وہ اپنے جانور کو ہانک کر دوسرے خانے میں لے جائے۔ ہر چال ایک منٹ میں پوری ہوجائے۔ جب کوئی حریف کے ٹھیرے

کو مارے تو اس وقت ایک خالی کارتوس کا فیر ہو۔ دونوں طرف توپ خانہ تیار رہے تاکہ جب بادشاہ کو کشت دی جائے تو توپ کا فیر ہو اور کھیل ختم ہونے پر فتح یاب پارٹی کے لیے ۱۰۱ توپ کی سلامی چھوڑی جائے۔

نوٹ۔ فتح پور سیکری میں اس کا نقشہ پہلے ہی سے موجود ہے جہاں چوسر کھیلنے میں گوٹ کا کام خواصوں سے لیا جاتا تھا۔

۵ ۔ خیالی محفل

[مرزا فرحت اللہ بیگ کا خیالی مشاعرہ مشہور ہے جس میں انھوں نے واقعی شعرا کی تصویریں کھینچ دی ہیں
—— آج اس کی پیش رَو ایک "خیالی محفل" میں بھی شرکت کیجیے۔
اُردو کے ابتدائی لکھنے والوں میں "اشہری" ایک نامور انشاپرداز تھے انھی کا یہ مضمون ہے۔]

صاحبو! دنیا میں بےشغلی سے بدتر کوئی چیز نہیں۔ مرزا غالب نے مشغلے ہی کے لیے دخترِ رز سے لگاؤ پیدا کیا آفرینش کی تمام صناعیاں مشاغلِ بوقلموں کا پتا دے رہی ہیں۔ پھر بےکار بیٹھے کیا کرتے ہو چلو دنیا کے حسینوں ہی کو دیکھ آئیں۔ آپ کہیں گے وہ کون سا مقامِ تعجب خیز ہے جہاں تفریحِ قلوبِ اہلِ افلاس کے لیے سامان جمع ہوں ہماری یہ تجویز سُن کر سب سے پہلے ہمارے مخدوم مولانا محمد عباس نے کہا ؎

بسم اللہ اٹھو بھی دیر کیا ہے ‌ ‌ ‌ وہ قافلہ ہے یہ نقشِ پا ہے

حضرت امیر مینائی سے ہمارا ادب مانع التماس ہوا مگر سپیدۂ انوارِ صبحِ تجلی نے اس سہانے وقت میں وہ مزہ دیا کہ تمام خرد آشنا نگاہوں کو یہی سوجھی کہ کچھ ہو جہاں منشی امیراللہ تسلیم "شامِ غریباں" لیے ہمارے ساتھ ہوں وہاں صاحب صبحِ تجلی کا بھی ساتھ ہم سے نہ چھوٹے۔ حضرتِ ریاض بولے اگر ایسا ہے تو اپنی صبح و شام بڑے لطف سے کٹے گی۔ ہمارے دوست جناب شہیر بھی چھڑی رومال لے کر آ بیٹھے۔ جناب ابوالحامد مولوی یوسف علی صاحب نے بھی جناب محسن کاکوروی کا ساتھ دیا۔ نیچرل پارٹی میں خواجہ حالی ہمارا ساتھ دینے

کو نکلے حضرت داغ نے بڑی آن بان سے تیاری کی جناب جلال لکھنوی نے کہا ہم بھی ساتھ ہیں۔منشی عبدالحلیم صاحب فخر، منشی نثار اور شیدا بھی تیار ہوئے۔ اسی طرح دس بیس شوقین اور اُٹھے۔ ہاں خوب یاد آیا منشی فدا علی صاحب فارغ پہلے ہی سے نوٹ بک لیے ایک طرف کھڑے تھے کہ جیسے ہی یہ رہروانِ مراحلِ شوق آگے بڑھیں وہ ایک ایک قدم کی تاریخ لکھتے جائیں۔ اتنے میں گھڑیال کی آواز آئی اور خیال کی ڈاک گاڑی جس کی ڈرائیوری مرزا فکر کے ہاتھ میں تھی، چھوٹی۔

آنکھ جھپکاتے ہی خراسان کے اسٹیشن پر آقا بیگہ کی قبر پہ گئے جو محمد خاں ترکمان کی معشوقہ تھی۔ ہائے یہی آقا بیگہ ہے جس نے کہا ہے ؎

ز ہشیارانِ عالم ہر کرا دیدم غمے دارد   دلا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمے دارد

پھر سمرقند میں ایک قبر ملی جس پر لکھا تھا ع ای بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ معلوم ہوا آرزوے سمرقندیہ کی قبر ہے جس کا شعر ہے ؎

شدیم خاکِ رہت گر بہ دردِ ما نہ رسی   چناں رویم کہ دیگر بہ گردِ ما نہ رسی

پھر ایک جگہ دل آرام بانو کو محوِ خوابِ ناز پایا جن کا یہ مطلع آپ نے سُنا ہوگا ؎

محو از دل خود ساز ہمہ نقشِ عدم را   منزلِ گہ اغیار مکن فرشِ حرم را

پھر سبزوار میں آقا دوست دخترِ قیام سبزواری کی قبر پر کچھ دیر ٹھیرے۔ منشی ناصر علی صاحب صلائے عام سے نثار پوچھ رہے تھے کہ تحقیقِ عشق میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ قبر سے آواز آئی ؎

ای محبّاں بو العجب دردیست دردِ عاشقی
ہر کہ دامن گیرد ایں دردش ز درماں بگزرد

یہاں سے ہرات پہنچے دیکھا کسی کے عشق میں بے دلی کے ہونٹ ہل رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہی ہے ؎

روم بہ باغ و زنرگس دو دیدہ وام کنم   کہ تا نظارۂ آں سروِ خوش خرام کنم

آگے بڑھ کر مضافِ قصبۂ خیاباں میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک قبر کے آس پاس لالۂ خودرو کے تختے کھلے ہوئے ہیں اور بے دلی کی روح اپنی غزل کے اس مطلع کو پنچم کے سُروں میں الاپ رہی ہے ؎

چشمِ پُرخون و خیالِ خام آں دلبر در او ۔۔۔ مجمرِ پر آتش است و پارۂ عنبر در او

ہاں خوب یاد آیا بلخ میں اُس شاعرہ کی قبر پر بھی دو منٹ ٹھہرنا ہوا جو ملا آصفی شیرازی کو ہر سال کچھ غلہ دیا کرتی تھی ایک سال نہیں بھیجا تو ملا نے یہ قطعہ لکھا ؎

ایا عروسِ خطا بخش و جرم پوش بگو ۔۔۔ کہ کی وظیفۂ مارا قرار خواہی داد

بہ وقتِ غلہ مرا گفتۂ کہ بار دہم ۔۔۔ سرم فدائے درت چند بار خواہی داد

بیگم خوش ہوئی اور المضاعف مقرر کیا۔ بلیغۂ شیرازیہ کی قبر کو بھی دیکھا۔ بانو بیگم دہلویہ کے مزار پر بھی کچھ دیر ٹھہرے۔ ہائے اس شعر پر کیسا کیسا دل ہلتا تھا ؎

گر میسر شود آں روئے چوں خورشید مرا ۔۔۔ پادشاہی چہ کہ دعوئ خدائی نہ کنم

پھر بنتِ اصفہانیہ کی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہوئے بزرگ کشمیریہ کی ٹوٹی قبر کو دیکھا۔ پہلے یہ رنڈی تھی اپنی ہی تصنیف کی چیزیں گاتی تھی۔ ظالم کا شعر ہے ؎

مو بمو در نالہ ام گوئی کہ اُستادِ ازل ۔۔۔ رشتۂ جانم بجائے تار در طنبور بست

۶ ۔ شیراز

[کیا مضائقہ ہے اگر اس "خیالی محفل" کے ساتھ آج کی نہیں آج سے پچاس برس پہلے کی اُس سرزمینِ حُسن و عشق کے باشندوں سے بھی کھڑے کھڑے مل لیجیے جو کبھی ایشیا کا "پارس" اور یورپ کی "پیرس" کہلاتی تھی۔]

قہوہ خانے شیراز میں بہت ہیں۔ ہر قہوہ خانے میں ایک شخص فصیح البیان خوش الحان جو تاریخِ سلف سے عمدہ واقفیت رکھتا ہے، مقرر ہوتا ہے جس کو "مرشد" اور قصہ گو کہتے ہیں۔ وہ قہوہ خانے میں ٹہلتا رہتا ہے اور سلاطین ماضیہ کے قصص اور امم سابقہ کے سِیَر بہ آوازِ بلند بیان کرتا جاتا ہے اور موقع موقع پر اشعار بھی پڑھتا ہے ان قہوہ خانوں میں باہم تمسخر اور ٹھٹھہ بازی بہت ہوتی ہے۔ قصہ گو کے خاموش ہوتے ہی تمام لوگ خوش طبعی شروع کر دیتے ہیں۔ دِل لگی عام ہے اور اس کو شوخی کہتے ہیں۔ جب کسی اجنبی سے آنکھ چار ہوتی ہے تو کہتے

ہیں ع مرزا رنجیدہ نہ شوی تا شوخی سے کنم ۔

۷ ۔ خوش گپّی

ایک دوست عرصے کے بعد ایک دوست سے ملے پوچھا کیسے رہے۔جواب دیا کچھ ایسے کچھ ویسے۔ دریافت کیا کیوں کر؟ جواب دیا شادی کی۔اس نے کہا بہت خوشی کی بات ہے۔جواب دیا نہیں عورت بڑی بدمزاج ہے اس نے کہا تو افسوس ہے۔کہا نہیں دو لاکھ رُپیہ جہیز لائی ہے۔کہا کہ برابر ہوئے۔بولا نہیں اس سے بھیڑیں لیں، سب مرگئیں۔دوست نے کہا نہایت رنج کا مقام ہے اس نے کہا نہیں کھالوں سے سب وصول ہوگیا۔کہا شکر ہے جواب دیا نہیں گھر میں آگ لگی سب مال جل گیا۔کہا مجھے آپ سے ہم دردی ہے جواب دیا نہیں مال گیا ہے بدمزاج بیوی بھی جل گئی۔

ب ۔ نوادرِ مشاہیر

۱ ۔ لیڈی بدرالدّین طیب جی

ایک پارسی خاتون اس محترمہ کی رحلت پر لکھتی ہیں۔ ان کی وفات سے سب کو رنج ہوا۔عورتوں کے تمام کاموں سے ان کو کمال دلچسپی تھی ان کے خیالات بہت اعلا اور صاف تھے اور وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی خواہ تھیں خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنی جاہل بہنوں کی فرسودہ بحثوں سے دق نہیں ہوتی تھیں۔

وہ پردے کی سختی کو جائز اور روا نہیں سمجھتی تھیں میں نے ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ جب آپ کا یہ عقیدہ ہے تو آپ یک قلم پردے کی رسم کیوں نہیں اُٹھا دیتیں۔انھوں نے کہا تنہا تو میں ایسا کرسکتی ہوں مگر اور عورتیں میرا ساتھ نہیں دیں گی اس لیے مجھے ابھی مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ جب میں نے سُنا کہ وہ لیڈیوں کے ساتھ فوٹو اُتروانے کو بیٹھی تھیں تو ان سے کسی نے کہا آپ کو معلوم ہے اس کی نقلیں چھاپی جائیں گی اس کا انھوں نے اُردو میں جواب دیا "کیا کرنا"

۲ - محمد حسین آزاد

اس ہفتے (جولائی سنہ ۸۷ ء) میں ہمارا گزر اس سڑک پر ہوا جس کے کنارے باغ میں کتب خانہ آزاد بن رہا ہے۔ پروفیسر آزاد کو سامنے دیکھا اہتمام تعمیر میں عرق ریزی کے ساتھ مصروف ہیں۔ ہم ان کے پاس گئے اور شکریہ ان کی توجہات کا ادا کیا جو رفاہِ قوم میں وہ کرتے رہتے ہیں۔ فرمانے لگے :-

"فقیر کا تکیہ ہوتا ہے اس میں ایک کنواں ہوتا ہے۔ پانی کا مٹکا بھرا ہوتا ہے۔ ٹھیکرے میں اُپلا سلگتا رہتا ہے کوئی مسافر آنکلتا ہے حقہ بھرکر پیتا ہے پانی سے ٹھنڈا ہوتا ہے فقیرِ آزاد کا تکیہ علم کا تکیہ ہے۔ کچھ کتابیں ہوں گی، کچھ اخبار ہوں گے، قلم دوات اور کاغذ رکھا ہوگا ۔ درختوں کا سایہ بھی ہے، چمن ہرے ہیں، نالیوں میں پانی جاری ہے راہِ علم کے مسافر آئیں کتاب سے دل بہلائیں اخباروں سے شگفتہ ہوں۔ فقیر آزاد دعا کے سوا اور کسی چیز کا طالب نہیں ۔"

۳ - سر سید احمد خاں

دیر سے کعبے کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں   دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

سید احمد خاں صاحب کا ذکر قصدِ حج کے ساتھ اخباروں میں ہوا لیکن نہ انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے عزم کی خبر کو شائع کیا اور نہ اس مشہور خبر کی تردید کی پھر ایک خط ان کا چھپا جس میں انھوں نے لفظِ شیخ کی جگہ "میر" لکھنے کی درخواست کی ہے خط درج ذیل ہے:-

"مخدومی اڈیٹر صاحب ۔ آپ نے جو اپنے اخبار میں میرے بیت اللہ جانے کی خبر کے اخیر میں شعر لکھا ہے نہایت موزوں ہے لیکن اگر شیخ جی کی جگہ میر جی چھاپ دیتے تو اور موزوں ہو جاتا۔

خاکسار ۔ سید احمد ۱۶ جون سنہ ۸۷ ء

نوٹ من جانب اڈیٹر "عالم تصویر"

"جب آپ بیت اللہ شریف تشریف لے جائیں گے اور وہاں کے عربوں سے آپ کو اور آپ سے عربوں کو خطاب کرنے کا موقع ملے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ لفظ "میر" اچھا تھا یا شیخ ۔

'ریاض الاخبار' کا حاشیہ

"سید صاحب کے ایک عقیدت مند کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ سید صاحب حج کو نہ جائیں گے۔ ان عقیدت مند کا نام محمد رمضان ہے جو سکریٹریٹ گورمنٹ پنجاب میں ہیں۔
ان کو اور سید صاحب کو یوں سمجھیے کہ ایک ہی خاک کے چند ذرّے ہیں جو سمٹ کر دو قالبوں میں کم و بیش جا بسے ہیں۔ عقیدت مند صاحب پہلے اڈیٹر "ریفارمر" سے بھڑے ہیں اور وہ تیرہ خیال جو دود دل کی طرح دماغ میں گھٹے ہوئے تھے کچھ ظاہر کیے ہیں۔
سید صاحب کے عزم حج کے متعلق آپ کے الفاظ یہ ہیں " وہ اس قابل نہیں جو مکّہ معظّمہ کے مصائب اُٹھا سکیں انھیں دس پانچ قدم چلنا مشکل ہو چہ جائے کہ بیت اللہ۔ اونٹ کی سواری اور بیت اللہ کے گرد ننگ دھڑنگ تہمد باندھ کر برہنہ سر طواف کرنا بہت دُشوار ہے۔"
اونٹ کی سواری گویا گدھے کی سواری سے گری ہوئی ہے۔ سچ ہے ماں کے پیٹ سے جو کوٹ پتلون پہنے نکلے ہوں اُن کو ننگ دھڑنگ ہونا یا تہمد باندھنا کیوں نہ دشوار ہو
صاحب "کشف الاخبار" نے براہِ راست سید صاحب سے دریافت کیا تھا — جواب ملا :-
اس فریضۂ اعلا کے ادا کرنے کا مثل اور مسلمانوں کے میرا بھی مصمم ارادہ ہے لیکن بعد عید الفطر غلط — اخباروں کی نیک فال کا شکرگزار ہوں ؎

مبارک بود فال مہ رُخ زدن
نہ برزخ زدن بلکہ شہ رُخ زدن

۴ - امیر مینائی

[نئی روشنی پھیلنے سے پہلے تین طاقتیں ہندُستان پر حکمراں تھیں۔ بادشاہ، صوفی اور شاعر۔ آخر میں یہ تینوں طاقتیں ایک ہی شخص میں جمع ہوئیں اور بہادر شاہِ ظفر کی شکل میں اپنا کامل جلوہ دکھا کر زوال پزیر ہوگئیں۔ اس کے بعد تصوّف چھُپ گیا۔ بادشاہت مٹ گئی صرف شاعری باقی رہی۔
امیر مینائی اس شاعری کا جو آگے چل کر اب اور کوئی صورت اختیار کرنے والی تھی، آخری نمونہ ہی نہیں ہندُستان کے اس بدلے ہوئے مذاق کا جو آیندہ لیڈروں کے لیے جگہ خالی کر رہا تھا، پہلا نمونہ بھی تھے۔
امیر اللغات کے لیے ہندُستان کے دورے کے سلسلے میں آپ کا ہر جگہ جیسا شاندار استقبال ہوتا ہے وہ شاعری کے حدوُد میں تو سرمایۂ ناز تھا ہی آج کل کے لیڈروں تک کے لیے بھی قابلِ رشک

ہو۔ دیکھیے، حیدرآباد کا ایک اخبار آپ کا خیر مقدم کر رہا ہو]

آج کل ہمارا شہر شیراز و اصفہان، لکھنؤ اور دہلی کو مات کر رہا ہو یہ ہماری خوش نصیبی ہو کہ یہاں نازِ مصحفی آیا ہو وہ کون؟ اُردو زبان کے قالبِ مردہ میں ازسرِ نو جان ڈالنے والے قمہٗ باذنی کہ کر اُردو کو پنجۂ ازل سے بچانے والے فخرِ شعرا حضرت امیر احمد امیرؔ مینائی لکھنوی دام ظلہٗ و برکاتہٗ — اسٹیشن پر جس وقت ریل آئی جو صاحب استقبال اور زیارت چہرۂ نورانی و مقدس کے لیے گیے تھے ان کے کلیجے ہاتھ بھر کے ہوگئے ادھر حضرت امیر مینائی نے اپنے فرسٹ کلاس سے پلیٹ فارم پر قدم رکھا اور اُدھر لاتعداد و غیر محدود سفید پوش دوڑے اور اُستادِ نامی کو گھیر لیا۔ نواب فصیح الملک بہادر داغؔ جن کے منشی صاحب قبلہ مہمان ہیں، مع اور معززین کے اسٹیشن پر آئے تھے ہجوم ایسا تھا جیسا لکھنؤ میں آٹھوں اور رام پور میں بے نظیر کے میلے میں یا دہلی میں پھول والوں کی سیر اور کلکتہ میں نوروز کے موقع پر ہوتا ہو --- والاخطاب مہاراجا پیش کار بہادر نے سرشار کو کئی جوڑی گاڑیاں لے کر اسٹیشن بھیجا تھا۔ منشی صاحب اور ان کے عزیز اور ہم راہی سوار ہوکر پہلے کلب گھر گئے جہاں ایک رئیس اعظم نے سامان "پھول پان" کا کیا تھا۔ وہاں بھی کئی سو شریف زادے اور شعرا حصولِ سعادت کے لیے جمع تھے۔ آپ کی "آمد کی رباعیاں" اسٹیشن پر بھی سخن دانانِ گراں مایہ نے پڑھیں اور کلب میں بھی — نواب خلد آشیاں کے بعد رئیسِ حال رام پور کی قدردانی کی تعریف عام طور پر یہاں پھیلی ہوئی ہو کہ جہاں ایسا باکمال فخرِ ہندستان اُستادِ زمن قیام گزین ہو۔

(۲)

منشی صاحب مرحوم کے حیدرآباد میں اس استقبال کے ذکر میں ہم حیدرآباد ہی میں حضرت ریاضؔ کے اس خیر مقدم کو بھی نہیں بھول سکتے جس کی کارروائی اپنے اخبار میں نقل کرتے ہوئے اس پر خود حضرت مرحوم نے مندرجہ ذیل نوٹ لکھا تھا:-

"ہمارے سفرِ حیدرآباد کے متعلق جریدۂ "روزگار" مدراس نے جو نوٹ شائع کیا ہو ہم نہیں سمجھتے اس کا شکریہ ادا کریں یا اس کے گلہ مند ہوں۔ جریدۂ "روزگار" مدراس کا ایک بہت ہی معزز پرچہ ہو اور حیدرآباد کا تو گویا "لوکل کاغذ" سمجھا جاتا ہو بلکہ لوکل پرچوں سے بھی زیادہ خدماتِ دکن میں نام آور ہو۔

جو تعلق و اتحاد باہمی جریدۂ 'روزگار' اور 'ریاض الاخبار' میں روزِ اجرا سے ہو وہی تعلق دونوں کے ایڈیٹروں میں ہو اس لیے بہ ظاہر تو موقع شکریہ ہی ادا کرنے کا ہو لیکن ہم نے شکریہ ادا کیا اور گویا ہم کو اپنے لیے خود داد تماقت دینا پڑی۔

جریدے کو یا تو واقعی ہماری نسبت غلط فہمی ہوئی یا ہم کو بے طرح اس نے بنایا ہو۔ اگر ہمارے تعلقات اس سے بخصیص نہ ہوتے تو پچھلا خیال ہمارے دل سے ہٹ ہی نہیں سکتا تھا مجبور ہم کو یہ کہنا پڑتا کہ اس کو ہماری نسبت غلط فہمی ہوئی اور اس نے ہمارے لیے اُن الفاظ سے کام لیا جن کے سزاوار ہم ہرگز نہیں ہوسکتے۔

ایک پاکیزہ نہاد بزرگ خضر صورت کے لیے تقاضاے مہماں نوازی یہی تھا کہ وہ جوشِ دل سے ہمارے لیے عمدہ الفاظ استعمال کرتا مگر ضرور تھا کہ مبلغ سے اپنے الفاظ کو بچاتا کہ ہم کو جاننے والے اس کے الفاظ کو ہمارے لیے کھلا مذاق نہ سمجھتے۔

ممکن ہو صحبتِ شعر و سخن میں ہماری زبان سے نکلے ہوئے اشعار نے کچھ زیادہ شرفِ قبول پایا ہو اور فخرِ زمانہ جناب گرامی کی واہ نے ہم کو زیادہ قابلِ اعتبار بنادیا ہو لیکن واقعتاً ہم اس ستائش کے قابل نہیں ہیں ـــ گو موقع کے لحاظ سے دو چار شعر اپنے اور دوسروں کے ہم یاد رکھتے ہیں اور ممکن ہو دوسروں کے بھی اپنے ہی نام سے پڑھ دیں مگر کس لیے ؎

اتنے لیے کہ آؤ بھگت بُتکدے میں ہو
پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بتا دیا

الفاظِ ستائش کے لیے بالیقین جریدے پر ہمارے فریب کا اثر ہوا اس لیے وہ ہر طرح شکریے کا مستحق ہو اور ہم ملامت کے ـــــ انتخاب میں ہم جریدے کا نوٹ اور وہ غزل درج کرتے ہیں اس لیے کہ جریدہ سمجھے اس کے نوٹ کی ہم نے قدر کی اور غایت یہ ہو کہ بے وقوف بننے پر بھی اپنی تعریف بُری نہیں معلوم ہوتی۔ ناظرین ہمارے اس نوٹ کو ماہِ صیام کے زیرِ اثر سمجھیں ؎

انساں ہوں فرشتہ ہوں سمجھ میں نہیں آتا
میں اور سے کچھ اور ہوں ماہِ رمضاں میں

(۳)

حضرتِ ریاض کا یہ نوٹ ہم نے ان کا اندازِ انشا پردازی (جو سنجیدگی اور ظرافت کا عجب شوخ

اتحاد تھا) دکھلانے کے لیے ناظرینِ اُردو کے سامنے پیش کردیا۔ اب "ورودِ بہجت آمود" کے عنوان سے وہ اصل ملاحظہ ہو جس پر یہ نوٹ لکھا گیا تھا۔ اس تحریر کا انداز بھی خاص ہو۔ شمالی اور جنوبی اُردو کا فرق لیے ہوئے :۔

"ہمارے قدیم معزّز دوست جناب مولوی ریاض احمد صاحب ریاض اڈیٹر 'ریاض الاخبار' گورکھ پور جن کو علومِ ادبیہ میں سخن آفریں نے یدطولیٰ عطا فرمایا ہو، حُسنِ اتّفاق سے مع جناب بابو موہن سنگھ صاحب سکریٹری میونسپلٹی گورکھ پور و رئیسِ بنارس واردِ حیدرآباد دکن ہوکر عالی جناب مہاراجا پیش کار بہادر دام اقبالہٗ کے دولت خانے میں فروکش و مہمان ہوئے اور اپنے احباپ دیرینہ کو ملاقات سے مسرور کیا مگر دورانِ جفاپیشہ نے ایامِ قیام کی گھڑیوں کو کچھ اس طرح کوتاہ کردیا کہ ایک دو روز کے قیام کے بعد رُخصت کا تذکرہ آگیا اور قدیم احباب کو رنجور کردیا — منشی ریاض احمد صاحب کی لیاقتِ علمیہ اور توغل ادبیہ کا حال ان کی تصنیفات سے ظاہر ہو جس کو ممالکِ ہندُستان میں ہرایک شخص بخوبی جانتا ہو محتاجِ بیان نہیں۔ حقیقت میں خالقِ عالم نے علومِ شعر و سخن میں ایسی ہی لیاقت بخشی ہو جو زمانۂ موجود کے کل اہلِ سخن ان کا لوہا مانے ہوئے ہیں اور ہندُستان کے گُل گُل دستوں میں ان کے اشعار نہایت آب و تاب سے طبع ہوتے ہیں اس کے علاوہ 'ریاض الاخبار' اور 'فتنہ' ان کی فطانت کی داد دیتا ہو۔ علاوہ اس کے خوش مزاجی و خوش خُلقی و آزادانہ روش، مہذّب پیرایہ ہرایک اپنے موقع پر ریاضِ الفت و محبّت و اخلاق کی ہردم تازہ بہار دکھاتا ہو۔ زمانے کا باغبان بھی گلشنِ روزگار میں ایسا گُل بہت ہی کم پاتا ہو۔ ہم تازہ غزل جسے ان کے باغِ سخن کا ایک پھول کہنا چاہیے، درجِ اخبار کرتے ہیں تاظرفِ ذہنِ ناظرین اس یوسفِ گم گشتہ کی نشانی کو محفوظ رکھے اور محظوظ ہوتا رہے۔"

۵ - پنڈت رتن ناتھ

افسانہ از افسانہ می خیزد۔ منشی صاحب مرحوم کے ذکر میں حضرتِ ریاض مغفور کا تذکرہ چھڑ گیا —— منشی صاحب حیدرآباد پہنچتے ہی مرض الموت میں مبتلا ہوگئے کچھ روز علیل رہ کر حیدرآباد ہی میں مرحوم و مدفون ہوئے۔

آپ کی وفات پر ہندُستان بھر ہل گیا۔ شعرا کے مرثیوں کے علاوہ اُردو اخبارات اور بعض انگریزی اخبارات سول اینڈ ملیٹری گزٹ وغیرہ نے بھی اچھے خاصے ماتمی نوٹ شائع کیے اسی سلسلے میں پنڈت

رتن ناتھ سرشار لکھنوی کا یہ نوحہ بھی یادگار ہے :-

ہائے امیر مینائی وائے امیر مینائی

ارے یہ کیا غضب ہوگیا ۔ حضرت امیر مینائی کے ذکر میں یہ ہائے اور وائے کیسا ۔ افسوس کہ خرمنِ شاعری پر بجلی گر پڑی سرزمینِ سخن پر آسمان ٹوٹ پڑا ۔ شاعری تو باقی رہے گی مگر اُستادی مٹ گئی ہائے ستم وائے ستم امیر مینائی جن کو ہم مدظلہ العالی کہتے تھے ان کو اب آں جہانی (رحمۃ اللہ علیہ) لکھتے ہیں ۱۹ر جمادی الثانی کو نور کے تڑکے یہ خبر شہر بھر میں مشہور ہوگئی کہ جگت اُستاد مفتی امیر احمد مینائی کا چراغ ہستی گل ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ ہزاروں حسرتوں کا خون ہوگیا لاکھوں تمنائیں خاک میں مل گئیں کہاں رامپور کہاں حیدرآباد مگر مٹی تو یہاں کی بدی تھی ۔

مدت سے حیدرآباد آنے کا اشتیاق جناب منشی صاحب مبرور کو تھا ۔ حضرت قدرِ قدرت فرماں روائے ریاست خلد اللہ ملکہٗ کی قدردانی اور جوہر شناسی اور شوقِ شعر و شاعری کا حال سُن کر اشتیاق کو اور ترقی ہوئی اور یہاں تشریف لاتے آتے ہی علیل ہوگئے ۔ سلسلِ بول کا عارضہ تو مدت سے تھا ہی یہاں آکے پیچش ہوگئی اور اس مُلک کی پیچش سے تو بہ ہی بھلی اللہ بچائے ۔ پیچش کے بعد بواسیر کے مرض نے گھیر لیا نقاہت نے زور پکڑا سن شریف بھی پچھتر کے قریب تھا جاں بر نہ ہو سکے ۔ خدا غریقِ رحمت کرے ـــــ ہم باقیاتِ صالحات رونے کے لیے رہ گئے ہیں مشیتِ ایزدی ، جبر کا نام صبر ہے ۔ مگر ایک تسلی ہم پس ماندوں کو ضرور ہے وہ یہ کہ جناب استادی نور اللہ مرقدہٗ کی یہ دلی حسرت بر آئی کہ حیدرآباد دیکھیں چناں چہ خاکِ پاک حیدرآباد کے سپرد اپنی خاک کردی ـــــ اعلا حضرت قدرِ قدرت نے کئی بار منشی صاحب کی علالت کا حال بڑی ہم دردیٔ خسروانہ کے ساتھ وابستانِ دامنِ دولت سے دریافت فرمایا ۔

اس وقت چار سو غزلیں اصلاح کے لیے جزدان میں موجود ہیں ۔ رہے نام اللہ کا ۔

اس علالت کی حالت میں انتقالِ پُرملال کے چار پانچ روز قبل خاک سار کی ایک تاریخ دیکھ کر اصلاح دی تھی ۔ میرا شعر تھا ؎

ہے عمرِ دو روزہ کا کیا اعتبار   نہیں اس میں سرشار کچھ قیل و قال

پلنگ پر لیٹتے ہی لیٹتے پہلا مصرع یوں بدلا ع

بشر بادِ صرصر کی اک موج ہے

جس وقت درگاہ میں دفنائے گئے مجھے اُستاد مرحوم کا یہ شعر یاد آیا ؎

حجلۂ گور میں سامانِ عروسی ہوگا لاش آرام سے سوئے گی سہاگن بن کر

ج - مذاکرۂ علمیہ

حافظ نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن

[علم و حکمت یا بہ الفاظِ دیگر سائنس اور قرآن میں یہ فرق ہے کہ سائنس کا تعلق علمِ انسانی سے ہے جو ناقص ہونے کی وجہ سے آگے اور پیچھے گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے اور قرآن علمِ الٰہی ہے جو ازل سے ابد تک یکساں ہے۔

سائنس اور قرآن میں تجزیے اور کلیتے کا بھی فرق ہے۔ سائنس جزوی حیثیت سے ہر مسئلے کی موشگافی کرتی ہے اور قرآن کلی طور پر حقیقی تحقیق ہے۔

اگر بادی النظر میں سائنس اور قرآن کا کوئی مشترک اصول ٹکراتا نظر آئے تو جیسا کہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے خدا کے علم کے مقابلے میں ہمیں اپنے ہی علم کو ناقص سمجھنا پڑے گا اور جیسا کہ ڈاکٹر صدر الحق صاحب کی بھی اس تشریح سے ثابت ہے کہ وہ مسئلہ جو تحقیقِ حال کے مطابق مولوی نذیر احمد صاحب کے پیشِ نظر نہیں تھا تاہم قران کے بلیغ الفاظ میں اس کی لچک موجود ہے کہ ڈاکٹر صدر الحق صاحب اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت بھی نئی ریسرچ کو اس کے خلاف نہ پائیں گے۔

ڈاکٹر صدر الحق صاحب اور حافظ نذیر احمد صاحب کی مندرجۂ ذیل خط وکتابت مذہبی حیثیت کے علاوہ خاص علمی حیثیت سے بھی دعوتِ عقل و ہوش ہے۔]

ڈاکٹر صاحب کا خط حافظ صاحب کے نام

مکرمی۔ تسلیم۔ گو مجھے آپ کی خدمت میں نیاز نہیں حاصل ہے مگر آپ کی قیمتی تصانیف سے بیش تر سابقے رہتے ہیں خاص کر جب سے آپ کا ترجمۂ قرآن شریف دیکھا ہے کچھ اور آپ کی ذات سے ارادت مندی ترقی کر گئی ہے۔

میں دو ایک خاص مقامات کا تذکرہ کرکے ترجمے میں، آپ سے کسی قدر تشریح چاہتا ہوں امید ہو کہ آپ میری پوری تسکین کرسکیں گے۔ قبل اس کے کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں یہ کہ دینا ضروری ہو کہ میں ایک معمولی استعداد کا آدمی ہوں مگر علمِ طب کی انگریزی تشریح سے کسی قدر واقف۔ میرے سوالات کا زیادہ تر تعلق اسی اصول سے ہوگا ہاں مجھے یہ بھی کہنا ہو کہ میں جو کچھ لکھوں گا اسے اس حیثیت سے فرض کیجیے کہ ایک شخص مخالف آپ کی مذہبی کتاب کے ترجمے کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتا ہو اور آپ کو اس کی تسکین کرنی ہو۔

پارۂ تیئس سورۂ زمر کے پہلے رکوع کی چھٹی آیت میں جہاں خداوندِ پاک فرماتا ہو . . . . . جس کا ترجمہ آپ نے حسب ذیل کیا ہو —— "وہی تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں (بہ تدریج) ایک طرح کے بعد دوسری طرح تین اندھیروں میں بناتا ہو۔ حاشیے پر فائدہ (۳) میں آپ نے جو "ایک طرح کے بعد دوسری طرح" اور "تین اندھیروں" کی صراحت کی ہو وہ مسلمہ تشریح زمانۂ حال کے خلاف ہو۔ امرِ اول الذکر کی تشریح مندرجۂ حاشیہ میں جو آپ نے لکھا ہو —— یہ مراد ہو کہ پہلے نُطفہ ہوتا ہو پھر لوتھڑا وغیرہ الخ اس سے معلوم ہوتا ہو کہ تبدیلِ حالت جس قدر ہوئی وہ سب ایک ہی مقامِ رحم میں۔ صرف نوعیت بدلتی رہی حالاں کہ ایسا نہیں ہو بلکہ خون سے مادّہ آکر انثیینِ رحم میں ایک مدت کے بعد دانہ بنتا ہو (یعنی پانی کی صورت سے منجمد ہوکر دانے کی صورت پکڑتا ہو) پھر وہاں سے منتقل ہوکر رحم میں آتا ہو جس میں اسے قریب ۲، ۳ انچ کے مسافت طے کرنا پڑتی ہو۔ رحم میں آنے کے بعد منی کی مدد سے نشوونما پاکر بچّہ بن جاتا ہو پس تشریحِ حال کے تبدیلِ حالت کے ساتھ مقامات بھی بدلتے رہے اور ہر مقام میں جداگانہ صورتیں پیدا ہوتی رہیں نہ کہ ایک ہی جگہ —— امرِ آخرالذکر کے متعلق بھی آپ کی تصریح مندرجۂ حاشیہ بہ اعتبارِ مسلمہ تشریح زمانۂ حال خلاف ہوئی جاتی ہو۔ تشریح حال کے مطابق تین ظلمات اس طرح ہوتے ہیں کہ خون میں تولید کا مادّہ موجود ہو اور وہی مادّہ خون سے آکر عورت کے انثیین میں ایک دانہ بنتا ہو جب وہ دانہ پختہ ہوتا ہو تب وہ رحم میں آتا ہو اور رحم میں آکر وہی دانہ منی کی مدد سے نشوونما پا۔ ۔ اور وہی مضغہ اورعلق وغیرہ ہوتا ہو یہاں تک کہ بعد تکمیلِ مدت لڑکا

تیار ہوجاتا ہے پس اس تفصیل سے اوّل ظلماتِ خون دُوسرے انثئین اور تیسرے خود رحم ہے۔

دُوسرا مقام سورۂ طلاق کی چھٹویں آیت ہے جہاں خداوندِ پاک فرماتا ہے خلق من ماءٍ دافق الخ یہاں ترجمے میں آپ نے ماءٍ دافق سے مراد منی لی ہے حالاں کہ دافق منی نہیں ہے بلکہ دافق خونِ شرائین ہے اور اس میں دافق کا مادّہ ہے . . . . میری انتہائی شکرگزاری کا باعث ہوگا اگر آپ تفصیلی جواب مندرجہ پتے سے مجھے دیں گے۔　　آپ کا نادیدہ نیازمند

ڈاکٹر صدرالحق از پٹنہ۔ ۱۰ ۸/۹

حافظ صاحب کا جواب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ ازبس کہ میرا ہاتھ بہ تقاضاے عمر مرتعش ہے اور میں اپنے ہاتھ سے سطر دو سطر بھی نہیں لکھ سکتا آپ کے پاکیزہ خط کو میں نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ موادِ خط اور مضمونِ خط ایک سے ایک عمدہ۔ آپ کو آیتِ یخلقکم فی بطون امھٰتکم الخ میں خدشہ واقع ہُوا ہے۔ آپ نے لفظِ بطون پر توجہ نہیں کی۔ لفظِ بطن جس کا ٹھیک ترجمہ پیٹ ہے ظرفِ وسیع ہے اور اس میں احشار و امعار اور رحم و ما یتعلق بہ من الانثئین وغیرہما سب داخل ہیں۔ نطفے میں جو تبدّلات ہوتے ہیں انثئینِ رحم میں ہوتے ہیں یا خود رحم میں بہرحال اندرونِ بطن ہوتے ہیں ــــــ فارتفع الاختلاف خون میں تولید کا مادّہ موجود ہوگا مگر اس کو ظلمت سے تعبیر کرنا تاویلِ دُور از کار ہے۔ منی میں دفق کا ہونا تو آپ کو بھی تسلیم ہے گو بعض قطرات بے دفق بھی خارج ہوتے ہوں مگر للاکثر حکم الکل منی کو دفق کہنا محلِ اعتراض ہو نہیں سکتا۔ جناب ڈاکٹر صاحب ایک ضروری امر یہ بات ہے کہ قرآن جہلاے عرب پر نازل ہُوا اور اس کے نزول کی غرض صرف یہ تھی کہ خدا کی قدرتیں یاد دلاکر ان کو خدا پرست بنایا جاے اور کلّموا النّاس علیٰ قدرِ عقولہم کے قاعدے سے جس طرح وہ لوگ سمجھ سکتے تھے ان کو سمجھایا گیا وہ ان باریکیوں سے واقف نہ تھے کہ رحم میں بھی انثئین ہیں وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ پیٹ میں بچّہ ہوتا ہے ــــــ قرآن کی بڑی عمدگی یہ ہے کہ جیسا وہ ایک جاہل کے لیے مفید ہے ویسا ہی ایک عالم محقق کے لیے ــــــ الفاظِ قرآنی میں تین ظلمتوں کی تصریح نہیں کہ ان سے کیا مراد ہے اور نہ اس کی تصریح ہے کہ نطفے

میں جو تبدلات واقع ہوتے ہیں وہ کس کس جگہ ہوتے ہیں ہم لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق محاکل اور مواقع تجویز کر لیے ہیں ــــ اگر آپ کو ان سے اتفاق نہیں تو آپ اپنے طور پر تجویز کیجیے نفسِ مطلب کسی صورت میں بھی فوت نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہاں تک بھی راضی ہوں کہ آپ حال کی تحقیقات کے مطابق زیادہ فائدہ تحریر کیجیے اور میں آپ کے نام سے دوسرے اڈیشن میں اس کو بڑھادوں گا۔ چاکل چھپ رہی ہے اور یہ مقام ابھی دور ہے۔

مجھ کو اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ترجمے کو بہ نظرِ تدقیق ملاحظہ فرما رہے ہیں اگر آپ مجھ کو اپنے تدشات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہیں گے تو میں بڑی احسان مندی کے ساتھ اپنی غلطی کی اصلاح کروں گا۔

راقم

خاکسار، نذیر احمد (دہلوی)

د ۔ نقدالادب

ا ۔ سرمایۂ زبانِ اُردو

[" امیر اللغات " اگر کم یاب ہے تو سرمایۂ زبانِ اُردو پر ذیل کی تنقید کو نایاب سمجھیے ــــ]

برآر از مدِ بسم اللہ تیغِ خوش مقالی را
مسخر کن سوادِ اعظمِ نازک خیالی را

ہم اس وقت سرمایۂ زبانِ اُردو کو دیکھ رہے ہیں جس کا دوسرا نام " تحفۂ سخن وران " ہے۔ یہ لغت سیّد ضامن علی صاحب جلالؔ لکھنوی کا ہے جن کا نام دیکھتے ہی لوگ چونک اُٹھیں گے اُردو زبان کی ایسی کتاب پر بڑے شوق سے دل لوٹتا ہے جو اصل زبان کی درست کرنے والی ہو اس سے پہلے ہم نے کچھ حصّہ " ارمغانِ دہلی " " مخزن اللغات " اور لالہ چرنجی لال کے لغت کا بھی دیکھا ہے۔ ان کتابوں کے مرتب کرنے والے ایسے ایسے چوکے ہیں کہ توبہ بھلی ۔ " مخزن " سے " ارمغان " پھر بھی غنیمت ہے۔ آج 'سرمایۂ زبانِ اُردو' سے پالا پڑا ہے جلالؔ کے نام سے اس لغت کو دیکھ کے نام بڑا درشن تھوڑے

یہ مثل ٹھیک اُتری۔

بات یہ ہی لغت کی راہ ایسی کٹھن ہی کہ سر کا پسینہ تلووں کو آجائے تب بھی اکیلے آدمی سے شاید طے نہ ہو سکے ہاں کوئی ایسا ہو کہ پہلے مسودہ شائع کر کے مُلک کے اچھے اچھے لوگوں سے رائے لے اور جب کوئی بھول چوک پر مطلع کرے تو ناک بھوں نہ سکوڑے بلکہ کتاب کی درستی پر متوجہ ہو لیکن یہ بھی جب کہ جب چند آدمی اسی پر اُدھار کھا بیٹھیں اور خرچ کرنے کو روپیہ بھی رکھتے ہوں۔ جلاؔل اکیلے اور پھر بوڑھے آدمی ان میں اتنا تنتا نہیں یہی سبب ہُوا کہ "سرمایۂ زبانِ اُردو" اور لالہ چرونجی لال کی کتاب "مخزن المحاورات" کے ساتھ برابر کے پلے پر تُلنے کے قابل ہی۔ بے شبہ رفتہ رفتہ لوگوں کو تجربہ ہوگا اور جو پھیر کے کتاب لکھیں گے وہ سنبھل کے لکھیں گے لیکن وہ لغت پہلے شائع ہو چکے تب بھی جلاؔل کو کچھ خاک تجربہ نہ ہُوا عبارت ایسی پوچ لکھی ہی کہ آج کل نو سکھئے بھی ایسی نہ لکھیں گے۔ کنایہ اور اشارہ یہ دو لفظ خدا جانے کس مولوی نے ان کو پڑھا دیئے تھے جن کے چلتے ایسے محاورے جن کو مصدر کی شکل میں قائم کیا ہی انھیں ان کے معنی صورتِ مصدر سے علاحدہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لغات سے آج کل کے الھڑ چوپٹ ہوں گے اور دور کے رہنے والے یہ سمجھیں گے کہ لکھنؤ کے شاعر جلاؔل نے جو کچھ لکھا ہی صحیح ہی اس مجبوری سے ہم کو اس لغت پر ریویو لکھنا پڑا۔

اگر ہم اِس سرے سے اُس سرے تک اِس لُغت کے دیکھنے کا اِرادہ کریں تو جی اُکتا جائے اور ہم اپنے جی پر جبر بھی کریں تو یہ ڈر ہی کہ جن لوگوں کو زبان کا مذاق کم ہی وہ ہم کو کوسیں گے کہ کہاں کا راگ مالا چھیڑا جس کا اور چھور نہیں ورنہ "الف الف نہ برآ" سے ہم شروع کرتے اور "یہیں" تک (جو لغت کا آخری لفظ ہی) پہنچ کے تمت بالخیر لکھ دیتے تاکہ لوگ دھوکے کے جال میں نہ پھنسیں بہرحال ہم آج ورق اُلٹ پلٹ کے کچھ لکھے دیتے ہیں۔

"**آدمی**۔ کنایہ ہی نوکر سے"

اور جو نوکر نہ ہو اسے آدمی نہ کہنا چاہیے شاید حضرت جلاؔل اس پر جانور کا اطلاق فرماتے ہیں۔

"**آنچل پلو**۔ ایک قسم کا دوپٹہ ہوتا ہی کہ دکن اور بنارس میں بنایا جاتا ہی اور دونوں کنارے عرض کے

زری باف ہوتے ہیں "

معنی غلط ۔ آنچل پلو : دوپٹے کا نام نہیں ہے ہاں دوپٹے میں آنچل پلو ہوتے ضرور ہیں ۔

"آنکھ پھوڑ ٹڈا ۔ کنایہ ہے سخت بدسرشت و مفسد سے ۔"

شاید جلالؔ نہ جانتے ہوں کہ دراصل یہ نام ایک قسم کے بوٹ کا ہے جو "آکھر" کے درخت پر رہتا ہے ۔ مفسد کو اس بوٹ کے اعتبار سے کہتے ہیں نہ کہ دراصل ۔

"آنکھ کا جاتی رہنا "

لغت میں لکھنے کی ایسی غلط ترکیب سخت مضر ہے۔ آنکھ کا جاتا رہنا یا آنکھیں جاتی رہنا ہونا چاہیے ۔

" آنکھوں کا کھٹکنا ۔ عبارت ہے دردِ چشم سے ۔"

یہ معنی غلط ۔ کھٹک دوسری چیز ہے اس کو درد نہ کہتے ہیں نہ کہہ سکتے ہیں ۔ کھٹک سے رہ رہ کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی چیز آنکھ میں چبھ اُٹھی ۔

"آنکھیں پھر جانا ۔ کنایہ ہے احتضار کے وقت دونوں آنکھوں کی زینت بدل جانے سے ۔"

اور محبت کے بعد رکاوٹ کا آجانا ، روزمرہ کی بات چیت ہے آپ کی آنکھیں پھر گئیں ۔

"آواز بھاری ہونا ۔ عبارت ہے آواز کے گراں ہوجانے سے بہ سبب چیخنے کے ۔"

حضرت نزلے وغیرہ سے بھی آواز بھاری ہوجاتی ہے ۔

" اپھرنا ۔ کنایہ ہے تھوڑی سی مقدرت پر کمینوں کے غرور کرنے سے ۔"

اتنا کھانا یا پینا کہ سانس پھولنے لگے اس کو بھی اپھرنا کہتے ہیں ۔

" اصیل ۔ اچھے لوہے کی تلوار ۔ زنِ طباخہ و خدمت گزار"

کیا حضرت جلالؔ نہیں جانتے کہ "اصیل" مُرغ کے اقسام میں ایک مشہور قسم بھی ہے ۔

"اِکّا ۔ اس نگینے کو کہتے ہیں جو بازو پر باندھا جاتا ہے ۔"

نگینے کا اطلاق غلط ہے ۔ اِکّا زیور ہے جس پر نگینہ جڑا ہوتا ہے ۔ جلالؔ نے خود ہی سند میں برقؔ کا شعر لکھا ہے ؎

دوچنداں ہوگیا زیور سے عالم اس پری رُو کا گُلِ خورشید ٹیکا اور قمر اِکّا ہے بازو کا

پھر بھی نہ سمجھے اور غلط معنی لکھ دیے۔

" السیٹھ - فریب کو کہتے ہیں۔"

غلط۔ کوئی حرکت جو چلتے کام میں روک ٹوک پیدا کرے السیٹھ کہی جاتی ہے۔

" اللے تللے کرنا - عبارت ہے مُفت کا رُپیہ خاطر خواہ خرچ کرنے سے "

مُفت کی تخصیص غلط۔ ضرورت سے زائد اصراف صحیح۔

" اوکھل میں سر دیا تو دھمکوں کا کیا ڈر - ایک مثل ہے جو اس جگہ کہی جاتی ہے کہ کوئی کسی خوف ناک مقام میں دانستہ قدم رکھ کر بعد کو پس وپیش اور اندیشہ کرے "

پس وپیش اور اندیشے کی حالت غلط۔ خود مثل کی صورت ان پہلوؤں کے خلاف ہے۔ صحیح یوں ہے کہ یہ مثل وہاں بولتے ہیں کہ جہاں کسی دھڑکے کے موقع پر بے دھڑک جرأت کی جائے۔

۲ - داغؔ کا ایک شعر

[محمد علی شوکت علی کے بڑے بھائی مولانا ذوالفقار علی خاں صاحب گوہرؔ نے اپنے اُستاد داغؔ کے ایک شعر کی توضیح بڑی خوب صورتی اور کام یابی سے کی ہے ایک ایسے شعر کا جو عام طور پر ناقص سمجھا جاتا رہا ہو وہ پہلو دکھا دینا جو اس کو کامل ترین اشعار کی صف سے بھی کچھ آگے بڑھا دے کسی غیر معمولی ہی دماغ کا کام ہوسکتا ہے۔ شعر کی یہ تشریح جو حضرتِ گوہرؔ نے کی ہے صرف ان کی ذہانت یا اُستاد پرستی نہیں ہے بلکہ حقیقی اور واقعی ہے۔ اس مضمون کا کمال یہ ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد شعر کا نقص، حُسن بن کے نظر آنے لگتا ہے۔]

جنابِ ایڈیٹر صاحب 'ریاض الاخبار'۔ چوں کہ آپ ایک معزز اُردو اخبار کے اڈیٹر ہونے کے علاوہ شاعری کی دُنیا میں بھی ایک وقیع درجہ رکھتے ہیں اس لیے میرا دل نہیں مانتا کہ اُردو نظم کے متعلق اپنے خیالات آپ کے سامنے ظاہر نہ کروں خصوصًا ایسی حالت میں جب کہ عرصے تک حضرت داغؔ مدظلہٗ کا ایک خاص مطلع شاعروں کی جولان گاہ رہا ہو اور جلوۂ داغ کے پردے میں حضرتِ داغؔ پر اعتراض ہوتے رہے ہوں۔

مجھے افسوس ہو کہ میں عین بحث کے وقت شدید بیمار ہوگیا اور خیالی دنیا سے اکثر نابلد رہا لیکن مجھے معلوم ہوا ہو کہ ایک سلسلہ اعتراضات کا جلوۂ داغ پر اخبارات میں شائع ہوتا رہا ہو اخبار موجود ہیں ان کو دیکھ کر رائے قائم کروں گا۔ سردست مجھے حضرت داغ کے مطلع مندرجۂ ذیل پر کچھ عرض کرنا ہو۔ میں اس مقدمہ کو پھر عام شعرا کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ہم عصر شعرائے دلی و لکھنؤ غور کریں اب زمانہ شاعری کے انقلاب کا شروع ہوچکا ہو جیسا کہ میں آگے ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا خدائے کارساز سعی مشکور فرمائے۔ آمین۔ ۵

دل پر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

اس غلطی کے مصرعۂ ثانی پر یہ اعتراض کیا گیا ہو کہ ردیف "کرنا" کے بعد لفظ "چاہیے" اور چاہیے ایسا لفظ مقدر نہیں ہوسکتا بلکہ بے اس کے جملہ بے معنی رہ جاتا ہو۔

میں اس اعتراض کو کسی اور جگہ تسلیم کرتا اگر وہ صورت نہ ہوتی جو یہاں موجود ہو۔ ہمارے نازک فہم شعرائے کچھ توجہ نہیں فرمائی کہ آیا لفظ "سوچ" کیا پہلو لیے ہوئے ہو اور کس قدر گہرا اثر اس ایک لفظ نے کل تشبیہ اور مصرع پر ڈال رکھا ہو۔ آفتاب عالم تاب کے مقابل اگر روشنی کو رکھا جائے ماند رہتی ہو اسی طرح لفظ سوچ اس مصرع میں ایسا آگیا ہو کہ اس کے بعد اگر حضرت داغ "آخر مجھے کیا" ہی کہہ کر مصرع ختم کردیتے اور کسی طرح وزن پورا ہوجاتا تو بھی میں یہی کہتا کہ عین نازک خیالی ہو۔ شاعر کی زبان الفاظ "کرنا" تک پابند رہی اور پھر وہ اپنے خیالات میں ڈوب گیا اور "سوچ" اس پر غالب آگیا اور ایک معمولی فہم کا شاعر بھی اس شعر کو سُن کر کہہ سکتا ہو کہ قائل کے دل پر اس اہم مسئلے کا بہت بڑا بار تھا اور اس مشکل کا سہل کرنا کس قدر دشوار کام تھا۔ وہ اس کشاکش میں پڑا تھا کہ کیا کرے۔ نہیں معلوم کتنے عرصے سے وہ اس گتھی کو سُلجھا رہا تھا اور وہ نہیں سُلجھتی تھی درمیان میں طرح طرح کی جنون انگیز خواہشیں پیدا ہوکر اس کو آگے نہیں چلنے دیتی تھیں۔ جب تفکر غالب ہوجاتا ہو تو انسان کا دماغ بہت سے ضروری فرائض ترک کردیتا ہو اور اسی لیے دیوانے پر اور مجذوب پر قانونِ قدرت نیز قانونِ انسانی نے کوئی تعزیر نہیں رکھی ہو۔ چہ جائے کہ ایک ایسا شخص جس کے دل پر ہزاروں نشترِ حسن وعشق کے لگ چکے ہوں زمانے کی رفتار سے لڑتے لڑتے جو عاجز ہوگیا ہو فانی عالم نے جس پر آہستہ آہستہ فنا کا رنگ پھیلا

شروع کر دیا ہو۔ موت جس کو دباتے دباتے قبر کے کنارے تک لے آئی ہو پس ایسے فکرمند پر اگر سوچ اور تفکر نے غلبہ کر کے سلسلۂ الفاظ سے اس کو ہٹا دیا ہو اور عالمِ خیال میں اس کو ڈبو دیا ہو تو اس کی تصویر ایک شعر میں اس طرح کھینچنا کیا قابلِ داد بات نہیں؟ مجھے تعجب ہے ان پر، جو اس پر غور نہیں کرتے۔

اُردو شاعروں نے اپنی نازک خیالی کو اس قدر محدود کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص ذرا بھی اس محدود دائرے سے ہٹا تو ہل چل پڑ جاتی ہے۔ ملک الشعرا شکسپیر نے اپنی ایک نظم میں ایک شعر لکھا ہے جو میں پیش کرتا ہوں:۔

"اے چرواہے کیا تو نے دیکھا ہے میری سیلیا کو اس طرف سے جاتے۔

اس کے رخسار چنبیلی کی طرح سفید ہیں اس کے لب گلاب کی پنکھڑی کی طرح سُرخ ہیں"

یہ عاشقِ نامراد جو اپنی سیلیا کو ڈھونڈھنے نکلا تھا چرواہے سے پتا پوچھتے پوچھتے اپنی معشوقہ کا حلیہ بیان کرنے میں کچھ ایسا محو ہو گیا سارا سراپا اس کا نہایت شوق بھرے الفاظ میں تفصیل سے بیان کرنے لگا۔ اب آپ غور کیجیے کہ اس کا کتنا وقت اس بیان میں صرف ہوا ہوگا۔ وہ اس بیان میں اتنا محو ہوا کہ مطلوب کی تلاش کی گرماگرمی اس کے دماغ سے جاتی رہی۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ دماغ کا سلسلۂ کار بدل گیا اور تلاش کی فکر پر عشق کے جذبے نے اپنا رنگ پھیر دیا۔ اب شکسپیر پر کیا کوئی یہ اُلٹا اعتراض کر سکتا ہے کہ اس نے فطرتِ انسانی کا فوٹو نہیں کھینچا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح داغ کا یہ شعر ہے جسے حضرت نے نہایت پاکیزگی کے ساتھ اور گہرائی لیے ہوئے لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے یوں کہیے کہ فکر کے وقت انصاف سے کام لینے کی غرض سے اس نے ترازو کے پلڑوں میں علاحدہ علاحدہ ایک چیز کو رکھ کر وزن کیا ہے۔ جب دیکھا دونوں ہم وزن ہیں تو ہاتھ کانپ اُٹھے دماغ پریشان ہو گیا۔ حواس میں اختلال پیدا ہوا اور وزن کرنے والا اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ اب کیا کروں ؎

دل بر سے جُدا ہونا یا دل کو جدا کرنا اس "سوچ" میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

۴۔ اُردو کے نئے اُستاد

پنڈت بشن نرائن در نے سنہ ۱۸۹۹ء میں پُرانے زمانے کے "ترقی پسند ادیبوں" سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا تھا آج تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد جزوی ترمیم سے موجودہ ترقی پسند ادیبوں

کے لیے وہ قابلِ غور ہے۔]

اخبار "پنجاب آب زرور" کے شیخ عبدالقادر نے اس دل آویز رسالے کو جس کے تیسیے سے مضمون کا عنوان قائم کیا گیا ہے مشتہر کرکے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی بابت وہ شائقینِ کلام اُردو کے شکریے کے مستحق ہیں۔ میری رائے میں ان کی یہ شکایت صحیح ہے کہ شمالی ہندستان کی ترقی پزیر نسل کے لوگوں کا برتاؤ ایک ایسی زبان کے بارے میں جو لسانِ الہام ہی نہیں ہے بلکہ جس کو میں اسلامیہ تہذیب ہندستان کا ایک پاسے وار نتیجہ قرار دیتا ہوں اگر مخالفانہ نہیں تو بے پروایانہ ضرور پایا جاتا ہے۔ ترقی پزیر نسل کے لوگوں کی بے پروائی جو اُردو کی نسبت ہے قابلِ افسوس ہے اور میں اکثر یہ خیال کیا کرتا ہوں کہ تعلیم یافتہ اشخاص کا اثر جو طبائع عام پر اس قدر کم پڑتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک بیرونی زبان جو خاص اپنی وضع کی خوبیاں اور مخصوص طریقے کے انداز رکھتی ہے اس کے حاصل کرنے کی حد سے بڑھی ہوئی سرگرمی میں وہ خاص اپنی مادری زبان کو ترقی دینے اور مالامال کرنے میں قاصر رہے۔ جیسا دوسرے مقامات پر بارہا میں نے بیان کیا عمدہ انگریزی عبارت لکھنے کا شوق فی الجملہ ہماری جدّتِ طبع کے حق میں مفید نہ ہوا کیوں کہ آورد کو جو ایک بیرونی زبان لکھنے والے کا ساتھ چھوڑتی ہی نہیں یا یہ کہیے کہ بہت کم چھوڑتی ہے بے اختیارانہ روانیٔ خیالات و جذبات (آمد) سے بیر ہے اور آمد ہی دماغی درستی کی بنیادِ اصلی ہے۔ اور نثر ہو خواہ نظم ہر معقول قسم کے کلام میں راستیٔ دماغ ہی اصل عنصرِ تاثیر ہے۔ انگریزی دان معاصرین کی اس گمراہی (کیوں کہ اور اس کو کیا کہا جائے) کے سبب کا دریافت کرنا مشکل نہیں ہے اور مسٹر عبدالقادر نے اس کی جو وجہ لکھی ہے اس سے بالکل میں متفق الرّائے ہوں۔ اس پر بھی جیسا انھوں نے آپ ہی بڑی ہوشیاری سے بیان کر دیا ہے خود اُردو کلام ایک حد تک اس صورتِ معاملات کا جواب دہ ہے کیوں کہ بہتیرے ضروری اصناف میں وہ ایسا ابتر جاہلانہ بلکہ قطعی طور کا ایذارساں پایا جاتا ہے کہ نوعمر اشخاص کی طبائع کو جو بچپن ہی سے پرستانِ حکمت کی کہانیوں اور تجربۂ روزگار کی حکایتوں کو انگلش زبان کے ذریعے سے سُن سُن کر پرورش پاتے رہے اس سے شوق کے بدلے نفرت کا زیادہ احتمال ہوتا ہے۔ اُردو زبان کو اگر قائم رہنا ہے تو اصولِ تمدن و معاشرت زمانۂ حال کے نئے حالات کے لیے اپنے کو موزوں بنانا چاہیے اور اس نظر سے مصنفینِ کلامِ اُردو کے طبقۂ جدیدہ کی

تنقید لطف سے خالی نہ ہوگی۔

باوصف انگلش تعلیم کی چمک دمک کے ہماری خاص زبان کا کلام ہم لوگوں کی نوعی حیات اس کے عزائم ومشاغل اس کی امیدوں اور امنگوں اور اخلاق ومعاشرت اور روحانی خیالات کی تبدیلیوں اور اس کی خام خیالیوں کا اصلی آئینہ ہے اور چوں کہ ہم لوگوں کو مغربی تہذیب کا سامنا ہے تو ایسی حالت میں خیالات اور جذبات کی جو نئی اور ہونے والی رغبتیں اس زمانے کے کلام اُردو کی نسبت ظاہر ہونے لگی ہیں ان کی تحقیق میں انگلستان اور ہندستان کے باہمی اثر کا مسئلہ ایک دل چسپ صورت سے منکشف ہوسکتا ہے۔

مسٹر عبدالقادر نے زبانِ اُردو کے مصنفینِ زمرۂ خاص کی بحث میں بہ نظرِ تنقید جو مضامین تحریر کیے ہیں اس سودمند تغیر کی وہ ایک عمدہ علامت ہے جو انگریزی دانوں کے برتاؤ میں اپنی خاص زبان کی تصنیفات کے متعلق پیدا ہو رہا ہے یہ کوئی خفیف امر نہیں ہے کہ من جملہ پانچ مصنفوں کے جن کا مسٹر عبدالقادر نے انتخاب کیا ہے چار نثار ہیں اور صرف ایک شاعر ہے۔

اس میں شک نہیں زمانۂ حال کی نثر پُرمغز موثر متنوع اور جامع ہے اور اس میں خاص صفت یہ ہے کہ شیریں ہے لیکن بہ ایں ہمہ اُستادانہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ نثر ہم کو ایسے لفظ سے متحیر اور مسرور نہیں کرپاتی جو نیا لیکن ناگزیر ہو یعنی موزوں اور بے ساختہ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آج کل اُردو نثر کا جہاں تک تعلق پایا جاتا ہے مسٹر عبدالقادر اور میں متفق الرائے ہیں۔ گو فروعات میں میری رائے مختلف ہے لیکن اصولاً ان تصنیفات کے باب میں جن کی بحث کی گئی ہے میری ان کی رائے ایک ہے مثلاً نثرِ غالب کی جو انھوں نے تعریف کی ہے اس میں ہر معقول پسند مبصر ان سے اتفاق کرے گا بلکہ میں کسی قدر تجاوز کرکے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ تمام اُردو کلام میں غالب کی نثر آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ اسے اُردو داں کبھی خوشی سے مُردہ نہ ہونے دیں گے۔ اس کا اُستادانہ حُسن، شاعرانہ نازک خیال، اس کی تلاش ایک پردے کے ساتھ بے ساختہ اظہار، سنجیدہ اور متین خیالات اور اس کے ساتھ خوش مذاقی کی وہ کیفیت جیسے بادلوں کے ساتھ رہ رہ کر آفتاب نکلتا آتا ہو —— غالب کی تحریر دیکھیے اور بعد اس کے ہمارے حال کے مصنفین کی تحریر دیکھیے تو دونوں کا فرق معلوم ہوجائے گا۔ اس زمانے کی نثر میں خیالات بہت آگئے ہیں لیکن خوبی جاتی رہی۔ کلام کے کارآمد ہونے سے کچھ بحث نہیں۔

ادنا درجے کی نثر خیالات اور معلومات سے کیسی ہی مالامال کیوں نہ ہو لیکن پھر ادنا کہلائے گی اعلا درجے کی نثر میں گو خیالات کی کوتاہی پائی جائے لیکن فریفتہ کرسکتی ہے۔ لیکن لطف اور حُسن یہ دونوں چیزیں ایسی نہیں ہیں جن کا ساتھ نہ نبھ سکتا ہو۔ زمانۂ حال کی اُردو ابھی اس کا کامل نمونہ نہیں بنی ہے مگر بن رہی ہے اگر اس میں کوئی خطرہ ہے تو یہ کہ بعض مقامات میں بے تابی اور خودپسندی کے ساتھ اور کُلّ جدید لذیذ کے حیرت انگیز جوش میں اس بات کا میلان پایا جاتا ہے کہ کوئی زبان ایسی گھڑ کر تیار کرلی جائے جو اس قدر وسیع اور زوردار ہو کہ نئے خیالات کا بار اُٹھالے۔ اسی سے ہم بعض جگہ مونگرز (انگریزی کردہ شدہ) نثر کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ طرز ہرگز اُردو نہیں ہے بلکہ انگریزی میں خیال باندھنے اور اپنی مادری زبان میں لکھنے کی ایک عجیب و غریب طریقے کی معجونِ مرکب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار قدیم طرز کے ویسے ہی شائق ہیں لیکن پُرانے الفاظ سے نئے خیالات ادا کرنے کا کام لینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے واس صاحب کی تاریخ روس کے ترجمے میں اچھی طرح اس بات کو نبھایا ہے۔ ان کا ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا مگر لوگ دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں جہاں اوضاع و اطوار اور اشخاص اور صحبت علی الخصوص لکھنؤ کی اس صحبت کا بیان کیا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے قوس قزح کے رنگ کی طرح غائب ہوتی چلی جاتی ہے وہاں طرزِ بیان بالکل بے نظیر پایا جاتا ہے۔ انھیں اپنی نثر کو سلیس، بے تکلف، فصیح اور چٹ پٹا بنانے میں بعض موقعوں پر خیالی اور علمی خوبیاں پیدا کرتے ہوئے مبالغے اور اغراق سے کام لینا پڑا ہے کہیں کہیں عدم واقفیت بھی ہوگئی ہے لیکن سُست کہیں نہیں ہے اور گو عمدگی اور توسیع خیال ہر جگہ عیاں ہے اس پر بھی ان کی نثر اُستادانہ نثر نہیں ہے۔ اس نثر میں یہ صفتِ خاص نہیں پائی جاتی ہے کہ ایک فقرہ خواہ جملہ خواہ خیال موزوں سی موزوں صورت میں ایک بات کو ذہن میں پہنچاکر ہمیشہ کے لیے مرکز کردے لیکن اس میں ایک لطف ایسا ہے جو پڑھنے کا معاوضہ جہاں تک کہ اُستادانہ کمال کے نہ ہونے کی حالت میں ممکن ہے دے دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے ہر شخص خوش ہوجاتا ہے اور ناخوش کوئی نہیں ہوتا۔

مسٹر عبدالقادر کی کتاب کے بارے میں اپنے جو خیالات میں نے ظاہر کئے ہیں ان کو بغیر اس کے

گذشتہ طبقہ کی اُردو شاعری کی نسبت بھی کچھ بیان کروں مشکل سے ختم کرسکتا ہوں۔ انھوں نے حالی کو منتخب کیا ہو اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ بعض مقامات میں حالی کی شہرت ہو۔ مسٹر موصوف بیان کرتے ہیں :۔

"برسوں تک متواتر غور کرنے کے بعد انھوں نے ایک کتاب شائع کی ہو اور ایک نثر نگار شاعر کا نمونہ پیش کیا ہو اور اپنے خیالات ایک ذخیرۂ منظومات کی حیثیت سے جس کا نام 'دیوانِ حالی' ہو پیش کیے ہیں۔ میں اس کتاب کو ایک طبقہ ساز (یعنی طبقۂ شعر قائم کرنے والی) کتاب قرار دیتا ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کوئی دن ایسا آئے گا جب یہ بات تسلیم کرلی جائے گی کہ اسی کتاب سے وہ زمانہ شروع ہوا جب اُردو شاعری نے وہ تکلفات کا بار جس سے وہ لدی ہوئی تھی اُتار ڈالا اور ایک خاص طور کے کنسرویٹو اشخاص نے اس کے جو حدود قرار دے رکھے تھے ان سے وہ زیادہ بلندی پر پہنچ گئی"

اب ہم کو پہلے تو اس خطرے کی حفاظت کرلینا چاہیے کہ ذاتیات کو علمی امور میں خلط ملط نہ ہونے دیں حالی جس شخص کا نام ہو اس کو اس نظر سے پسند کرنا کہ وہ مسلمانوں کی حب الوطنی اور ان کی مذہبی اور قومی سرگرمی کو اُبھارتا ہو اور زوال کے زمانے میں اس قوم سے ہمدردی کرتا ہو۔ تعلیم میں گرم جوشی رکھتا ہو۔ مذہب اسلام کی تائید میں اخلاقی نصائح کرتا ہو اس کے ہم مذہب لوگوں پر جو بُرائیاں اثر پیدا کررہی ہیں ان کی مذمت کرتا ہو یہ باتیں اور ہیں اور یہ دوسرا امر ہو کہ حالی کو شاعرانہ حیثیت سے کوئی دیکھے اور اپنے اندازے کے موافق اس بات کی جانچ کرے کہ اس کی شاعری کی اصلیت کیا ہو؟

اس کے نکتہ چین اور معترف ایسا نہیں کرتے ورنہ مسٹر سید محمود نے اپنی تاریخ تعلیم' میں "وہ مشہور شاعر" کے الفاظ سے اسے یاد نہ کیا ہوتا اور نہ مسٹر عبدالقادر نے 'دیوانِ حالی' کو ایک " طبقہ ساز کتاب" قرار دیا ہوتا ــــ اُردو شاعری کو تکلفات کی حد سے نکال کر نیچرل شاعری کی حد میں لانے کی بابت حالی کی تعریف کرنا یا حفظانِ صحت کے پُرجوش طرف داروں کے لیے بے محابا محاورات کے موافق پُرانے طرز کی اُردو شاعری کی مذمت میں یہ کہنا کہ دریا کی سطح پر نجس چیزیں تیرتی رہتی ہیں بہت آسان بات ہو لیکن جس وقت پانی ٹھیر جائے اور جب نارنگیوں کے باغات اور چنبیلی کی جھاڑیوں سے گزر کر برگد کے درختوں کے سائے میں بہ رہا ہو تو اس پر نگاہ کرو اور اس کی موجوں سے جو نغمہ پیدا ہوتا ہو اس کو سُنو اور مجھ سے پوچھیے تو

میں خود اقرار کرتا ہوں کہ میری طبیعت اس قدر ٹھس ہے کہ حالی کے کلام میں مجھ کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی نظم کی بات بھی پائی جاتی ہے گو اس بات کا ضرور یقین ہے کہ نثر میں اس نظم کے مطالب زیادہ عمدگی سے بیان ہو سکتے ہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں ہو سکتا کہ جن باتوں پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے وہ نئی ہیں سوال یہ ہے کہ نظم کلام کے لیے وہ باتیں موزوں ہیں یا نہیں اگر ہیں تو شاعر صاحب نثر کی پست سطح سے ابھار کر ان کو نظم کی بلندی تک نہ پہنچا سکے جس میں شاعری کا کوئی حسن پیدا ہوتا اور اس اعتبار سے وہ کوئی شاعر نہ ہوئے بلکہ نظم کرنے کی ایک کل ٹھیرے . . . . . .

مجھ سے بڑھ کر اُردو شاعری کے اس تنگ میدان سے کوئی شخص ناخوش نہ ہوگا جس کی پُرانی رواج پرستیاں اور ناممدوح خیال آرائیاں اس کا غلط فلسفہ اور اس سے زیادہ خراب اخلاق جو اس کے کاموں کو اور بدنما کر دیتا ہے اور وہ پُر فساد اور مہلک اثر جو عام طبائع پر اس سے ہمیشہ پڑتا آیا اور پڑ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ مجھ سے زیادہ کوئی اس بات کا خواہش مند بھی نہ ہوگا کہ ان بے وقت کا راگ گانے والوں (اُردو کے نئے اُستادوں) کو سکھایا جاتا کہ ان کے اس اعلا منصب کا فرض اور ذمّے داری ایک ایسے زمانے میں اور بھی بڑھ جاتی ہے جب عامیانہ مشاغل اور مادّی ترقی کا میلان ایک ایسی مصلح چیز کا تقاضا کر رہا ہے جس کو بوجہ اس امر کے کہ قدیم اخلاق کی آواز بند ہوگئی اور پُرانے عقائد کے چراغ ٹمٹمانے لگے صرف ایک شاعر مہیا کر سکتا ہے جو پراسپرو کی طرح اپنی طلسمی چھڑی سے نئے خیالات کے طوفان کی موجوں کو قابو میں رکھ سکے۔

زمانۂ حال کی اُردو شاعری قدیم شاعری کی نسبت طرزِ ادا اور خیالات دونوں باتوں میں ادنا درجے کی ہے شعر کا کہنا ایک قلبی امر ہے۔ محسوساتِ قلبی کو اس کا تار پود سمجھنا چاہیے اور خیالات کے لیے قبل اس کے کہ وہ شاعر کے کام آسکیں لازم ہے کہ جذبات کی کسوٹی پر خوب کس لیا جائے اس کے بعد یہ جذبات جس وقت خیالات کی شکل میں آئیں گے تو ضرور ان میں یہ قوت ہوگی کہ دوسرے لوگوں کی طبیعت پر بھی وہی اثر پیدا کریں اور اس طور سے شاعر وہ کام کر سکے گا جو کسی سے نہیں ہو سکتا اور اس قابل ہو سکے گا کہ طریقۂ عمل اصل مخازن پر اپنا اثر پیدا کر کے ان کی حالت بدل دے جہاں تک کہ اس تاثیر کو دخل ہے اس سے کوئی بحث نہیں کہ شاعر کے محسوساتِ قلبی معقول یا غیر معقول اور اس کے خیالات صحیح یا غلط ہیں اگر وہ احساس

بھی ویسا ہی کرتا ہو جیسا اس کا خیال ہو اور اس کا احساس بہ نسبت دیگر اشخاص کے زیادہ قوی ہو اور اگر اس کی طبیعت اس طور پر واقع ہوئی ہو کہ حواس اور عقل کے مقتضیات اپنے موافق کے جذبات اس کے دل میں پیدا کریں اور اگر اس میں یہ قوت مودع ہو کہ ان جذبات کو خوش نما اور مترنم الفاظ میں ظاہر کردے تو وہ سچا شاعر ہو اور بھلائی خواہ بُرائی پیدا کرنے کا ایک قوی آلہ ہوسکتا ہو۔ زمانۂ غدر کے پیشتر کے شعرا اس امر کے اعتبار سے سچے شاعر تھے۔ ہم ان کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن ان کی مقناطیسی تاثیر جو ہم پر اپنا اثر ظاہر کرتی ہو اس کو روک نہیں سکتے کیونکہ وہ سچی ہو اور ان کے دلوں کی اصلی تہ سے نکلی ہو۔ اپنی سمجھ کے موافق اس دُنیا کے متعلق ان کا جو خیال تھا اور جو کچھ اس کو وہ سمجھتے تھے ان کا شعر ان سب باتوں کی تاریخ ہو۔

ایک بہت بڑے بے روح شاعر کو اگر مُردہ سلطنتوں کی دینی ماں کہا جاسکتا ہو تو ہم اس نئے اُستاد شاعر کو ان بچوں کا مصیبت زدہ باپ کہہ سکتے ہیں جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے اور انھی کی کتاب کے صفحات میں مدفون ہیں حب الوطنی، نیچر، آزادی اور اسی طرح کی دوسری باتوں کا ذکر کرنا یا ان کا عشق پیدا کرنا اور بات ہو اور کسی دوسرے شخص کے دل میں ان خیالات کا پیدا کردینا دوسری بات ہو۔

نئے زمانے نے ابھی تک اپنا شاعر اُردو زبان میں نہیں پیدا کیا ہو۔"

—————— (۲) ——————

["اُردو ادب کے نئے اُستاد" کی طرح غدر کے بعد مسلمانوں کے "دماغی بحران" کے سلسلے میں "مذہب اسلام کے نئے اُستاد" کا سبق بھی یاد رکھنے کے لائق ہو — نواب قاضی سر عزیزالدین مرحوم نے اسلام کے مطابق تقسیم ترکہ کے قانون میں کچھ اصلاح کرنا چاہی تھی اس کے جواب میں ڈپٹی عبدالقادر صاحب مرحوم (مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے والد ماجد) نے جو کچھ لکھا تھا افسوس ہو وہ ہمارے پاس محفوظ نہیں — البتہ قاضی صاحب کے جواب میں ڈپٹی صاحب کا یہ عنوان اُردو ادب کو شاید ہمیشہ یاد رہے گا :-

"کیا آپ قاضی ہیں ؟"

یہ سرخی کیا بجائے خود ایک بلیغ الزامی جواب نہیں ؟ خیر وہ جواب تو نہیں لیکن ایک اور جواب جو

مکمل اور نہایت مدلل بزرگ پیش کرتے ہیں۔]

ایک ایسے زمانے میں جب کہ فکرِ معاش فکرِ معاد پر مقدم ہے جب کہ مذہب اور بانیٔ مذہب پر برسر بازار نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں جب کہ مذہب کا بدلنا کپڑوں کے بدلنے سے بھی زیادہ آسان ہوگیا ہے اور جب کہ ہر شخص زمانے کی تیز رفتار کے ساتھ ہاتھ پاؤں چھوڑے بہا چلا جا رہا ہے۔ جناب قاضی عزیزالدین صاحب کا یہ جملہ کہ " اسلام کے مطابق جو تقسیم ترکے کا دستور ہے وہ خلافِ مصلحت وقت ہے " کچھ زیادہ غیض و غضب کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔ ... آزادہ نویسی کے بانی اس ... میں سر سید مرحوم تھے مگر وہ نفسِ اسلام کو جملہ عیوب سے مبرّا اور حشو و زوائد سے پاک اور ہر زمانے کے اقتضا کے موافق جانتے تھے اور مسلمانوں کے رسم و رواج اور ان کے افعال و اقوال کا جواب دہ اسلام کو نہیں قرار دیتے تھے۔

مذہب ایک ایسی شے ہے جو انسان کی آنکھوں پر "اندھوٹے" چڑھا دیتا ہے جس سے اسے اپنے دائیں بائیں دیکھنے اور نظر کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی بلکہ بے تحاشا اس سڑک پر دوڑتا چلا جاتا ہے جو بانیٔ مذہب نے بنادی ہے اور اس دوڑ میں اگر اسے سربفلک پہاڑوں اور ناپیدا کنار سمندروں کا سامنا بھی ہو تو وہ انھیں بھی ایک ہی جست میں پار کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے بالکل قرینِ قیاس ہے اگر قاضی صاحب کے مذکورہ بالا جملے اور اسی قبیل کے بعض اور جملوں نے ان کے مضمون کو میرے راسخ الاعتقاد مسلمان بھائیوں کے لیے مثل اس لوہے کے لٹھے کے کردیا ہو جس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی آگ میں رکھ دیا جائے تو پھر اس کا کوئی حصّہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے چھوا بھی جائے لیکن میں ایسے مسلمانوں کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اگر واقعی قاضی صاحب کا " دل مسلمانوں کی حالت پر دُکھا ہے" اور آپ نے "سچی ہم دردی اپنی قوم کے ساتھ کی ہے" تو وہ مضمون ضرور اس قابل ہے کہ اس کی قدر اور اس کی طرف توجّہ کی جائے اور اگر قابلِ عمل ہو تو اس کو عملی صورت میں لایا جائے۔ اگر زمانے کا اقتضا بھی ہے تو ہمارے فقہ کا ایک عظیم الشان جزو علمِ فرائض (جس کی نسبت اس لحاظ سے کہ یہ علم ایسا ہے جس کی حاجت بعد موت کے پڑتی ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے (تعلموا الفرائض و علموها الناس فانها نصف العلم) جانے بازر ہے ہیں زمانے کے اقتضا ہی پر عمل کرنا پڑے گا۔

مگر دیکھنا یہ ہو کہ آیا تقسیمِ ترکہ کے اصول میں کوئی بھی ایسی بات ہو جس سے اس کا استعمال مفید ٹھیرتا ہو۔ اس نظر سے جب ہم اس قانون کو دیکھتے ہیں تو ہم کو نظر آتا ہو کہ اسلام نے اپنے نہایت منصفانہ اور بے نظیر اصول کے موافق کسی حق دار کو اس کے جائز حق سے محروم نہیں کیا۔ بڑا بھائی محض اس وجہ سے کہ وہ بڑا ہو اپنے چھوٹے بھائی کی بہ نسبت ایک حبّہ زیادہ نہیں پاسکتا۔ نہ بہن مجرّد اس وجہ سے کہ وہ پرائے گھر کی ہو اپنے واجبی حصّے سے محروم ہوسکتی ہو اب اگر کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ خاندان کا ایک شخص دوسروں کے حصّے پر قابض رہے تو ضرور وہ اور حق داروں کو محروم کرکے جایداد کو اپنے ہی حق میں منتقل کرنے کی کوشش کرے گا اور ایسی حالت میں کہ وہ کل ریاست پر حاوی ہو ایسا کرنا اس کے لیے کچھ دشوار نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ فرض کیجیے کسی جایداد کے چار بھائی حصّے دار ہیں؛ ممکن ہو کہ سب ایک ہی طبیعت کے ہوں ممکن ہو بڑے بھائی کی بہ نسبت چھوٹا بھائی اپنے حصّے کو اپنی حوصلہ مندی سے ترقی دینے کی حسرت رکھتا ہو تو یہ نہایت بے جا ہو کہ اسے اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے سے جبراً باز رکھا جائے دوسری طرف اگر بھائی آپس میں نباہ سکیں تو اسلام نے تقسیمِ حصص پر مجبور بھی نہیں کیا ہو بلکہ اپنے حکیمانہ اور عادلانہ اصول کے ساتھ اتّفاق و اتحاد کی طرح طرح سے تاکید فرمائی ہو۔ خداوند تعالیٰ نے جس موقع پر مسلمانوں کو صلح و آشتی کی تاکید فرمائی ہو وہاں انھیں بھائی بھائی کہا ہو۔

اگر وراثت کا قاعدہ صرف اس وجہ سے نامناسب ہو کہ اس سے چند پشتوں کے بعد اولاد بالکل مفلس ہوجاتی ہو (حالاں کہ یہ بجائے خود قوتِ عمل قائم رکھنے کی ایک حکمت ہو) تو یہ صورت اس حالت میں اور بھی جلد پیش آئے گی کہ اس قانون پر عمل نہ کیا جائے۔ مثلاً جیکب نامی ایک شخص مرا اور اس نے چار بیٹے جوزف، جیمس، جارج اور جان چھوڑے۔ بڑا بیٹا جوزف اپنے باپ کی جایداد پر قابض ہوا جس کی آمدنی فرض کیجیے ایک لاکھ پونڈ سالانہ کی ہو اب جوزف بارہ ہزار پونڈ سالانہ اپنے تینوں بھائیوں کو "معمولی گزارے" کے لیے دیتا ہو اور باقی اپنے علاوہ اپنی "خاندانی عزّت" پر صرف کرتا ہو پھر اب اگر ان تینوں کے چار ہی بیٹے ہیں تو ہر بیٹے کو اپنے باپ کے بعد ایک ہزار پونڈ سالانہ ملیں گے خیال فرمائیے

کہ جس دادا کی آمدنی ایک لاکھ پونڈ سالانہ تھی اس کے پوتوں کے صرف ایک ہزار پونڈ سالانہ ہیں لیکن ہماری شریعت کے مطابق انھی پوتوں کی آمدنی چھ ہزار دو سو پچاس فی کس ہوگی۔ ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔

جو بزرگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق سلطنتیں قابلِ تقسیم کیوں نہیں شاید ان کی نظر اس پر نہیں پڑی کہ یہ سلطنتیں اس عہد کا ایک مِٹا ہؤا نقش ہیں جب سلطنتیں کسی خاص ذات کا حق نہیں ہوتی تھیں۔ سیدالقوم خادمھم ہوتا تھا اور خلافت کی باگ جمہور کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔

اصل یہ ہے کہ قدرت نے جو سلسلہ تفوّق کا قائم کر رکھا ہے وہ اسی کا مقتضی ہے کہ دو برابر کی طاقتیں محلِ واحد میں جمع نہ ہونے پائیں۔ انگلستان میں جہاں اب پولس کے ایک ادنا سپاہی کی انگلی کشت و خون کو آنِ واحد میں روک دیتی ہے " ہپٹائر کی سات سلطنتوں " کے زمانے میں برٹوالڈا (عاملِ کل) بننے کے لیے ان سات سلطنتوں کے بادشاہ ملک میں کیسی قیامت برپا کرتے تھے۔ وللہ درمن قال دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند۔

شمعون اسائلس کا قول ہے کہ قوانین خواہ کیسے ہی عادلانہ ہوں جرائم کو موقوف نہیں کرسکتے جس گناہ کی بنیاد پڑ چکی وہ قیامت تک نہیں مٹ سکتی البتہ اس کی شکل بدل جاتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جایداد اور دولت قابلِ قدر چیزیں نہیں ہیں لیکن یہ کہنا کہ ساری دُنیاوی عزت دولت ہی کی بدولت ہے محض خلافِ واقعہ ہے۔

میں مانتا ہوں کہ چھتاری اور دتاولی کے عالی شان علاقے تقسیم ہوکر نسبتاً چھوٹی چھوٹی ریاست بن گئے مگر ایسی بھی بہت سی مثالیں ہیں جن سے میں خود اور قاضی صاحب دونوں بخوبی واقف ہیں مثلاً بھیکن پور ضلع علی گڑھ کہ اولاد نے ترکے کو ترقی دے کر آباد اجداد کی جایداد سے اپنے حصے کو بڑھا لیا ——— ایک وجہ بالکل عجیب قسم کی قاضی صاحب نے تقسیم ترکہ کے خلاف لکھی ہے کہ مسلمان کثیرالاولاد ہوتے ہیں حالاں کہ کسی قوم کا کثیرالاولاد ہونا اس کے اقبال مند اور مرفہ الحال ہونے کی دلیل ہے۔ فضول خرچی کا ذمہ دار قانونِ وراثت کو ٹھیرانا کسی طرح درست نہیں کیوں کہ اسلام نے میانہ روی کی تائید فرمائی ہے اور اسراف کرنے والوں کو اخوان الشیاطین ٹھیرایا ہے اگر فضول خرچی کا سبب قانونِ وراثت ہے تو انگلستان کے امیر کیوں فضول خرچ

ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے گولڈ اسمتھ کا "ڈزرٹڈ ولیج" پڑھا ہو وہ جانتے ہوں گے کہ اس نے ان امیروں کا کیا کچھ رونا رویا ہو۔

قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہو کہ "اب سے پہلے عرب میں مسلمانوں کی جو حالت تھی وہ اب ہماری حالت نہیں ہو اس زمانے میں مسلمانوں کے مقبوضات محدود تھے اور ان کی جایداد چند اونٹ، کھجور کے درخت یا غلام تھے ان کو جس طرح چاہا بانٹ لیا" یہ بالکل ایسی ہی بات ہو کہ جیسے 'علی گڑھ منتھلی' میں ایک بار ریڈیکل کے خفیہ نام سے ایک صاحب نے عربی لٹریچر کی نسبت لکھا تھا کہ اس میں اونٹ کی مینگنیوں کی تعریف کے سوا اور رکھا ہی کیا ہو۔

قاضی صاحب کے جواب میں اب سے گیارہ سو برس پہلے کا اگر ہم تصور کریں تو سنہ ۲۲۲ھ پر پہنچتے ہیں یہ وہ زمانہ ہو کہ بنی عباس بغداد میں اور بنی اُمیہ قرطبہ میں تختِ خلافت پر جلوہ افروز ہیں طباطبائی بصرہ میں، بنی زیاد یمن میں اور آلِ طاہریان خراسان میں اپنے ٹھاٹھ جمائے ہوئے ہیں ایک موقع پر حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے متعدد پیشوں اور حرفوں کے نام بتائے ہیں جن میں خیرالقرون کے اکابر مسلمین مصروف تھے حضرت عثمان غنی کا غنا اس قدر مشہور ہو کہ ان کے لیے کسی سند اور حوالے کی ضرورت نہیں ہو۔ حضرت ابو بکر صدیق جس وقت مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں تو چالیس ہزار درہم مسلمانوں کی امداد کے لیے دیے تھے۔ ان تمام معتبر شہادتوں کے بعد غالباً اس شبہے کی گنجایش نہیں رہے گی کہ مسلمان صرف چند اونٹوں اور کھجور کے درختوں ہی کے مالک تھے اور ان کے پاس وراثت کے واسطے کافی سرمایہ موجود نہ تھا۔

ر۔ لکھنؤ کی ایک "نوآبادی"

ویرانۂ مٹیا برج کے حالات حضرت شاہِ اودھ کے انتقال کے سلسلے میں
ایک نامہ نگار کے قلم سے

یوں تو ہر سال ایامِ گرم میں بندگانِ حضرت کا مزاجِ ہمایوں جادۂ اعتدال سے منحرف ہوجایا کرتا تھا مگر امسال اواخرِ شعبان المعظم سے نزولِ نوازلِ حارہ کے سبب پہلے دردِ سر لاحق ہوا اور معالجۂ مناسب سے

دو زائل ہوا اور غشیان اور تہوع اور تبخیر شدید کی شکایت ہوئی جس سے عنصرِ اقدس کو بہت ایذا پہنچی جب یہ شکایت بھی رفع ہوئی تو ہیجانِ مادّہ قدیم بواسیر ی سے تپ عارض ہوئی اور آخر کو دنبل بواسیری نے بروز کیا اور چند مرتبہ بہت خون بھی جاری ہوا مگر حسبِ معمول بہ رفع ہوا اچھی طرح نہ ہوا۔ اطبائے معالج نے بڑی دانائی اور مزاج دانی کے ساتھ تبریدات و تقویتِ قلب اور مسہلات سے باحسن وجوہ معالجہ کیا اس درمیان میں مزاجِ معلّی درست ہو چلا اور شفائے تپ بھی بعد جاری ہو گئے ہر شوال (۱۲۸۰ھ) سے پھر تبخیر اور اختلاجِ قلب کی شکایت شروع ہوئی اور ہر دو شنبہ ایک الجھن اور انتشار عارض ہوا شدتِ ضعف اور قلتِ غذا کے ساتھ بے خوابی نے دو زور پکڑا کہ دم بدم بے چینی اور الجھن کو ترقی ہوئی اور غشیان اور کف کی بھی شکایت دامن گیر ہوئی ۔۔ اس علالت میں مزاجِ ہمایوں ایسا ناساز ہوا کہ مٹیا برج میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور تمام کارخانہ تہ و بالا نظر آنے لگا ابوابِ الیوناتِ شاہی پر تقسیمِ صدقات وخیرات سے اچھا خاصا لنگر جاری ہو گیا ہر کس وناکس درگاہِ شافیِ مطلق میں دست بہ دعا بصد تضرع و زاری رکابت دعوائی کلکتہ میں طرح طرح کی بے اصل افواہیں مشہور ہوئیں صدہا باشندگانِ کلکتہ کا سڑک پر ہجوم رہتا ہر ایک استفسار مزاجِ ہمایوں کے بعد صحت و سلامتی کی دعائیں کرتا۔ دو تین دن بڑی اضطراب اور پیچ و تاب میں گزرے بارے الحمدللہ کہ ادھر ایک ہفتے سے اگرچہ ازالۂ مرض پورے طور پر نہیں ہوا ہے مگر طبیبانِ معالج یعنی اقدم الاطبا حکیم علی محمد صاحب اور حکیم مشرف الدولہ بہادر کی کوششوں سے ایسا افاقہ ہوا کہ وابستانِ دامنِ دولت کی جان میں جان آئی۔

اب دو دن سے بندگانِ اقدس و اعلیٰ نے بعد الاستخارہ معالج کی تبدیلی فرمائی ہے اور جناب حکیم آغا شکوہ صاحب معالج ہوئے ہیں امید ہے کہ جلد انشاءاللہ استرداد صحت و شفائے کامل حاصل ہو۔ خدا رکھے اسی ایک ذات سے سلطنتِ اودھ کا نام زندہ اور روشن ہے ——— راقم س۔ا۔ از مٹیا برج

سابقاً اطلاع دی گئی تھی کہ جناب حذاقت مآب کا علاج شروع ہوا حکیم صاحب موصوف چھ دن معالج رہے اور اس درمیان میں کوئی افاقہ بیّن شکایاتِ لاحقہ میں ظاہر نہ ہوا ہیجانِ مادہ سے زبان اور منہ میں آبلے پڑ گئے اس وجہ سے کچھ ثقلِ زبان بھی پیدا ہوا۔ ایک شب وجع بین الکتفین سے بھی بندگانِ حضرت بہت بے چین رہے غرض کہ ایسے ہی اسباب سے ساتویں دن ان کا علاج موقوف ہوا اور پھر وہی اطبائے قدیم

حاضر ہوتے دس دن تک انھوں نے اپنی تشخیص اور تجربے کے موافق مناسب تدبیریں کیں مگر کوئی فائدہ مترتب نہ ہوا آخرکار جمیع عائدانِ حضور خصوصاً مدارالمہام نواب منصور الدولہ بہادر اور ذوالفقار الدولہ جرنیل صاحب بہادر و معتمد الدولہ بہادر نے بڑی خیرخواہانہ جرأت کے ساتھ گزارش کی کہ حکیم عبدالعلی صاحب سے بہتر کوئی تجربہ کار اور لائق طبیب نہیں۔ اطبائے شاہی کا تجربہ اور معلومات شاید یہیں تک کے چند مرضوں تک محدود ہے اور حکیم صاحب موصوف بعد الاستخارہ خاص طور پر لکھنؤ سے طلب کیے گئے ہیں انھی کا معالجہ ہونا چاہیے۔ المختصر بہ ہزار جد و جہد رد و بخشش کے بعد حکیم صاحب ممدوح کا علاج ہے بفضلہ تعالیٰ موکید اور ورم معدہ میں تخفیف بیّن پائی جاتی ہے زبان کے آبلے بھی مندمل ہو چلے ہیں البتہ تبخیر اور بے خوابی کی شکایت بدستور ہے۔ حکیم صاحب موصوف اور اطبائے سابق و اراکین دولت روزانہ وقتاً فوقتاً حاضر رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ خود حضرت نے ارشاد فرمایا مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ المستعان حکیم عبدالعلی ہی کے علاج سے مجھے شفا ہوگی۔

راقم وقائع راست گو نامہ نگار

۲۰ ستمبر کو ہم نے خبر علالت مزاج اقدس کی بالتفصیل لکھ کر بھیجی تھی اس کے بعد حکیم علی محمد صاحب لکھنوی کا علاج چھ روز تک رہا اور کیفیت مزاج بدستور رہی تبخیر کی شدتیں اور عوارض اگرچہ کی ترقی تو مدت سے تھی مگر کبھی تپ کی شکایت اس بیماری سے چار مہینے کی مدت میں نہ ہوئی تھی ۲۰ ستمبر کی رات کو لرزہ خفیف کے ساتھ تپ آئی اور اس تپ نے عجب قیامت ڈھائی تپ سے پیاس بڑھ گئی اجابت معمول کے عوض ایک دست آیا جس سے ضعف نے قوت پر بڑا غلبہ پایا تکیے پر سر رکھ کے جو خاموش ہوئے تو تمام دن اسی حالت میں رہے زور سے کراہنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ دس بجے رات کو پھر ایک ویسی ہی اجابت ہوئی اس سے اور بھی زیادہ غیر حالت ہوئی غرض کہ دو بجنے بجتے چاند گہنا گیا آفتاب سلطنت پر زوال آگیا اس وقت سلطان خانے میں جو قیامت برپا تھی کیا بیان ہو ملازمین و متوسلین در و دیوار سے سر ٹکراتے تھے۔ بیگمات پتھر کے فرش پر پچھاڑیں کھاتی تھیں گویا برج بھر میں ہنگامہ محشر بپا تھا۔

تین بجے صاحب ایجنٹ بہادر اور صاحب ڈپٹی کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پولس پہنچ گئے۔ پہلے نعش دیکھی حسرت و افسوس کیا پھر تمام ایوانات و ابواب و دفاترِ شاہی اور مکاناتِ اہل کاران پر جابجا پولس کے

پہرے مقرر کیے اور چلے گئے صبح کو سلطان خانے میں صفِ ماتم بچھی ہنگامۂ نوحہ و فریاد دن بھر گرم رہا دوپہر کو پھر صاحب ایجنٹ بہادر آئے ۔ نواب خاص محل صاحبہ اور شاہزادگان نے اور مرشد زادوں نے تجہیز و تکفین اپنے اہتمام سے کرنا چاہی مگر صاحب ایجنٹ نے مناسب نہ جانا اور اجازت نہ دی خاص مصارفِ شاہی سے بہ ذریعے نواب منصرم الدولہ بہادر و عطار الدولہ بہادر بندوبست کرایا شام تک سب سامان درست ہوگئے اور ۹ بجے رات کو غسل دیا گیا اس وقت پھر صاحب ایجنٹ بہادر آئے اور بہ حکم گورمنٹ دو کمپنیاں بہ طور گارڈ آف آنر ہم راہی جنازے کے لیے ساتھ لائے ۔ دس بجے رات کو سلطان خانے سے جنازہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ برآمد ہوا قصر البیضا سے تا امام باڑۂ سبطین آباد جہاں حسبِ استخارہ شمس العلما مفتی میر محمد عباس صاحب مدفنِ خاص قرار پایا تھا پبلک روڈ پر وہ ہجوم تھا کہ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی دو رویہ دوکانوں پر اور ان کی چھتوں پر ہزار ہا زن و مرد ہندو مسلمان پیر و جوان مصروفِ نالہ و فغاں تھے ۔ آگے آگے گارڈ آف آنر اس کے بعد جلوسِ متوسلین بہ لباسِ ماتمی مع نوبت خانہ وغیرہ رواں تھا ۔ جب جنازہ امام باڑۂ سبطین آباد کے پاس آیا کمپنی نے سلامی لی اور ماتمی باجا بجایا ۔ بارہ بجے تجہیز و تکفین سے فراغت ہوگئی ۔ مہرِ درخشاں نے بہ زیرِ خاک منہ چھپایا عالم میں اندھیرا چھایا ۔ سچ ہے ؎

سلطان و گدا کا ایک انجام ہوا — مرنے پہ بلا کفن کو دو گز کپڑا

راقم ۔ ہیچ مداں خستہ جگر ، سید سراج الدین احمد

(۲)

حالات حضرت سلطانِ عالم واجد علی شاہ سابق شاہِ اودھ

سنہ ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۸۴۷ء میں تختِ سلطنت پر جلوس فرمایا تخت نشینی کے بعد کچھ دن تک طریقۂ ملاحظۂ کاغذات و صورتِ دربار بہ دستور زمانِ سابق رہی بعد ازاں ہر اتوار کو دربار ہونے لگا ۔

صبح کو پانچ بلکہ ساڑھے چار بجے بسترِ استراحت سے بیدار ہوتے اور بعد رفعِ حوائجِ ضروری نمازِ صبح ادا فرماتے بر وقتِ نماز ایک آدمی پیچھے کھڑا ہو کر چلا چلا کے رکعتیں گنتا جاتا تاکہ سہو نہ ہو جائے ۔

بعد ادائے نماز و انفراغ وظائف مختصر جس کا خطاب "لبِ معشوق" تھا نوش فرماتے اِس وقت بجز اُن لوگوں کے جو کہ اس کوٹھی کے متعلق مُلازم تھے جہاں کہ حضرت تشریف فرما تھے دوسرا کوئی اہلِ کار اور کارگزارِ شاہی سے نہیں حاضر ہوسکتا تھا اس وقت حضرت بعض ضروری کاغذات ملاحظہ فرماتے اور دیگر عرائض و مقدمے جات اور اقرار نامے جات وغیرہ ہر پنج شنبے کو ملاحظہ فرماکر بہ دستخطِ خاص مزیّن فرماتے۔ بعد نوش فرمانے لبِ معشوق کے چوں کہ آئے دِن حضرت کے شوق سے نئی نئی عمارتیں بنا کرتیں جا بہ جا کوٹھیاں بھی جایا کرتی تھیں وہاں تشریف لے جاتے اور ان کی آراستگی کے اہتمام اور سیر میں مصروف رہتے بعد دوپہر قریب ایک بجے کے نمازِ ظہر ادا فرماتے۔ بعد ازاں خاصا تناول فرما کے حسبِ دستور پھر کام میں معروف ہوجاتے ساڑھے چار یا پانچ بجے بہتمام سے اِن کاموں کے انجام دینے کا حکم فرماکر گاڑی پر سوار ہوتے۔

ازاں جملہ ۱۲ محرم الحرام سے بالکل گاڑی پر سوار ہونا موقوف فرما دیتے اگرچہ حسبِ معمول ۲ بجے سے سواری درِ دولت پر تیار حاضر رہتی مگر حضرت "بادِ بہاری" یعنی بوچے ہی پر سوار ہوتے۔ یہ قاعدہ ۱۳ محرم سے ۱۷ ربیع الاوّل تک جاری رہتا۔ انھی دِنوں میں تمام ایوانات شاہی میں بجائے فرشِ سنگِ مرمر کے قالین بچھ جاتے۔ کُل کوٹھیات اور باغات اور چکّر اور پھاٹکوں پر سفید روشنی ہونے لگتی۔ انھی دِنوں میں بعد جائزہ موجودہ کُل کبوتران شاہی کے خرید کبوتران شروع ہوتی یہ خرید بھی اسی تین مہینے کے عرصے تک رہتی۔ بعد اِن تین مہینوں کے حسبِ دستور سابق کل فرشِ قالین اُٹھ جاتا اور فرشِ سنگِ مرمر رہتا۔ کل ایوانات اور باغات وغیرہ پر سبز روشنی ہونے لگتی اور بجائے سفید پرکالوں کے سبز پرکالے بدل دیے جاتے۔ کوٹھی کے اندر بھی سبز جھاڑ سبز جھاڑ سبز فانوس اور سبز کنول روشن کیے جاتے تاکہ آنکھوں کو ناگوار نہ ہوں۔

ملاحظۂ کاغذات کے وقت ہر شخص حاضر رہتا تھا اس کے بعد صحبتِ مقربانِ قدیم ہوتی تھی سواری میں دو ترک سوار صندوقچہ لے کر چلتے تھے راستے میں جو مستغیث عرضی دیتا تھا صندوقچے میں داخل کردیتے تھے اس کا نام "مشغلۂ نوشیروانی" رکھا تھا۔

ایک مہینے کے بعد نواب علی نقی خاں کو انتیس پارچے کا خلعتِ وزارت ملا اور یہ خطاب عطا ہوا۔

رکن و رکین خلافت و جہاں داری، اعتضاد سلطنت و شہریاری، امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک
معتمد الخاقان تلمیذ السلطان - سیف مسلول بازوئے شاہنشاہی رنج مصقول معرکۂ دشمن کاہی،
ساعد و مساعد یک رنگی ناصح و مناصح صداقت و وفا مرید مرشد پرست، اخلاص گزین خانہ زاد
عقیدت صفوت آئین - مختار ذی اقتدار یار وفادار سپہ سالار، رستم ہند مدار الدولہ منتظم الملک
علی نقی خاں بہادر سہراب جنگ، فدوی خاص جاں نثار — ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ
بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ۔

معتمد السلطان نجم الدولہ بہادر کو سفارت ریزیڈنٹ ملی - حفیظ الدولہ مولوی باقر علی موقوف ہوئے اہتمام الدولہ حیدر حسین خاں کو اہتمام دیوان عام ملا - میر یوسف علی کو اہتمام الدولہ کی خدمت تفویض ہوئی - امیر الدولہ خلانشین ہوئے - سیف الدولہ علی حسین خاں خدمت قدیم دیوان خانے سے برطرف کیے گئے - مشیر الدولہ مہاراجا بال کرشن بہادر کو خدمت دیوانی اور راجا بہاری لال کو خدمت واصل باقی بہ دستور بحال رہی - بشیر الدولہ، گلبن الدولہ، دیانت الدولہ، احسن الدولہ، فیروز الدولہ کو وزارت محلات معلی عنایت ہوئی - حاجی شریف خواجہ سرا کو رسالہ ترک سوار دیوان خاص اور کئی تلنگہ پلٹنیں سپرد ہوئیں اسی طرح ثابت الدولہ، وہاج الدولہ، رضی الدولہ نجیب الدولہ، قطب الدولہ، انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ ان سب ارباب نشاط کو خدمات عالیہ ملیں - نائب الدولہ نیاز علی خاں معرض عتاب میں آئے مگر وظیفۂ شاہی بہ دستور رہا -

خلاصہ رتق و فتق مہمات سلطنت و واسطے دادرسی مستغیثان بنا بر غفلت یا طمع عمال ایک کچہری تحصیل حضور مقرر ہوئی اس کے مہتمم مولوی فضل حق خیرآبادی مقرر ہوئے -

---

بعد انتزاع سلطنت جب سے حضرت مٹیا برج تشریف لائے - کلکتہ کے پہلو میں رفتہ رفتہ ایک اچھا خاصا لکھنؤ آباد کر دیا سیکڑوں عمارات رفیع الدرجات تعمیر کرائے بہت سے فرحت خیز باغ اور خوش نما جانور خانے بنوائے - لاکھ ڈیڑھ کی سلطنت نیت کی برکت سے ایسی چمکی کہ لاکھوں ہی کا مرجع اور ملجا ہو گئی - صوبۂ اودھ اور دربار دہلی کے شرفائے اہل کمال اور ہزاروں غربا و مفلوک الحال اسی

دامن فیض دامن سے آکر لپٹے۔ علما حفاظ، اطبا شعرا، خوش نویس، محرّر، مصوّر، قرآن خواں، مرثیہ خواں، حدیث خواں، سوار پیادے، رکاب دار، جانورباز وغیرہ وغیرہ از اعلا تا ادنا چار ہزار سے زیادہ نفر چالیس پچاس ہزار کے نوکر تھے۔ نوکروں کے علاوہ سینکڑوں آدمی علاقۂ تعمیرات سے متمتع تھے سیکڑوں دانہ خوری جانورخانے سے رزق پاتے تھے۔ سیکڑوں محلات اور بیگمات کے توسّل کی بدولت گھر بیٹھے روٹی کھاتے تھے۔ اہلِ بازار اور تاجرانِ کلکتہ اس سرکار کی بدولت ہر مہینے میں ہزاروں کا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ خاص کعبہ شریف میں ایک نائب امجد مقرر، کربلائے معلّا میں ایک طبیب مع مصارفِ شفاخانہ بیماروں کے لیے معیّن غرض کہ کہاں تک ان امور کی شرح کی جائے۔ ایک ذاتِ ربوبیت آیات سرمایۂ خیر و برکات اور مجمع ہزاراں حسنات تھی۔ مزاج میں یہ سادگی کہ کبھی طعام و لباس میں کسی طرح کا تکلّف پسند نہ تھا اکثر پلاؤ قورمہ چھوڑکر بقول اور اُبالی دال نوش فرمالیتے۔ جیسی پوشاک خواصِ خاص نے حاضر کی زیبِ تن فرمائی کبھی اپنی فرمایش سے پوشاک خانے سے نہ منگائی۔ غربا کی طرف اکثر التفات رہتا رذیل الخدمت ملازمین کو بھی ہمیشہ خطاباتِ ملائم سے یاد کرتے۔ جھڑکنا یا چیں بجبیں ہونا یا تو تکار کے بات کرنا۔۔ خلافِ عادت تھا اگر کبھی کسی بے انتظامی سے کوئی تکلیف پہنچی تو ایسے کلماتِ دردانگیز سے تنبیہ فرماتے کہ خادموں کا دل بھر آتا تھا

صفائی کی بڑی تاکید رہتی تھی صدہا خاک روب اور سقّے ملازم تھے جہاں دو کی ضرورت وہاں چار موجود۔ باغات اور چمنوں میں صدہا باغ بان معیّن ہر وقت ہر خیاباں صاف و پاک اور ہر روش بےخس و خاشاک رہتی۔ صوم و صلات کبھی بلا عذرِ شرعی قضا نہ فرمائی۔ زنِ نامحرم کو ہاتھ لگانا کیسا سامنے بُلانا بھی گوارا نہ تھا اور اسی سبب سے ممنوعات کی کثرت تھی۔

جو شخص اس انتزاع کو صرف شاہِ اودھ کی عیش و عیاشی پر محمول کرے وہ سفیہ ہے۔ پارینہ دفتر کے اُلٹنے سے اگر فرصت ہوتی تو ہم حالات منکشف کر دیتے اور ثابت کر دکھاتے کہ جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں اور دفعتہً زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لینا گورنمنٹ کا کیسا فعل تھا ؎

خوں بہانا تھا مرا شاید بہانہ فصد کا
برچھیاں ماریں رگوں پر کس نے نشتر کے عوض

سلطانِ عالم حضرت محمد واجد علی شاہ مغفرت پناہ فردوس آرام گاہ نے ۱۰ ذی قعدہ سنہ ۱۲۲۷ھ کو گلشنِ ہستی میں قدم رکھا ۲۷ صفر سنہ ۱۲۶۳ھ کو بہ عمر بست و پنج سالگی سریر سلطنت پر جلوس ہوا۔ نو سال تین ماہ کے بعد گلزارِ سلطنت پر خزاں آئی نیرنگیٔ روزگار نے انتزاعِ سلطنت کی صورت دکھائی۔ اسی زمانے میں گردشِ تقدیر اور کششِ خاک ۲۷ رمضان ۱۲۷۰ھ کو کشاں کشاں کلکتہ لائی۔ جون سنہ ۱۸۵۷ء میں بحکم گورنمنٹ قلعہ فورٹ ولیم میں معتکف ہوکر دو سوا دو برس کے بعد اس حبسِ بےجا سے رہائی پائی۔ اب مٹیا برج کی تقدیر یہ رنگ لائی کہ حضرتِ ممدوح نے سواتیس برس کی اقامتِ کلکتہ کے بعد ۳ محرم سنہ ۱۳۰۵ھ کی رات کو ۷۷ سال ایک ماہ ۲۲ یوم کی عمر میں چار مہینے اور تیرہ دن علیل رہ کر اس دنیائے ناپائدار سے رحلت فرمائی ؎

اب کہاں وہ حضرتِ واجد علی شاہِ اودھ — جن کے دم سے فخر کرتا تھا مقامِ لکھنؤ
جا چکی تھی سلطنت اب نامِ شاہی بھی گیا — ہند سے ہمراہِ شاہِ نیک نامِ لکھنؤ
جب سے حضرت نے بسایا تھا اودھ بنگال میں — شاق اہلِ لکھنؤ پر تھا قیامِ لکھنؤ
عیش و راحت لطفِ صحبت سے عیاں تھا روز و شب — صاف مٹیا برج میں سب اہتمامِ لکھنؤ

سالِ تاریخ اس بیانِ واقعی سے ہے عیاں
مٹ گیا لو ہائے کلکتہ میں نامِ لکھنؤ
سنہ ۱۳۰۵ھ

تبصرے

ادبیات

کھنڈر از جناب طاہر میر، معمولی چھوٹی تقطیع، ۱۷۶ صفحے مجلد قیمت پونے دو رُپے۔ ناشر دار النشر بھاٹی گیٹ، لاہور۔

یہ طاہر میر صاحب کے آٹھ افسانچوں کا مجموعہ ہو۔ پلاٹ کی پرواز وہی ہو جو آج کل کے افسانہ نگاروں کو بہت مرغوب ہو جس کا پس منظر جنسی جذبات ہوتے ہیں۔ عموماً دیکھا جاتا ہو کہ لوگ نام تو واقعیت اور حقیقت کا لیتے ہیں لیکن جب پلاٹ آنکھیں پھیر لیتا ہو تو ذہنی خلفشار نظریں دھند پیدا کردیتا ہو اور وہ مفروضاتِ ذہنی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں، جس سے افسانے کی تعمیر کھنڈر ہوجاتی ہو۔ مثلاً اسی مجموعے میں ایک افسانچہ ہو "سزا"۔ جس میں ایک نوجوان دوشیزہ اپنی بہن کی خدمت کے لیے اس کے مکان پر بھیجی جاتی ہو۔ وہاں دولھا بھائی دیکھتے ہی سالی پر عاشق ہوتے اور زبردستی اس کی عصمت دری کرتے ہیں اور وہ اُن کو قتل کرڈالتی ہو۔ آپ ہی فرمایئے کون شریف ماں باپ کنواری جوان بیٹی کو اس طرح بھیج دیں گے۔ یہ نہ واقعیت سے نہ حقیقت سے واسطہ رکھتا ہو۔

اسی میں ایک کہانی ہو، "کس کی بیوی؟" سارا افسانچہ پڑھ جایئے خاک پتا نہیں لگا سکیں گے کہ راجیش و رانی کی شادی ہوجانے میں کونسا امر مانع تھا، اور "بنسی" اپنی بہن "رانی" اور "راجیش" کی محبت کا حال معلوم کرکے اتنا برہم کیوں ہوگیا؟ مگر کیا کیا جائے کہ ہر لڑکی "حُسن و ناز کا مجسمہ" ہو۔ سماج سے شرافت طلاق لے چکی ہو، مذہب، ایمان زمین کے نیچے خراٹے لے رہے ہیں۔ مُلکی قانون معرضِ التوا میں ہو۔ لحاظ، مروت، شرم، حیا کا جنازہ نکل چکا ہو، ضبط اور تہذیبِ نفس کے پھول ہوچکے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ ایسا ہی معلوم

ہوتا ہی کہ ہمارے منشی اور شاعر آج کل ایسی نئی دُنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ کلنڈر کیا آج کل کے سبھی لکھنے والے ایسے ہی اخلاق سوز خواب میں پریشان ہیں۔

جب خیالات کی یہ پریشانی ہی تو زبان پریشانی سے کیسے بچ سکتی تھی۔ چند بے عنوانیاں یہاں دکھائی جاتی ہیں۔ صفحہ ۷ پر ہی "بغل لگا کر" یہ ترکیب غلط ہی۔ بغل مار کر لکھنا چاہیئے تھا۔ صفحہ ۱۲۷، "لذتِ نفسانی کا ذایق ہونے کے لیے" عجیب زبان ہی۔ صفحہ ۱۳، "ہاتھ چھٹ"، صحیح ترکیب ہتھ چھٹ ہی۔ صفحہ ۱۲ "جعفر بھی "قہقہہ زن ہوگیا"۔ یہ اسدشاہی ریختہ بھی خوب ہی۔ ایسی ترکیبیں کثرت سے آئیں مثلاً "گفتگو کی آوازیں سماعت نشین نہ ہوسکیں"، "جس قدر صدمہ ہوا اندازہ اور جانچ اس کے گرد حلقہ زن نہیں ہوسکتے"، "کی کتنی جنّت بکنار اور کیف آفریں آرزوئیں خاک میں مل گئیں" (صـ۱۶) "امیدوں کے تمام کپڑے مجھ سے الگ ہوچکے ہیں" (صـ۲۹)۔ "کئی عورتوں کی پارسائی ٹوٹ جاچکی تھی" (۳۲)۔ "جسمی عشق" (۱۲۰) وغیرہ۔

(ک)

دَورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعرا

مولفہ مولوی عبدالشکور صاحب ایم اے۔ کتاب خانہ دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت عہ۔

اُردو زبان مختلف اقوامِ ہند کے میل جول کی ضرورت سے پیدا ہوئی اور مختلف اقوام نے اس کی ساخت و پرداخت اور نشوونما میں حصہ لیا۔ لیکن اس مسلمہ تاریخی حقیقت کو سیاسی شور و شغب میں فراموش کرنے کی کوشش کی جارہی ہی اور گاندھی جی نے تمام تاریخی شواہد اور مُلکی ضروریات کے خلاف اُردو زبان کو مسلمان بادشاہوں کی زبان کہہ کر ایک نہایت نفاق انگیز غلط بیانی کو فروغ دیا ہی۔ اس لیے بار بار اس حقیقت کو سامنے لانے کی ضرورت ہی کہ اُردو زبان ہندستان میں فرقہ وار اتّفاق و یک جہتی کے خیال سے پیدا ہوئی اور اُسے کسی ایک فرقے کی زبان کہہ دینا تنگ نظری اور نفاق کی تخم پاشی کرنا ہی۔ کتاب زیرِ نظر سے کچھ اسی قسم کا مقصد حل ہوگا اس لیے کہ اس میں دورِ حاضر کے موجودہ اور گزشتہ منتخب شعرا کے حالات اور ان کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہی۔ ان ہندو شعرا کو مسلمان شعرا سے الگ کرکے نمایاں کرنے کی ضرورت اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ اُردو کے ساتھ جو مختلف فرقوں کے اتّحاد کی روایات اور جذبات وابستہ ہیں انھیں پامال کرنے

اور اردو زبان جو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ اور ناقابلِ تقسیم ترکہ ہی اُسے تقسیم کرکے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہی۔ کتاب زیرِ نظر میں دورِ حاضر کے ۱۳ ماضی وحال ہندو شعرا کے حالات دیئے گئے ہیں اور ان کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہی۔ جن میں سے ۲۲ اس وقت بقیدِ حیات ہیں اور اُردو زبان اور شعر وشاعری کی خدمت اسی خلوص سے انجام دے رہے ہیں جس کی اپنے آباد اجداد کے ترکے کی قدر و حفاظت کرنے والے سپوتوں سے توقع کی جاسکتی ہی۔ ان سب کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام پر سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہی کہ اظہارِ خیالات کی قدرت اور زبان کی باریکیوں پر نظر رکھنے میں یہ اپنے مسلم معاصرین سے پیچھے نہیں ہیں اور اگر کسی کو نام نہ بتایا جائے تو یہ امتیاز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کلام کسی مسلمان شاعر کا ہی یا ہندو شاعر کا مثلاً ؎

دُنیا میں ظہورِ صبح ہوا، گلشن پر کیسا جوبن ہی — خورشید کا غنچہ کھِلنے لگا، اللہ کی قدرت روشن ہی

اگر کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ شعر منشی جوالا پرشاد برق مرحوم کا کہا ہوا ہی تو اسے مثالاً سیماب اکبرآبادی کا شعر ماننے میں کسی کو کیا تامل ہوسکتا ہی۔ برق ہی کی مثنوی کے یہ اشعار ؎

اٹھلاتی لجاتی مُسکراتی — کس ناز سے ہی بہار آتی

کم سن، الھڑ، حسین، البیلی — چوتھی کی دُلھن نئی نویلی

. . . .

ہریالی بنی وطن میں آئی — اک سبز پری چمن میں آئی

ٹھیٹ دہلی ولکھنو کی زبان میں ہیں جو وہاں کے ہندو مسلمان سب بولتے ہیں۔

اسی طرح دیگر شعرا کے نمونۂ کلام پر نظر ڈالیے تو ہندو مسلمان کا امتیاز بہت ہی کم نظر آتا ہی اور خال خال ہی اشعار ایسے ملیں گے جن میں یہ فرقی یا مذہبی امتیاز نمایاں ہوگا۔ صوفیائے کرام کا عقیدہ ہمہ اوست اور ہمہ از وست جو مسلمان شعرا کا بنیادی جذبہ ہی وہی ہندو شعرا کے کلام میں بھی ضوفگن ہی۔ مگر یہاں معتقدات و خیالات کی بحث نہیں ہی بلکہ طرزِ اظہارِ خیالات کی ہی جس میں تمام امتیازات تقریباً بالکل ہی معدوم ہوجاتے ہیں۔

مرحوم شعرا میں سرشار، برق (جوالا پرشاد)، شاد، نظر، سرور، چکبست، برق (مہاراج بہادر) ریش اور

مداں کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام اور موجودہ شعرا میں ساحر، شوق، کیفی، نا شاد، جوش، محروم، وحشی، جگر، اندرجیت شرما، وفا، فراق، ملّا، قیس، زحمت، مدہوش، عرش، بیتاب، تاجور، سحر، مقور، مہر اور بسمل کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام دیا گیا ہو اور کلام کے انتخاب میں سلیقے اور تمیز کا اظہار کیا گیا ہو جس سے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہوجاتا ہو۔ مقدمۂ کتاب میں زبانِ اُردو کی پیدایش و ارتقا کے مختلف مدارج اور اُردو شاعری کے مختلف ادوار کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہو اور موجودہ رجحانات پہ تنقیدی نظر ڈالی گئی ہو جو مفید اور دل چسپ ہو اور اس طرح جن شعرا کا کلام دیا گیا ہو، اُن کا زمان و مکان سے تعلق بھی واضح ہوجاتا ہو۔

کتابت و طباعت بہ حیثیت مجموعی معقول ہو گو صفحات کی ترتیب میں کاتب صاحب نے ایک جگہ اپنی جدت طرازی کا نمونہ دکھایا ہو جس سے پنڈت میلارام وفا اور پنڈت اندرجیت شرما کے نمونۂ کلام میں خلط مبحث ہوگیا ہو۔ تاہم بہ یک نظر یہ معلوم ہوسکتا ہو کہ صفحہ ۱۲۴ کے بعد وہ مضمون ہونا چاہیے جو صفحات ۱۲۹ و ۱۳۰ پہ ہو۔ بہ ہر نوع کتاب سے زمانۂ حال کی ایک اہم ضرورت پوری ہوتی ہو اور ہر اُردو خواں کے لیئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ (ر۔ع۔ا)

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

(انگریزی) مترجمہ مسٹر ڈی سی دتّا، سدھانا پریس بڑودہ۔ قیمت درج نہیں

یہ شاہ ابوسعید ابوالخیر کی ۳۳۴ رباعیات کا انگریزی نظم میں ترجمہ ہو۔ ابوسعید ابوالخیر فارسی کے سب سے پہلے صوفی شاعر ہیں جو گیارھویں صدی کے اوائل میں گزرے ہیں۔ ان کی رباعیاں عارفانہ اور سالکانہ خیالات و جذبات سے مملو ہیں۔ ان کا ترجمہ انگریزی میں اور پھر وہ بھی نظم میں آسان نہ تھا۔ فٹز جیرالڈ نے رباعیاتِ عمر خیام کا جو منظوم ترجمہ کیا ہو اور جس سے عمر خیام کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی وہ دراصل ترجمہ نہیں ہو بلکہ مترجم نے شاعر کے خیالات کو لے کر اپنی زبان میں ادا کردیا ہو اور محققین کی رائے ہو کہ مفہوم سمجھنے میں بھی اکثر مقامات پر فٹز جیرالڈ نے غلطی کی ہو تاہم فٹز جیرالڈ کا یہ ترجمہ ایک بین الاقوامی ادبی شاہکار سمجھا جاتا ہو اور حق یہ ہو کہ مترجم اس تعریف کا مستحق بھی ہو۔ مسٹر ڈی سی دتّا نے اس ترجمے میں فٹز جیرالڈ سے زیادہ احتیاط کی ہو اور باوجود فارسی میں خود دست گاہ رکھنے کے انھوں نے بعض علمائے فارسی سے،

لی ہو اور اصل کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ کر ترجمے میں اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح چربہ اُتارنے کی کوشش کی ہو۔ اصل فارسی رباعیوں کے ساتھ نہ ہونے سے ترجمے کی صحت وخوبی کی نسبت کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکی۔

افسانے

پنکھڑیاں | مولفہ مسٹر محمد رحیم چمن دہلوی، نیا کتاب گھر، اُردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ قیمت عہ/
یہ مسٹر محمد رحیم چمن دہلوی کے دس مختصر اصلاحی افسانوں کا مجموعہ ہو جس میں مولف نے سماج کے مظالم کا پردہ فاش کیا ہو اور اصلاح کی رہ نمائی کی ہو۔ مجنون روسی افسانہ نگار کی طرح نہیں جو ظلم کی بُنیادوں کو اکھاڑ کر پاش پاش کرنا چاہتا ہو۔ بلکہ ایک واعظ و ناصح کی طرح جو دلیل وحجت سے کام لیتا ہو۔ افسانے زیادہ تر بچوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اور مقدمے میں مولف نے یہ بھی بتایا ہو کہ "میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں؟" چند افسانوں کے پلاٹ انگریزی افسانوں سے لیے گئے ہیں جنھیں اُردو کے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہو۔ بعض انگریزی افسانے پلاٹ اور کہانی کے اعتبار سے بالکل پوچ ہوتے ہیں اور انھیں صرف زبان اور طرزِ بیان کی شوخی سے افسانہ بنادیا جاتا ہو۔ اُردو کے ماحول میں ایسے افسانے نہیں کھپ سکتے اور نہ انھیں منتخب کرنے کی ایسی ضرورت ہی ہو۔ کتاب کا پہلا افسانہ "محبوبۂ فرنگ" کچھ اسی نوعیت کا ہو۔ باقی افسانے دل چسپ اور بہ حیثیتِ مجموعی سبق آموز ہیں۔

دھوپ چھاؤں | مولفہ مولوی عبدالشکور ایم اے۔ کتاب خانہ دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت عہ/

یہ مولوی عبدالشکور کے تیرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہو۔ جس میں سے کچھ تفریحی اور کچھ سبق آموز ہیں۔ اکثر افسانے انگریزی طرز کے ہیں جن میں ایک نامکمل واقعے کو اندازِ بیان کے زور سے افسانہ کردیا گیا ہو۔ اور نتیجے کی تشریح کے بجاے اسے قیاس وتخیل پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ بہ حیثیت مجموعی افسانے دل چسپ ہیں اور خوب صورت جلد میں ملبوس۔

شگوفے مولفہ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور، قیمت ع۲

ڈاکٹر شفیق الرحمن پنجاب کے ایک شوخ نگار افسانہ نویس ہیں جن کے افسانے عام طور پر دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ کتاب زیرِ نظر ان کے گیارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے پیشتر "کرنیں" کے نام سے ان کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ جو کافی مقبول ہوا۔ زیرِ نظر افسانے سابقہ مجموعے کی ترقی یافتہ شکل ہیں جو مولف کے ذہنی ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان کے پلاٹ اور کردار زندگی کے واقعی حالات سے زیادہ قریب ہیں۔ یہ افسانے طبقۂ اوسط کی زندگی سے متعلق ہیں یعنی وہ طبقہ جو سرمایہ دار اور مزدور کا درمیانی درجہ ہے، اور ان میں اس طبقے کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ بعض افسانے کافی بلند پایے کے ہیں جو مغرب کے اونچے درجے کے افسانوں کے ہم پلہ کہے جا سکتے ہیں۔ "بڑی آپا" اور "دو تارے" جذبات سے مملو اور جوش سے بھرے ہوے ہیں اور دوسرے افسانے بھی خاصے دلچسپ اور متفکرانہ ہیں۔ کتاب کی ظاہری شکل و صورت خوش نما اور دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ کافی مقبول ہوگا۔

حرکت میں برکت }
گل نار بیگم } مولفہ مولوی الیاس احمد مجیبی، ناشر بچوں کا بک ڈپو، احمد منزل، کلاں محل دہلی، قیمت ۸/ و ۸/۔

ان دو کتابوں میں مولوی الیاس احمد صاحب مجیبی نے الف لیلہ کی کہانیوں کو مختصر اور عام فہم زبان میں بیان کیا ہے؛ جو بچوں کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ پہلے پہلی کتاب "حرکت میں برکت" سندباد جہازی کے قصوں پر مشتمل ہے اور دوسری کتاب میں سات دوسرے قصے اسی الف لیلہ کے ہیں۔ الف لیلہ دنیا کی ان معدودے چند کتابوں میں ہے جن کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں کیا گیا ہے اور باوجود اتنی پرانی ہونے کے اب تک وہ ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے چناں چہ انجمن ترقی اردو نے حال ہی میں اس کا ترجمہ اصل عربی سے کرا کے شائع کرنا شروع کیا ہے جس کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں اور دو حصے اور باقی ہیں۔ ان قصوں سے بچوں کو مانوس کرنے کے لیے مولف نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے جو قابلِ قدر ہے اور زبان کی سلاست اور روانی کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے بچوں کو پڑھایا جائے تاکہ ان کی علمی اور ادبی قابلیت بڑھے۔ چوں کہ یہ کتاب خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے اس میں

زبان اور محاورے کا خاص لحاظ ہونا چاہیئے تھا تاکہ بچّوں کے کان اور زبان غلط محاوروں سے آشنا نہ ہوں اور اس سلسلے میں جو خامیاں رہ گئی ہیں ان پر ہمیں امید ہی کہ آیندہ اشاعتوں میں توجّہ کی جائے گی۔ مثال کے طور پر ایسی بعض خامیوں پر جو سرسری طور پر نظر آئیں توجّہ دلانا چاہتا ہوں۔

'حرکت میں برکت' صفحہ ۱۰، سطر ۴ ۔" سندباد کو ایسا لگا " فصاحت کے خلاف ہی۔

صفحہ ۱۱، سطر ۷، " جان کے لالے پڑ پڑ گئے " اس ثقل کی اُردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی

" صفحہ ۱۳، سطر ۱۲، " بلی کے سہارے پیرتے پیرتے " تیرنا زیادہ موزوں تھا

" صفحہ ۱۵، سطر ۱۴، " قوال بغداد میں کبھی نہ تھے ۔ گویتے لکھنا چاہیئے تھا۔

مولوی سعید انصاری صاحب، ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تقریظات جو کتاب کی ابتدا میں دی گئی ہیں، اس کے افادے کی بہترین سند ہیں۔ اور ہمیں امید ہی کہ یہ سلسلہ کافی مقبول ہوگا

متفرقات

سونے کی چڑیا | مولفہ مولوی عبدالغفور لکچرار ٹریننگ کالج علی گڑھ۔ ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی، قیمت ۸ر

مولوی عبدالغفور صاحب لکچرار ٹریننگ کالج علی گڑھ نے یہ نہایت دل چسپ اور مفید چھوٹی سی کتاب لکھی ہی جس میں ہندستان کی عظمتِ پیشیں کو یاد دلایا ہی اور دکھایا ہی کہ صنعت و حرفت و تجارت کی یہ کتنی بڑی منڈی تھی جو ساری دُنیا کو ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی تھی۔ اور ہر جگہ سے سونا لدا ہوا یہاں چلا آتا تھا۔ چوں کہ اُس وقت یہاں کی بنی ہوئی چیزیں ساری دُنیا سے اچھی ہوتی تھیں اس لئے چیزوں کی قیمت میں چیزیں نہیں لی جاتی تھیں بلکہ سونا لیا جاتا تھا اور یہی وجہ ہی کہ ساری دُنیا کی دولت کھنچ کھنچ کر یہاں آرہی تھی۔ کتاب میں گیارہ مختلف عنوانات قائم کرکے یہاں کی مختلف مصنوعات اور پیداوار کا ذکر کیا گیا ہے جو دوسرے مُلکوں کو جاتی تھیں اور جن کی ہر جگہ ویسی ہی قدر ہوتی تھی جیسی آج ہم ولایتی

مال کی کرتے ہیں۔ اس یاددہانی سے مولف کا مقصد یہ ہو کہ ہماری نوجوان پود اگر ان باتوں پر غور کرے تو وہ ہندستان کے اُس عہدِ زریں کو واپس لانے کی پھر کوشش کرسکتی جو ہماری غفلت اور حکومت کی کوششوں سے ہم سے چھن گیا ہو۔ ڈھاکے کی ململ، کالی کٹ، سلی پٹم اور ٹھٹہ (سندھ) کی چھینٹ ولایت میں امرا کی زیب و زینت تھی، اور ولایتی کارخانے ان کی نقل بنانے سے عاجز تھے۔ البتہ جب انگریزی حکومت نے انگلستان میں ہندستانی کپڑے کے رواج کو قانوناً بند کیا تو وہاں کے کارخانے رفتہ رفتہ بڑھنے لگے اور پھر حکومت چوں کہ ہمارے اوپر انھی کی تھی اس لیے ہم پیچھے رہ گئے۔ مولف نے ایک ماہرِ تعلیم ہونے کی حیثیت سے کتاب کا اندازِ بیان ایسا رکھا ہو جسے بچے دلچسپی اور شوق سے پڑھ سکیں۔ اور ہمارے نزدیک یہ کتاب اِس قابل ہو کہ عام طور پر بچّوں کو پڑھائی جائے۔

Vol. 24 JULY 1944 No. 3

THE URDU

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Delhi.

جلد ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء نمبر ۴

اُردُو

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ



ایڈیٹر:- عبدالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) دہلی

اُردوٗ

جلد ۲۴ اکتوبر سنہ ۴۴ء نمبر ۴

فہرستِ مضامین

سیّد صلاح الدّین جمالی مینجر انجمن نے جیّد پریس بلّی ماراں دہلی میں چھپواکر
دفتر انجمنِ ترقّیٔ اُردوٗ (ہند) دہلی سے شائع کیا۔

وقت کا اہم تقاضا:
اُردو یونی ورسٹی



کل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس کے اجلاس ناگ پور میں ۲۰؍ جنوری ۱۹۴۴ء کو سب سے اہم قرارداد اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے متعلق تھی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ قرارداد یہ تھی :-

"اِس کانفرنس کی راے ہے کہ اُردو کی مقبولیت اور صلاحیت کے پیشِ نظر نیز اِس کی افادیت کو مزید موثر بنانے کے لیے اِس امر کی ضرورت ہے کہ برطانوی ہند کے کسی مرکزی مقام پر ایک چارٹرڈ اُردو یونی ورسٹی قائم کی جائے اور انجمن ترقیٔ اُردو ہند سے درخواست ہے کہ وہ اس کے قیام کے امکانات پر غور و خوض کرے اور اِس سلسلے میں ابتدائی تدابیر عمل میں لائے "۔

یہ ہمارے مُلک کی بدنصیبی ہے کہ ابتدا سے جدید تعلیم کا ڈول کچھ ایسا پڑا کہ جو فوائد اس سے مترتب ہوسکتے تھے وہ نہ ہوے اور بعض اعتبار سے جو نقصان اس سے پہنچے اُن کی تلافی اب تک نہ ہوسکی۔ غیر زبان کا سیکھنا نہ تو کوئی بُری بات ہے اور نہ کچھ زیادہ مشکل، بلکہ ایک لحاظ سے مستحسن ہے۔ بہ قول گوئٹے کے کہ جو صرف اپنی ہی زبان جانتا ہے وہ کوئی زبان نہیں جانتا۔ لیکن جب ہر مضمون اور علم کا سیکھنا کسی ایسی غیر زبان کے ذریعے سے لازم قرار دیا جائے جو بالکل اجنبی ہے تو وہ ایک عذاب ہوجاتا ہے۔ قواے جسمانی و ذہنی مضمحل ہوجاتے ہیں اور جدّت و جوّدت مفقود ہوجاتی ہے۔ ایک وقت تو خود زبان سیکھنے کی ہے اور دوسرے اُس کے ذریعے سے مضمون سمجھنے کی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ مضمون پر۔ اور وقت دُگنا بلکہ کئی گنا زیادہ صرف

ہوتا ہے۔ اور عمر کا سب سے عزیز حصہ اِس اُلجھن میں بےکار جاتا ہے۔ دُنیا کا شاید ہی کوئی ایسا مُلک ہوگا جو اِس مخمصے میں مُبتلا ہو۔

دوسرا بڑا عیب یہ ہے کہ انتہائی تعلیم تک ہر مضمون انگریزی زبان اور انگریز یا دوسرے یورپی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعے پڑھنے سے طلبہ کے طرزِ فکر و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہے اور غیر محسوس طور پر وہ اُسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ نقالی اور تقلید غالب آجاتی ہے۔ اِس ذہنی نکبت کی وجہ سے وہ بےلاگ غور و فکر سے قاصر رہتے ہیں۔ اور اُن میں اور اُن کے ماحول میں مغائرت پیدا ہوجاتی ہے جو قومی ترقی اور نشوونما کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہے۔ اِس باطنی کیفیت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہے۔

خیالات اور جذبات ادا کرنے کے لیے زبان ایسی ہی ضروری ہے جیسے انسانی زندگی کے لیے آکسیجن۔ زبان کے ہر ہر لفظ اور جُملے میں قومی روایات، تہذیب و تمدّن کے شعار اور ذہنی و روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔ قوم کی ذہنیت میں اور اُس کی زبان میں ایک خاص تعلّق ہوتا ہے۔ یہ تعلّق غیر زبان سے پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری جدید تعلیم نے ہمیں اس سے بہت کچھ محروم کردیا ہے۔ انگریزی طرزِ بیان و طرزِ خیال اور انگریزی لفظوں اور جُملوں کی ساخت و ترکیب ہمارے تعلیم یافتہ گروہ کے دِل و دماغ میں ایسی رچ جاتی ہے کہ جب وہ کسی خیال کو ادا کرتے ہیں تو وہ ہماری زبان اور زبان والوں کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔ اُس سے لُطف حاصل کرنا تو درکنار بعض وقت اُس کا سمجھنا بھی دُشوار ہوجاتا ہے اور حُسنِ بیان جو ادب کی جان ہے پیدا نہیں ہونے پاتا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک صدی کی تعلیم کے بعد بھی ہم اِس قابل نہیں ہوے کہ اُن علوم و فنون کو جو ہم نے انگریزی زبان کے ذریعے سے حاصل کیے ہیں اِس ڈھنگ سے اپنی زبان میں منتقل کرسکیں کہ اہلِ مُلک اُن سے مستفید ہوسکیں۔ یہ علم گونگے کا گُڑ ہوگیا ہے۔ تعلیم سے جو یہ منشا تھا کہ اُس سے علم کی روشنی مُلک میں پھیلے گی اور جو لوگ یونی ورسٹیوں اور کالجوں سے پڑھ پڑھ کر نکلیں گے وہ اپنی معلومات سے اہلِ وطن کو نہال کردیں گے، پُورا نہیں ہوا۔

ایک ایسے مُلک کے لیے جو علم میں پس ماندہ بھی ہو اور مُفلس بھی، ایک اجنبی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا نہایت مضرت رساں ہو۔ یہی وجہ ہو کہ تعلیم کی رفتار بہت سُست ہو۔ سالہا سال کی تعلیم کے بعد بھی اب تک پورے ایک فی صدی اشخاص بھی یونی ورسٹی کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہوئے۔ اگر یہ تعلیم اپنی زبان کے ذریعے سے دی جاتی اور اُس میں علوم و فنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ کی جاتیں تو دُوسرے فوائد کے سوا اُن آزاد مدارس کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچتا جو سررشتۂ تعلیم کے قواعد یا کسی یونی ورسٹی کے نصاب کے پابند نہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں اُن کے نصابِ تعلیم میں داخل ہوجاتیں اور وہ بغیر کثیر مصارف کے جو یونی ورسٹی کی تعلیم میں برداشت کرنے پڑتے ہیں، متمتع ہوتے۔ علاوہ اس کے وہ اشخاص جو بہ وجہ عدمِ استطاعت یا دُوسری مجبوریوں سے اعلا تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ اِن علمی کتابوں کو اپنی زبان میں پڑھ کر بہت کچھ فائدہ حاصل کرتے۔ اہلِ مُلک کو اِن فوائد سے اِس لیے محرُوم رہنا پڑا کہ تعلیم غیر اور اجنبی زبان میں دی جاتی ہو۔

برٹش انڈیا میں جو ہم نے یونی ورسٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہو، اُس کا ذریعۂ تعلیم ہم نے اُردو زبان اس لیے قرار دیا ہو کہ شمالی ہند کے بہت بڑے علاقے میں یہ مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہو۔ علاوہ شمالی ہند کے مُلک کے بعض دُوسرے علاقوں میں بھی اُردو کا عام رواج ہوگیا ہو اور وہاں بھی یہ ذریعۂ تعلیم ہوسکتی ہو۔ اِن علاقوں میں جن لوگوں کی مادری زبان اُردو نہیں اُن کے لیے بھی یہ اجنبی نہیں۔ علاوہ اُن لوگوں کے جن کی مادری زبان اُردو ہو، وہاں کا ایک کثیر حصّۂ آبادی اُسے بلاتکلف بولتا اور سمجھتا ہو۔ غرض اختلافِ السنہ کے باوجود وسیع رقبوں میں اور کروروں اشخاص کے لیے اُردو جامع زبان بننے کی بہ خوبی صلاحیّت رکھتی ہو جس کے ذریعے اعلا تعلیم کو عام کرکے ہم صوبائی زبانوں یا مقامی بولیوں کو بھی آیندہ بہت کچھ ترقّی دے سکتے ہیں۔ اِس موقع پر مَیں اِس معاملے پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ بالفعل ہمارے پیشِ نظر شمالی ہند ہو جہاں ایسی یونی ورسٹی کا قائم کرنا نسبتًا آسان ہو۔

اِس وقت اُس پُرانی بحث کا چھیڑنا لاحاصل ہو کہ اُردو میں یہ صلاحیت ہو یا نہیں کہ وہ

اعلا تعلیم کا ذریعہ ہوسکے۔ اُردو زبان کی صلاحیت کا بیّن ثبوت جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے۔ یہ تو ہے اس وقت کی بات۔ لیکن اُردو نے ایک صدی قبل بھی اپنی اس صلاحیت کا حیرت انگیز ثبوت دیا تھا۔ دہلی کالج میں تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔ اُس وقت کے ماہرانِ تعلیم اور افسرانِ سررشتۂ تعلیمات نے معائنے کے بعد اس طریقۂ تعلیم کو بہت سراہا۔ پرنسپل کارگل اپنی سالانہ رپوٹ دہلی کالج بابت ۱۸۵۲ء میں لکھتے ہیں کہ "مشرقی شعبے کے طالبِ علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھے ہوے ہیں"

آگے چل کر پرنسپل موصوف اسی رپوٹ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"حال ہی میں اس کالج کا معائنہ کرنے کئی اصحاب تشریف لائے جن میں نہایت ہی ذہین و طبّاع افسرانِ فوج، مشنری اور تعلیمی مسائل کا عملی تجربہ رکھنے والے اصحاب تھے۔ انھوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علم نجوم، سائنس اور مذہبی اور عام اخلاقی مسائل پر گفتگو کی اور انھوں نے یہ راے ظاہر کی کہ اس شعبے میں یقیناً بہت ترقی ہوئی ہے اور مختصر یہ کہ اس طرح کا نظامِ تعلیم ہندستان بھر میں کہیں اور نہیں ہے۔" (پرنسپل کارگل کی رپوٹ بابت ۱۸۵۲-۵۳ء)

اس رپوٹ پر لفٹننٹ گورنر بہادر نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ" طلبہ (شعبۂ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق جو تیقن دلایا گیا ہے اُس سے بے حد مسرّت ہوئی۔

تعلیمِ عامہ صوبہ بنگال کے سرکاری تبصرہ بابت ۱۸۵۳ء میں دہلی کالج کے متعلق حسبِ ذیل الفاظ ملتے ہیں:-

"ایک خصوصیت دہلی کالج کی ایسی ہے جس سے وہ شمالی اور جنوبی صوبہ جات کے تمام کالجوں پر فوقیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس میں بڑی حد تک تعلیم دیسی زبان (اُردو) کے ذریعے سے دی جاتی ہے یہ صورت خاص کر ریاضی اور اُس کی تمام شاخوں میں اور اُس سے کچھ کم درجے پر تاریخ اور اخلاقیات میں ہے۔ اس اصول پر پہلے مسٹر بوترس نے اپنی پرنسپلی کے زمانے میں عمل کیا اور اُن کے جانشین ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی اُسی جوش اور سرگرمی کے ساتھ اُسے جاری رکھا اور اب دہلی میں یہ

طریقِ تعلیم مستقل حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ یہ نہایت ہی اچھا ہوگا کہ اس نظام کو آزادی سے ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ چند برسوں کے بعد ہم اس قابل ہوجائیں گے کہ اس کے نتائج کا دیگر تعلیمی نظاموں کے نتائج سے مقابلہ کریں۔" (تبصرہ برتعلیم عامہ صوبہ بنگال از جے گر حصۂ دوم ۱۸۵۳ء)

مسٹر فریڈرک مواٹ (MOUVAT) ایم۔ڈی۔ ایل۔ ایل۔ بی فرسٹ فزیشن میڈیکل کالج کلکتہ و سکریٹری کونسل آف ایجوکیشن بنگال نے اپنی رپوٹ میں دہلی کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی استعداد اور قابلیت اور خاص کر اُن کی سائنس کی واقفیت پر بہت قابلِ تحسین الفاظ میں تعریف کی گورمنٹ مغربی شمالی نے جنرل کمیٹی تعلیمِ عامہ کی رپوٹ بابت ۱۸۵۳ء پر جو رزولیوشن لکھا اُس میں اُس کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

"اُردو کے ذریعے سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے اُس کی مسٹر مواٹ نے بہت تعریف کی ہے۔ ہزآنر ایسی تعلیم کی جو اِس ذریعے سے دی جاتی ہے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی بہت قدر کرتے ہیں۔"

کالج کی مجلسِ ترجمہ نے تقریباً سوا سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر تالیف اور ترجمہ کیں اور علمی اصطلاحات کے ترجمے کے لیے ایسے اچھے قواعد وضع کیے جو اب بھی کارآمد ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ کالج قائم رہتا اور حالاتِ زمانہ کے مطابق اس میں ضروری ترقی ہوتی رہتی تو یہی سب سے پہلی اُردو یونی ورسٹی ہوتی اور یہ ہمارا بڑا شان دار کارنامہ ہوتا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد دِلّی صوبۂ پنجاب میں داخل کر دی گئی اور کالج توڑ دیا گیا اور اِس طرح سالہا سال کی محنت اور آیندہ امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اُردو یونی ورسٹی کا خیال سب سے پہلے ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سر سیّد احمد خاں کو ہوا، جب کہ اُنھوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے (جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سکریٹری تھے) اِس بارے میں ایک عرض داشت گورمنٹ آف انڈیا میں پیش کی۔ اِس عرض داشت میں سر سیّد نے اِس تجویز کی ضرورت اور اہمیت کو صاف اور سادہ زبان میں نہایت مدلّل طور پر بیان کیا ہے اور اِس امر پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ جب تک جدید علوم ہم کو

ہماری زبان میں نہ پڑھائے جائیں گے، ہماری تعلیم ناقص، ناکافی اور غیر مؤثر رہے گی۔ پھر اُس طریقۂ تعلیم کا ذکر کیا ہے جو اُس وقت مُلک میں رائج تھا اور تھوڑے تغیّر و تبدّل کے ساتھ اب بھی رائج ہے اور اُس کے نقائص اور خامیوں پر بحث کی ہے، اور جو اعتراضات اور شُبہات مجوزہ یونی ورسٹی کے متعلق ہوسکتے تھے انھیں رفع کیا ہے۔ سر سید کی تجویز کا خلاصہ یہ ہے:۔

"گورنمنٹ ہند اعلا درجے کی تعلیم عام کا ایسا سررشتہ قائم کرے جس میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے ہوا کرے اور دیسی زبان میں اُنھی مضمونوں کا امتحان سالانہ ہوا کرے جن میں کہ اب طالب علم کلکتے کی یونی ورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں اور جو سندیں اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کی مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کے عوض میں عطا ہوتی ہیں وہی سندیں اُن طالب علموں کو عطا ہوا کریں جو اُنھی مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔ حاصل یہ کہ خواہ تو ایک اُردو فراق کلکتے کی یونی ورسٹی میں قائم کیا جائے یا ممالک شمالی و مغربی میں ایک یونی ورسٹی دیسی زبان کی علاحدہ مقرر کی جائے۔"

یہ عرض داشت ایسوسی ایشن کے ممبروں کے دستخط سے (جس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے) ہز ایکسی لنسی وائسرائے و گورنر جنرل آف انڈیا اِن کونسل کی خدمت میں پیش کی گئی اور اِس بارے میں گورنمنٹ آف انڈیا سے مراسلت بھی ہوتی رہی۔ وزیرِ ہند نے بھی اِس خیال کو پسند کیا۔ اخباروں میں بھی کچھ دِنوں تک اِس پر بحث رہی لیکن افسوس ہے کہ اُس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ اہم تجویز جس میں ہندستان اور خاص کر شمالی ہند کی علمی اور تہذیبی ترقّی کے شان دار اور وسیع امکانات مضمر تھے، عمل میں نہ آسکی لیکن اب حالات بہت بدل گئے ہیں اور زمانہ ایسا آگیا ہے کہ وہ رُکاوٹیں جن کو اُس وقت بڑی اہمیت دی جاتی تھی، باقی نہیں رہیں اور نہ اب اُن اعتراضات اور شُبہات کا وجود رہا ہے جو اُس زمانے میں لوگوں کے دِلوں میں جاگزین تھے اُس وقت یہ ایک انوکھی تجویز خیال کی جاتی تھی، لیکن اِس زمانے میں حالات کے اعتبار سے، یہ ایک ایسی تعلیمی تجویز ہے کہ نہ تو اُس اُصُول سے جس پر یہ مبنی ہے کسی کو انکار

ہوسکتا ہے اور نہ اس کے عمل میں لانے میں کوئی غیر معمولی دُشواری پیش آسکتی ہے۔

شاید اب بھی نصابِ تعلیم کے مسئلے پر کچھ ردّ وکد کی جائے۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ مشکل ایسی نہیں جو حل نہ ہوسکے اُردو زبان نے اس عرصے میں علم و ادب کے میدان میں بہت کچھ ترقی کرلی ہے اور ایسی نئی صلاحیتیں اور ایسے نئے اسلوب حاصل کرلیے ہیں کہ اُس میں مختلف قسم کے علوم اور مختلف نوعیتوں کے مضامین ادا کرنے کی کافی قدرت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا بہت کچھ سامان تو جامعۂ عثمانیہ نے مہیا کردیا ہے اور باقی جو ضرورت ہوگی اُس کے مہیا کرنے کے لیے انجمن ترقیٔ اُردو ہر طرح آمادہ ہے۔

اِس موقع پر یہ بھی جتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس یونی ورسٹی کے طلبہ کے لیے انگریزی زبان کی تحصیل نہ صرف قطعی طور پر لازم ہوگی بلکہ اُس کے پڑھانے میں زیادہ تاکید اور توجہ کی جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ جب دیگر علوم اور مضامین پر سے انگریزی کی قید اُٹھالی جائے گی تو نہ صرف اُنھیں انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے زیادہ وقت ملے گا بلکہ وہ اُسے زیادہ شوق سے اور بہتر طریقے سے حاصل کرسکیں گے۔

اِس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے بعض امور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :-

۱۔ سرمایے کا سوال

۲۔ مقام، جہاں یونی ورسٹی قائم کی جائے۔

۳۔ نصابِ تعلیم اور اُس کی کتابیں۔

ان امور پر غور کرنے کے لیے ایک اساسی مجلس قائم کی جائے گی اور وہ خاص خاص شعبوں کے لیے ذیلی مجلسیں بنائے گی۔ لیکن نصابی اور دوسری ضروری کتابوں کے متعلق انجمن ترقیٔ اُردو ہند وثوق کے ساتھ اِس بات کا یقین دِلاتی ہے کہ وہ اِس ضرورت کے پورا کرنے میں کما حقہٗ کوشش کرے گی۔

یہ وہ اہم مسئلہ ہے جس کے متعلق ابتدا سے شبہ ظاہر کیا گیا ہے اور اب بھی بہت سے لوگ اس سے مطمئن نہیں۔ چناں چہ جس وقت سرسید نے اپنی عرض داشت اُردو یونی ورسٹی کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا

میں بھی تو گورنر جنرل اِن کونسل، سکریٹری آف اسٹیٹ اور ڈائرکٹر تعلیمات نے اِسی دُشواری کا اظہار کیا تھا کہ نصاب کی اور نصاب کے علاوہ علوم و فنون کی دوسری کتابیں جو تکمیلِ علم کے لیے ضروری ہیں کہاں سے آئیں گی۔ انجمنِ ترقیٔ اُردو ہند بخوشی اِس بڑی ذمےداری کو اپنے سر لینے کے لیے تیار ہے اور وہ اِس کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کرے گی اور جس طرح بن پڑے گا اِس کام کو انجام دے گی۔ رہے دوسرے امور، سو اُن کا فیصلہ اساسی مجلس اور اس کی ذیلی مجلسیں کریں گی۔

سب سے پہلے ہم اُن یونی ورسٹیوں کی خدمت میں اپیل کرتے ہیں جو اُن علاقوں میں واقع ہیں جہاں اُردو زبان رائج ہے کہ وہ اِس تجویز کو قبول کرکے تدریجی طور پر یا جس طرح وہ مناسب خیال کریں عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ اگر ان میں سے کسی یونی ورسٹی نے اِسے قبول کرنے کی ہمت کی تو وہ ایک ایسی بے بہا مثال پیش کرے گی جس کا نام ہمیشہ فخر و عزت سے لیا جائے گا۔ اور اگر بدقسمتی سے اُن میں سے کسی یونی ورسٹی نے بھی ہماری درخواست قبول نہ کی تو پھر ہم الگ یونی ورسٹی بنانے کا ڈول ڈالیں گے اور جہاں تک ہمارے امکان میں ہے ہم کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے اور پوری قوت اور ہمت صرف کردیں گے، اب یہ بات کہ یہ یونی ورسٹی کیسی ہوگی، کہاں ہوگی، اس کے لیے سامان کہاں سے مہیا ہوگا؟ یہ سب باتیں ہماری اساسی مجلس طے کرے گی۔

عبدالحق

معتمدِ اعزازی انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند)

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ رسالہ "اُردو" (ماہِ اکتوبر سنہ ۴۴ء) جس کی کتابت پوری ہوچکی تھی، جدید سرکاری احکام کی بنا پر نہ وقت پر شائع کیا جا سکا نہ مقررہ ضخامت قائم رکھی جا سکی۔ امید ہے کہ ناظرین ہمیں اس باب میں معذور تصور فرمائیں گے حکومت نے آخر اکتوبر میں جو منظوری دی ہے اُس کے مطابق رسالہ چھاپ کر شائع کیا جا رہا ہے اور امید ہے کہ آیندہ اشاعتوں میں قلم کو کسی قدر اور خفی کرکے رسالے کی ضخامت آٹھ جزیا کچھ اور زیادہ کردی جائے گی تاکہ مضامین کی مقدار میں حتی الامکان کمی نہ آنے پائے۔ رسالے کا کاغذ سرکاری اجازت کے مطابق استعمال کیا جا رہا ہے۔ فقط۔

(ادارہ)

وَ بہٖ نستعین

آغازِ مہم

(بہ قلم سیّد ہاشمی فرید آبادی)

ہر سمت سے منھ پھیر کے، باندھے ہوئے احرام
ہو کعبۂ مقصود کی جانب مرا اقدام
ہمت ہو یہ اندازۂ دشواریِ منزل
ملتا ہو صعوبت میں سفر کی مجھے آرام
چبھتے ہوئے کانٹوں میں ہو مہمیز کی تاثیر
اُفتاد میں رستے کی ہو برخیز کا پیغام
ایمائے گشایش مجھے ہر عقدۂ مشکل
پرواز کی تحریک مجھے ہر گرہِ دام
وہ مطمحِ عالی ہو مرے شوقِ گزیں کا
جاسکتی نہیں جس کی حدوں تک ہوسِ خام
اللہ نے تقدیر شکن دی مجھے تدبیر
اور عزم وہ محکم کہ جو ہوتا نہیں ناکام
صادق ہو طلب، پاک ہو دل، میری مہم کا
مسعود سرآغاز ہو مقبول سرانجام!

نیا اُردو ادب (۱۸۷۴ء تا ۱۹۴۴ء)

(بہ قلم جناب غلام یزدانی صاحب ناظم آثارِ قدیمہ حیدرآباد)

[اس موضوع پر ہم رسالہ 'اُردو' میں جناب عزیز احمد صاحب کے ایک سیرحاصل مضمون کی آخری قسط شائع کر رہے ہیں لیکن جناب غلام یزدانی صاحب جن کی فضیلتِ علمی اور کہنہ مشقی مسلّم ہو۔ یقین ہو کہ ان کے ذاتی تاثرات و نظریات کو خاص دل چسپی سے مطالعہ کیا جائے گا۔ ادارہ]

ہم نوا بہنو اور ہم طریق دوستو! جب سے میرا وظیفہ ہُوا ہو بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ مجھے کوئی شغل نہیں رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہو کہ مَیں پہلے سے زیادہ مصرُوف ہوں۔ فرق البتہ اتنا ضرور ہُوا ہو کہ پہلے مَیں آثارِ قدیمہ سے چمٹا ہوا تھا۔ اور اب وہ خود مجھ سے لپٹ گئے ہیں اور کسی طرح پنڈ نہیں چھوڑتے۔ اسی لیے اگر کوئی کرم فرما کسی ادبی علمی کام میں پھنسا دیتا ہو تو مَیں اسے خلاصی سمجھتا ہوں۔ آج کے مضمون کے لیے بھی مَیں اپنے دو محترم دوستوں کا شکرگزار ہوں۔ مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب جن کے حکم کی تعمیل میں آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اس وقت آثارِ قدیمہ کا کوئی تصرّف اور قبضہ میرے دل و دماغ پر نہیں ہو۔ نئے اُردو ادب کی ابتدا اور نوعیت پر بعض لائق مصنّفین بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ جن کی اجمالی کیفیت آپ رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب 'تاریخ ادبِ اُردو' یا پروفیسر عبدالقادر سروری کی عالمانہ تالیف 'جدید اُردو شاعری' میں شاید پڑھ چکے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہو کہ اُردو ادب کے اِس نئے دوْر کو آغاز ہوئے اگرچہ پوُرے ستّر برس گُزر چکے ہیں۔ تاہم پُرانی طرز کے دِل دادہ غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ، کے میدان میں قدما کے رنگ میں اب تک ڈوبے ہوئے ہیں۔

ور جو ان میں ذہن اور طباع ہیں ان کا کلام درد اور انسانی تاثرات کے اظہار میں، یا حقیقتِ نفس اور معرفتِ الٰہی کی جستجو میں، یا زندگی کے واقعات کو موثر پیرائے میں پیش کرنے میں، یا قومی یا انفرادی کارناموں کی سبق آموز داستان سُنانے میں دورِ جدید کی نظم سے کسی طرح کم نہیں۔ مثال کے طور پر میں دو شاعروں کا نام لیتا ہوں۔ حضرت جگر مرادآبادی اور حضرت امجد حیدرآبادی۔ یہ دونو قدیم طرز کے لکھنے والے ہیں۔ ایک غزل گوئی میں شہرہ آفاق ہیں اور دوسرے رباعی نویسی میں۔ کلام دیکھا جائے تو وہی پُرانی بحریں ہیں اور وہی الفاظ۔ لیکن ان کے اعلا خیال اور صنعت گر طبیعت نے اُنھی الفاظ کو اُلٹ پلٹ کر اس ترکیب سے سجایا ہے اور ایسے معنی پیدا کیے ہیں کہ انسانی زندگی کا ہر منظر ایک دل کش انداز میں آپ کے سامنے آجاتا ہے۔ اور عشق و محبّت کے سوز و گداز کے علاوہ فطرت کے راز اور مابعد طبیعات کی باریکیاں بھی آپ پر روشن ہوجاتی ہیں۔ میں پُرانی لکیر کا فقیر نہیں نہ نئی تحریکات کا دُشمن۔ بلکہ ہر نئی چیز میں تازگی کی چاشنی کے علاوہ میں ترقّی کی جھلک دیکھتا ہوں۔ میرا عرض کرنا صرف یہ ہے کہ آزاد اور حالی نے جب غزل گوئی اور پُرانی روش کو مذموم ٹھیرایا۔ اس وقت اُردو شاعری کی حالت بہت زبوں تھی۔ غدر کے بعد بیس پچیس[۲۵] برس میں علم و فضل کی جتنی شمعیں تھیں سب بجھ گئیں۔ جو لوگ شعر کہتے تھے وہ صرف نقّالی کرتے تھے۔ اِدھر مغربی زبانوں خصوصًا انگریزی نظم کی جگمگاہٹ نے ان مصلحین کی نظر کو خیرہ کردیا۔ اور انھوں نے اپنے خیال میں مغربی اسلوب کو پیشِ نظر رکھ کر آیندہ اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ حالاں کہ اس کی بنیاد کے لیے مسالا پہلے سے بہت کچھ فراہم ہوچکا تھا۔ نظیر اکبرآبادی تقریبًا انتی برس پہلے اپنے دناموں، میں تمدّن اور تہذیب، رسم و رواج، مذہب وحقیقت، عشق و وارفتگی، موسم و مناظر، غرض فطرت، قدرت اور معرفت کے ہر جلوے کو پیش کرچکے تھے۔ اور بحروں میں بھی تغیّر و تبدّل کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو کے قدیم قصیدوں میں بہاریہ رنگ، مثنویوں میں معاشرتی اور نفسیاتی کیفیات اور رباعیوں میں معرفت اور اسرارِ الٰہی کے خزانے پہلے سے موجود تھے۔ بہ ہرحال صاحبان انگریز کی تائید سے نئی نظم کی خوب سرپرستی ہوئی۔ نقد انعام ملے اور جتنے

پروفیسر اور ہیڈ مولوی نظم نویس تھے وہ تقریباً سب کے سب شمس العلما یا خان بہادر بن گئے۔ غزل بےچاری صاحب بہادر کی فہم سے بالاتر تھی۔ اس لیے اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ اور وہ مشرقی فنون لطیفہ کی طرح قابلِ التفات نہ سمجھی گئی۔ غزل گوئی حقیقت میں ایک کٹھن کام ہے۔ دو مصرعوں میں ایک پورا مضمون باندھ دینا۔ جس میں جوش بھی ہو ولولہ بھی۔ یاس بھی حرمان بھی۔ خوشی بھی راحت بھی۔ خیال کی دُنیا میں اسرارِ الٰہی کی تہ کو پہنچنا اور صحائفِ آسمانی کے دقیق نکات کی ترجمانی کرنا۔ پھر انداز بھی اچھوتا، ترکیبیں دل کش، زبان دل فریب، اور سب میں زیادہ قافیہ اور ردیف کا التزام رکھنا اور الفاظ کی لہروں سے ترنم پیدا کرنا، یہ مشرقی دماغ ہی کرسکتا ہے۔ اور مشرقی ذہن ہی اس کی داد دے سکتا ہے۔ باوجود نئی طرز کی نظموں کی عالم گیر مقبولیت کے مشاعرے غزل میں اب بھی نئی روح پھونکتے رہتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس سے غزل گوئی کے مُردہ ہونے کا اندیشہ نہیں۔ مشاعروں میں البتہ اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اوّل تو مَیں طرح کے مصرعوں کا قائل نہیں۔ مبتدی کے لیے یہ اچھی چیز ہوں۔ جس کو اساتذہ کے کلام سے قافیہ ردیفوں کے علاوہ مضمون بھی تقلید کے لیے مل جاتے ہیں۔ طرح کے مصرع کی مثال کٹ کھنوں کی سمجھنی چاہیے جن سے بچّوں کو لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ لیکن مشّاق طبیعتوں کو ایسی قیود کا پابند کرنا گویا ان کو بجائے جدّت کے نقالی سکھانا ہے۔ شاعری خلّاقی ہے نہ دریوزہ گری۔ اس طرح کے مصرع کی ابتدا شاید ایرانی بادشاہوں کے دربار سے ہوئی ہو۔ جو اُستادانِ فن کے کمال کو ایک ہی کسوٹی سے پرکھنا چاہتے ہوں۔ عام شاعروں کے لیے میری ناقص رائے میں طرح کا مصرع مانع ترقّی ہے۔ ہر شاعر کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنا تازہ کلام سُنائے۔ 'تازہ' کی شرط مَیں نے اس لیے عائد کی ہے کہ بعض صاحب اپنا دقیانوسی کلام لے آتے ہیں۔ اور نئے کے لیے جدّ و جہد نہیں فرماتے۔ متواتر جدوجہد اور کاوش ہی سے ترقّی کی امید ہوسکتی ہے۔ دوسری اصلاح مشاعروں میں داد دینے کے طریقوں پر ہونی چاہیے۔ بعض اُستادانِ فن مشاعرے میں اپنے شاگردوں کی ایک فوج لے کر آجاتے ہیں۔ اور ابھی اُستاد کے مُنھ سے آدھا مصرع بھی نہیں نکلتا یہ محفل کو سُبحان اللہ اور مرحبا کے نعروں سے

گونجا دیتے ہیں ۔ اور پھر کمال یہ کہ جب کوئی دوسرا شاعر اپنا کلام پڑھتا ہے۔ تو خواہ اس میں کیسی ہی خوبی اور لطافت ہو یہ ایسے چپکے بیٹھے رہتے ہیں گویا انھیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ اس بے ہودگی کی وجہ سے اساتذہ میں اکثر چشمک ہوجاتی ہے اور ابتذال پر اتر آتے ہیں ۔ میں چالیس پینتالیس برس کا ذکر کرتا ہوں ۔ اس وقت دہلی کی شریف بیگمات مشاعروں کو انھی لغویات کی وجہ سے منحوس سمجھنے لگی تھیں ۔ مثال کے طور پر اپنے گھر کا حال بیان کرتا ہوں ۔ سنہ ایک یا دو میں تیراہا بیرم خاں کے رہنے والے چند عزیزوں اور دوستوں نے میرزا فرحت اللہ بیگ کے مکان پر مشاعرے کا انتظام کیا۔ چوں کہ ہم کو رات کے وقت باہر جانے کی ممانعت تھی اس لیے میں نے اپنی والدہ سے چپکے سے پوچھا کہ فرحت اللہ بیگ کے مکان پر مشاعرہ ہو رہا ہے کیا میں بھی جاؤں ۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا ۔ '' اے ہے بہن حسن جہاں بیگم کو کیا ہوگیا کہ انھوں نے اپنے مکان پر مشاعرے کی اجازت دے دی '' میں نے کہا آخر ہرج کیا ہے فرمانے لگیں '' منحوس ہوتا ہے۔ دیکھو لال قلعے میں ہوتا تھا ۔ اس کا کیا حشر ہوا ۔ فلانے نواب کے ہاں ہوتا تھا ۔ اس کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی '' اُس وقت تو نحس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ انھی بے آئینیوں کی وجہ سے عناد اور رنجش کے بیج ایسی مجلسوں میں بو دیے جاتے تھے ۔ جن کے نتائج سے وہ بدنام ہوگئیں اور منحوس سمجھی جانے لگیں ۔ تذکرتاً جو حسن جہاں بیگم صاحبہ کا نام آگیا ہے تو میں ذرا واضح کردینا چاہتا ہوں ۔ یہ خاتون فرحت اللہ بیگ صاحب کی پھپی تھیں اور بڑی نیک صفات کی بیوی تھیں ۔ فرحت اللہ بیگ صاحب کی والدہ کا چوں کہ ان کی شیر خواری کے زمانے ہی میں انتقال ہوگیا تھا اِس لیے حسن جہاں بیگم صاحبہ نے ان کو نہایت محبت اور اُلفت سے پالا ۔ اور جتنی خوبیاں میرزا صاحب کے کردار میں نظر آتی ہیں یہ سب انھی نیک بیوی کے اخلاق کا پرتو ہیں ۔ ضمناً ایک بات اور سُنا دوں کہ فرحت اللہ بیگ صاحب نے بھی اس مشاعرے میں غزل پڑھی تھی جس کا ایک مصرع مجھے یاد رہ گیا ۔

ہم نے یہ پھبتی کسی لنگور پیراہن میں ہے

شعر کا پہلا مصرع آپ ان سے خود پوچھ سکتے ہیں۔ اس میں رقیبِ روسیاہ کا ذکر تھا۔ ان کی عمر اس وقت سولہ یا سترہ سال کی ہوگی۔ لیکن اس مصرع سے آپ ان کے مضامین کے مزاحیہ رنگ کا صحیح پتا چلا سکتے ہیں۔ داد دینے کے لیے ہمیں صائب کے مشہور شعر پر عمل کرنا چاہیے سے

صائبؔ دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ نا شناس و سکوتِ سخن شناس

صحیح قدردانی سے شاعر کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور اچھے کلام پر سامعین کا سکوت اس کے دل کو توڑ دیتا ہے۔ اگر کلام میں کوئی نقص یا لغزش ہو تو مناسب طریقے سے اس کو سمجھا دینا چاہیے لیکن بھری محفل میں مضحکہ اڑانا زیبا نہیں۔ جیسا کہ اکثر مشاعروں میں ہوتا ہے۔ کم از کم اس مجلس کے اراکین سے تو مجھے توقع ہے کہ وہ دادِ سخن میں نصفت پسندی اور صحیح ذوق کو کام میں لائیں گے اور عام مشاعروں کے اس بُرے رواج کو ترک کر دیں گے۔

نئے اسلوب کی نظم نے پچھلے پچاس ساٹھ برس میں خوب ترقی کی اور اقبال کی شاعری نے تو اس کو معراج پر پہنچا دیا۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مغربی تعلیم کا عام رواج، ایک بیرونی قوم کے راج کی وجہ سے ملک میں حُبّ الوطنی اور قومی ذہنیت کا پیدا ہو جانا، سیاسی اور اقتصادی کش کش، اور اس صدی کی تین عالم گیر لڑائیاں۔ حالات کا شاعر کے دل و دماغ پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور مُلکی اور قومی اُمنگیں اور جذبے چشموں کی طرح اُبل پڑتے ہیں۔ ان چشموں کے پانی کی روانی بے شک دل آویز ہوتی ہے لیکن جب تک ان کا منبع علم کی گہری سوتوں سے نہ ہو وہ پانی تھوڑی دور بہ کر خشک ہو جاتا ہے۔ اور اس کی سیرابی عالم گیر نہیں ہوتی۔ میں شاعر کی بصیرت کو بڑھانے کے لیے علم کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں اور انّ الشعراء تلامیذ الرحمٰن پر صرف اتنا عقیدہ ہے کہ ایسا شاعر جو اکتسابی علم سے مستغنی ہو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ شکسپیر اور ٹیگور خاص خاص زمانوں میں پیدا ہو جاتے ہیں لیکن ڈانٹے، ملٹن اور اقبال اگر اکتسابی علوم سے بہرہ ور نہ ہوتے تو ان کو وہ شہرت اور بقاے

(ن) دصف

عوام حاصل نہ ہوتی جو اب حاصل ہے۔ علم سے مشاہدہ اور تفکر کی تربیت ہوتی ہے اور کسی قوم یا ملک کی شاعری کو بہ حیثیتِ کُل جب ہم جانچتے ہیں تو اسی قوم یا ملک کا ادب ہمیں پیش نظر آتا ہے جو دولتِ علم سے زیادہ سرشار ہے۔

خدا کے فضل سے اس وقت ہندستان کے ہر حصّے میں نئی طرز کے اچھے شاعر موجود ہیں۔ پنجاب میں حفیظؔ جالندھری، اخترؔ شیرانی، تاثیرؔ دہلی میں فیضؔ۔ صوبہ جاتِ متحدہ میں جوشؔ، ساغرؔ اور خود حیدرآباد میں بہت سی نمایاں ہستیاں ہیں۔ جن کا کلام میں نے ریڈیو پر یا رسالوں میں یا ان کے مطبوعہ نظم کے مجموعوں میں پڑھا ہے اور جس کی تازگی، ترنّم اور جوش نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔ ان شعرا میں سے بعض خاصے کہنہ مشق ہیں مثلاً علی اخترؔ صاحب اور جناب فضل الرحمان صاحب اور نوجوانوں میں کوکبؔ، مخدومؔ، وجدؔ اور باقیؔ، فضل الرحمان صاحب نے تو پچھلے جلسے میں اپنی عالمانہ نظم "ابتدائے آفرینش" سُنا کر ہم سب کو بے حد محظوظ فرمایا تھا۔ اور بعض کے کلام سے ہم شاید آج مستفید ہوں۔ حیدرآباد کی بیبیوں میں بھی شعر و سخن کا ذوق ہے اور ہماری عزیز بہن لطیف النسا بیگم نے بچّوں کی نفسیات پر غور فرمانے کے بعد چند سبق آموز نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ایسے بچّوں کی ذہنی تربیت کے لیے بے حد مفید ہیں جو 'لوریوں' کی منزل سے گزر چکے ہیں۔

نئے زمانے کی شاعری کے ضمن میں ایک اور بات میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ ذوقی مسئلہ ہے اصولی نہیں۔ شاعری کا موسیقی سے گہرا تعلق ہے۔ موسیقی کی دو قسمیں ہیں ایک فقط گلے کی، چاہے آپ اسے لحن کہیں خوش الحانی اسی سے نکلا ہے۔ اور دوسری ساز کے ذریعے سے۔ اُردو شاعری میں غزل اور گیت کے ساتھ تو ساز لازمی ہے۔ کیوں کہ ساز سے ان کا اثر دوبالا ہوجاتا ہے اور بغیر اس کے وہ بالکل پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مذہبی نظموں کے ساتھ ساز ذرا بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں 'مثنوی مولانا روم' کو پیش کرتا ہوں جس کو بعض مغنّی بغیر ساز کے ایسے موثر طور سے پڑھتے ہیں کہ دل ہل جاتا ہے۔ خود ہمارے محلّے میں ایک صاحب حاجی قدرت اللہ نامی رہتے تھے۔ بڑی مقدس صورت تھی۔ لمبی حنائی ڈاڑھی، لبیں کتری ہوئی، روشن بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، گورا

رنگ ، چوڑا سینہ ، مدانہ قد ، نگینوں کا بیوپار کرتے تھے ۔ لیکن طبیعت سے صوفی منش تھے ۔ مثنوی اس خوش الحانی اور درد سے پڑھتے تھے کہ مجلس پہ سناٹا چھا جاتا تھا ۔ مَیں نے ان سے بہتر کسی اور کو مثنوی پڑھتے ہوئے نہیں سُنا ۔ اور میرا ذاتی خیال ہو کہ مثنوی مولانا روم اگر ساز کے ساتھ پڑھی جائے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوگا جو فقط لحن سے ہوتا ہو ۔ ساز پھر ایک مصنوعی چیز ہو اور مثنوی مولانا روم' ایک آسمانی صحیفہ ۔ مولانا جامی فرماتے ہیں ؎ 'ہست قرآں در زبانِ پہلوی' ساز کے حامی شاید زبور Psalms کی نظیر پیش کریں ۔ جن کا اثر کلیساؤں میں باجے کے ساتھ کئی گنا ہوجاتا ہو ۔ مَیں جواب میں کہوں گا ۔ کہ مذہبی عقیدہ ایک ذہنیت پیدا کردیتا ہو ۔ اسی وجہ سے تونس کے مغنّیوں سے جب مَیں نے سورۂ الرّحمٰن کو ساز کے ساتھ پڑھتا ہُوا سُنا تو مجھے بھلا معلوم نہیں ہُوا ۔ آپ نے بھی شاید اسی قسم کے عربی ریکارڈ سُنے ہوں گے جو فرانسیسی کمپنیوں نے تیار کیے ہیں اور مغربی اسلامی ممالک میں کثرت سے بکتے ہیں ۔ مجھے بعض بعض صورتوں میں شاعری اور غنا کو صرف ساز کی حد تک علاحدہ رکھنے کا خیال اس وجہ سے پیدا ہُوا کہ چند روز ہوئے حیدرآباد ریڈیو پر مَیں نے اقبال کا شکوہ اور جوابِ شکوہ قوالی کی دھن میں ساز کے ساتھ سُنا ۔ بعض طبائع کو پسند آیا ہو ۔ لیکن شکوہ کے لیے مَیں ڈھولک کی تال کو بے ٹھکا سمجھتا ہوں ۔ بہ ہر حال یہ ایک ذوقی مسئلہ ہو چوں کہ مولوی فضل الرحمان صاحب کے نفیس ذوق کا مَیں بے حد مدّاح ہوں اس لیے میری ان سے التجا ہو کہ وہ مذہبی اور قومی نظموں کے لیے ساز کے لزوم یا غیر لزوم پر غور فرمائیں ۔ حیدرآباد کو ان لطیف مسائل میں دوسرے اسلامی ممالک کی رہ نُمائی کرنا زیبا ہوگا ۔

اب مَیں نثر کے متعلق چند باتیں کہنا چاہتا ہوں ۔ نثر کی ترقّی کے لیے ہم کو انیسویں صدی کی ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کرکے اُردو نثر کو فارسی تعقیدات سے پاک کرنے کی کوشش کی ۔ جو ترجمے جان گل کرسٹ کی نگرانی میں ہوئے ان میں سلاست کا خاص خیال رکھا گیا ۔ پھر بھی غدر تک اُردو نثر میں مضامین کے اعتبار سے کوئی خاص ترقّی نہیں ہوئی ۔ جس کی وجہ زیادہ تر یہ بھی تھی کہ مغلیہ خاندان کے نام نہاد آخری تاج دار

تک سرکاری زبان فارسی رہی ۔ جو کتابیں اس زمانے کی ہیں وہ یا تو قصّے کہانیاں ہیں یا کچھ مذہبی تالیفات ۔ ایک دو اخبار بھی جاری ہوئے ۔لیکن ان کا اسلوب قدیم بادشاہی روز ناچوں کا سا تھا۔ تنقید یا ذاتی رائے کو کوئی دخل نہ تھا ۔ زبان البتّہ غدر کے قریب شستہ ہوگئی تھی جیسا کہ ان ابتدائی اخباروں کی تحریر یا غالب کے ۵۷ء کے بعد کے خطوط سے معلوم ہوتی ہے ۔ انیسویں صدی کے آخری پچیس سال میں اُردو نثر نے البتّہ بے حد ترقی کی ۔ صوبہ جاتِ متحدہ میں اس ترقی کا سہرا سرسید مرحوم اور اُن کے قابل رفقا کے سر پر زیب دیتا ہے ۔ اسی زمانے میں آزاد ، ماسٹر پیارے لال ، سید احمد اور بہت سے علما نے پنجاب میں ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی میں اُردو ادب کو مغربی علوم کی دولت سے مالامال کیا ۔ خود سرسید کے مضامین رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں اُردو ادب کا بہترین نمونہ ہیں ۔ یہ زمانہ انگلستان میں بھی مضمون نویسی کا تھا ۔ مولوی ذکاء اللہ نے بیکن ، سمائلس ، شیلی کے مضامین کو پیشِ نظر رکھ کر اور بہت کچھ ان کے خیالات کا ترجمہ کرکے اُردو ادب میں علمی اور اخلاقی مضامین کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ۔ مولوی نذیر احمد نے اخلاقیات اور افسانے کو سمو کر قصہ نویسی کا نیا ڈھنگ ڈالا۔ 'مرات العروس'، 'بنات النعش'، 'توبۃ النصوح' اس طرز کی بہترین تصنیفات ہیں ۔ ان میں اخلاقیات کے علاوہ امورِ خانہ داری ، عورتوں کی تعلیم اور سماجی اصلاح پر بھی نہایت پسندیدہ طریقے سے بحث کی گئی ہے مولانا حالی نے بھی عورتوں کے توہمات کو رفع کرنے اور ان میں تعلیم کو رواج دینے کے لیے 'مجالس النسا' لکھی ۔ ادبی حیثیت سے یہ 'بنات النعش' سے بہتر ہے ۔ لیکن نذیر احمد کی کتابوں کے مقابل میں اس کی زیادہ قدر نہیں ہوئی ۔ مولانا حالی کا بہترین کارنامہ اُردو نثر میں 'مقدمہ شعر و شاعری' ہے ۔ اس کتاب نے اُردو دان طبقے کو تنقید کے اصولوں سے روشناس کیا ۔ گو آزاد نے 'آبِ حیات' میں پچھلے تذکرہ نویسوں کی ڈگر کو چھوڑ دیا تھا اور اپنی جدّت اور ذوقِ سلیم کی مدد سے شعرا کے کلام کی نسبت بہت قابلِ قدر رائے دی تھی ۔ پھر بھی اس رائے میں گول گول الفاظ لکھنے کا قدیم رنگ موجود ہے۔ آزاد کے طرزِ تحریر کی نفاست البتّہ اُس زمانے کے اُردو لکھنے والوں میں ہمیشہ ممتاز رہے گی انگلستان میں بھی اس زمانے میں نثر کے لکھنے کے لیے الفاظ کی موزونیت اور ان کا تُزک و احتشام لازمی تھا

جو موجودہ صدی میں ترک ہوگیا ہو۔ آزاد انگریزی سے تھوڑے بہت ضرور واقف ہو گئے تھے۔ ان کی 'نیرنگ خیال' سے صاف عیاں ہو کہ بنین کی کتاب 'پلگرمس پروگریس' (Bunyan's Pilgrims Progress) ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ علمِ تنقید کے ایک اور امام سرسید کے رفقا میں مولانا شبلی تھے۔ ان کی شستہ اور مدلل تحریر نے اُردو ادب میں تاریخ کے لیے میدان صاف کردیا اور سیرت پر جو قابلِ قدر کتابیں ان کے لائق تلامذہ نے اعظم گڑھ سے شائع کی ہیں وہ سب شبلی ہی کے فیض کا نتیجہ ہیں۔ حالی نے بھی سرسید کے حالاتِ زندگی 'حیاتِ جاوید' میں لکھ کر اُردو نثر میں سوانح عمری لکھنے کا طریقہ بتایا۔ ادب کا ایک اہم شعبہ یعنی افسانہ انیسویں صدی میں پیدا تو ہوگیا۔ لیکن جن انگریزی ناولوں کے ترجموں پر اس کی بنیاد پڑی وہ نہایت ادنا درجے کی تھی۔ علاوہ ازیں خود اُردو زبان میں جو قصے رائج تھے وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے دُور ازکار ہونے کے سوا فحش اور بتذل بھی تھے۔ ہندستان کے رسم ورواج میں چوں کہ جوڑے کے خود پسند کرنے کا رواج اب تک مفقود ہو اس لیے ہیرو اور ہیروان کے عشق کی ابتدا اور اس کا نتیجہ مصنوعی ہی سا رہا۔ انیسویں صدی میں علوم وفنون پر بھی کتابیں تالیف ہوئیں جو مدرسے کے طالب علموں کے لیے تو بے شک مفید ثابت ہوئیں لیکن ان کی کوئی اہم ادبی حیثیت نہیں۔ پچھلی صدی کے مترجمین میں سید علی بلگرامی مرحوم کا اسمِ گرامی ضرور قابلِ ذکر ہو۔ انھوں نے مشہور فرانسیسی مصنف گی بان کی کتاب کا ترجمہ 'تمدنِ عرب' کے نام سے کرکے اُردوداں طبقے کو اسلامی فنون اور علوم سے مغربی زاویۂ نگاہ کے مطابق روشناس کرایا۔ ان کے ترجمے میں ایک خاص علمی شان ہو۔

بیسویں صدی میں اُردو ادب نے جو وسعت اور وقعت حاصل کی وہ حیرت انگیز ہو۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ ملک میں تعلیم کی ترقی، اس بات کا احساس کہ مادری زبان کے سوا غیر زبان میں مہارت حاصل کرنی نہایت دشوار ہو، قومیت کے جذبے کا نمو، اور سیاسی جدوجہد۔ انجمنِ ترقی اُردو نے مولوی عبدالحق صاحب کی نگرانی میں نہایت قابلِ قدر کام کیا۔ لیکن اس زمانے کا سب سے عظیم الشان کارنامہ عثمانیہ یونی ورسٹی کا قیام ہو جو اعلا حضرت بندگانِ عالی فرماں روائے دکن کی علمی

سرپرستی کی بدولت عمل میں آیا۔ اور جس نے اُردو زبان کو دُنیا کی اور علمی زبانوں کے ہم پلّہ بنادیا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں زبانِ اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جانا ایک بڑی مہم تھی لیکن اس کے سر ہوتے ہی اُردو کا غلبہ تمام مُلک پر چھا گیا۔ اور بعض کوتاہ نظر جماعتیں اس حقیقی مُلکی اور قومی زبان کے کتنے ہی مخالف ہوں لیکن ان کی کوشش اس کا بال بیکا نہیں کرسکتی۔ مَیں اس زمانے کی ادبی ترقی پر تبصرہ کرنے میں بعض علما اور ماہرین کا ذکر کروں گا لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میرا تبصرہ مکمل ہو اور جو نام مجھ سے چھُٹ گئے ہیں وہ مَیں نے دانستہ چھوڑ دیے ہیں۔ بلکہ یہ ایک سرسری تنقید ہو اوّل میں صحافت سے شروع کروں گا جو مُلک میں ہر قسم کی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ زبان میں اَدبی صلاحیت پیدا کرنے کا بھی اچھا ذریعہ ہو۔ اس ضمن میں مولانا محمدعلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کوشش خاص طور سے قابلِ ستایش ہو پنجاب میں ،پیسہ اخبار، اور ،وکیل، نے صحافت کا خاصا معیار قائم کردیا تھا۔ لیکن محمدعلی اور آزاد کی کوشش سے اُردو اخبار انگریزی اخباروں کی ٹکر کے ہوگئے۔ آزاد چوں کہ عربی کے فاضل ہیں اور مصری صحافت کا ان پر گہرا اثر تھا۔ اس لیے ' البلاغ ' کی زبان کا اثر تمام ہندُستان کی زبانوں پر پڑا اور ایک طرح سے اس اثر نے اُردو اور ہندی زبان کی خلیج کو اور وسیع کردیا۔ لیکن محمدعلی نے صحافت کے لیے ایک سلیس زبان کا نمونہ پیش کیا جس میں ان کے عالمانہ تبحر کی وجہ سے ،زور، اور ان کی خداداد شوخی کی وجہ سے 'لطافت' پیدا ہوگئی۔ محمدعلی کی تحریر کا نمونہ آپ آج کل کی صحافت میں قاضی عبدالغفار صاحب کے مضامین میں دیکھتے ہیں جو اس میدان میں مولانا مرحوم کے بہترین جانشین ہیں۔ تنقیدی ادب کی بنیاد جو حاؔلی اور شبلؔی نے ڈالی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے عالمانہ مقدموں سے اس کو اور استوار کیا اور پروفیسر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عابدحسین عابد، ، میرزا محمدسعید اور محمد مجیب نے مغربی اصولوں سے مزید استفادہ کرکے اپنے لائق پیش رووں کی بنیاد پر ایک مستحکم عمارت قائم کردی۔ چناں چہ حال میں جو کتابیں اُردو اَدب پر تالیف ہورہی ہیں ان میں تنقید کا معیار مغربی زبانوں کے معیار سے کم نہیں ہو سید اعجازحسین صاحب کی کتاب ،نئے اَدبی رجحانات، ڈاکٹر اخترحسین رائے پوری کی تالیف

، ادب اور انقلاب ، پروفیسر یوسف حسین خاں کی تصنیف ، رُوحِ اقبال ، جس میں شاعر کے کلام پر بہ حیثیت مفکر اور صنعت گر بحث کی گئی ہو اور ڈاکٹر رضی الدین کا اسی شاعر کے فلسفے کا گہرا مطالعہ موجودہ اُردو ادب کے تنقیدی معیار کی چند روشن مثالیں ہیں۔

ہندستان کی آب و ہوا گرم ہونے کی وجہ سے اس مُلک کے رہنے والوں کی طبیعتوں میں محبّت کے جوش کی کمی نہیں۔ اس لیے موجودہ اُردو ادب میں افسانوں کی بھرمار ہو۔ مَیں انیسویں صدی کے آخری دَور کی تنقید میں یہ عرض کرچکا ہوں کہ پردے کا رواج اب تک ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ مغربی ممالک کے رہنے والوں کی طرح اپنے جوڑے آپ تلاش کریں۔ تعلیم کی ترقّی سے پردہ رفتہ رفتہ اُٹھ رہا ہو اور ایک دن وہ اُٹھ کر رہے گا۔ لیکن اس رواج کو مٹانے سے پہلے ہم کو پردے کے قیام کی وجوہ پر غور کرلینا چاہیے۔ کردار کی پُختگی اور متانت اس رسم کو ہٹاسکیں گے۔ لیکن عریانیت کا جذبہ خرابیاں پیدا کرے گا اور پردہ زیادہ عرصے تک قائم رہے گا۔ افسانہ نگاری میں بھی کیفیاتِ زندگی کے بیان کرنے میں عفّت اور وقار کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ورنہ مجھے ڈر ہو کہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ادبِ لطیف کے بے باک نمونوں کی تقلید پر ہمارے اور افسانہ نگار بھی تعزیراتِ ہند کی زد میں نہ آجائیں۔ مُلک کے رسم و رواج کے مخالف ہونے کے باوجود منشی پریم چند سرگباشی نے افسانہ نویسی کے معیار کو نہایت خوش اسلوبی سے بلند کیا۔ غریبوں کی زندگی کے حالات اور سماجی خرابیوں کو انھوں نے بہت ہمدردی سے بیان کیا ہو اور جو انسانی خدمت انھوں نے اپنے افسانوں سے انجام دی ہو۔ وہ بڑے بڑے واعظین اور مصلحانِ قوم سے بھی پوری ہونی مشکل ہو۔ زبان اور فن کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے اعلا مرتبہ رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کے بعد موجودہ زمانے کے افسانہ نویسوں میں ایم۔ اسلم، سدرشن، نیاز فتح پوری اور اشتیاق حسین قریشی کے نام شمالی ہند میں اور مولوی فضل الرحمان اور قاضی عبدالغفار صاحب کے اسمائے گرامی حیدرآباد میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ریڈیو پر بھی افسانوں کے نمونے پیش ہوتے رہتے ہیں اور سینماؤں میں بھی ہم رات دن دیکھتے ہیں۔ یہ سب معاشرتی خرابیوں کے رفع کرنے کے

لیے اچھے ہیں۔ سنیما کے افسانوں کی بنیاد اکثر مذہبی قصص یا قومی روایات پر ہوتی ہو۔ جس کا اخلاقی اثر تو بے شک مفید ہوتا ہو۔ لیکن دیکھنے والوں کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتے جو اصلی زندگی کے واقعات سے ہوسکتا ہو۔ اور مغربی اور مشرقی افسانے میں صرف فرق یہی ہو کہ ایک ہر طرح سے زندگی کی اصلی کیفیات کا آئینہ ہوتا ہو اور دوسرے میں بڑا حصہ محض خیالی۔

یہ عربی مقولہ " المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام " تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ ادبِ لطیف کے لیے بھی ظرافت لازمی ہو۔ قدیم اُردو ادب میں یہ عنصر آپ عمر عیار کی حکایات اور مختلف چٹکلوں اور لطیفوں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری زمانے کی تالیفات میں یہ رنگ آپ کو رتن ناتھ سرشار کے 'خوجی' کی کردار میں اور 'اودھ پنچ' کے مضامین میں نظر آتا ہو۔ موجودہ زمانے کی مزاحیہ نثر میں سید امتیاز علی تاج کے 'چچا چھکّن' خوجی ہی کے نئے خیال والے صاحب زادے ہیں۔ لیکن میرزا فرحت اللہ بیگ کا مرتبہ اس فن میں اُستاد کا سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے مزاح کو اپنے معاشرتی مضامین کے تانے بانے میں اِس کمال سے بُن دیا ہو کہ لطافت کا ہر پھول اپنی جگہ پر موزوں نظر آتا ہو۔ اور مصنوعیت کا شائبہ نہیں رہتا۔ پطرس کے مزاحیہ مضامین میں بھی نفیس ذوق اور اعلا تفکّر پایا جاتا ہو۔ لیکن میرزا صاحب کی زبان کی شادابی، روانی اور چاشنی پطرس کی زبان میں کہاں۔ ظرافت کے لیے ذہانت کے علاوہ نہایت لطیف ذوق کی ضرورت ہو۔ جو ہر کس و ناکس میں ہونا مشکل ہو۔ اور اسی وجہ سے اکثر نام نہاد مزاحیہ نگاروں کی تالیفات محض بکواس ہیں۔ میرزا فرحت اللہ بیگ اور پطرس کے بعد اس رنگ میں نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی اور امتیاز علی تاج کے نام ذکر کرنے کے قابل ہیں۔ حیدرآباد کے مزاحیہ نگاروں کی فہرست اگر مرتب کی جائے تو اس میں میرزا عصمت اللہ بیگ کا نام ممتاز نظر آئے گا۔ یہ سرکاری رسالہ 'جیت' کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کا مشاہدہ اچھا ہو۔ لیکن خیالات کے اظہار میں لطافت اور پاکیزگی کا زیادہ خیال کرنے کی بجائے یہ اپنے قدر دانوں کو محاورے اور زبان کے چٹخارے سے ہنساتے ہیں۔

ادبِ لطیف کے لیے عورتوں کی بول چال، اور اسی میں ان کے خیالات کا اظہار، خاص

اہمیت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں مولوی سید احمد مؤلف "فرہنگِ آصفیہ" نے چند اچھی کتابیں شریف بیگمات کی زبان میں لکھی تھیں۔ موجودہ صدی میں میرے عزیز دوست آغا حیدر حسن نے اُردو نثر کے اِس موضوع پر خوب دِل کھول کر طبع آزمائی کی ہے۔ اور چوں کہ وہ دہلی کے ایک اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہاں کی بیگمات کی زبان میں معاشرت اور خانہ داری کی نہایت سچّی اور پُرلطف تصویریں کھینچی ہیں۔ آغا صاحب ہر فنِ لطیف کے دِل دادہ ہیں اسی وجہ سے ان کی تحریر کے بعض مرقعے بے شک لاجواب ہیں۔ ہمارے گھرانے کی ایک باندی نیفو نامی تھی۔ میاں نظام الدین اسے غدر کے بعد حیدرآباد سے لے گئے تھے۔ نسل سے وہ ہندن تھی لیکن اس کو اپنے حُسن پر بڑا ناز تھا۔ آغا صاحب نے اس کا حال اس خوبی سے لکھا ہے کہ میں سُن کر پھڑک گیا۔ شاید وہ آغا صاحب کی کسی کتاب میں چھپ بھی گیا ہے۔ حاضرین میں سے جو چاہے اس مضمون کو پڑھ کر لُطف اٹھا سکتا ہے۔

اِس صدی میں اُردو زبان کی علمی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے بعض قابلِ قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحق کی "قواعدِ اُردو"، اور اُنھی کے زیرِ نگرانی "اکسفورڈ کون سائز ڈکشنری" کا ترجمہ، مولانا وحیدالدین سلیم کی کتاب "وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ"، اور ڈاکٹر محی الدین قادری کی کی تالیف "لسانیات اور صوتیات"۔ میں نے صرف چند نام گنائے ہیں لیکن اسی قبیل کی اور کتابیں بھی مرتّب ہوئی ہیں۔ جن سے اُردو زبان کو علمی مرتبہ حاصل ہوجانے کے علاوہ اس کے لغت میں بھی بے حد وسعت ہوگئی۔

اُردو ادب کو ترقّی دینے اور زبان کو مانجھنے میں ماہانہ اور سہ ماہی رسالے بھی نہایت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ ابتدائی رسالوں میں "مخزن" اور "زمانہ" خصوصیت سے قابلِ ذِکر ہیں۔ "مخزن" کو سر عبدالقادر نے جاری کیا تھا۔ جن کو اب تک اُردو زبان اور ادب سے بے حد شغف ہے۔ اور وہ ملازمت کی مصروفیت کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنی محبوب مُلکی زبان کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ "زمانہ" منشی دیانارائن نگم کے زیرِ ادارت نکلا اور مرتے دم تک

منشی صاحب اس کے ایڈیٹر رہے ۔ آج کل بے شمار رسالے نکل رہے ہیں ۔ بعض ان میں نہایت اچھے ہیں بعض اوسط درجے کے بعض ناکارہ ۔ ان کے مقاصد کی نوعیت اور علمی اور ادبی معیار پر تفصیل سے بحث کرنا اِس مضمون میں ممکن نہیں ۔ کیا اچھا ہو کہ ہماری مجلس کا کوئی اور رکن اس موضوع پر اپنی عالمانہ رائے سے ہم کو آیندہ کسی اجلاس میں مستفید فرمائے ۔ اتنا البتہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُردو ادب کی موجودہ ترقی کے مدِّ نظر ہم کو ایک ایسے رسالے کی شدید ضرورت ہے جو سٹیڈ کے مشہور انگریزی رسالے " ریویو اوف ریویوز (Review of Reviews) کے مماثل ہو اور جس میں ملک کے تمام رسالوں کے اہم مضامین پر ایک جامع تبصرہ شائع ہوا کرے ۔ اس سے دو فائدے ہوں گے ۔ ایک تو یہ کہ اُردو ادب کے شائقین ملک کے تمام ادیبوں کے کارناموں سے آشنا رہیں گے ۔ اور دوسرے خود ان ادیبوں کو اپنے مضامین کے حُسن و قبح پر صحیح تنقید حاصل ہوجائے گی ۔ حیدرآباد میں اس وقت بہت سے ادبی اور علمی ادارے ہیں جو اپنی اپنی جگہ اُردو زبان کی ترویج اور ترقی کے لیے نہایت گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ ریویو اوف ریویوز (Review of Reviews) کے مثل اُردو کا تنقیدی رسالہ اگر حیدرآباد کے کسی ادارے کی زیرِ نگرانی شائع ہو تو مجھے بے حد مسرّت ہوگی ۔ کام نہایت اہم ہے اور اس کے لیے نہایت لطیف ادبی ذوق اور علمی تبحر کی ضرورت ہے ۔ ایسے رسالے کے شائع کرنے سے شاید آیندہ اُردو اکاڈیمی کی بنیاد کے لیے زمین صاف ہوجائے جو مشہور فرانسیسی اکاڈیمی کی طرح اُردو ادب اور زبان کے معیار کو ایک اعلا پیمانے پر پہنچا سکے ۔

گزشتہ چالیس برس میں ترجموں سے بھی اُردو ادب اور زبان کو قوت اور بالیدگی حاصل ہوئی ہے ۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے دارالترجمہ کا کارنامہ ہی کچھ کم شان دار نہیں ۔ لیکن شمالی ہند کے بعض اداروں اور علما نے بھی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ۔ ان ترجموں کی نوعیت دو قسم کی ہے ۔ ایک قسم نے اُردو زبان میں علوم و فنون کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن ان کی کوئی ادبی شان نہیں اور غیر مانوس الفاظ اور بے سلیقہ عبارتیں صاحبِ ذوق کے کانوں پر کھٹکتے ہیں ۔ دوسری قسم کے ترجمے اُن ادیبوں کے ہیں

جنھوں نے اپنے ذوقِ سلیم اور خوش مذاقی سے اُردو میں اجنبی زبان کے مضامین کو بہ اصطلاح مولوی سلیم الدین مرحوم "اپنا لیا" ہے۔ ان مترجمین میں مولوی عنایت اللہ مرحوم کا نام سب میں زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ مرحوم کے والدِ بزرگوار مولوی ذکاء اللہ صاحب نے جن کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں زبان کی شستگی کا ایک خاص معیار قائم کردیا تھا۔ سپوت بیٹے نے اس معیار کو کہیں اور زیادہ بلند کردیا۔ ان کے ترجموں میں وہ سلاست اور روانی ہے کہ یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ اصل کتاب ہے یا ترجمہ۔ مولوی عنایت اللہ کے بعد میں اس میدان میں ڈاکٹر عابد حسین کو سمجھتا ہوں۔ ان کے ترجمے میں بھی ادبی شان نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اصل کتاب کے مضمون کا مفہوم ایسی صفائی اور موزوں الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ ترجمہ ایک اصل تحریر معلوم ہونے لگتا ہے۔ ترجمہ ایک مشکل کام ہے اور خصوصاً علمی اور فنی کتابوں کا۔ بعض معترضین نے دارالترجمہ کی تالیفات پر عربیت کا الزام لگایا ہے۔ میں اصطلاح کی حد تک عربیت، سنسکریت یا انگریزیت کا قائل نہیں۔ اصطلاح کا صحیح مفہوم ادا ہونا چاہیے سو اگر اصطلاح بین الاقوامی ہے یعنی ہر ملک کی زبان میں ایک ہی استعمال ہوتی ہے تو اس کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر بین الاقوامی نہیں اور مختلف ممالک کی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے تو اُردو میں بھی اس کا ترجمہ کردینا چاہیے۔ اب واضعینِ اصطلاح کا فرض ہے کہ دیکھیں اس کا مفہوم کن مادّوں اور لفظوں سے اُردو زبان میں زیادہ عام فہم ہوسکتا ہے۔ اس قسم کے اصول، دارالترجمہ کے واضعانِ اصطلاح کے زیرِ نظر رہے ہیں۔ افراط تفریط ضرور ہوئی ہے جس کو ماہرینِ آیندہ درست کردیں گے۔ آج کل بڑی مصیبت یہ ہوگئی ہے کہ سیاسی جدّ و جہد نے ملک کی ایسی زبان کو جس نے یہیں جنم لیا اور یہیں پرورش پائی صرف چند غیر مانوس الفاظ کی خاطر جو بد مذاق طبیعتوں کے جذبے سے داخل ہوگئے ہیں ایک اجنبی زبان سمجھ لیا ہے۔ اور اُردو اور ہندی کو علاحدہ علاحدہ دو زبانیں سمجھنے لگے ہیں حالاں کہ دونوں کی ساخت ایک ہی ہے۔ لسانیات کے ماہر جانتے ہیں کہ زبانیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور کس طرح ان میں ترقّی ہوتی ہے۔ سنسکرت کو مرحوم ہوئے، ایک ہزار برس ہوگئے جن لوگوں کا یہ گمان ہے کہ ہندی کے ڈھانچ میں یہ دوبارہ زندہ ہوجائے گی محض خیال ہی خیال ہے۔ نہ عربی و فارسی الفاظ کی بھرمار سے اُردو

پروان چڑھ سکتی ہو۔ ہر زبان کی ترقی کے لیے علوم و فنون کا فیضان لازمی ہو جن کا ذخیرہ دو ہزار برس کی قدیم زبانوں میں بالکل محدود ہو۔ اس کے علاوہ زبان کو رونق اور شادابی فرتوت لفظوں کی ٹھوسم ٹھاس سے نہیں ہوتی ہو۔ بلکہ نئی قلمیں لگانے کے لیے ذوقِ لطیف کا مالی تازہ ثمردار درختوں اور مہکتے ہوئے پھولوں کے پودوں کی تلاش میں رہتا ہو۔ میں اُردو ہندی کے جھگڑے کو ایک عارضی بیماری سمجھتا ہوں جو سیاسی آب و ہوا صاف ہونے پر خود بخود زائل ہو جائے گی۔ ہمارے ہندو بھائیوں کی آبادی زائد ہونے کی وجہ سے اگر الفاظ کا ایک غیر مانوس ذخیرہ ملکی زبان میں داخل بھی ہوگیا تو مضائقہ نہیں کیوں کہ ادبِ لطیف میں صرف وہ اسی وقت شامل ہوسکتا ہو جب صوت اور ساخت اور معنی کے لحاظ سے وُہ گھل مل جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اُردو کے حامیوں کو ہراساں نہ ہونا چاہیے یہ زبان اب بڑ کا تناور درخت بن چکی ہو جس کی جڑیں اور شاخیں برابر پھیلتی چلی جاتی ہیں اور سیاسی آندھیوں سے اس کے اُکھڑ جانے کا ڈر نہیں۔

میں نے اپنے بُرے بھلے خیالات بیان کردیے لیکن آپ میری جرأت اور بے باکی پر خبر نہیں دل میں کیا کہ رہے ہوں گے کہ ساری عمر تو اس نے مٹی اور اینٹ کے گھروندوں اور رنگوں اور پتھر کی پتلیوں کی پوجا میں گزارے اور اب اُردو ادب اور زبان پر گفتگو کررہا ہو۔ خیر معاف فرمائیے۔ رخصت ہوتا ہوں۔ آداب عرض۔

ترقی پسند ادب (۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

[جناب عزیز احمد صاحب اُستاد ادبیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)]

حسرت موہانی کی عشقیہ شاعری کا نفسِ مضمون پُرانا اور روایاتی ہی اگرچہ اس میں غضب کی انفرادیت اور تازگی ہی، اور یقینی طور پر ہمیشہ یہی محسوس ہوتا ہی کہ شاعر کی رسم شاعری کچھ ہی ہو وہ اپنے دل کی بات کہہ رہا ہی۔ حسرت موہانی نے ہندستان کی تحریکِ آزادی کے سلسلے میں جو کچھ قربانیاں کی ہیں ان کا اثر، اور ایک طرح کا خلوص اور جوشِ کردار ان کی سیاسی شاعری کی جان ہی ؎

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہی تجھ کو آرزو ہمّتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز اُس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر

خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار فن و ہُنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہی گناہ کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر، اعتماد کر

ہی مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی اک طُرفہ تماشا ہی حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہے سزا دے لو، تم اور بھی کھُل کھیلو پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

باطن میں ہیں آزاد، بظاہر ہیں نظر بند ہی دیدۂ دل باز یہاں، دیدۂ سر بند

فیضِ محبت ہے قیدِ محن		میرے لیے ایک بلائے حسن

نیا جب اس نے کوئی شر اٹھایا		مری ایذا پسندی نے دعا دی

شبِ معراجِ مردانِ خدا ہے		بہ قولِ شیخ، روزِ نامرادی

مجازی عشق بھی ایک شے ہے لیکن		ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی

۱۹۲۴ء سے حسرت کی سیاسی شاعری پر اشتمالیت کا رنگ گہرا ہوگیا ہے

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی		نہ حکام کا جورِ بے جا رہے گا

زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں		کسی کا نہ محنت پہ دعوا رہے گا

جسے کہتے ہیں اہِمسا اک اصولِ خودکشی تھا		عمل اُس پہ، کوئی کہتا، نہ کبھی عوام کرتے

اور باوجود انتہائی مذہبی اعتقاد کے وہ یہ بھی کہتے ہیں ہے

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا، اہلِ سویت نے		دکھائی سب کو راہِ حریت بے خوفِ دیں ہوکر

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سویت		دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخہ		لینن کی طرح دیں گے نہ دُنیا کو ہلا ہم

لیکن اِس انقلاب کا سب سے بڑا نہیں تو مجموعی طور پر نمایندہ شاعر جوش ہے۔ جوش کی شاعری میں ابتدا ہی سے حریت پسندی کی طرف کچھ کچھ رجحان تھا اگرچہ کہ وہ ان کے خمرِ دائم کے بعد ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن حیدر آباد کی ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد، کچھ نفسیاتی وجوہ، اور شاید

طبعی رحجان کی وجہ سے انھوں نے عملی طور پر ترقی پسند مصنفین اور شاعروں کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے ان کی شاعری کو چار چاند لگ گئے ، اور ایک ذہنی نفسِ مضمون جس کی اُن کی لااُبالی شاعرانہ طبیعت کو بڑی ضرورت تھی ، انھیں مل گیا۔

جوشؔ کی شاعری میں بہت جوش و خروش ، اور ایک غیر معمولی ہمت اور مردانگی ہو۔ یہ مردانگی ان کی شاعری کی عظمت کی سب سے بڑی وجہ ہو۔ ہر طرح کی جسمانی اور ارادی کمزوری کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں ؎

مرد کہتے ہیں اُسے او مانگ چوٹی کے غلام جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام

اسی وجہ سے ان کے تشبیہات اور استعارات میں آتشِ سیال کا سا اُبال اور جوش پیدا ہوتا ہو۔ اِن استعارات کی حدّت اور نُدرت متحرک اور زلزلہ خیز ہو ؎

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہو ، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہو ، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہو ، بے نور ہو چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہو ، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اُن کو خبر تھی ، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چُرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا ، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں ، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

کون اِنکار کرسکتا ہو کہ ایسی نظموں کی پُرشوکت روانی ، اِن کے وزن ، ان کے الفاظ کی بے محابا ترتیب ، اِن کے جذبات کی خودسری میں انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ صاف سُنائی دیتی ہو۔ جوشؔ

کی ایسی نظموں میں جمالی قدر پُرانی، صاف، ستھری، پامال مثالوں سے نکل کر کثافت، بیماری، گندگی کو اپنے طلسمی انقلابی مَس سے جان دار، اور موضوعِ حُسنِ شاعری بناتی ہی۔ کیوں کہ ایک بار جب اس کثافت یا بیماری کی بے درد معاشی وجہ سمجھ میں آجائے تو اس سے نفرت باقی نہیں رہتی، اس کی جگہ ایک طرح کا غیظ و غضب، جوش اور غصّہ پیدا ہوجاتا ہی، جس کا مقصد اِس غلاظت کو صاف کرنا ہوتا ہی۔ جوش کی اِن نظموں کے اسلوب، ان کے طرزِ بیان اور ان کی اِس نوع کی تشبیہوں اور استعاروں کا بعض ہونہار نوجوان شعرا مثلاً احسان دانش اور مخدوم محی الدین پر اچھا خاصا اثر ہوا ہی۔

جوش کا ایک اور محبوب اسلوب "نظم تکرار" ہی۔ مسلسل غزل یا قصیدے کی تشبیب کی طرح، یہ نظم —— جسے سلیم مرحوم، آزاد انصاری اور خود جوش نے پروان چڑھایا ہی، کسی ایک موضوع کو مختلف اور متوازی مضامین یا تشبیہوں کی تکرار کے ذریعے ادا کرتی ہی۔ جوش نے بہت کام یابی سے اسے انقلاب کی خدمت کے لیے استعمال کیا ہی۔ مثال کے طور پر "نظامِ نو" ملاحظہ ہو جو میرے خیال میں ان کی Imagery کی اعلاترین مثال ہی۔ چند شعر یہ ہیں ؎

کھیل، ہاں اے نوعِ انساں، اِن سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بجولاں ہی تو کیا؟

چل چکی ہی پیشوائی کو نسیم باغِ مصر
آج یوسف، مُبتلائے چاہِ کنعاں ہی تو کیا؟

ختم ہوجائے گا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہی تو کیا؟

مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہی انقلاب
ابرِ غم، زلفِ جہاں پر بال جنباں ہی تو کیا؟

راہ میں ہی کارواں تشکیک اور تحقیق کا
آج اگر نادانیٔ اوہام و ایقاں ہی تو کیا؟

کل یہی بندہ، الوہیت سے ہوگا شادکام
آج اگر بہتانِ عبدیت پہ نازاں ہی تو کیا؟

کل جواہر سے گراں ہوگی لہو کی بوند بوند
آج اپنا خون پانی سے بھی ارزاں ہی تو کیا؟

آرہی ہی آگ لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی
آج راون کا محل، سیتا کا زنداں ہی تو کیا؟

دستِ غم خواری میں ہوگی کل زمامِ آب و نان
آج اگر نامہربانی میرِ ساماں ہی تو کیا؟

بن رہا ہی صرصرِ سیلاب خونِ ہاشمی
آج ابوسفیان کے گھر میں چراغاں ہی تو کیا؟

موت اگر اب تک رگِ جاں پر خراماں ہو تو کیا؟ ہو رہا ہو طبعِ فرمانِ حیاتِ جاوداں

نظم کی ساخت تضاد پر مبنی ہو۔ اس تضاد کو واضح کرنے کے لیے شاعر نے روایتی رمزیت، عبرانی قصص الانبیا، ارضیات، عورتوں کے سنگھار، جدید سائنس کے تجرباتی رُجحان، فلسفہ، جواہرات، رامائن، روایاتِ میزبانی، تاریخِ اسلام، اور زندگی اور موت کی کش مکش سے اپنے مقصد کے لیے تشبیہیں مستعار لی ہیں۔ تقریباً ہر تشبیہ نادر ہو، اور اگر کوئی نادر نہیں، تو ترتیبِ الفاظ اُسے نادر بنا دیتی ہو۔

جوشؔ جب شاعرانہ وجدان سے الگ ہو کے لکھتے ہیں، تو ان کی شاعری پُھس پُھسی اور "آورد" کی شاعری معلوم ہونے لگتی ہو۔ ان کے بلند کو، میں بہ غایت بلند تو نہیں کہہ سکتا مگر پستش بہ غایت پست کا اطلاق ان پر یقیناً ہوتا ہو۔ اقبالؔ کی طرح وہ شاعری میں ذہنی اور فلسفیانہ قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن چوں کہ وہ اقبالؔ کے عظیم الشان علمی پس منظر اور ذہنی پیش منظر سے محروم ہیں، اِس لیے جب جوشؔ گہرائیوں میں اُترنا چاہتے ہیں تو ان کی سطحیت اور نمایاں ہو جاتی ہو۔ باوجود اِن کے اس تمام جوش و خروش، اِس تمام اُبال اور شورش کے کبھی کبھی اُن کے خلوص، اور اُن کے عقیدے پر بھی شک ہوتا ہو۔ اِس کی وجہ جوشِ الفاظ کی فراوانی، لیکن جوشِ کردار کی کمی ہو۔ پھر بھی اُردو شاعری انقلابی نفسِ مضمون کو جاگزیں کرنے، اور تشبیہات میں ایک ہل چل سی مچا دینے کی وجہ سے انھوں نے اپنے لیے ایک لازوال جگہ پیدا کرلی ہو۔

فیضؔ کی شاعری "دِلے بہ فروختم جانے خریدم" کہہ کے انقلاب کے ماحول میں قدم رکھنے کی کوشش کر رہی ہو، لیکن خرید و فروخت کا یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہو چکتا ہو۔ عاشقی اور انقلاب کا درمیانی خطِ فاصل، جس کو وہ پار کرنا چاہتے ہیں، کسی طرح پار نہیں ہو چکتا۔ اُن کی شاعری عشق اور انقلاب کے درمیان ایک گُریزِ مسلسل بن گئی ہو۔ "حُسنِ محبوب کا سیّال تصوّر" کسی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ وہ ہمہ وقتی طور پر انقلاب کی خدمت کرسکیں۔ "مجھ سے پہلی سی محبّت مرے محبوب نہ مانگ"

"سوچ"، "رقیب سے"، "چند روز اور مری جان"، "موضوعِ سخن"، "ہم لوگ"، "مرے ہم دم مرے دوست" سب کا موضوع ایک ہی سا ہے۔ شاعر کی طبیعت کی اس ختم نہ ہونے والی کش مکش میں عشقیہ زندگی کے نقوش ہیں ——— جن کو شاعر بھلا دینا چاہتا ہے، اور بھلا نہیں سکتا ——— زیادہ سچے، واضح، اور دل فریب معلوم ہوتے ہیں ؎

یہ ترے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد | اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد | دل کی بے سُود تڑپ، جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

یا "موضوعِ سخن" کا یہ حصّہ ؎

آج پھر حُسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی | وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار | صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

یا "مرے ہم دم، مرے دوست" کا یہ ٹکڑا ؎

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم | گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش | دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور | یک بہ یک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے جھکتی ہے سرِ شاخ سے خود برگِ گلاب | کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے

اس میں کیا شک ہے کہ اس شخص نے واقعی عاشقی کی ہے، اور عشق اور دیدارِ حُسن کے ہر لمحے سے ایسا جمالی حظ حاصل کیا ہے کہ وہ لاکھ اس سے گریز کر کے خالص جوشیلی انقلابی شاعری کو اپنا مسلک بنانا چاہے، وہ اپنے تجربوں کو نہیں بھول سکتا

لیکن میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری کا انقلابی پہلو ناکام یاب ہے۔ نامکمل سہی، مگر ناکام یاب ہرگز نہیں عشق سے انقلابی جذبہ سبق بھی لے سکتا ہے۔ اپنے رقیب سے فیض یہ کہتے ہیں ؎

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے؟ | جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی ، غریبوں کی حمایت سیکھی — یاس و حرمان کے ، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا — سرد آہوں کے ، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

ان کی خالص انقلابی نظموں میں سب سے زیادہ تعمیری، میرے خیال میں "بول" ہو سے

دیکھ کر آہن گر کی دُکاں میں — تند ہیں شعلے ، سُرخ ہو آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے — پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہو — جسم و زباں کی موت سے پہلے

فیض کی شاعرانہ تشبیہوں اور تصویروں کا زندگی کی رفتار سے بہت گہرا تعلق ہو ، یہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی کام یابی اور خصوصیت ہو ۔ "تنہائی" اور "موضوعِ سخن" میں جو غالباً ان کی بہترین نظمیں ہیں یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہو ۔

"تنہائی" میں استعارتاً گرد و پیش کا سارا ماحول شاعر کا ساتھ دیتا ہو سے

ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا تاروں کا غبار — لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار — اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سُراغ

استعاروں کی سحرکاری ، شاعر کے جذبے کا اتنا ساتھ دیتی ہو ، کہ خارجی اور داخلی احساس ایک ہوجاتے ہیں ۔ اور فطرت اور انسان میں ایک حقیقی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہو ۔ اسی طرح "موضوعِ سخن" میں یہ تشبیہ سے

اُن کا آنچل ہو ، کہ رخسار ، کہ پیراہن ہو ! — کچھ تو ہو جس سے ہوئی جاتی ہو چلمن رنگیں

اِس ایک شعر میں رمزی تشبیہ کی وجہ سے مشرقی شاعری کی حیاتِ معاشقہ کی صدیاں آباد ہیں ۔ کتنی پابندیاں کتنے روک ، کیسا صدیوں کا مسخ شدہ جمالی معیار اِس شعر کے باطن سے جھانکتا ہو ۔ یہ غالباً فیض کا بہترین شعر ہو ۔

ن ۔ م ۔ راشد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہو کہ اُنھوں نے نظمِ آزاد کو اُردو میں مقبول کیا ۔ نظم

اری کے تجربے اُردو میں کچھ عرصے سے ہو رہے تھے۔ طباطبائی اور بجنوری مرحوم نے اس سلسلے میں کوششیں کی تھیں۔ لیکن نظمِ عاری کا سب سے کامیاب نمونہ عابد نواز جنگ کا "ہیملٹ" کے کچھ حصّوں کا ترجمہ ہے۔ نظمِ آزاد نظمِ عاری سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ عام اُردو شاعر یا ناظر دونوں کو تقریباً ایک ہی سمجھتا ہے۔

انگریزی اور امریکائی شاعری میں "نظمِ آزاد" (Free verse) کا تحریک تصوریت Imagism کے ساتھ زور بندھا۔ یہ تحریک، فرانسیسی رمزیت کے ابہام اور سہل پسندی کا ردِ عمل تھی۔ لیکن اس کی نظمِ آزاد فرانس ہی کے شعرا یعنی فرانسیسی اور بالخصوص لافورگ Laforgue کی [illegible] کی مرہونِ منّت ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جس نے نظمِ آزاد کو سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا فرانسیسی نظمِ آزاد اور عہدِ الزبتھ کی انگریزی نظمِ عاری میں تقریباً وہی خصوصیتیں دیکھتا ہے اور دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے۔ "لافورگ — جو یقیناً بہت اہم تکنیکی موجد تھا — کی نظمِ آزاد، زیادہ تر اسی طرح کی نظمِ آزاد ہے، جیسے شکسپیر، ویبسٹر، ٹرنر کا آخری دور کا کلام نظمِ آزاد ہے۔ عہدِ الزبتھ اور جیکوبین زمانے کی شاعری، نظمِ عاری کی بحر کو پھیلاتی ہے، سکیڑتی ہے، اُس کی شکل بگاڑتی ہے۔"

اُردو شاعری میں اظہار کی آزادی کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اگر راشد صاحب نہ بھی لکھتے تب بھی ایک طرح کی نظمِ عاری یا نظمِ آزاد کی مقبولیت ضروری تھی۔ لیکن راشد صاحب نے اِس طرز کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اِس نظمِ آزاد کو قافیے اور ردیف سے بالکل بے نیاز نہیں کر سکے۔ جا بہ جا اُن کو قافیے اور ردیف کا سہارا لینا پڑتا ہے ؎

تیرے رنگیں رَس بھرے ہونٹوں کا لمس
جس کے آگے ہیچ جرعاتِ شراب
یہ سنہری پھل، یہ سیمیں پھول مانندِ سراب
سوزِ شمع و گردشِ پروانہ گویا داستاں
نغمۂ سیارگاں، بے رنگ و آب
قطرۂ بے مایہ طغیانِ شباب

ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی ۔ اور حیرت ہونے لگتی ہے کہ کیا واقعی اُردو نظم نے بحر و قافیے سے وہ آزادی حاصل کرلی، جس کی وہ عرصے سے جویا تھی ؟۔ یا کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ پابندی اور بڑھ گئی۔ اور اگر یہ بات ہے تو نظمِ آزاد کو ابھی اور زیادہ آزادی کی ضرورت ہے ۔ راشد صاحب کی نظمِ آزاد، نظم میں وہ روانی اور سلاست بھی نہ پیدا کرسکی، جو اس کی سب سے بڑی وجہِ جواز ہے، مغلق ترکیبیں جو نامانوس بھی ہیں راشد صاحب کی نظم کا دوسرا سہارا ہیں ۔ اوپر کی مثال ہی میں دیکھیے " قطرۂ بے مایہ طغیانِ شباب"۔ اسی طرح " مژ تازہ و ناب" ، "ساعتِ دزدیدہ و نایاب" ، "بسترِ سنجاب وسمور" اور ایسی بیسیوں ترکیبوں سے راشد صاحب کی نظم ذہنی اور شعری سہارا لیتی ہے ۔ اس طرح وہ نظم کا ذہنی وزن بڑھانا چاہتی ہے، اور یہ اس کی کمزوری کی نشانی ہے ۔

بحیثیت طرزِ اظہار نظمِ آزاد کی کامیابی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ اس میں رمزیت کو پیش کرنے کی بڑی صلاحیت ہے ۔ "خودکشی" اور "زنجیر" میں راشد صاحب نے اپنی نظموں کو رمزیت کا رنگ دیا ہے۔ مثلاً "خودکشی" کے یہ حصے ؎

"شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا مَیں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہوجاتی تھی دوبارہ بلند"

محاورے کی خامی سے قطعِ نظر، اِس ٹکڑے میں رمزی جدت ہے، اُس سے زیادہ کامیاب یہ ٹکڑا ہے ؎

"آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے مَیں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج مَیں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو
بوئے مَے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی "

"زنجیر" میں پوری نظم کا بنیادی رمز زنجیر ہے۔ پہلے بند کی رمزیت کی تشریح دوسرے بند کی رمزیت اور نیم تشریح سے، اور تیسرے بند کی صاف تشریح سے ہوتی ہے۔

ان کی نظمِ آزاد میں غیرمانوس خیالات کے بیان اور ان کے پیہم اظہار کی بھی صلاحیت ہے۔ "تجرباتِ پرواز" کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

"میرے سینے ہی میں پنہاں رہیں آہیں میری
کرسکیں روح کو عریاں نہ نگاہیں میری!
ایک بار اور محبت کرلوں
سعیِ ناکام سہی
اور اک زہر بھرا جام سہی
میرا یا میری تمناؤں کا انجام سہی
ایک سودا ہی سہی، آرزوے خام سہی"

نظمِ آزاد میں قافیے اور ردیف کی سخت پابندی سے نجات مل جانے کی وجہ سے نئی طرح ٹھوس تشبیہیں اور استعارے اپنا راستہ تلاش کرلیتے ہیں۔ یہ تشبیہیں، چلتی پھرتی زندگی سے آئی ہیں، کبھی ان میں مشاہدہ اور احساس ایک ہوجاتا ہے جیسے

تیری مژگاں کے تلے نیند کی شبنم کا نزول
جس سے دھل جانے کو ہے غازہ ترا۔ ("اتفاقات")

تیرے سینے کے سمن زاروں میں اٹھیں لرزشیں
میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کے لیے ("ایک رات")

عشق کا ہیجان، آدھی رات اور تیرا شباب

تیری آنکھ اور میرا دل
عنکبوت اور اُس کا بے چارہ شکار ("آنکھوں کے جال")

یا

شمع کے سائے سے دیوار پہ محراب سی ہے ("عہدِ وفا")

کبھی کبھی ان تشبیہوں میں سچی جدت اور ندرت بھی نظر آجاتی ہے ؎
رقص کی یہ گردشیں
ایک بہم آسیا کے دور ہیں ("رقص")

اور

نیند، آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے
اپنے پر تولتی ہے، چیختی ہے! ("بے کراں رات کے سناٹے میں")

اس نظمِ آزاد کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ایک ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سی لغزش سے اس پر مضحکہ خیز نثریت پیدا ہوجاتی ہے۔ مثال کی طور پر "خودکشی" میں یہ حصّہ ؎

"جی میں آئی ہے لگادوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوے و بام کو"

یہی وجہ ہے کہ اس کثرت سے نظمِ آزاد کی نقل اُتار اُتار کے ہنسی اُڑائی گئی ہے۔ کنھیالال کپور اور چراغ حسن حسرت کی نقلیں خصوصیت سے بہت دل چسپ ہیں، اور مُصلح بھی ہیں۔

لیکن تکنیک ہی پر ن۔م۔راشد کی ساری خوبیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ ترقی پسندی ان کی کچھ ہی نظموں میں ہے مثلاً "شرابی"، "زنجیر"، "دریچے کے قریب" اور وہ بھی ذرا کم کم۔ صرف ایک آدھ جگہ اس میں حقیقت جھلکتی ہے، "دریچے کے قریب" میں ؎

"دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پنہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں !
اِن میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دُلھن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ، ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے
اِن میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں"

لیکن چند مثالوں سے قطع نظر اُن کی شاعری اور طبیعت کا مجموعی رُجحان زندگی کی کش مکش سے گریزاں اور مفرور ہے اور رجعت کی طرف مائل ہے۔" وادیٔ پنہاں" میں انھیں ایک ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں خیر و شر کے تصوّرات نہ ہوں۔ "رقص" میں وہ اپنے فرار، اپنی بےطاقتی کا صاف صاف اقبال کرتے ہیں ؎

"بندگی سے اِس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر مَیں جھپٹ سکتا نہیں !"

اِس کی وجہ یہ ہے کہ صرف دو طاقتیں ان کے دل و دماغ پر مسلّط ہیں۔ جنس، اور جنسی تشنگی کی وجہ سے خواہشِ مرگ۔ جنس اُن کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے "اجنبی عورت" کو

پڑھ کے شک ہونے لگتا ہو کہ جنس میں محویت ان کے نزدیک اکتساب کائنات کا واحد ذریعہ ہو۔ "حزنِ انسان" سے معلوم ہوتا ہو جنس ہی کی وجہ سے انھیں تصوریت سے دشمنی ہو۔ راشد صاحب کے نزدیک تصوریت کا واحد قصور یہ ہو کہ وہ جنس پرستی کو دھوکا دیتی ہو ؎

آہ انساں کہ ہو وہموں کا پرستار ابھی
حُسن بے چارے کو دھوکا سا دیے جاتا ہو
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کیے جاتا ہو
مُسکرا دے کہ ہو تابندہ ابھی تیرا شباب
ہو یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب

اِسی ہمہ گیر جنس پرستی، جسم پرستی کی روشنی ہی میں راشد صاحب فطرت کو دیکھتے ہیں اور اِس طرح ایک سہل انکار لا ادریت کی طرف ان کا قدم اُٹھتا ہو ؎

پھول ہیں، گھاس ہو، اشجار ہیں، دیواریں ہیں
اور کچھ سایے کہ ہیں مختصر و تیرہ و تار،
تجھ کو کیا اس سے غرض ہو کہ خدا ہو کہ نہیں؟

یہ لا ادریت اس وقت دہریت بن جاتی ہو، جب راشد صاحب یہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے نام پر بنائے ہوئے تمام مذہبوں میں ــــ انسان کی ہزارہا سال کے مرتب کیے ہوئے قانونِ اخلاق کی حد تک تو وہ افلاطون کو جواب دے ہی چکے ہیں ــــ جنس کو قدرِ واحد اور زندگی کی سب سے بڑی حقیقت نہیں سمجھا جاتا۔

میری رائے میں راشد صاحب کی اِس بے حد و انتہا جنس پرستی کی تہ میں ایک گہرا جنسی احساسِ کمتری ہو۔ "رقص"، "اجنبی عورت" اور "انتقام" میں یہ جنسی احساسِ کمتری خصوصیت سے نمایاں ہو۔ "دیوارِ رنگ" اصل میں خود ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہو۔ اِسی لیے وہ ایک سفید فام عورت سے ہم بستر ہونے کو قومی انتقام سمجھتے ہیں۔ اگر انتقام اتنا سہل اور اتنا لذیذ

ہوتا تو کیا کہنے۔ لیکن احساسِ کمتری کے سوا بھی، مجھے تو یہ بڑا ہی بورژوا انتقام معلوم ہوتا ہے جس کی تعریف کیمونسٹ مینی فسٹو میں یوں کی گئی ہے۔ "وہ ایک دوسرے کی بیویوں کی عصمت ریزی میں انتہائی لذت محسوس کرتے ہیں" ظاہر ہے کہ یہ مریضانہ جنس پرستی کوئی حقیقی قوتِ تخلیق نہیں اس لیے اُس کا منتہا ایک طرح کی مرگ انگیز رومانیت ہے ؎

"صبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آئے
اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ رہیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہوجائے ("اتفاقات")

جس زندگی میں جنس کے برابر اور کوئی قدر نہ ہو، اُس میں موت کی خواہش ضروری ہے۔ یہ فرار کی انتہا ہے۔ چناں چہ راشد صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام کی مریضانہ جنس پرستی کا خاتمہ "خودکشی" پر ہوتا ہے۔ اِس صدی کے سب سے بڑے شاعر نے سچ لکھا ہے ؎

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں جو ہوا نالۂ مرغانِ چمن سے مدہوش

راشد صاحب کی بہت سی نظمیں سترھویں صدی کے انگریز METAPHYSICAL شعرا سے ماخوذ ہیں۔ ماخوذ اِس طرح ہیں کہ مرکزی خیال ان نظموں سے لیا گیا ہے، مگر اس کی تجدید کی گئی ہے یعنی اس خیال کو راشد صاحب نے اپنی للّوپتّی جنس پرستی پر منطبق کیا ہے۔ اور اِن نظموں کی تمام وجدانی خصوصیتوں اور جمالی خوبیوں کا خون ہوگیا ہے۔ چناں چہ "حزنِ انسان" ایک حد تک DONNE کی نظم EXTASIE سے متاثر ہے۔ اِسی طرح "سپاہی" ڈن کی سولھویں ELEGIE کی ایک جدید شکل ہے۔ "زوال" MARVELL کی نظم TO HIS COY MISTRESS سے ماخوذ ہے۔ لیکن راشد نے کہیں خیال یا موضوع کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

اسرار الحق مجاز نے شاعری کو انقلاب پر قربان نہیں کیا ۔ وہ کر بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ

تغزل ہی سے اُن کی شاعری کا خمیر بنا ہی۔ اُن کی دو ابتدائی غزلیں جو شاؔد کے رنگ میں ہیں بہت اچھی ہیں۔ عشقیہ شاعری ان کا فطری موضوع ہی اور اِسی میں وہ جدّت طرازیاں دکھاتے ہیں۔ مشاہدے اور بیان کی نُدرت کبھی کبھی لطف دے جاتی ہی۔ جیسے "بتانِ حرم" میں یہ شعر ؎

آہ وہ دوشیزہ لب، مخمل ریزہ لب، مخمل نار لب آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خوں بار لب

انقلابی رجحانات میں آزادیٔ نسواں پر انھوں نے بہت زور دیا ہی۔ یہ ان کے لیے ایک نفسیاتی اور جمالی ضرورت بھی ہی۔ "نوجوان خاتون سے" اپنے لُطفِ استدلال اور شوخی کے باعث بہت دلچسپ ہی ؎

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہی تو اِس نشتر کی تیزی آزمالیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تونے سر اُٹھایا بھی تو کیا حاصل بھری محفل میں آکر سر جھکالیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہی لیکن تو اِس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

عورت کی عصمت اور عمل دونوں کی روح پردے میں نمایاں نہیں ہوسکتی ؎

قسم شوخیٔ عشقِ سنجوگتا کی
قسم جونؔ کے عزمِ صبر آزما کی
قسم طاہرؔہ کی قسم خالدؔہ کی

کوئی اور شے ہی یہ عصمت نہیں ہی

"رات اور ریل" "خانہ بدوش" اور "خوابِ سحر" اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن مجاز کی بہترین نظم "آوارہ" ہی۔ یہ نظم اُن کے انقلابی عقیدے اور تغزل کے امتزاج سے بنی ہی۔ اس کی رومانیت انقلابی ہی۔ "آوارہ" ایک خالص رومانی فرد ہی۔ چناں چہ انیسویں صدی کے جرمن اور انگریزی رومانی دَور میں بھی WANDERER اور WANDERLUST کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ اب ہمارے ترقی پسند ادب نے "آوارہ" کو اپنالیا ہی، اور اپنی انقلابی رومانیت کی ایک ممتاز شخصیت بنایا ہی کرشن چندر کے ایک ڈرامے "نیل کنٹھ" میں بھی "آوارہ" ہی حقیقی انسانیت کا نمایندہ بتایا گیا ہی۔

اقبال کے قلندر کی انقلابی رومانی صورت ہے۔ مجاز کی اس نظم کا زاویۂ نگاہ شاعر کا داخلی احساس ہے۔ اسی لیے منظر کا احساس فوراً داخلی بن جاتا ہے ؎

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اُٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

"غمِ دل" اور "وحشتِ دل" بھی داخلی احساسات ہیں۔ "آوارہ" کی ذہنی بغاوت کی محرک شہر کی سرمایہ دارانہ خارجیت ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے کو بے گانہ اور آوارہ محسوس کرتا ہے ؎

بڑھ کے اِس اندرسبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز کے سوا یوپی کے دو ایک اور ترقی پسند شاعر قابلِ ذکر ہیں۔ جذبی کے اِس ایک شعر کو یاس پسند ہندستان کے پورے طول و عرض میں لافانی شہرت حاصل ہوچکی ہے ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی		اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

مجازی کی کچھ نظمیں مَیں نے اِدھر اُدھر رسالوں میں دیکھی ہیں، کچھ ان کی زبانی سُنی ہیں۔ یاس کا رنگ، اور موت کا خوف غالب ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "فروزاں" زیرِ طبع ہے، جب تک اُن کا پورا کلام پڑھ نہ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ اِسی طرح علی جواد زیدی کے کلام سے بھی، بجز ان کی چند نظموں کے جو سری نگر میں ان کی زبانی سُنی تھیں، مَیں واقف نہیں۔

احسان دانش کا مزدور طبقے سے تعلق رہا ہے۔ اِسی وجہ سے اُن کے کلام میں درد اِس قدر ہے کہ

وہ فن کی باریکیوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ ان کی شاعری مرثیہ گوئی ہی، اس میں حد سے زیادہ وقت سہی، لیکن اُن کے جذبات سچّے اور درد میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تمام اصنافِ شاعری میں سے مرثیے اور نوحے کا ان پر سب سے زیادہ اثر ہی اور اس کو وہ مزدور کے لیے استعمال کرتے ہیں ـــــ مرثیے اور نوحے کے اسلوب یا شکل کو نہیں، اُس کے طرزِ اظہار کو۔ مرثیوں کی طرح اُن کے درد میں بھی ایک طرح کی بےبسی ہی۔ کیوں کہ مزدور طبقے کی بےبسی کو انھوں نے خود دیکھا اور خود محسوس کیا ہی۔ "مزدور کی عید"، "مزدور کی دیوالی"، "برسات اور مزدور" اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

کبھی کبھی جوش و خروش میں وہ مزدور کی بےبسی کا موضوع بھول کے، جوشؔ کے سے اشتعال و خروش سے لکھتے ہیں جیسے "باغی کا خواب"۔ اس میں مولویوں کا ذکر ان الفاظ میں ہی۔ ؎

ان کے ایمانوں میں رخنے تھے دغا میں داغ تھے — دل تھا ناقص دامنِ صدق و صفا میں داغ تھے

خانقاہوں میں دلوں کا مدعا بکتا رہا — مدتوں ان کی دکانوں میں خدا بکتا رہا

اسی طرح "اپنے شکاری دوست" میں وہ جنگل کے خوں خواروں کو بستی کے خوں خواروں کے مقابلے میں بہت غنیمت بتاتے ہیں ؎

یہ کبھی آبادیوں میں آ کے غراتے نہیں — یہ کسانوں اور مزدوروں کا حق کھاتے نہیں

ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں شقی دل، گرگ خو — چوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہ رگ کا لہو

ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں جو باصد احتشام — کالجوں میں نوجوانوں کو بناتے ہیں غلام

ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں جو عشرت کے لیے — دام پھیلاتے ہیں، بیواؤں کی عصمت کے لیے

لاکھ حیواں ہوں اُخوت کو یہ کھو سکتے نہیں — شیر چیتے ایسے بے انصاف ہو سکتے نہیں

احسان دانشؔ کے قطعات، نئی اور اچھوتی تشبیہات سے پُر ہیں۔ شاعری کی حد تک یہ اُن کا ایک کامیاب کارنامہ ہی۔ کبھی کبھی وہ مناظرِ قدرت کی بڑی رنگینی سے تصویر کھینچتے ہیں۔

ایک طرح کی انقلابی حقیقت نگاری ان کی بعض نظموں میں پائی جاتی ہی جیسے "ہسپتال" جس

کے دو پہلو انھوں نے واضح کیے ہیں ۔ ایک طرف تو امیر مریضوں پر ڈاکٹروں کی پوری توجہ ؎

کہیں تپ دق کی جاں گزاری تو اں کے سانچوں میں ڈھل رہی تھی ۔ کہیں ہلاکت جھجک جھجک کر حیات کے ساتھ چل رہی تھی
نحیفِ سرسام کسپروں کے نشے میں بے خود پڑے ہوئے تھے ۔ برآمدوں میں قدم قدم پر بخار سہمے ہوئے کھڑے تھے

دوسری طرف جنرل وارڈ میں مفلس مریض ؎

دوائیں باسی ، خراب پوشش ، نہ تازہ کھانا ، نہ صاف پانی ۔ نہ خون میں زندگی کی گرمی ، نہ سانس میں جاں فزا روانی
نہ کوئی آثارِ تن درستی ، نہ کوئی خدمت گزار اُن کا ۔ نہ اُن پہ نرسوں کی مہربانی ، نہ پاسباں غم گسار اُن کا
وہ نوجواں خود پسند لڑکے ، ابھی جو تعلیم پا رہے تھے ۔ غریب فاقہ کشوں کی جانوں کو تجربوں میں گنوا رہے تھے

اِس معاشی تفریق ، عدل کے اِس فقدان ، اِس ظلم کا انھوں نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہی ، اور اُن کی قوّتِ مشاہدہ تیز ہی ۔ آج کل اُن کا کلام فیشن ایبل نہیں رہا ، کیوں کہ اُن کی ترقّی پسندی اکادمی ترقّی پسندی نہیں ۔ لیکن وہ بہت سے اکادمی شاعروں سے زیادہ پُرخلوص ، جان دار ، اور سچّے شاعر ہیں ۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے مزدوروں کے متعلق شاعری کرنا اور چیز ہی اور مزدوروں میں عُمر گزار کے شاعری کرنا دُوسری بات ۔

مخدوم محی الدین کی شاعری ، تمام انقلابی شاعری کے مقابل اپنے خلوص ، جوشِ کردار اور انقلابی جذبہ کی وجہ سے ممتاز ہے ۔ خالص شاعری کی حیثیت سے بھی اِس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا ۔ اور یہ زبان ، محاورے اور اوزان کی بے شمار غلطیوں کے باوجود ۔ نظمیں تھوڑی ہی ہیں ، لیکن وہ عشقیہ ہوں یا انقلابی ، ایک آتش فشاں اندرونی حرارت ایک سچّا مخلص جذبہ اُن کا محرّک ہی ۔

مخدوم کے کلام کا مجموعہ جو "سُرخ سویرا" کے نام سے حال ہی میں شائع ہُوا ہی اُن کی ایک ابتدائی عشقیہ نظم "طور" سے شروع ہوتا ہی ۔ "طور" ، مخدوم کے لیے مجازی محبّت کا ایک رمز ہی ۔ یہ اُس کا انتہائی نقطہ یا مقام یا کیفیت ہی جس کے اظہار کے لیے انھوں نے عشقِ حقیقی سے ایک تلمیح مستعار لی ہی ۔ مخدوم کا عشق جسمانی آرزوؤں کی تکمیل کا عشق ہی ۔ اُس میں انفرادیت ہی ۔ اور ان

دونوں حیثیتوں سے وہ حسرت موہانی سے متاثر ہی - اِس عشق کی وارداتوں کے بیان میں ایک ناقابلِ انکار واقعیت ہی۔ ''سجدہ''، ''انتظار''، ''وہ'' اور ایسی کئی نظموں کی جان یہی واقعیت ہی - اِن نظموں کو پڑھ کے یقین آجاتا ہی کہ اِس شخص نے سچ مچ محبت کی ہی۔ ''لمحۂ رخصت'' اور ''نامۂ حبیب'' سے معلوم ہوتا ہی کہ اس نے اپنی محبوبہ کی نفسیات کا بھی مطالعہ کیا ہی، اور اس کی نفسیات کو اپنی داخلیت کی روشنی میں دیکھ کے، اُس میں جوش و حرارت، البیلاپن، اور جدّت پیدا کردی ہی ؎

کچھ سُننے کی خواہش کانوں کو، کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنّا باہوں میں
وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہی ایک ادائے زلیخائی
اندازِ تغافل تیور سے، رُسوائی کا ساماں آنکھوں میں (''لمحۂ رخصت'')

اور ''نامۂ حبیب'' میں آوارہ ہواؤں کی زبانی، عاشق کی شکایتوں پر محبوبہ کا جواب ؎

سُنا ہی ضبط کو تُم دل کی سنگینی سمجھتے ہو
ادائے خوفِ رُسوائی کو خودبینی سمجھتے ہو

لیکن محبت ''کچّی کلی کی بے زبانی'' پر غالب آجائے گی ؎

جنوں پرور اداؤں کے سنورنے کے اِرادے ہیں
خدا کے عرشِ اُلفت سے اُترنے کے اِرادے ہیں
زمین و آسماں کو ایک کرنے کے ارادے ہیں

آخری شعر سے معلوم ہونے لگتا ہی کہ عشق میں بھی ایک انقلابی کیفیت بڑھتی جاتی ہی، ایک ایسا لمحہ آجاتا ہی جب شاعر کسی کی بھی، اپنے معشوق کی بھی، غلامی نہیں کرسکتا ؎

آہ پہلے نارسا تھی، اب کہیں رُکتی نہیں اب کسی کے آستانے پر جبیں جُھکتی نہیں

اِس کے بعد ایک مقام ایسا آتا ہی کہ انقلاب اور عشق ایک ہوجاتے ہیں۔

انقلابی خیالات کی رفتار شروع میں تو زیادہ تیز نہیں یعنی ''باغی'' اور ''جنگ'' میں لیکن ''مشرق

میں اپنے ماحول سے بے زاری مخدوم کی انقلابی حرارت میں جوالامکھی کا سا زور اور اشتعال پیدا کردیتی ہے۔ وہ مشرق جس کا ڈانڈا اقبالؔ نے آسمان سے جا بلایا ہے اُس کی اصلیت اِس نئے شاعر کے نزدیک یہ ہے سے

وہم زائیدہ خداؤں کا، روایت کا غلام		پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں		خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اجتماعی زندگی کی طرح خانگی زندگی میں بھی شاعر کو ہر طرف موت کے سڑتے ہوئے آثار نظر آتے ہیں سے

گھر کے ہر ذرّے سے ناسور کی بو آتی ہے		قبر کی، عود کی، کافور کی بو آتی ہے

اِس اشتعال کا پہلا مقصد تخریب ہے "اوّل آں بنیاد را ویراں کنند" جوالامکھی کا پہلا کام اِس پُرانے نظام کو جلاکے خاک کرنا ہے سے

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں		("موت کا گیت")

نہیں صرف نظامِ نو نہیں، بلکہ پوری کائنات تباہ کردیے جانے کی مستحق ہے کیوں کہ اُس نے ایسا وحشت ناک نظام پیدا کیا ہے سے

پھونک دو قصر کو گر کُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دُنیا سے جو دُنیا ہے یہی		("موت کا گیت")

لیکن "مشرق" اور "موت کا گیت" دونوں تخریبی نظموں کا خاتمہ ایک نئی اِنسان پرست اور عدل پرست دُنیا کی بنیاد کے تصوّر پر ہوتا ہے۔ بہت جلد نئی دُنیا کی تعمیر کے اہم فرض کا احساس، اِس ذمّے داری کا احساس، شاعر کے جوشِ تخریب کو ایک تعمیری راستہ دِکھاتا ہے۔ "جہانِ نو" اور اس کے بعد کی نظموں کی روحِ عمل تعمیری ہے۔

جب ایک بار مخدومؔ نے یہ محسوس کرلیا کہ شاعری کا بہت بڑا فرض مزدوروں کے بڑے بڑے جتھوں کو جگانا ہے، تو ان کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محض ذہنی گورکھ دھندوں کی انقلابی شاعری، ترقی پسند

بورژوا حلقوں میں تو مقبول ہوسکتی ہی لیکن اپنا اصلی فرض انجام نہیں دے سکتی ۔ انگلستان کے بعض ترقی پسند شاعروں نے بھی اس طرح کی نظموں کی ضرورت محسوس کی تھی جو کم علم مزدوروں میں مقبول ہوسکے ۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں برنگھم میں اوڈن نے مجھے سترھویں صدی کے گیتوں کا ایک مجموعہ دکھلایا اور کہا تھا "اب میں اس قسم کی شاعری کا زیادہ تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اس کے بغیر وہ عوام کے کام کی نہیں "۔ مخدوم محی الدین نے انقلابی گیت کی اہمیت کو بہت جلد معلوم کرلیا ۔ "مسافر" "سپاہی" "جنگِ آزادی" اور "بنگال" اُن کے اچھے خاصے کامیاب گیت ہیں ۔ "سپاہی" میں بلند تر ذہنی شاعری کا پیرایہ اظہار ایسے سیدھے سادے الفاظ ہیں کہ عالم کی طرح اَن پڑھ سپاہی بھی محسوس کرتا ہو کہ ساری کائنات ، اُس لڑائی کو خوف و عبرت سے دیکھتی ہی جو غلامی کے لیے لڑی جائے لیکن اس لڑائی سے ہمدردی رکھتی ہی جو مساوات اور آزادی کے لیے ہو ؎

کتنے سہمے ہوے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہی
سُرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہی

لیکن جو لڑائی مساوات اور آزادی کے لیے ہو ، اس سے ساری کائنات ہمدردی رکھتی ہی ؎

گر رہا ہی سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہی میری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا

"جنگِ آزادی" مخدوم کا سب سے جوشیلا گیت ہی ، جس کا کورس یہ ہی ؎

یہ جنگ ہی جنگِ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی

لیکن اس جنگ کی بُنیاد قوم پرستی نہیں، بین الاقوامیت ہی ؎

سارا سنسار ہمارا ہی پورب، پچھم، اُتر دکھن
ہم افرنگی، ہم امریکی ہم چینی جاں بازانِ وطن
ہم سُرخ سپاہی ظلم شکن آہن پیکر، فولاد بدن

اِسی طرح "بنگال" کا کورس ایک ایسے ہندُستانی اتحاد کی تعلیم دیتا ہی جس میں تمام سیاسی جماعتوں کو بجائے ایک دوسرے کی مخالفت کے، ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ اِس کے لیے بڑی بےتعصبی، وسیع نظری اور بےلوث ہمدردی کی ضرورت ہی ؎

ایک ہوکر دُشمنوں پر وار کرسکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کرسکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کرسکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کرسکتے ہیں ہم

گیت کے کورس میں اِس خیال کی بڑی اہمیت ہی، کیوں کہ یہ اِس طرح عوام کے دل تک پہنچ سکتا ہی۔

مخدوم محی الدین کے یہاں ایک طرح کی انقلابی طنزنگاری بھی ہی ؎

ای خدائے دوجہاں، ای وہ جو ہر اک دل میں ہی دیکھ تیرے ہاتھ کا شہ کار کس منزل میں ہی
کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

مخدوم محی الدین کے انقلابی محاکات اور تشبیہات میں ایک ایسی پُرجوش نُدرت ہی جو مشرقی اور مغربی تشبیہوں کے امتزاج کا نتیجہ ہی۔ یہ تشبیہیں کبھی کبھی ایک آدھ شعر میں وہ سب کہ جاتی ہیں

جس کی تصویر میں صفحے کے صفحے سیاہ ہوسکتے ہیں ۔

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اُس مشرق کو دیکھ — کھینچتی ہے سانس سینے میں، مریضِ دق کو دیکھ

وحشت کی تصویر کھینچنے میں شاعر کو کمال حاصل ہے ؎

ملک الموت کے چہرے پہ تبسم دیکھو

دوسرے

جن کے دل ہیں کچلے ہوئے، جن کی تمنا پامال — جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

کبھی کبھی ان کی تشبیہیں انوکھی، مگر اپنی اندرونی حقیقت کی وجہ سے بڑی سچی ہوتی ہیں ؎

خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

اُن کے استعارے ایسے ہیں، کہ پوری کائنات ان کا پس منظر بن جاتی ہے، اور اِس پس منظر سے پس ماندہ انسان کا درد اور زیادہ نمایاں ہوتا ہے ۔

فلک پہ ابر کے اُڑتے ہوئے جزیروں میں — زمیں کے درد کو اوپر بلا رہا ہے قمر

اُداس رات ہے، افلاس ہے، غلامی ہے — کفن سے مُنھ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

’’[illegible]‘‘ کی یہ غیر مرئی تصویر ملاحظہ ہو ۔

دخترِ خواجگی، روحِ غارت گری — موت کی ہم سفر، مرگھٹوں کی پری

بعض اوقات اِن تشبیہوں کے پیچھے علمی دنیا کا پس منظر ہوتا ہے، مثلاً یہ مصرع، جس میں آزادیِ گفتار کے فقدان کی مثال دی گئی ہے، عبرانی اور یونانی علم الاصنام کی یاد دلاتا ہے، اور تصویر کیسی دل فریب ہے ۔

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے ۔ گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے

یہی انقلابی استعارے اور تشبیہیں، مخدوم محی الدین کی انقلابی رمزیت کا راستہ کھولتی ہیں ۔ ’’اندھیرا‘‘ اس کی بڑی اچھی مثال ہے ۔ یہ اندھیرا سرمایہ دارانہ نظام کا ہے، جہاں ہر چیز مانگی ہوئی ہے، اصلی مالک سے [illegible] کی ہوئی ہے ۔

رات کے ہاتھ میں اِک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی ان کا کفن

اس کے بعد اس تمدن کے پیدا کیے ہوئے جنگ کی تصویریں ہیں، اور ایک تصویر بہت نئی اور دہشت ناک ہے ؎

لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے، اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں

یہاں تک کہ معاشی نظام کائنات بن کر پھر ماتم کرنے لگتا ہے ؎

چاند کے ستاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

"انقلاب" میرے خیال میں مخدوم کی کامیاب ترین اور سب سے زیادہ موثر نظم ہے اس نظم میں انقلاب اور عشق ایک ہوجاتے ہیں۔ سرِراہ لوگ انقلاب نے نقیبِ اوّل کا اس طرح انتظار کر رہے ہیں گویا وہ کوئی معشوق ہے۔ اس کی آمد کا انتظار عشقیہ انتظار ہے، عشق، حُسن، نغمہ اور روحانی زندگی کے تمام پُرانے معیار، اُس کی سواری کے گزرتے ہی خاک بسر ہوجائیں گے ؎

اے جانِ نغمۂ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

اس انتظار میں حُسن پر مُردنی سی چھا گئی ہی، جمادات اور نباتات، ذرّے اور پھول، ساری کائنات مغموم ہو گئی ہی:-

نہ تابناکیِ رُخ ہی، نہ کاکلوں کا ہجوم
ہی ذرّہ ذرّہ پریشاں، کلی کلی مغموم
ہی گُل بہاں متعفن، ہوائیں سب مسموم
گُزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہی

"ہی ذرّہ ذرّہ پریشاں، کلی کلی مغموم" اِس مصرع میں وہ درد و سوز ہی کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کسی غزل میں یہ مصرع شاید کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا، لیکن شاعر نے اُسے عشقیہ موضوع سے اُٹھا کے انقلابی موضوع میں کچھ اِس خوبی سے رکھ دیا ہی کہ اُس کا گداز دہ چند بڑھ گیا ہی۔

---

(۵)

ترقّی پسند افسانہ اور ناول

مضمون کی طوالت بڑھتی ہی جارہی ہی۔ اِس لیے ہم ترقّی پسند افسانے اور ناول کا اِس تفصیل سے مطالعہ نہ کرسکیں گے، جیسے ہم نے شاعری کا کیا تھا۔ اسی لیے ہم پریم چند کے متعلق بھی یہاں کچھ نہ لکھیں گے۔ سرسری طور پر ان کا ذِکر کرنے سے بدرجہا بہتر یہ ہوگا کہ ہم آیندہ کسی اور موقعے پر ان کی فن کاری کا مفصّل مطالعہ کریں۔ پریم چند کا اپنے آخری زمانے میں ترقّی پسند تحریک کی طرف مائل ہونا اِس تحریک کی بڑی خوش قسمتی تھی۔ اِس سے ترقّی پسند افسانے کو وہ ہمّت، حقیقت نگاری کی وہ صلاحیت نصیب ہوئی، جو آج اُسے ترقّی پسند ادب کی سب سے کام یاب شاخ بنائے ہی۔ اگر ان کا افسانہ مشعلِ راہ نہ ہوتا، تو بہت سے نوجوان افسانہ نگار ـــــ جو آج کام یاب اور مشہور ہیں ـــــ اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہوتے، اور تقلیدی اسالیب کی مقبولیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوتی۔

قاضی عبدالغفار کا "لیلہ کے خطوط" پہلا ترقی پسند ناول ہی۔ ناول کا اطلاق اِس کتاب پر ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہی جو "انشا پردازی" ــــ پرانے معنوں میں ــــ سے قصّے کا کام لیتی ہی قاضی صاحب نے ناول کی اِس نوع کی پیروی کی ہی، جو اٹھارہویں صدی میں فرانس اور انگلستان میں بہت مقبول تھی اور "خطوط کا ناول" کہلاتی تھی۔ "قصہ پن" اور قصّے کی تفصیلیں زیادہ نہیں۔ اور مصنّف کا یہ مقصد بھی نہیں "مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا گیا۔ حقیقت یہ ہی کہ اِس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہی کہ اگر اِس بدنصیب مُلک میں کچھ لوگ ان نقوش کے معنی سمجھ سکیں تو سمجھ لیں۔" اِس مقصد میں اپنی سحرطرازی، اپنے ہمہ گیر طنز، اپنی فطرت شناسی کی وجہ سے مصنّف کو غیرمعمولی کامیابی ہوئی ہی۔ اِن خطوط کے لکھنے والی "لیلہ بنتِ لیلہ"۔ بنتِ لیلہ، پیشہ عصمت فروشی، وطن ہندستان ــــ سمجھ دار، زود فہم، چالاک، ذہین، شریر، بدمعاش، حرافہ ــــ ۲۲ برس کی بڑھیا کھوسٹ ــــ" کوئی معمولی بیسوا نہیں۔ وہ ایک مجسّم استعارہ ہی جس کے پردے میں ہندستان کی زخم خوردہ اور مظلوم نسوانیت نظر آتی ہی۔[۱]

لیکن اِن خطوط میں روداد کی بھی جھلک نظر آہی جاتی ہی۔ "ہم کہیں جارہے ہیں، ریل کا اسٹیشن ہی، میرے والد کے ساتھ ایک خوش رُو جوان ہی، مردانہ حُسن کی ایک تصویر جو ہنوز مکمّل نہ ہوئی تھی۔ یہ میرا منگیتر ہی، جس کے ساتھ میری جوانی، میرا بڑھاپا گزرنا چاہیے تھا! مَیں اس کی طرف نیچی نگاہوں سے اِس طرح دیکھ رہی ہوں کہ گویا دیکھ نہیں رہی . . . . . . پھر ایک ۲۲ سالہ جوانِ رعنا اس دریچے کے سامنے سے گزرا ــــ یہ میرا پہلا مرد ہی جس نے مجھے عورت بنایا مگر بیوی نہ بنایا۔ جس نے مجھے میری شاخ سے چُن کر چند روز گلے کا ہار بنایا، پھر مسل کر بدررو میں پھینک دیا۔ جس ظالم نے میری دوشیزگی کو وہاں پہنچا دیا، جہاں اب تم دیکھ رہے ہو، جس نے

[۱] "لیلہ کے خطوط" پر میرا تبصرہ "اُردو" اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اور اب مجھے اِس تبصرے میں کچھ نقائص نظر آتے ہیں۔ اِس حصّے میں مَیں نے اس تبصرے سے کافی استفادہ کیا ہی۔

مجھے اب وہ بنادیا جو میں اب نظر آتی ہوں "

رفتہ رفتہ لیلہ کی بیسوائی شخصیت مکمل ہوجاتی ہو۔ جس کو قاضی صاحب کے سحرکار قلم نے ہزار طریقوں سے ظاہر کیا ہے۔ اُس کی شخصیت اتنی مکمل ہوجاتی ہو، اُس کی داخلیت پر دُنیا اور خصوصًا طرح طرح کے مردوں کے خارجی تجربوں کا ملمع ایسا چڑھ جاتا ہی، کہ وہ اِس سوداگری کے عالم میں بھی تماشائی ہو کے ہندستان کے تمدّن کا کھیل دیکھتی ہی۔ اور طنز، گہرے چبھتے ہوے طنز سے اُسے محسوس اور بیان کرتی ہی۔ سینکڑوں قسم کے مرد اُس کے تصویرخانے کی زینت ہیں "نیزہ سوگھوڑوں کی طاقت" والے عاشق "سور کی طرح سر جھکاکر سیدھا حملہ" کرنے والے عاشق۔ اخبار نویس، طلسم ہوش رُبا پڑھنے والے، گل زارِ داغ پڑھ پڑھ کر رونے والے، مولانا، لیڈر، افلاطونی دوست، بھانت بھانت کے مرد جو اس کے خلوت خانے میں نہ صِرف اپنے جسم، بلکہ اپنی روح کی ساری گندگی، سارے سطحی پن، ساری بھوک، ساری خودغرضی کو عُریاں کرتے ہیں۔ لیکن ظاہری اختلافات کے باوجود بیسوا سے اُن کا رشتہ ایک ہی ہی۔ بکتے ہوئے حُسن کی قیمت وصول کرنا" جس کو وہ عشق کہتے ہیں وہ ایک غزل ہی۔ جس کا مقطع وہی خلوتِ بے ناموس ہی! جب وہ میرے پہلو میں آکر بیٹھتے ہیں اور بسور بسور کر سوز و گدازِ عشق کا حال بیان کرتے ہیں، کہتے ہیں "میں مرتا ہوں، میں تم پر جان دیتا ہوں، مجھے جیسی تُم سے محبّت ہو ایسی تو کبھی کسی سے نہیں ہوئی، تُم میری دِل و جان کی مالک ہو، تم بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا، میں دِل میں ہنستی ہوں اور کن انکھیوں سے دیکھتی ہوں کہ اِس اظہارِ التفات بے پایاں کے ساتھ اب وہ میری طرف کھسکتے آتے ہیں۔ اِس عالم بے اختیاری میں اُن کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف آتا ہی، اُن کا سر میرے شانے کی طرف۔ اُن کا دوسرا ہاتھ میری کمر کی جانب میں اندازہ کرلیتی ہوں کہ غزل کا مقطع قریب ہی۔ پھر چند روز ان کا عشق گرم رہتا ہی۔ تا آں کہ ہوس کا اِشارہ کسی دوسری جانب ہوتا ہی اور میرے باسی بوسوں کی تھکن وہ محسوس کرنے لگتے ہیں . . . . کسی دِن وہ غائب ہوجاتے ہیں اور پھر کبھی میری طرف نہیں آتے، کبھی سُن لیتی ہوں

نہ اب اُن کے عشق سمندِ بادپا کی باگ کسی دوسری طرف پھر گئی ہے۔"

لیلہ اپنے ایک مجنوں کی مسلسل الحاح و زاری کے بعد آہستہ آہستہ محبت میں گرفتار ہونے لگتی ہے۔ مگر وہ ہوس پرستی اور ہوس ناکی کی اس قدر عادی ہوگئی ہے کہ اس سچّی محبت کے جذبے کو ایک خطرناک اور نقصان رساں کمزوری سمجھ کے وہ اپنے عاشق کو چھوڑ کے چلی جاتی ہے۔ اور سال بھر تک دونوں میں خط و کتابت نہیں ہوتی۔ اس دوران میں وہ اپنے آپ کو اور بھی زیادہ بے احتیاطی سے، ایک مجنونانہ جذبے کے ساتھ، سفلی تعیش میں غرق کردیتی ہے یہاں تک کہ اس کی شباب کی تازگی رخصت ہونے لگتی ہے۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ جب اس کا عاشق بہت بیمار تھا وہ اس کی تیمارداری کرتی ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ ایک نئی زندگی کا خواب دیکھنے لگتی ہے۔

"چند روز اس نئی دنیا میں مجھے دم لینے دو جس کے دروازے میرے لیے کھلتے جاتے ہیں۔ اس ویرانے کو آباد ہونے دو۔ مجرموں سے میرے انتقام کا وہ وقت آئے گا جب میں بیدی اور ان کے بغاوت کا علم بلند کروں گی....."

بیسواؤں کے متعلق اس سے پہلے بھی اُردو میں اچھے اچھے ناول لکھے جا چکے تھے، جیسے "امراؤ جان ادا" یا وہ بے مثل قصہ جس کا ترجمہ سجاد حسین کسمنڈوی نے "نشتر" کے نام سے کیا تھا۔ ان دونوں ناولوں میں خارجی حقیقت نگاری "لیلہ کے خطوط" سے زیادہ ہے۔ امراؤ جان اور خانم جان کے کردار قاضی صاحب کی لیلہ کے مقابل زیادہ انفرادی ہیں، خارجی زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن ان پرانے ناولوں میں بیسوا کے وجود کو بلا احتجاج تسلیم کرلیا گیا ہے، توبہ کی بھی گنجایش رکھی گئی ہے۔ قاضی صاحب کی لیلہ اس پیشے کی باطنی حقیقت ہے، اور وہ ایک انقلابی علم بلند کرتی ہے۔ اس کی انفرادیت کے نقوش نمایاں نہ سہی لیکن وہ قاضی صاحب کی "ڈیوٹی ما" (Diotima) ہے، اُن کا شہراد اُن کے شکنجے سے ٹوٹا ہے۔ یوں تو انھوں نے مشرق اور مغرب کے بہت سے "صنم خانے" دیکھے ہیں، لیکن اس ناول میں ان کے تجربے نے مستقبل کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

"لیلہ کے خطوط" پڑھ کے ایک اور خیال آتا ہے اور وہ یہ کہ کاش قاضی صاحب "مجنوں کی

ڈائری" اور "تین پیسے کی چھوکری" اور اِس قسم کی اور کتابیں نہ لکھتے۔

"انگارے" کے مصنّفین میں احمد علی صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے دہلی کی قدیم رجعت پسند زندگی اور اُس کے مشغلوں، خصوصاً کبوتربازی کی بہت اچھی تصویریں کھینچی ہیں۔ کبوتربازی کے سلسلے میں اچھی خاصی کردار نگاری کا بھی موقع مل جاتا ہے جیسے "اُستاد شمّو خاں" ان کا ایک بڑا دلچسپ افسانہ۔ "موٹر لاری کا سفر" ہے، جس کا ڈھکا ہوا مگر بے پناہ طنز، ہندستانی سماج کی جنسی بھوک کی تصویر بڑی نزاکت اور لطافت سے کھینچتا ہے۔ "انگارے" میں بھی بہترین افسانے احمد علی ہی کے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ احمد علی صاحب کے وہ افسانے جو "انگارے" یا "شعلے" میں شائع ہوئے ہیں، ترقی پسند تحریک، اور ترقی پسند افسانے کی تعمیر کے ابتدائی دور کے ہیں۔ اس لیے اگر ترتیب و ترکیب یا تکنیک میں کچھ خامیاں ہیں، یا اگر اُس میں دِقّت اتنی زیادہ ہے کہ اس سے افسانے کے فنّی توازن پر اثر پڑتا ہے، تو یہ سب کمزوریاں قابلِ معافی ہیں۔ احمد علی صاحب کا ایک ناول *Twilight in Delhi* انگریزی میں شائع ہوا ہے، اور انگلستان کے چوٹی کے ناول نگاروں مثلاً ورجینا وُولف اور ای ایم فارسٹر نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ فارسٹر نے اپنے مشہور ناول "سفیرِ ہند" کے جدید ترین اڈیشن (۱۹۴۲ء) میں اپنے ایک تازہ نوٹ میں ان کے اس ناول کا تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کا ذِکر ہم نے یہاں اِس لیے کیا کہ اُس کا اسلوب اُس پُرانے طرز کے اُردو ناول کا ہے، جو پریم چند سے پہلے بہت مقبول تھا، جس میں لاتعداد اشعار، قصّے اور عمل کی مدد کرتے تھے۔ احمد علی کی ذہانت اور صلاحیت میں کوئی شبہ نہیں لیکن اُردو کو ان کی بہت ضرورت ہے، اور اُردو میں ان کی شہرت انگریزی کے مقابل محدود سہی، مگر بہت زیادہ پائے دار ہوگی۔

سجاد ظہیر نے لندن کے ہندستانی طلبہ کی زندگی کے متعلق ایک چھوٹا سا ناول "لندن کی ایک

بات" لکھا ہو۔ شروع میں انگریزوں اور ہندستانیوں کے سیاسی اور معاشی تعلقات اور نئی معاشی تحریکوں پر بحثیں ہیں، پھر ناچ کے ایک جلسے کا حال ہو، پھر سوئٹزرلینڈ کے رومان بھرے ماحول میں ایک ہندستانی لڑکے اور انگریز لڑکی کے عشق کا ایک چھوٹا سا خاکہ ہو۔ اس خاکے کی بنا پر یہ تصنیف ناول ہونے کا دعوا شاید ہی کرسکتی اور مصنف نے اپنے تمہیدی نوٹ میں لکھ بھی دیا ہو کہ اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہو. کتاب کا آخری حصہ دلچسپ ہو۔ نعیم کا کردار اس کتاب کی کامیاب ترین پیش کش ہو۔ وہ اُن شکست طالب علموں میں سے ہو، جن کی جڑ یہ ہو "آخر۔ تمھاری تھیسس کب ختم ہوگی" نعیم کی تھیسس کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ سالہا سال تک آتش دان کے پاس بیٹھا ناول پڑھتا رہے گا۔ ہندستانی طالب علم اُسے پسند کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ بلا ڈگری لیے ہندستان واپس جانے کا زمانہ آجائے گا۔

پریم چند کی روایات کی سب سے زیادہ نگہداشت اوپندرناتھ اشک نے کی ہو، اور اپنے لیے موضوع اور بیان کے نئے راستے بھی تلاش کیے ہیں۔ پریم چند کی طرح انھیں بھی نچلے متوسّط طبقے کے مصائب، مسائل، خرابیاں، بے ہودگیاں، پریشا بیان کرنے میں کمال حاصل ہو۔ پریم چند کی طرح ان کے افسانوں میں بھی ایک طرح کا ضبط اور ٹھیراؤ ہو۔ اگرچہ کہ بعض نئے افسانوں ـــــ مثلاً "ترغیبِ گناہ" "چٹان" اور "اُبال" میں انھوں نے اس ٹھیراؤ کو گوارا نہیں کیا ہو، یہ شاید ترقّی پسند افسانوں کے اس رجحان ـــــ جنس کے نفسیاتی مطالعے ـــــ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے۔ عموماً اوپندرناتھ اشک جو لکھتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کے۔ اسی وجہ سے نہ ان کے یہاں رقّت انگیزی ہو، نہ تخریبی افراط۔

افسانے کے "فن" کی طرف وہ بہت توجہ کرتے ہیں جیساکہ "کونپل" کے مقدمے سے ظاہر ہو۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ افسانہ نگار "ایک کامیاب مقرّر کی طرح پہلے ہی فقرے سے ناظر کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لے اور پھر جوں جوں افسانے کو بڑھائے، اپنے ناظر کی دلچسپی

میں اضافہ کرتا جائے ۔ حتیٰ کہ کلائمکس پر پہنچ کر وہ اس طرح افسانے کو ختم کردے کہ جو اثر وہ اپنے ناظر پر ڈالنا چاہتا ہے، وہ تمام تر شدّت کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوجائے " اوپندرناتھ کو اُن افسانوں پر اعتراض ہے جن میں "افسانویت" کم ہوتی ہے۔ پلاٹ کے مکمل اور قرینِ قیاس ہونے پر وہ بہت مُصر ہیں ۔ اور پلاٹ کی بے ترتیب روانی اُنھیں پسند نہیں ـــــ مگر اس کا کیا علاج کہ زندگی کے پلاٹ کی روانی بے ترتیب بھی ہوتی ہے ۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ افسانے کا مقصد بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور واقعے کی حقیقت کو بھی بشرطِ ضرورت مقصد پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ "فن" پر انھوں نے ہر افسانے میں کافی توجہ کی ہے، اسی وجہ سے ان کے افسانے کی ابتدا اُس کی اُٹھان، اور اُس کا خاتمہ سب ایک ترتیب کے پابند ہوتے ہیں ۔ یہ پابندی افسانے کے داخلی مقصد میں حارج نہیں ہوتی، بلکہ اُس کے نقوش کو اور زیادہ واضح کرتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپندرناتھ اشک کے بہت سے افسانوں میں بڑی داخلیت ہے۔ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ یا تو افسانہ نگار کی آپ بیتی، یا اُس کے احساسات کا مرقّع، یا اُس کے گہرے مشاہدے کی چیز پڑھ رہا ہے۔ مثلاً "یہ انسان" کی داخلیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اوپندرناتھ اشک کا ایک محبوب داخلی موضوع ایک آرٹسٹ کی ایک کالج کی لڑکی سے ناکام محبّت ہے۔ یہ ان کے ناول "ستاروں کے کھیل" کا موضوع ہے ۔ گہری داخلیت کے ساتھ "ناسور" "ہارجیت" "شاعر کی شکست" کا بھی یہی موضوع ہے، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد مصنّف کے کسی ذاتی تجربے یا احساس پر ہے۔

نچلے متوسط طبقے میں جنسی عدمِ مساوات اور طبقوں کے مقابل زیادہ نمایاں ہے۔ کیوں کہ اس طبقے میں بیوی معاشی طور پر شوہر کی زیادہ محتاج ہوتی ہے ۔ یعنی نہ وہ مزدور عورت کی طرح خود اپنا پیٹ پالنے کی کوشش کرسکتی ہے، نہ اعلا طبقوں کی طرح تعلیم یا رُپے کی وجہ سے اس کی محتاجی کم ہوتی ہے ۔ اس نچلے متوسط طبقے میں عورت کی عدم مساوات، اُس کی تشنگی، اُس کی بے بسی، اور اُس کے شاذ و نادر انتقام کی تصویریں اوپندرناتھ اشک نے کئی افسانوں میں کھینچی ہیں مثلاً "کونپل"

"قفس"، "چٹان"، "چیتن کی ماں" وغیرہ۔ اوپندرناتھ اشک نے اس طبقے کی سماجی نفسیات کا اچھا خاصہ مطالعہ کیا ہے، یا کم از کم اس کے مشاہدے کا اثر ان پر اچھا خاصا گہرا ہے۔

اگرچہ کہ بنیادی طور پر وہ اس طبقے کے افسانہ نگار ہیں لیکن مزدور طبقے کے مصائب کے متعلق انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں اُن میں بھی بڑا درد اور خلوص ہے، اور سستی رقت انگیزی بہت کم۔ ان میں طبقاتی کش مکش بھی نظر آتی ہے، اور انفرادی نفسیات کا لطیف اور طنز آمیز مطالعہ بھی۔ ایسے افسانوں میں، "وہ میری منگیتر تھی" "تین سو چوبیس" اور "کاکڑاں کا تیلی" بہت دلچسپ ہیں۔ "کاکڑاں کا تیلی" واقعہ نگاری کا شاہ کار ہے۔ طبقاتی تفاوت کا جنسی پہلو "اُبال" میں نظر آتا ہے۔

اوپندرناتھ اشک کے نزدیک ترقی پسندی کا مفہوم بلند، اور وسیع ہے۔ "ترقی پسندی مجھے مرغوب ہے۔ لیکن افسانے میں یہ ترقی پسندی کسی مزدور یا کسان یا بیسوا یا کسی دوسرے پسماندہ شخص کا قدرے عریاں نقشہ پیش کر دینے تک ہی ختم نہیں ہوجاتی۔ اور نہ افسانے میں دو چار دیدہ و دانستہ لکھی ہوئی گالیاں یا کراہت پیدا کرنے والے مناظر کا ذکر اسے ترقی پسند بناتا ہے۔ درحقیقت کسی افسانے کا ترقی پسند یا رجعت پسند ہونا مصنف کے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے جسے سامنے رکھ کر وہ افسانہ لکھتا ہے یا جو اس کے افسانے سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

اوپندرناتھ اشک میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ آرٹ اور ترتیب پر بہت زیادہ دھیان کرنے کی وجہ سے ان کے یہاں وہ جوش، اور روانی نہیں جو بندشوں کو توڑ دیتی ہے۔ اس سے قطع نظر اس میں کوئی کلام نہیں کہ اوپندرناتھ اشک جدید دور کے دو یا تین بہترین افسانہ نگاروں میں ہیں۔

دیویندر ستیارتھی کے افسانوں پر "افسانے" یا "قصے" کا انطباق محض اس حد تک ہو سکتا ہے، کہ وہ اُن گیتوں کا جدید پس منظر بن جاتے ہیں، جو ہندستان میں صدیوں سے گائے جاتے رہے ہیں۔ اُن کے اکثر و بیشتر "افسانے" ان کی خانہ بدوش زندگی کے واقعات ہیں۔ جن کو اپنے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے انھوں نے گیتوں کی سماجی، معاشی یا وارداتی کیفیتوں کو نمایاں

کرنے . . لیے ایک طرح کا افسانوی رنگ دیا ہی۔ جا بہ جا اُن کی ذاتی رائے، یا سفر کے معمولی معمولی تاثرات، اِن واقعات کو شخصی رنگ دیتے ہیں۔ کہیں کہیں واقعے میں سچی افسانویت بھی ہوتی ہی جیسے "برہم چاری" یا "میری زندگی کا ایک ورق" کبھی ایک یا کئی گیت مل کے خود ایک افسانہ سُناتے ہیں، جس کی جڑیں سینکڑوں سال پُرانی ہیں، اور جس سے کئی شاخیں پھوٹ چکی ہیں، جیسے "تین گیت" "مامونٹی" "لاچی" وغیرہ۔ آپ بیتیاں بھی ہیں جیسے "دیا جلے ساری رات"

دیویندر ستیارتھی کی اِن تصنیفوں کو افسانہ کہیے یا مضمون، لیکن یہ اُن گیتوں کی وجہ سے جن کے لیے یہ ایک طرح کی 'زیریں عمارت' کا کام دیتے ہیں، اُردو میں یہ یادگار رہیں گے۔ اِن کی وجہ سے گیت، اُن کا ماحول، اُن کے تعمیری اسباب زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں۔ اور اُن کے جانچنے کے لیے افسانوی معیار مقرر کرنا غلطی ہوگی۔ وہ بجائے خود ایک نئی صنفِ ادب ہیں، جس میں افسانہ، واقعہ، سفرنامہ، تبصرہ، تحقیق سب باہم مل جُل کے ایک ہوگئے ہیں۔

تمام ترقی پسند ادیبوں میں کسی کا نام اِس قدر توصیف اور عزت کا مستحق نہیں، جتنا کرشن چندر کا ہی۔ اس کی وجہ ان کی بے لوث، باخلوص انسانیت ہی، جو اُن کی ہر تحریر سے مترشح ہی۔ اِسی پر ان کے تخیل، اور اُن کے فن کی بنیاد ہی۔ اِس انسانیت کی وجہ سے ان کی ترقی پسندی کبھی دل آزاری نہیں کرتی۔ وہ دِلوں میں اُتر کے اپنا کام کرجاتی ہی، سب کو متاثر کرتی ہی، لیکن کسی کا دِل نہیں دُکھاتی۔ یہ خصوصیت ترقی پسند ادیبوں میں شاید ہی اور کسی میں پائی جاتی ہو۔ یہ ایک خداداد نعمت ہی۔ ایک طرح کی بےغرض نفسیاتی کیفیت ہی۔

اِس انسانیت، اِس انسان پرستی کی وجہ سے کرشن چندر کے دِل میں مظلوم انسان سے سچی ہم دردی ہی۔ اِس ہم دردی کی بنیاد ایک طرح کی رومانیت، اور فطرت پرستی پر ہی۔ اِسی وجہ سے وہ مزدور مرد سے زیادہ مزدور عورت کے افسانہ نگار ہیں۔ مزدور عورت کی بدقسمتی ہندُستان میں دُہری ہی ایک تو طبقاتی اور دُوسرے جنسی۔ اُن کا محبوب ترین موضوع سرمایہ دار ہوس پر ناچار عورت کی

قربانی ہو۔ اِس موضوع پر اُنھوں نے بیسیوں افسانے لکھے ہیں؛ اور اِس کی جدّت اور اس کا تنوع ختم ہونے میں نہیں آیا۔ کیوں کہ ان میں سے ہر افسانے کا پس منظر مختلف ہوتا ہو۔ اِس طرح "جنّت اور جہنّم" "بند والی"، "سفید پھول" "ٹوٹے ہوئے تارے"، "اندھا چھترپتی" اور اِس قسم کے کئی اور افسانے عورت کے جسم کی فروخت، اور اس کی روح اور اُس کے دِل کی تباہی اور بربادی کے افسانے ہیں۔ اِن افسانوں میں فطرت اِن بدنصیبوں سے ہم دردی کرتی ہو۔ مناظرِ فطرت کا حُسن، اور انسان کی یہ تباہ کاریاں، ایک ایسا تضاد پیش کرتی ہیں، جن کو کرشن چندر کی مسافر نظر اور اُن کا سحر طراز قلم بہت اچھی طرح دیکھتا اور بیان کرتا ہو۔ یہ فروخت اور تباہی صِرف مزدور عورتوں تک محدود نہیں، یہ کرشن چندر کے نزدیک ہندستانی کی طبقاتی کش مکش، ہندستان کے مہاجنی نظام کی بدترین لعنت ہو۔ "شکست" سے معلوم ہوتا ہو کہ اِس قسم کا کوئی تلخ تجربہ یا احساس اِس موضوع کی تہ میں کارفرما ہو۔ "شکست" ہی میں انھوں نے ہندستان کی عورت کے متعلق یہ بے مثل فقرہ لکھا ہو:-

"رام اور لکشمن کنڈ دِن کے اُجیالے میں تھے، لیکن سیتا کنڈ پر رات کی ہول ناک تاریکی مسلط تھی۔ اور اُسے سیتا، دھرتی کی بیٹی کے آخری دِن یاد آنے۔ وہ چودہ سال اپنے خاوند کے ہم راہ جنگلوں میں گھومتی رہی تھی۔ وہ ایک ظالم راجا کے پھندے میں پھنس کر لنکا کے ایک باغ میں اپنی عصمت کو بچاتی ہوئی برہ کے دِن کاٹتی رہی تھی، اور جب وہ برہ کے دِن پورے ہوئے، اور وہ بن باس ختم ہوگیا، تو مسرّت کے چند مختصر ایّام کے بعد ایک جاہل دھوبی کے کہنے پر اس کی زندگی میں پھر ایک نیا بن باس شروع ہوا، نیا، آخری، ابدی۔ وہ بن باس جو ایک دفعہ شروع ہوکر پھر کبھی ختم نہ ہوا۔ اِسی لیے تو سیتا کنڈ تاریک ہو، خاموش ہو، اُداس ہو، اتھاہ ہو۔ شیام کو احساس ہوا کہ جیسے اس کنڈ میں صرف سیتا کے ہی نہیں بلکہ سارے ہندستانی سماج کی عورتوں کے آنسو چھلک رہے ہیں جن کی زندگیاں صدیوں سے تاریک، خاموش اور اُداس ہیں، اور شیام کو اپنے احساس کی تلخی میں یہ بالکل مناسب معلوم ہوا کہ سیتا کنڈ سب سے نیچے بنایا گیا تھا۔ نیلے آسمان کے مسرّت بھرے نور سے دُور، ایک چٹان کی سنگلاخ چھاتی میں، چاروں پتھروں کی دیواروں کے بیچ۔ یہاں روشنی کسی درز میں سے

گزر کر بھی نہ پہنچتی تھی۔ یہی ہندستانی عورت کی صحیح جگہ ہے۔ سب کے نیچے، قدموں میں۔"

ہندستانی عورت کی اِس مظلومیت کا، کرشن چندر کی انقلابی رومانیت نے رنگا رنگ اسالیب میں اظہار کیا ہے، جہلم میں ناؤ پر ایک نامعلوم عورت کے چہرے پر بے پناہ غم اور اُداسی، وُلر کی جھیل میں ایک ڈونگا چلانے والی، ایک بچے کی ماں، جس کا شوہر تلاشِ معاش میں اُسے بے آسرا چھوڑ کے بدیس چلا گیا ہے، اور وہ اپنے آپ کو پانچ رُپے کے عوض بیچ ڈالتی ہے۔ پہاڑی عورتیں جو امیروں کے ہاتھ بیچی جاتی ہیں، پڑھی لکھی عورتیں جن کی مرضی کے خلاف شادیاں کی جاتی ہیں اور ان کے معصوم دِل توڑ دیے جاتے ہیں، ان کی خاموش زبانیں، اور گرم گرم آنسو۔ "شکست" کے کردار جیسے ونتی اور چندرا، یہ سب اِس انقلابی رومانیت کے شاہکار ہیں۔ "موٹر کے آگے اور پیچھے، چیڑ اور دیودار کے گھنے اور سبز جنگلوں کے درمیان، چاندی کے تار کی طرح چمکتی ہوئی پکّی سڑک پھیلتی جا رہی ہے۔ ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک، ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک، ایک امیر کی جیب سے دوسرے امیر کی جیب تک، یہ وہی نقرئی تار ہے جس نے انسانوں کے دِل تاریک کر دیے ہیں، عورتوں کی عصمتیں ویران کر ڈالی ہیں۔ اور سماج کی روح کو آتشک کے جہنم میں جُھلسا دیا ہے۔"

اِس انقلابی رومانیت کی تہ میں ایک طرح کی انفرادیت، ایک رومانی شکستگی اور تشنگی بھی ہے جو کرشن چندر کے نقطۂ نظر پر حاوی ہے ــــــ شاید ضرورت سے زیادہ حاوی ہے۔ ابھی وہ اپنے ذہنی نشو و نما کے رومانی دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن ابھی سے انھوں نے اُردو افسانے میں وہ جگہ حاصل کر لی ہے، جس کو پریم چند کے سِوا اور کسی نے حاصل نہیں کیا تھا۔ اُن کا افسانہ پریم چند کے افسانے سے بہت زیادہ آزاد ہے۔ وہ ابتدا، درمیانی حصّہ، انتہا کے پورے نشیب و فراز کی پابندی بہت کم کرتا ہے۔ بہت کم وہ پیشہ ور افسانہ نگاروں کے افسانوں کی طرح اُٹھان یا کلائمکس کی طرف توجّہ کرتا ہے۔ قدرت، مناظرِ فطرت، اور مصنّف کی انفرادی نظر کے سِوا وہ کسی اور قید کا پابند نہیں۔ اِس میں زندگی کی سی آزادی ہے۔ کرشن چندر کے سحر نگار قلم پر اس کی

بنیاد ہے۔ اُس کا پس منظر کشمیر کے بلند پہاڑ، پنجاب اور ہندستان کے شہر اور اُس کا ہیرو تباہ حال، مظلوم، لُٹتا ہوا انسان ہے۔ اُس کا نقطۂ نظر ہم دردی، طنز، تشریح ہے۔ اُس کا موضوع انسان ہے اور فطرت ۔ بدنصیب انسان، حسین قدرتی مناظر میں رینگتا ہوا کیڑا، جس کو اپنی نوع کو نقصان پہنچانے، اپنی نوع کا خون چوسنے کے سوا کسی اور کام میں لطف نہیں آتا۔ جو اس حسین، باوقعت، مہماں نواز، سچی اور کھری فطرت کی نہ تسخیر کرتا ہے نہ تقلید۔

منظر کشی میں کرشن چندر کا مقابلہ اُردو کا کوئی اور ادیب نہیں کر سکتا۔ کسی ادیب یا شاعر نے کشمیر کے پہاڑوں، وادیوں، چشموں، ندیوں، جھیلوں، مرغ زاروں، قصبوں اور دیہاتوں کی ایسی اچھی تصویریں نہ کھینچی ہوں گی۔ مناظرِ قدرت کرشن چندر کی نگاہ کو وہ وسعت اور وہ معیار عطا کرتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ انسان کو اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اس سے اور زیادہ ہم دردی کر سکتا ہے۔ اکثر افسانے منظر کشی کے شاہ کار ہیں۔

"وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا، آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرشِ زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی، اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے بینڈے ابھی تک چیں چیں کیے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ کوہو، کوہو رٹ رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے تنکے ابھی سو رہے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح ٹنگے ہوئے تھے گویا دور کے مندر لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اُگی ہوئی گھاس پر ننھے ننھے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے، پھر دور کہیں اُس نے رہٹ کے چلنے کی آواز سنی اور پورب میں افق پر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔" ("زندگی کے موڑ پر ...")

"تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا، اور بجلی کے پُر پیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے۔ ایک جہنمی منظر تھا جس میں بادلوں کی گرج، ہوا کی وحشیانہ چیخیں اور چوٹیوں پر سے گرتی ہوئی برف کے وحشیانہ قہقہے سنائی دیتے تھے۔" ("ارجن کی ایک شام")

کرشن چندر کے آرٹ کی طرح ان کی منظر نگاری کا کمال بھی ان کے ناول "شکست" ہی میں دیکھنے میں

آتا ہی۔ ماندر ندی، جو گانو کو تین طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ تین چشمے جن کے نام ”چھو ہارا“ ”بادام“ اور ”موتی چور“ تھے۔ موتی چور اور باقی دونوں چشموں کا پانی مل کر کھیتوں سے بہتا ہوا ماندر میں جا گرتا تھا۔ یہاں ملو کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا اور دو پن چکیاں۔ ملو کے درختوں میں جھولے پڑے ہوئے تھے، اور اس جھنڈ کے سائے میں دوپہر کے وقت گڈریے اپنے ریوڑوں سمیت سویا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب ترنگ آتی تو چرواہنیں پینگ بڑھاتیں اور ملو کی شاخوں کو چھونے کی کوشش کرتیں گڈریے گھٹنوں تک پانی میں کھڑے ہاتھوں سے مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے۔“

منظر نگاری ”شکست“ کے پورے قصّے کو ایک ایسا دل فریب رومانی رنگ دیتی ہو کہ گویا اس میں قدرت کی نباتی زندگی کا رس اور نور بھر دیتی ہو۔ لیکن ”شکست“ اس سے بہت زیادہ ہو۔ غالباً وہ اُردو کا بہترین ناول ہو۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ کرشن چندر ناول میں افسانے سے بھی زیادہ کام یاب ہوں گے، بہ شرطے کہ وہ اس کی طرف اور توجہ کریں۔ اس ناول میں شیام، ایک کشمیری تحصیل دار کا بیٹا اور کالج کا طالب علم، مصنّف کی شخصیت، اس کی رومانیت، اس کے بنتے ہوئے سیاسی عقیدے اس کی بےتعصبی، اور اُس کے ذہنی اور نفسی انقلاب کی ترجمانی کرتا ہو۔ ناول میں دو عشقیہ سلسلے ہیں۔ ایک کا شیام خود ہیرو ہو، اور اس کی محبوبہ ونتی، ایک ایسی عورت کی لڑکی ہو، جس کے جنسی کردار کو گانو کے پنڈت اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ لیکن پنڈت سری کشن اپنے اپاہج، بدصورت لڑکے درگا داس کی شادی ونتی سے کرنا چاہتے ہیں، اور اسی لیے اس کے ماموں کو رشوت دیتے ہیں۔ دوسرا عشقیہ سلسلہ ایک نیم برہمن، نیم چمار لڑکی چندرا اور ایک چھتری نوجوان موہن سنگھ کی باہمی کشش کا ہو۔ اس سلسلے میں شیام ایک حسّاس ناظر، اور ہم درد دوست ہو۔ موہن سنگھ کو شکار میں ایک جنگلی سوءر زخمی کر دیتی ہو، وہ اچھا ہوتا ہو تو دیکھتا ہو کہ پنڈت جی کے بھائی صاحب اس کی محبوبہ کی عصمت کے درپے ہیں، ان پر وہ قاتلانہ حملہ کرکے گرفتار ہوتا ہو، پرانے زخم ہرے ہو جاتے ہیں، اور وہ مر جاتا ہو۔ اِدھر ونتی کا بیاہ درگا داس سے ہو جاتا ہو۔ جب بیاہ ہونے لگتا ہو، تو اس کی ماں روکنا چاہتی ہو۔ لیکن ونتی کے ماموں کو تو رشوت دی گئی تھی وہ اُسے ایک کمرے میں بند کر دیتا ہو، اور وہ گرفتار طائر کی طرح ہندستانی عورت

ہونے کی وجہ سے بے بس ہو کے پھڑپھڑاتی ہو" اور مٹی کی دیواریں سب کچھ جانتی ہیں، حرکت کرنا نہیں جانتیں، وہ قید کرسکتی ہیں، لیکن راستہ نہیں دے سکتیں، وہ پناہ دے سکتی ہیں، لیکن آزادی نہیں "
ونتی کی درگاداس سے شادی ہوگئی اور شیام کی ماں نے مجبور کرکے کسی اور لڑکی سے شیام کی نسبت ٹھیرائی۔ شیام کے شگن کے دن ونتی کی جینے کی طاقت، زندگی کی قوت ارادی یک لخت ختم ہوگئی۔ اُس کی موت کا منظر اُردو نثر کے زندہ جاوید شاہ کاروں میں شمار ہوگا:۔

"اور اس کی سہیلیاں زور زور سے چلانے لگیں۔" ونتی۔ ونتی " لیکن ونتی وہاں نہ تھی، وہ دور بہت دور چلی گئی تھی، اور ایک لافانی گلیشیر کی گہرائیوں میں سما گئی تھی۔ اور گو انھوں نے بہت شور مچایا، اور اس کے ہاتھ پاؤں ملے، اور اُس کے سرد رخساروں سے اپنے گرم گرم لہو سے رواں دواں گال چھوئے، لیکن نہ ونتی کی گھنی پلکوں پر کوئی لرزش ہوئی، نہ اس کے لبوں کے کونے کانپے، نہ اُس کے نتھنوں سے زندگی کا لطیف سانس پیدا ہوا۔ وہ ایک برف کی مورت کی طرح اس شہتوت کے تنے کے نیچے پڑی تھی، اور ڈال ڈال پات پات ہرے ہرے توتے چلا رہے تھے۔ ونتی اُٹھ! ونتی جاگ، ونتی آج تیرے محبوب کا شگن ہو، دیکھ دُھند پہاڑوں پر پھیل رہی ہو، سورج کا سونا ندی کی آنکھوں میں چمک رہا ہو۔ تیری سہیلیوں کے دلوں میں محبت کے گیت رُکے ہوئے ہیں۔ اُٹھ پیاری ونتی۔ لاجونتی، چھوئی موئی ایسی نازک شرمیلی، کنواری اُٹھ، دیکھ تیرے محبوب کے ماتھے پر شگن کا سُرخ ٹیکا چمک رہا ہو اور تیری مانگ سہاگ کے سیندور سے رچی ہوئی ہو۔ اُٹھ پیاری ونتی، دیکھ دُنیا کتنی خوب صورت ہو۔ شہتوت کے پیڑ پر گلابی قرمزی شہتوت لمبے لمبے آویزوں کی طرح لٹک رہے ہیں، اور پہاڑوں پر دُھند، محبوب کے نازک گداز لمس کی طرح پھیلتی جارہی ہو.........

اور گو توتے دیر تک چلاتے رہے، اور اُس کی سہیلیاں دیر تک شور مچاتی رہیں، حتیٰ کہ بہت سے لوگ وہاں جمع ہوگئے، اور گو کائنات اِسی طرح خوب صورت تھی، اور نیلے آسمان پر ستمبر کے بادل شہزادے اپنا لباسِ فاخرہ جس میں دُھند کا ریشم اور کرنوں کے سنہری تار گندھے ہوئے تھے، پہن کر خراماں خراماں گزر رہے تھے، لیکن ونتی کو فرصتِ نظارہ کہاں تھی۔ اُس نے کسی کی طرف پلک اُٹھا کر بھی نہ دیکھا، اور چپ چاپ برف کے گلیشیر کی طرف بڑھتی گئی۔"

اس ناول میں کردار نگاری بھی بہت اچھی ہو۔ چھایا، نوراں، چندرا، سب ہی اور خصوصیت سے

چندرا میں بڑی انفرادیت ہے۔ بام دیو کا کردار دگالیوں، اور اپنی انسانیت دونوں کی وجہ سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تھانے دار یار محمد پیسے کی نہیں، عورت کے جسم کی رشوت چاہتا ہے۔ اور موہن سنگھ وہ لیڈر راج پوت جو شاید چندرا کے بعد اس ناول کا سب سے جیالا کردار ہے۔ علی جو ایک ہندو ریاست کا چھوٹا سا مسلمان عہدہ دار، جس کا اصلی اور سچا ہم درد ہندو تحصیل دار کا بیٹا شیام ہے، اور جو علی جو سے سیاسیات پر بحث کرتا ہے، اور قدامت پرستی کی جگہ اِنسانی اشتراکیت، اور اس بے تعصبی کے اصول سمجھاتا ہے جو اِس ناول کی جان ہیں۔

کرشن چندر کا طرزِ تحریر اُردو افسانوی ادب میں ایک نئی اور بڑی ہی لطیف اور انوکھی چیز ہے۔ اِس میں کہیں لفاظی نہیں، کہیں طوالت نہیں۔ اِس طرزِ تحریر کی کام یابی کی بنیاد اِنسان کی داخلی ضروریات اور فطرت کے خارجی اظہارات کی ہم آہنگی پر ہے۔ اِسی ہم آہنگی سے کرشن چندر کے اسلوب میں وہ انقلابی رمزیت پیدا ہوگئی ہے، جو ان کی تحریر کی جان ہے۔ فطرت کا احساس چوں کہ شعورِ انسانی کی حدود میں اچھی طرح جذب ہو کے نمایاں ہوتا ہے، اِس لیے وہ اپنے اظہار کے لیے نت نئی تشبیہیں، نت نئے خطوطِ متوازی تلاش کرتا ہے۔ رومانیت اور انسان پرستی نے اِس طرزِ تحریر کو لطیف اور جاذب بنا دیا ہے۔ اُس میں سختی یا کرختگی کم ہے، اور اگر اُس کی ضرورت ہو تو طنز یہ خدمت انجام دیتا ہے۔ طنز جو دِل کی گہرائیوں تک اُتر جاتا ہے۔ اِس طنز سے انسان کی غلط روی، اور فطرت کی دل کشی کے احساس کا تضاد اور زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر کرشن چندر اِس طرف لگے رہے تو شاید ایک دِن ان کا مرتبہ پریم چند سے بھی بڑھ جائے۔ اِس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوگی اور رومانیت کو کسی قدر دبانا بھی پڑے گا۔ انقلابی رومانیت سے جتنا کام لینا تھا وہ لے چکے، اب ذرا آگے بڑھنے کی ضرورت ہے

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے اپنی بے لوث واقعیت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ یہ واقعیت قطعی نہیں، اِسے رومانیت، اور نتیجہ خیز تخیل کا امتزاج حاصل ہے۔ "گرہن" کے پیش لفظ میں خود بیدی صاحب

نے لکھا ہے: "مجھے تخیلی فن پر یقین ہے۔ جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں اُسے من وعن بیان کردینے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اُسے احاطۂ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اظہارِ حقیقت کے لیے ایک رومانی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ بلکہ مشاہدے کے بعد پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچنا بجائے خود کسی حد تک ایک رومانی طرزِ عمل ہے اور اِس اعتبار سے مطلق حقیقت نگاری بہ حیثیت فن غیر موزوں ہے۔"

بیدی کے پہلے مجموعے "دانہ و دام" کے افسانے ترقی پسند ادب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق دیہاتی زندگی سے ہے۔ متداول روایات کی ایک زیریں لہر ان افسانوں کو ہندستان کی ہزارہا سال زندگی کا ایک پرتو بناتی ہے، جس کا نقطۂ نظر اب بدل گیا ہے۔ اِس طرح "بھولا" ایک بیوہ ماں کا بچہ، اپنے بوڑھے نانا سے دِن کو کہانی سنتا ہے، جس کی وجہ سے کوئی مسافر راستہ بھٹک جاتا ہے۔ بھولا خود کھو جاتا ہے، لیکن رات کو شمع جلائے وہ اپنے ماموں کو لانے گیا تھا، جو راستہ بھٹک گیا تھا، اور گئی رات تک نہ آیا تھا۔ دیہاتی زندگی میں یہ متداول روایات بڑی ہی رومانی چاشنی رکھتی ہیں۔ ایک بھولے بھالے بچے نے اپنی ماں سے سوال کیا کہ میں کہاں سے آیا۔ ماں کے پاس بہت سے روایتی جواب ہیں، جن میں سے ایک بہت دِل چسپ ہے: "تمھارا باپ ایک سو بیالیس گھنڈیوں والا جال لےکر رام تلائی یا شاہِ بلور کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا، صرف جونکیں تھیں۔ ایک ننھا سا مینڈک عمرو جولاہے کے گھر کے سامنے رُوئی کے ایک گالے پر آرام سے بیٹھا ہوا برسات کی خوشی میں گا رہا تھا، وہ تمھیں تھے۔ تمھارا باپ تمھیں اُٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔"

یا "منگل اشٹکا" میں سماجی اور دُنیوی امن و سکون قائم رکھنے کا یہ فلسفہ پنڈت نے سنایا:- "نمسکار! جو تیر مارنا چاہتا تھا، اُسے جانوروں نے اپدیش دیا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے	ایک بیل مارنے کے
۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے	ایک براہمن کو مارنے کے
۱۰۰ براہمنوں کا مارنا برابر ہے	ایک استری کو مارنے کے

۱۰۰ استریوں کا مارنا برابر ہو ایک گربھ وتی (حاملہ) استری کو مارنے کے

۱۰ گربھ وتی استریوں کا مارنا برابر ہو ایک گائے مارنے کے . . . "

بیدی کے افسانوں کا ماحول دیہاتی زندگی ہو۔ اس کے مسائل، اس کی گندی معاشرت، اس کے مصائب بیان کرنے میں کوئی اور ترقی پسند ادیب ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نچلے متوسط طبقہ کی زندگی، جو ہمیشہ تباہی کے غار پر ایک دھاگے سے لٹکی ہوتی ہو، اُن کے افسانوں میں اپنے پورے انسانی درد اور دہشت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ اس کا انھوں نے اچھی طرح مشاہدہ کیا ہو، اسے بھگتا ہو اور اس کی تکلیف کو محسوس کیا ہو۔ "بھولا" کی ماں کی دلی اذیت میں اس کی جھلک ہو۔ نچلے متوسط طبقے کی خانگی زندگی کا نقشہ شاید ہی کسی نے ایسا اچھا کھینچا ہو۔ اس کا کام یاب ترین نمونہ شاید "گرم کوٹ" ہو۔ اس افسانے میں محبت، اور معاشی حاجت مندی کی وہ تمام زنجیریں، وہ تمام کڑیاں نمایاں ہیں جو ایک غریب متوسط درجے کے خاندان کے افراد کو ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے لیے قربانی کرنا چاہتا ہو، بجز بچوں کے جو ابھی اچھی طرح دُنیا کے مصائب اور مسائل کو نہیں سمجھتے اور مٹھائی اور کھلونوں کے لیے جائز طور پر ضد کرتے ہیں، اور ان کی ماں جو ڈرتی ہو کہ اگر اُس کے خاوند کو گرم کوٹ نصیب نہ ہوا تو شاید اُسے کچھ ہوجائے اور فاقوں کی نوبت آجائے، اپنی ضد کرنے والی بچی کے منھ پر زور سے ایک تھپڑ لگاتی ہو۔ اس خاندان کے لیے دس رُپے کے نوٹ کا گم ہوجانا ایک قیامتِ صغرا ہو، جس کے غم میں خاندان کے سردار کو خودکشی کا کچھ خیال سا آتا ہو، مگر اس موسم میں راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا کیوں کہ سارا پانی تو اوپر سے اوپر باری دوآب لے لیتی ہو۔ اس افسانے میں متوسط طبقے کی ہندستانی بیوی کی سچی محبت اور ہم دردی کی تصویر ہو، ایک خاندان کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔ جذبات، احساسات، ضروریات، معاشی دُشواریوں، محبت اور قربانی کی ایک دُنیا آباد ہو۔

"چھوکری کی لوٹ" میں خوشیاں اور اُمنگیں ایک طرف ہیں، جو سماج کی رسموں میں جھانکتی ہیں، تو دوسری طرف طنز اور تلخی ہو۔ "غلامی" پوسٹ آفس کے ایک کلرک کی نفسیات، اور اس کی

گھریلو زندگی کے پس منظر کا بڑا ہی دل کش مطالعہ ہے۔ غلامی بھی ایک عادت ہوتی ہے جو کسی طرح نہیں چھوٹتی، ساری عمر پوسٹ آفس کا کام کرکے یہ کلرک پنشن پاتا ہے لیکن بیٹوں، بہوؤں، پوتوں میں اسے مسرت نہیں ملتی، پھر وہ ایک چھوٹے سے پوسٹ آفس میں نوکری کرلیتا ہے، اس کو دمہ ہے، اور وہ مارے تکلیف کے لوٹتا ہے، مگر اُسے جو لطف آفس کی غلامی میں ہے، وہ کسی اور کام میں نہیں مل سکتا۔ "آلو" میں ایک نوجوان کی اشتراکی تصوریت اور اس کے بال بچوں کی بھوک کا تقابل ہے۔ چھکڑوں سے وہ بچے کچھے آلو چُن کے جیب میں ڈال لیا کرتا تھا اور اُس کی بیوی، اس کی بچی کا مریڈ اُنھی آلوؤں کو اُبال کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی، مگر اس اشتراکی نے گاڑی بانوں کو ہڑتال کرنے کی تحریک میں مدد دی، ہڑتال ہوئی اور رزق کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ اس لکھی سنگھ کے بچے جن کو ماں دن بھر یہ کہ کے بہلا رہی تھی کہ شام کو باپ آلو لے کے آئے گا، بلک رہے تھے، اور جب باپ خالی ہاتھ آیا تو بچہ اور زور زور سے رونے لگا، لکھی سنگھ کی بیوی اس پر برس پڑی تو نوجوان اشتراکی اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اپنی بیوی کے متعلق سوچنے لگا۔ "کیا بسنتو رجعت پسند ہوگئی ہے؟"

نچلے طبقے کی زندگی کے نقشے بھی انھوں نے بڑی خوبی سے کھینچے ہیں، اگرچہ کہ ایسے افسانے لکھنے میں ان کا نقطۂ نظر اور طرزِ تحریر اس طبقے سے باہر کے آدمی کا سا ہوتا ہے۔ "من کی من میں" "دس منٹ بارش میں"، "لچھمن"، "گرہن"، "رحمان کے جوتے"، "ہڈیاں اور پھول" اور "لاروے" اس قسم کے اچھے افسانوں میں سے ہیں۔ "لچھمن" میں بڑے طنز سے اس افسانے کے ذرا عجیب اور مضحکہ خیز سے ہیرو کے کردار اور اس کی نفسیات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کی نفسیات کی تہ میں ایک رومانی عشق ہے، جس میں چتا کی آگ کے سوا کہیں کامیابی نہیں۔ "گرہن" گھریلو زندگی میں اس اجنبی لڑکی کی مصیبت کی داستان ہے جو بہو بن کے آتی ہے، کالیتھوں کو چار بچے دیتی ہے، وہ نہ تاب جاوی تھی نہ سر پھ جاوی۔ اسی لیے وہ ایک مکار شرابی کی ہوس کا شکار ہوجاتی ہے۔ اور اس افسانے پر چاند گرہن کا پس منظر اپنی پوری ہیبت کے ساتھ چھایا ہوا ہے۔ "رحمان کے جوتے" میں زندگی

کا طنز ہے۔" ہڈیاں اور پھول " میں شک اور محبت اور بیماری کی لعنت ہے جو گھریلو زندگی کے سکھ کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔ اور شک اور رشک کبھی اپنا مقصد حاصل نہیں کرتا۔ " لاروے" اس قسم کے افسانوں میں سب سے زیادہ تلخ ہے۔ غریب اور گندے نچلے طبقے کے انسانوں اور کیڑوں اور مکوڑوں کی زندگی میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں غلاظت میں پیدا ہوتے، اور پلتے ہیں، اور غلاظت سے باہر زندہ نہیں رہ سکتے۔

بیدی کے افسانوں میں زندگی کی تلخی، اور اس کی مصیبتوں کے ساتھ تھوڑا سا وہ لُطف بھی ہے، جو ان مصائب میں امید کی ہلکی سی روشنی پیدا کرتا ہے۔ یہ لُطف محبت اور ہمدردی کا ہے۔ اس کی وجہ سے ہندستان کے نچلے متوسط طبقے، اور مزدور اور کسان کی زندگی قابلِ برداشت ہے۔

بیدی کے پاس طنز ہے، لیکن ظرافت یا ہنسی بالکل نہیں۔ طنز چُبھتا ہوا، سخت اور ناخوش گوار ہے۔ تصوّر زندگی کا ہے۔ اس کے سوا بیدی صاحب کی زبان بھی ذرا غلطیاں کر جاتی ہے، لیکن یہ غلطیاں ان کے محاسن کے آگے ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

علی عبّاس حسینی ترقی پسند افسانہ نگاروں میں بڑی اچھی جگہ کے مستحق ہیں۔ ان کا رجحان قطعی انقلابی نہیں، لیکن اصلاحی ضرور ہے ان کے نقطۂ نظر میں انسانیت دوستی اور قوم پرستی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر اُردو میں ایک بڑا موثر افسانہ " ایک ماں کے دو بچّے " ان کے شاہ کاروں میں ہے۔ اس افسانے میں نفرت سے محبت کا، اور دُشمنی سے برادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو رہا ہے، وہائٹ وے کی دُکان سے ایک مسلمان کچھ خرید کے نکلتا ہے، ایک ٹیکسی والے کو آواز دیتا ہے، جب ٹیکسی میں بیٹھ جاتا ہے تو ایک ہندو جو اندر چُھپا بیٹھا ہے اُس کی گردن پر چُھری تانتا ہے۔ گاڑی ایک خاموش جگہ جاتی ہے۔ مسلمان ہندو سے پوچھتا ہے کہ تم میرے خون کے پیاسے کیوں ہو! ہندو کہتا ہے کہ اُس کا بیٹا اپنے چھ ماہ کے بچّے کے لیے غذا لینے کو نکلا ہی تھا کہ مسلمانوں نے اُسے مار ڈالا " ہائے انھی پھوٹی آنکھوں کے سامنے میرے بالک کے سر سے بھیجا بہ گیا اور میں

ڑا ہاتھ ہی ملتا رہ گیا۔ اب اِس ظلم کے بعد تم کیسے امید رکھتے ہو کہ میں اپنے بس میں لانے کے بعد
کسی مسلمان کو زندہ چھوڑ دوں گا؟" یہ سُن کے مسلمان اس سے صِرف ایک خواہش اور کرتا ہے: "بابا تم سے
صِرف اتنی تمنا ہے کہ مجھے مارنے کے بعد جب تم یہاں مجھے بے گور و کفن چھوڑ جانا تو ذرا تکلیف کر کے
ذکریا اسٹریٹ کے مسلم ہوٹل میں نمبر ۲۸ کے کمرے تک چلے جانا، وہاں تم کو دو لاشیں ملیں گی۔ ایک
میرے نوجوان بیٹے کی۔ اور دوسری میری سال بھر کی بیاہی بیٹی کی! ہوٹل والے کو یہ میرا بٹوہ دینا وہ اُن
کے دفن کا سامان کر دے گا۔ لیکن بھائیو! وہیں میری بیٹی کے پہلو میں اُس کا تین دن کا نونہال سسکتا
ملے گا۔ اُسے یہ ملن فوڈ پیٹ بھر کے کھلا دینا۔ اُس کے بعد اسی چھُرے سے جس سے ابھی مجھے ذبح
کرنے والے ہو، اس کو بھی مار ڈالنا"۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بھائی کو بھائی پر پیار کیسے نہ آتا۔ جسونت رائے
اس شیخ سعید سے لپٹ گیا جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ دونوں جا کے شیخ سعید کے نواسے کو بہ وقتِ تمام
لے آئے۔ جسونت رائے نے شیخ سعید سے ان کا نواسا لے کر اپنی بہو کی گود میں دے دیا اور بولے۔
"بہو ایک مسلمان نے تیری مانگ کا سیندور چھینا اور تیری چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں! دوسرے نے تیرے
جلتے ہوئے دِل پر پھایا رکھا اور اپنے لختِ جگر سے تیری بھری گود اور بھر دی! لے یہ تیرا دوسرا بچہ ہے۔
جس کے دو دو بچے ہوں اس کو شوہر کا غم کیوں ہو" بھارت ماتا کی طرح اِس دیوی نے اِن دونوں
بچوں کو سینے سے لگا لیا اور چپکے سے بولی "یہ میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں۔ جب ان میں سے
ایک پھوٹی تو میں کانی ٹھیری؛ اور جب دونوں تو بالکل اندھی" ——— اِسی طرح ہندو مسلم اتحاد
کے موضوع پر عباس حسینی نے اور بھی کئی افسانے لکھے ہیں جیسے "بوڑھا اور بالا" اور "دیش اور
دھرم" یہ افسانے دیہاتوں کی زندگی میں بسے ہوئے ہیں، اور ان کا موضوع فرقہ پرستی کے بھوت
کے سامنے انفرادی رفاقت اور دوستی کی فریاد اور قربانی ہے۔

یو۔پی کی دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں علی عباس حسینی کو کمال حاصل ہے۔ دیہاتی زندگی کی
مصروفیتوں، اس کی صعوبتوں، اُس کی خوشیوں اور اس کی پریشانیوں کو وہ بڑی خوبی سے بیان کرتے
ہیں۔ نفسِ قصّہ کی حد تک وہ تخیل، اور جذبات کے تجاوز کو اس کا پورا موقع دیتے ہیں کہ وہ

واقعے کو دیہاتی زندگی کے عام نقوش میں واضح اور نمایاں کرکے دِکھائیں ۔ " بہو کی ہنسی" جذبات کے تجاوز اور اِس ہسٹریا اور خواہش کی کہانی ہے جو اپنی اور دوسروں کی جان لیتا ہے ۔ بعد کے افسانوں میں ترقّی پسند تصوریّت ، دیہاتی زندگی کے مسائل کو ایک نئی روشنی میں پیش کرتی ہے جیسے " عدالت " جس کا موضوع ایک غریب لڑکی کو پھسلا کے دغا دینا ، اور پھر اس لڑکی کا خوف ناک رومانی انقلاب ہے ۔ " شکار یا شکاری" میں دیہاتیوں کی مصیبتوں کا ذکر ہے ۔ جس کا کم سے کم خراج انسانی ہم دردی ہے ۔ لیکن " حقِ نمک" اس قِسم کے افسانوں میں اپنے درد ، اپنی واقعیت ، اور اپنی معاشی معنی خیزی کی وجہ سے بہت ممتاز ہے ۔ جس میں ایک کم سِن زر خرید نوکر ، چھوٹے سے اپاہج امیر زادے کی جان بچانے کے لیے ــــــ جس کی خدمت کے لیے وہ نوکر تھا ــــ اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے ، اور مرنے کے بعد جب اُس کے مالک اس کی اتنی تعریف کردیتے ہیں کہ " مرتے مرتے حقِ نمک ادا کرگیا " تو ٹھکرائن تنک کے کہتی ہیں "ہونھ! اچھا کیوں نہ ہوتا ! چھ برس کی جان کے لیے مٹھی بھر رُپیہ نہیں دیا تھا ۔"

چمرٹولی کی زندگی کے متعلق علی عبّاس حسینی نے دو بہت دِل چسپ افسانے لکھے ہیں ۔ دونوں کا موضوع محبّت ، نفرت ، خود غرضی ، اور تعصب ہیں ۔ " سکھی " کا موضوع دو نوجوان چمارنوں کی دوستی ہے ۔ جو اِس دُنیا میں اِن دونوں کو راس نہیں آئی ۔ تفصیلات کے بیان میں مصنّف نے اس غضب کا جوہر دِکھایا ہے کہ اِن چماروں کی جیتی جاگتی زندگی نظر میں پھر جاتی ہے ۔ " آم کا پھل " ایک باہمّت چور اور ایک بانکی لیکن بدنام اور مطعون چمارن کی کام یاب محبّت کی داستان ہے ۔ دیہاتی زندگی کے مصائب ہی علی عبّاس حسینی کے پیشِ نظر نہیں ، اس کے دِل کی محبّت بھری دھڑکن ، اُس کی خوشیاں ، اُس کا سہاگ ، یہ سب اُنھوں نے دیکھا ہے ۔ " جھولا " کا موضوع اِس زندگی کی وہ تھوڑی بہت مسرّت ہے ، جو شوہر کی محبّت میں مِلتی ہے ۔ ساس نندوں کی لڑائیاں اور گھر بھر کا کام کاج اور برہ کی آگ کے بعد شوہر کے قدموں کی پہچانی ہوئی آہٹ آتی ہے ۔ اب دیہاتی دُلھن کا جھولا پڑگیا ۔ وہ روٹھے ہوئے سیّاں کو مناتی ہے ۔

ہندو اور مسلمان متوسط طبقے ، اور زمینداروں وغیرہ کے متعلق بھی علی عبّاس حسینی نے اچھے خاصے

افسانے لکھے ہیں ۔ کبھی کبھی وہ پُرانی قدروں کی حمایت بھی کرجاتے ہیں ، جیسے "نبرد عشق" نیا پردے کی حمایت ۔ لیکن یہ افسانے جو ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوئے تھے ، ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے لکھے گئے تھے ۔ کہیں "سنیمائی" یعنی ضرورت سے زیادہ خوش آیند اور کامیاب محبت کے قصے بھی ہیں جیسے "سو بیگھے" "گونگا بہری" وغیرہ ۔ مگر علی عباس حسینی کو متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کی زندگی ، اور خصوصیت سے عشقیہ زندگی کی تصویر کھینچنے میں ید طولا حاصل ہے ۔ "باسی پھول" اور "انسپکٹر کی عید" اس قسم کے بہت اچھے افسانے ہیں "باسی پھول" میں عشق چلمن ، لذتِ دیدار اور اقرارِ محبت سے آگے نہیں بڑھتا لیکن دلوں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے ۔ لڑکی کی شادی کسی اور سے ہوجاتی ہے ، اس کا شوہر مرجاتا ہے ، اور اس کا پہلا پرستار آخر تک اس کے لیے اپنی زندگی وقف کردیتا ہے ۔ آخر میں اپنی محبت کا پھل پاتا ہے ۔ یہ پاکیزہ محبت کی کہانی ہے ، جس کی تہ میں سچا خلوص ہے ۔ "انسپکٹر کی عید" بنتِ عم سے والہانہ محبت کی داستان ہے ، جس کو ایک متوسط مسلمان گھرانے کا معاشی اُتار چڑھاؤ ، اور طبائع کا اختلاف متاثر کرتا رہتا ہے ۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں تنہائی ایک خاص موضوع ہے ۔ اس کا بہترین اظہار "تاربابو" میں ہوتا ہے ، جو ایک مکڑی کو اپنی محبوبہ کی طرح رکھتا ہے ۔ اور جب ایک حسین لڑکی اس کی تنہائی پر ترس کھا کے اُس سے شادی کرنے پر تیار ہوجاتی ہے تو کہتی ہے : "آپ کو راج رانی (مکڑی) کو نکالنا پڑے گا ۔ مجھے سوکن نہیں پسند"

ان کے اکثر افسانے ایک طرح کے شاعرانہ انصاف پر ختم ہوتے ہیں ۔ اگرچہ کہ جرم کے بعد وہ عقوبت کے ضرور قائل ہیں ۔ لیکن مصیبت کے بعد اپنے کرداروں کو خوش دیکھ کے اور خوش کرکے انھیں دلی مسرت ہوتی ہے ۔ کاش فطرت بھی اسی اصول کی پیروی کرے ۔

مجھے خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی ۔ "فیصلہ" ، "ایک لڑکی" اور "ناگن" کی رومانیت مریضانہ ہے ۔ "سرکشی" کی قسم کے افسانوں سے بجائے

فائدے کے، اور زیادہ مخالفت، اِس لیے اور زیادہ نقصان کی توقع ہو۔ "تین عورتیں" اور "معمار" البتہ انقلابی اور انسانی تصوریت کی وجہ سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے افسانے یقیناً دِل چسپ ہیں۔ اِس دِل چسپی کا بڑا سبب ان کی ٹکنیک ہو۔ افسانوں کا انجام غیرمتوقع ہوتا ہو، اور ناظر افسانہ ختم کرکے تعجب میں کھو سا جاتا ہو۔ یہ امریکی افسانہ نگاری کا بڑا کام یاب اصول ہو۔ او۔ہنری نے بڑی کام یابی کے ساتھ اِس اصول کو برتا ہو۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے موضوعات میں غضب کا تنوّع ہو۔ اکثر و بیش تر فسانوں کی بنیاد اُن کے مشاہدات پر ہو۔ دوستوں کی نفسیات، انڈین کرسچین عورتوں اور رنڈیوں کی نفسیات، اور ان کی زندگی اور خواہشات کے متعلق۔ فلم کمپنیوں کے شب و روز کے متعلق، اور اپنے تجربوں اور خواہشوں کی بنیاد پر انھوں نے بہ کثرت افسانے لکھے ہیں۔ شہری زندگی ان کا اصلی موضوع ہو۔ انھوں نے......کی ایک آدھ لڑکی، اور بیگو یا شیرو کی مالکہ سے عشق کی مریضانہ حکایات بھی لکھی ہیں۔ لیکن صرف ایک کہانی "نامکمل تحریر" میں صحت مند، آزاد، اور زندگی بخشنے والا عشق نظر آتا ہو۔ ورنہ جنس کا طلسم جس میں ان کا شعور اور لاشعور چاروں طرف سے گھرا ہُوا ہو، حد درجہ مریضانہ ہو۔ انھوں نے عنفوانِ شباب کے متعلق بہت سے افسانے لکھے ہیں، جن کو اکثر ترقی پسند ادیب گھناونے بتاتے ہیں۔ "دھنواں"، "پھاہا" اور "بلاؤز" میں واقعہ نگاری کے سِوا کچھ نہیں۔ وہ واقعہ جو زندگی پر صحت مند اثر نہ ڈالے قدرت کا ایک فعلِ عبث ہو اور اس کا ذِکر نہ صرف تضیعِ اوقات ہو، بلکہ انسانی بہبودی کے لیے مُضر بھی ہو۔ "دھنواں" کسی کچّی لکڑی کا دھنواں نہ سہی، لیکن میرے خیال میں یہ ڈی۔ایچ۔ لارنس کو اچھی طرح ہضم نہ کرسکنے کی وجہ سے بدہضمی کی ڈکار ہو۔ اِس قسم کے افسانوں کی سماجی نقطۂ نظر سے ایک ہی وجہِ جواز ہوسکتی ہو اور وہ یہ کہ بچّوں کو شروع سے جنسی تعلیم ملنی چاہیے۔ لیکن اس خامی کو واضح کرنے کے لیے ایسے ترغیب انگیز افسانے لکھنا، جن کو پڑھ کے ہی بچّے جنس کو اور زیادہ مریضانہ نظر سے دیکھیں، انقلابی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں۔ جنس نے سعادت حسن منٹو کے

یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہو۔ "کبوتر والا سائیں" جو افسانے کی حیثیت سے بہت دلچسپ ہو، جنس کی طاقت کو ایک مذہبی رمز کی طرح پیش کرتا ہو۔ عظیم بیگ چغتائی کی طرح ـــ اور ان کی ظرافت کے بغیر ـــ منٹو صاحب نے لڑکیوں سے نوک جھونک کے افسانے بھی لکھے ہیں جیسے "چوہے وان" اور "اس کا اور میرا انتقام"۔ کہیں کہیں منٹو کے یہاں قابلِ قدر محبت کے افسانے بھی ملتے ہیں جیسے "بانجھ" جس میں واقعے اور تخیل کا درمیانی پردہ اُٹھ گیا ہو، اور طبقاتی کش مکش سے اُبھر کے محبت اپنی آزادی کا حق منوا کے قربان ہو جاتی ہو۔ یا "شوشو" جس میں لڑکیوں کا الھڑپن اور تخیل، اور ایک لڑکی کے اُٹھتے ہوئے احساسات کا بڑا اچھا تجزیہ ہو۔ کاش منٹو صاحب جنس کے متعلق ایسے افسانے لکھیں جن کو پڑھ کے کچھ فائدہ ہو، لوگ غور کریں، اور سوچیں۔ ورنہ مریضانہ جنس پرستی سے بڑھ کے ایک ایسے سماج کا اور کوئی دشمن نہیں، جو انقلاب کا خواہاں ہو۔ کرشن چندر کے افسانوں کی آزادی چاہنے والی، کھلی ہوئی ہوا میں پرواز چڑھنے والی محبت کے تصور کا مقابلہ جب کوئی منٹو کی مریضانہ محبت کے تصور سے کرتا ہو، تو محبت کے انقلابی تصور اور جنس پرستی کا فرق سمجھ میں آتا ہو۔

جس مصنف کے ذہن پر جنس چھائی ہو، جنون بھی اُس سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ لارنس اور موپاساں کی مثالوں سے یہ ظاہر ہو۔ جنون سعادت حسن منٹو کا دوسرا محبوب موضوع ہو۔ "اُس کا پتی" میں ہمدرد کو جنون ہو جاتا ہو، "نعرہ" میں نعرہ لگانے والے کو۔ افسوس تو یہ ہو کہ منٹو کا انقلابی ہیرو بھی، بجائے اس کے کہ سلجھے ہوئے عمل سے، محنت اور کوشش سے، تبلیغ سے، ملک کو کوئی فائدہ پہنچائے، بالعموم اپنے جوشِ جنون میں پاگل خانے یا مرگھٹ پہنچتا ہو۔ کاش وہ قید خانے پہنچتا۔ قربانی کا صحیح راستہ اُن کے انقلابی کو نہیں معلوم خواہ وہ منگو کوچوان ہو یا سلیم انقلابی یا گل زماں سماج کی جو کیفیت منٹو کی سمجھ میں اچھی طرح آتی ہو وہ سماجی ہسٹریا ہو، جس کی بڑی اچھی مثال "اُلّو کا پٹھا" اور "وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے" میں ملتی ہو۔

نفسِ مضمون کی حد تک سب سے بڑا اعتراض منٹو پر یہ عائد ہوتا ہو کہ اس میں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا۔ انسان اور انسان کی دوستی، ہمدردی، رفاقت، محبت، جس پر ہر

اچھے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہی، ان کے یہاں نہیں ہی۔ جنسی محبت اور کشش کی محبت میں فرق نہیں (ملاحظہ ہو "شیرو") انقلابی کو اگر جنون نہ ہو تو وہ خودکشی کا ارادہ ضرور کرتا ہی؛ دوست جمع ہوتے ہیں تو اِس لیے کہ اپنے رجعت پسند مریضانہ احساسات کا اظہار کریں۔ منٹو صاحب اپنے ساتھی ترقی پسندوں سے بھی خوش نہیں۔ "دھواں" کے پیش لفظ میں غالباً احمد علی اور رشید جہاں کی طرف اشارہ ہی۔ "ترقی پسند" جو ہجو کا شاہ کار ہی غالباً اُردو ترقی پسند کے دو بہت بالاتر نمایندوں راجندر سنگھ بیدی اور دیویندر ستیارتھی کا مذاق اُڑانے کے لیے لکھا گیا ہی۔

عصمت چغتائی کو ترقی پسندوں میں شمار کرنا، ترقی پسند ادیبوں کی محض سرپرستی اور خاتون پرستی ہی۔ ان کا رجحان سعادت حسن منٹو سے بھی زیادہ رجعت پسند اور مریضانہ ہی۔ ان کا یہ دعوا کہ عورت اور مرد برابر ہیں، بالکل صحیح ہی لیکن اِس آزادی کے ثبوت اور اظہار کے لیے وہ جو مضامین انتخاب فرماتی ہیں، وہ شاذ و نادر ہی کسی کونے سے ترقی پسند معلوم ہوتے ہیں۔ یوں عصمت چغتائی میں بڑی صلاحیت ہی۔ اُن کے طرزِ تحریر میں نسوانیت ہی۔ یعنی وہ اِس طرح لکھتی ہیں جیسے کوئی عورت اپنے نقطۂ نظر سے لکھ رہی ہو ذہنی طور پر مرد بن کے نہ لکھ رہی ہو۔ اسلوب میں عورتوں کی چلتی ہوئی زبان کی سی روانی ہی، اور اس پر انگریزی تحریر کا جدت پسند اثر پڑا ہی۔ ان کا یہ دعوا غلط سہی کہ متوسط درجے کی مسلمان لڑکی کا ذکر، انھوں نے اِس طرح سے کیا ہی جیسے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے لیکن اُس کی نفسیات کو کبھی کبھی وہ اچھی طرح بیان کرسکتی ہیں جیسے "چھری میں سے" "ساس" "پردے کے پیچھے سے" "اُف یہ بچے" اور اِس قسم کے چند افسانوں میں۔

اگر اُن کے نقطۂ نظر میں صحت مندی ہوتی تو یہ اسلوب، متوسط طبقے کی لڑکی کی نفسیات کے حقیقی مطالعے کا انھیں اور زیادہ موقع دیتا۔ لیکن ایک طرح کی غیر معمولی نفسیاتی جنس پرستی نے اُن کے ذاتی نفسی احساس کو اتنا اُبھارا ہی کہ وہ ساری دُنیا میں اپنے آپ ہی کو دیکھتی ہیں یا ساری دُنیا میں ایسی ہی چیزیں انھیں نظر آتی ہیں، جن کی سب سے بڑی قدر جنس کی بے راہ روی، گم راہی،

غلط روی ہو۔ اِس لیے بجائے اِس کے کہ وہ اپنی ہم جنس لڑکیوں کی پوری زندگی کے ہر پہلو کا معائنہ کرتیں، انھیں ہر طرف جنس ہی جنس نظر آتی ہو۔ جنس سے متعلق طرح طرح کے امکانات اُن کی نظر پر حاوی ہیں۔ "لحاف" "بھول بھلیاں" "جال" اور اِس قسم کے دُوسرے افسانوں کی واقعیت سے انکار کرنا تو محض حماقت ہوگی، لیکن سوال یہ ہو کہ زندگی کی اِن غلط کاریوں کو اِن افسانوں میں کس طرح پیش کیا گیا ہو۔ اِس طرح پیش کیا گیا ہو کہ ترغیب کا پہلو زیادہ نمایاں ہو۔ مزا لے لے کے یہ قصّے لکھے گئے ہیں۔ اِن کا انجام اور زیادہ گمراہی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہو۔ اگر عصمت چغتائی کو انھی حقائق سے زیادہ واقفیت تھی، تو انھیں کم سے کم اِن واقعات کو اِس طرح پیش کرنا چاہیے تھا کہ کراہت ترغیب پر غالب آئے۔ حقیقت نگاری کا اصلی مقصد زندگی کے نت نئے امکانات پیدا کرنا ہو، نہ کہ پُرانے زخموں کو کُرید کُرید کر اُنھیں اور زیادہ سڑانا۔ اور وہ یہ بھول گئیں کہ عورت کی زندگی کی ایک بڑی حقیقت اس کا ماں ہونا بھی ہو۔

بعض اور افسانے جو عصمت چغتائی نے ترقی پسندوں کو خوش کرنے کے لیے لکھے ہیں، اُن میں اگر پروپاگنڈے کی قدر موجود ہو تو تفصیلی واقعیت باقی نہیں۔ اِس قسم کے افسانوں میں "میرا بچہ" (ذرا اِس کا علی عبّاس حسینی کے افسانے سے موازنہ کیجیے) "کافر" اور "خدمت گار" شامل ہیں۔ تفصیلی واقعیت کی کمی کی وجہ سے یہ افسانے وہ اثر پیدا نہیں کرسکتے جو ان کا مقصد ہو۔

لیکن ان کے بعض افسانوں میں حقیقی ترقی پسندی بھی ہو، واقعہ نگاری بھی، اور اسلوب میں غضب کا جوش اور جدّت بھی۔ اِس قسم کے افسانوں میں سب سے اچھا "جوانی" ہو جو غالباً عصمت چغتائی کا سب سے مکمّل، سب سے اچھا افسانہ ہو۔ اپنے مرحوم بھائی کو وہ مرنے کے بعد بھی اچھی طرح معاف نہ کرسکیں — غالباً عصمت کی جنس پرستی کی تہ میں کوئی شعوری یا لاشعوری خاندانی بھید ہو — اور انھوں نے "باغی" لکھ کے اُردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا اُن پر اچھا خاصا اثر ہو جس کا نتیجہ "پنکچر" اور خصوصیت سے "ایک شوہر کی خاطر" جیسے کام یاب مزاحیہ افسانے میں ظاہر ہوتا ہو۔

اگر ان کی جنس پرستی میں ذرا روک اور ٹھیراؤ پیدا ہو، ذرا اور توازن ہو، اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو وہ ان کی اصلی جگہ پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں، تو یقین ہے کہ اپنی جدت پسند تحریر، اپنی قوتِ مشاہدہ، اپنی بے جھجک جرأت کی وجہ سے وہ درحقیقت اپنے لیے اُردو ادب میں جگہ پیدا کرسکیں گی۔

مَیں نے صرف چند اہم افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ بہت سوں کا مَیں نے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن کی تصانیف سے مَیں واقف تھا، لیکن طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہ کرسکا۔ ان سب سے مَیں معافی چاہتا ہوں۔

(۶)

ترقّی پسند ڈراما

اگر آل انڈیا ریڈیو کی سرپرستی نہ ہوتی تو شاید مختصر ڈرامے کی طرف ترقّی پسند ادیب توجّہ نہ کرتے۔ اس سرپرستی کی وجہ سے اُردو میں ریڈیائی ڈراما وجود میں آیا ہے۔ سب سے زیادہ ریڈیائی ڈرامے سعادت حسن منٹو نے لکھے ہیں۔ 'پیش لفظ' میں وہ لکھتے ہیں، "مَیں چوں کہ اس میدان میں سب سے آگے ہوں اس لیے مجھے یقین ہے کہ ہندی اور غیر ہندی ڈرامہ نویس دونوں میرے یہ پندرہ ڈرامے پڑھ کر مفید معلومات حاصل کریں گے ——— اور بھی اچھا ہوگا اگر یہ لوگ میرے ڈرامے ریڈیو پر بھی سُنیں۔ اس سے وہ میرے محاسن اور اپنے عیوب اچھی طرح معلوم کرسکیں گے۔ مَیں اسی طریقے سے اپنے عیب معلوم کرتا رہا ہوں۔"

اس تعلّی کو پڑھنے سے جو امید ہوتی ہے، وہ ڈرامے پڑھ چکنے کے بعد باقی نہیں رہتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ڈراموں کی ڈرامائی ترتیب اور پیرایۂ اظہار میں بڑی جدت ہے۔ جیسے "انتظار" اور "کیا مَیں اندر آسکتا ہوں"۔ بعضوں میں لطیف رومانی ابہام ہے جس کی وجہ سے وہ

پُر اسرار معلوم ہوتے ہیں جیسے "کبوتری" اور "اکیلی" اور کم سے کم ایک افسانے میں پُر استعجاب انجام کی تکنیک کو اُنھوں نے کام یابی سے استعمال کیا ہو ——— "جیب کترا" میں۔ لیکن اِن کے سوا باقی تمام ڈراموں میں سطحیت ہو، اور تکنیک کے سوا کچھ اور نہیں۔ شاعر اور اس کی محبوبہ کے متعلق تین ڈرامے ہیں، "نیلی رگیں" "ساڑھی" اور "نقشِ فریادی" جن کی رومانیت بہت سستی ہو۔ "ٹیڑھی لکیر" "جرنلسٹ" "کمرہ نمبر ۹" میں زندگی سے کوئی خاص مُناسبت نہیں پائی جاتی۔ دو فارس (مزاحیہ ڈرامے) البتہ غنیمت ہیں۔ "قانون کی حفاظت" اور "بیمار"۔ لیکن "تین انگلیاں" میں ترقی پسند ادیب جاسوسی پر اُتر آیا ہو اور "تحفہ" میں اپنے پُرانے افسانوی موضوع رومانی جنون پر۔

کرشن چندر کے ڈراموں کا مجموعہ "دروازہ" پڑھ کر بھی یہی خیال ہوتا ہو کہ کاش وہ ناول اور افسانے ہی میں لگے رہتے۔ اُن کے اکثر ڈراموں میں سطحیت اور سرسری رومانیت ہو۔ لیکن کم سے کم دو ڈرامے واقعی اچھے ہیں۔ ایک تو "نیل کنٹھ" جس میں شوجی اور پاربتی آکاش سے اُتر کر دُنیا پر اِس ذلیل اِنسان کی خودغرض زندگی دیکھتے ہیں۔ بالآخر وہ ایک مندر پہنچتے ہیں جہاں ایک آوارہ سادھو پھٹے پُرانے کپڑے پہنے آگ جلائے بیٹھا ہو۔ پاربتی کو بھوک لگی ہو۔ آوارہ، ایک بدبودار سا روٹی کا ٹکڑا، جو ایک کتّے نے سونگھ کر چھوڑ دیا، اور جسے آوارہ نے اپنے لیے اُٹھا رکھا تھا۔ پاربتی کو یہ کہہ کے دیتا ہو کہ تمھاری بھوک میری بھوک سے زیادہ ہو۔ پاربتی اِس بدبودار ٹکڑے کو لینے میں تامّل کرتی ہیں تو شوجی کہتے ہیں "یہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کیا دیکھ رہی ہو۔ پاربتی! اِسے سویکار کرلو۔ یہ ایک بدبودار روٹی کا ٹکڑا نہیں ہو۔ یہی وہ امرت ہو پاربتی، جس کی خاطر ہم نے اور سب دیوتاؤں نے سمندر کا کونہ کونہ کھنگال ڈالا تھا۔ یہی وہ جیون کا آخری بھید ہو جسے ایک آوارہ سادھو اپنے کلیجے سے چمٹائے ہوئے ہو۔" کرشن چندر کے ڈراموں میں اُن کے افسانوں کے مقابل خارجیت بہت زیادہ ہو۔ اُن کا دوسرا اچھا ڈراما "سرائے کے باہر" اِس اصول سے مستثنیٰ ہو، اس پُراثر ڈرامے میں آوارہ شاعر کے کردار میں انھوں نے اپنے لیے جگہ تلاش ہی کرلی ہو۔ یہ ڈراما اپنی حقیقت نگاری، اور اپنے اسلوب اور ترتیب کی وجہ سے بہت دِل چسپ ہو۔

اوپندر ناتھ اشک نے بھی ڈرامے لکھے ہیں، مگر ان کے ڈرامے بھی کرشن چندر کی طرح ان کے افسانوں کے مقابل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

— ۷ —

ترقی پسند ظرافت

ترقی پسند تحریک نے صرف ایک اچھا ظریف اور مضحکہ نگار پیدا کیا ہو۔ کنھیالال کپور۔ اِس مضحک نگاری میں جو قوت ہو وہ سنجیدہ سے سنجیدہ تنقید، اور سخت سے سخت تنقید میں نہیں۔ "رومان کی تلاش" "ایک آرٹسٹ" "چینی شاعری" "سُنانے کا مرض" سب میں ترقی پسند ادیبوں کے رجحانات کی طرف مزاحیہ اشارے ہیں، لیکن "اُردو افسانہ نویسی کے چند نمونے" اور "غالب، جدید شعرا کی ایک مجلس میں" ان کے اہم ترین اور مقبول ترین مضامین ہیں۔ جدید افسانے کے سلسلے میں انھوں نے ترقی پسند افسانے کے اُن رجحانات کا بھی مذاق اُڑایا ہو، جن میں مبالغہ اور رقت انگیزی زیادہ ہو، اور خلوص اور زندگی کم۔ ترقی پسند افسانوں میں کنھیالال صاحب کے نزدیک مزدور اور اس کی مظلومیت اور بیماریوں کے متعلق افسانے محض پچیس فی صدی ترقی پسند ہیں۔ پچاس فی صدی ترقی پسند وہ افسانے ہیں جن میں مزدور پر ظلم اور مزدور کی عورت سے عشق کیا جاتا ہو۔ پچھتر فی صد ترقی پسند وہ افسانے ہیں جن میں مزدور سرمایہ دار کی بیوی سے عشق کرتا ہو۔ سو فی صد ترقی پسند وہ افسانے ہیں جن میں بیٹا ماں سے یا بھائی بہن سے عشق کرے! مصنف اکثر اپنے ذاتی تجربات کسی اور شخص کی زبانی بیان کرتا ہو اور "بعض دفعہ تو اِتنا بتانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا کہ آج کل مصنف کن جنسی امراض میں مبتلا ہو" یہ تنقیدیں زرا سخت ضرور ہیں، اور شاید نامہربان بھی، لیکن یہ انقلابی تحریک کو ایک بھدی، گندی روایت بن جانے سے ضرور روکیں گی۔ اس کے بعد کنھیالال کپور نے اسی بے دردی سے جذباتی، نفسیاتی، دیہاتی، رومانی اور حقیقت نگاری کے افسانوں کا مذاق اُڑایا ہو۔

اُن کا دوسرا مضمون "غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں" بہت زیادہ دل چسپ ہو کیوں کہ

از ضمیمہ "نورالآفاق"، نمبر ۷ جلد ۱ - ۲۳ر نومبر ۱۸۷۳ء

نقل خط اوّل سرسید احمد خاں بنام سید امداد علی ڈپٹی کلکٹر (صفحہ ۲)

"جناب ڈپٹی صاحب مخدوم و مکرم بندہ سلامت

بعد سلام مسنون الاسلام التماس ایں کہ آپ جو میرے مکان میں تشریف لائے مجھے کمال خوشی ہوئی کہ یہ ایک ذریعہ میرے یاد آنے کا ہوگا۔ بہرحال اگر ملاقات نہیں ہوتی تو مکان دیکھ دیکھ کر یاد کیا کروگے۔ مَیں یہاں بہت خوش ہوں کام بہت کم ہے۔ تصنیفِ کتب کو بہت فرصت ہے۔ چھاپے خانہ فضلِ الٰہی سے جاری ہوگیا ہے۔ تفسیر چھپ رہی ہے۔ مجھ کو بڑا اشتیاق اس بات کے دریافت کرنے کا ہے کہ آپ کے اور احباب ہمارے شفیق صدرالصدور صاحب بہادر ولی اللہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟ مَیں متنا ہوں کہ جناب ممدوح بڑی دھوم دھام سے کچہری فرماتے ہیں اور اگلوں کی نیک نامی مٹانا چاہتے ہیں۔ یریدون ان یطفوا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ امید کہ آپ اپنی خیروعافیت سے مطلع فرمادیں اور اطلاع دیں کہ شفقی سوتی بہاری لال صاحب کے یہاں کون مرگیا ہے تاکہ مَیں تعزیت نامہ لکھوں۔ معلوم نہیں کہ [illegible] صاحب خاص شہر وہاں ہیں یا اپنے گھر گئے۔ مولوی محمد حسین صاحب کی خدمت میں سلام نیاز اور یہ پرچہ ان کو بھی دکھلادیجیے گا۔ منصف صاحب امروہہ مرادآباد میں میرے بعد اگر آئے ہوں تو حال لکھنا کہ وہ کہاں رہے اور ملاقات ہو تو میری زبان سے یہ شعر پڑھنا ؎

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

تحصیل دار صاحب مرادآباد تو ہم سے پہلے ہی خفا ہو گئے تھے۔ ان کی خدمت میں کیا لکھوں۔

والسلام۔

خاکسار

سید احمد ۱۶ر جولائی ۱۸۶۲ء غازی پور"

اسی ضمیمہ "نورالآفاق"[1] میں ایک خط مولوی امداد علی کے نام ۱۶ر جولائی ۱۸۶۲ء کا غازی پور

[1] "نورالآفاق"، سرسید کی تردید کے لیے ۱۸۷۳ء میں جاری ہوا۔ اس پرچے کے مقاصد (باقی نوٹ اگلے صفحے پر)

سے لکھا ہوا ہے لیکن وہ فارسی میں ہے (صفحہ ۲ تا صفحہ ۳)

نقل خط سوم سید احمد خاں بنام سید امداد علی صاحب (صسے)

" جناب ڈپٹی صاحب مخدوم مکرم بندہ سلامت۔

بعد سلام مسنون الاسلام عرض یہ ہے کہ بندہ بفضل الٰہی سے بہ خیریت ہے۔ اخبارات مرادآباد سے جو جو الفاظ عنایت و شفقت آپ نے بعض اوقات نسبت میرے ارشاد فرمائے معلوم ہوئے۔ میں اس کا نہایت شکرگزار ہوں مجھے آپ کی صفائی اور یک رنگی سے یہی توقع تھی۔ درحقیقت آپ بہ نسبت حضوری کے غیبت میں زیادہ تر پاس و لحاظ محبت اور دوستی کا رکھتے ہیں۔ برخلاف ابنائے زمانہ کے منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ۔ میں ایک مسکین آدمی ہوں۔ کسی کی برائی میں نہیں۔ البتہ حکام اپنی قدردانی سے میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ اس پر حسد کرتے ہیں وہ اپنی کیوں نہیں ایسی لیاقت پیدا کرتے کہ حکام کی آنکھ میں ان کی عزت یا قدر ہو۔ واہیات بکنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میری تفسیر پہنچی ہوگی اس کو مطالعہ فرماکر جو نقص نظر میں پڑے اس سے مطلع فرمائیے اور پانچ روپے قیمت کے جلد بھیج دیجیے۔ اور ہمیشہ اور اپنی خیروعافیت سے جلد جلد مطلع فرماتے رہیے۔ منشی امام الدین کا بہت دنوں سے حال معلوم نہیں ہوا۔ ان کے حال سے مطلع فرمادیں کہ کس رنگ میں ہیں۔ ہم سے تو وہ جبھی ناخوش ہو گئے تھے جب جناب پاور صاحب بہادر آزردہ ہوئے تھے۔ مگر میں تو بہ دستور ان کا دوست ہوں۔ اس لیے ان کی خیروعافیت چاہتا ہوں۔ والسلام

خاکسار

سید احمد غازی پور ۳ ر اگست ۱۸۶۲ء"

سید احمد خاں نے پہلے خط میں "ولی اللہ" مولوی پیغمبر بخش کو بہ طور طعن کے لکھا ہے۔ مولوی صاحب

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوں گے جو اس کے پہلے نمبر کے سرورق پر درج تھی "ان دنوں ہندستان میں ایک قرن شیطان پیدا ہوا ہے کے سبب سے عجب فتنہ پیدا ہوا۔ در الحاد بازہوا۔ . . . . . . الحادی باتوں کے شائع کرنے کو ایک پرچہ اخبار نیا ایجاد ہوا اور بہ مصداق "برعکس نہند نام زنگی کافور" بہ تہذیب الاخلاق نام نہاد کیا۔ بس حامیانِ اسلام کی طرف سے 'نورالآفاق' جاری ہوا"۔ (ملاحظہ ہو نورالآفاق نمبر ا جلد ا : ۳۰ ر اگست ۱۸۷۳ء)

مراد آباد میں سید احمد خاں کی جگہ مقرر ہوئے تھے۔ دوسرے خط میں (جو فارسی میں ہی) مولوی پیغمبر بخش کی نسبت لکھا ہی کہ " مردماں را عادت است کہ کسے کہ بہ عنایت ایزدی نام آوردہ و نیک نام می باشد برآں حسد می برند و بدگوئی نیک نامی می کنند و نمی دانند کہ ازیں لغویات ہیچ فائدہ شاں و مضرت آں شخص نیست"

اسی فارسی خط میں مولوی عالم علی کے متعلق لکھا ہی کہ "مولوی عالم علی از حد طماع و احسان فراموش اند۔ من در مرادآباد شنیدہ بودم کہ او شاں شکایت من می کنند و دریں جا متواتر شنیدم چناں چہ بہ جہت رخصت من ہم نیامدہ بودند۔ الحال او شاں فراموش کردند کہ بہ طفیل من و بہ تصدق جناب شیکسپیر صاحب از پھانسی نجات یافتند"

خیالات و نظریات

مردار مرغی کا واقعہ:- ان خطوط سے ہم سرسید مرحوم کے ذاتی اعتقادات بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ ادب کی یہی وہ صنعت ہی جس میں لکھنے والا اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہی اور وہ اپنا کیرکٹر، مافی الضمیر اور اپنی سچی رائیں بلا کم و کاست ظاہر کر دیتا ہی۔ لندن پہنچ کر سرسید نے بے ذبح کی ہوئی مرغی کھائی اور اس کی اطلاع نواب محسن الملک مرحوم کو بھی کی۔ ان کو بڑا رنج ہوا اور سختی سے محاسبہ کیا۔ سرسید اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جس سے آپ کو افسوس ہوا اس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ بات جوڑ کر ہندستانی نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں۔ افسوس کہ مجھے ایسے لفظ لکھنے نہ آئے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجیے۔ جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا۔ تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کروگے۔ بھائی کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں برا کروں اور اس کو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ برا نہ کہیں۔ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہی۔ جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہی۔ جو بات کہتے ہیں، وہ سن لیتا ہی۔ جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہی۔ ایسا پیچھے پڑا ہی کہ نہ جہاز میں چھوڑے

نہ زمین پر چھوڑے۔ نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا
چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے
رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈرتا۔ میں اس کو قرآنِ مجید سے جائز سمجھتا
ہوں نہ روایت شاذہ سے۔ بہرحال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف
معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ سے نہایت سچے دل سے التجا کرتا ہوں کہ بعضے آقاؤں کے نہایت
بدخصلت اور بدکردار غلام ہوتے ہیں۔ وہ آقا اپنے غلام پر ناراض تو ہوتے ہیں مگر اس غلام
کو غلام سمجھتے ہیں۔ اسی طرح گو آپ میری حرکاتِ ناشایستہ سے ناراض ہوں مگر مجھ کو اپنا غلام
سمجھتے رہیں۔ "برمن منگر برکرم خویش نگر" یہ الفاظ میں نے نہیں لکھے میرے دِل نے لکھے
ہیں۔" [1]

لیکن دراصل سرسید کا پختہ یقین یہی تھا کہ بغیر ذبح کی ہوئی مُرغی جائز ہے۔ چناں چہ آیندہ
ایک خط میں جو محسن الملک ہی کے نام ہے سید محمود کی طرف سے لکھتے ہیں :-

"سوائے تقلید کے اور سوائے مرغی والی بات کے باقی سب مانی جاویں گی۔" [2]

نواب محسن الملک نے سرسید کی اس حرکت کے خلاف دوستانہ اور محبت آمیز انداز میں اعتراض
کیا اور وہ کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ سرسید نے اس کا جواب ظریفانہ دیا ہے لکھتے ہیں :-

"آپ نے جو کچھ میری مردار مرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس نے
عجب لُطف مجھ کو دیا ہے۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی دولتِ عشقِ مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے کہ
نہیں کیوں کہ بغیر اس کے آدمی میں اور مٹی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اب جو مزہ آپ کے الفاظ
نے دیا ہے اس کی مثال بیان کرتا ہوں بعضی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ عاشق اور معشوق میں آپس میں
خفگی ہوجاتی ہے اور جوشِ محبت زیادہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں سُناتے
ہیں۔ وہ لفظ تو بظاہر ٹیڑھے ہوتے ہیں مگر ان سب سے جوشِ محبت اور نہایت مزے دار
اُلفت ٹپکتی ہے۔"

لیکن سرسید کو خدا اور رسول سے جو محبت تھی اس سے انکار کی مجال نہیں۔ محسن الملک

---

[1] "خطوط سرسید" صفحہ ۳۵۔   [2] "خطوطِ سرسید" صفحہ ۷۱

کو لکھتے ہیں :-

"ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرت کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا۔ اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آں حضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہوکر مرگیا حاضر کرو۔ مارا ہمیں تحفۂ شہنشاہی بس است۔"[1]

سرسید کے دل میں احکام خدا کی محبت بھی پوری طرح جاگزین تھی نواب وقارالملک کا ایک انگریز آفیسر سے نماز کے معاملے میں جھگڑا ہوگیا۔ ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"بھائی مشتاق حسین کل میں سارے دن متردد رہا کیوں کہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی ملاکر بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں۔ اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت لچر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو۔ اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کیسا۔ "حضور رخصت ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں" کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفا دے دینا تھا۔ اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا نوکری نہ میسر ہوتی۔ فاقے مرجاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔"[2]

---

[1] خطوطِ سرسید، ص ۳۸ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۱۸ و ۴۷۔　　[2] ایضاً ص ۱۸

سرسید کی زندگی اور ان کی تحریک عہدِ وکٹوریہ کے جملہ اثرات کی آئینہ دار ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی اور روحانی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ پرانے نظریوں پر دوبارہ غور و خوض کرنے اور زندگی کے مسائل کو نئے اسلوب پر ترتیب دینے کی ضرورت تھی۔ سرسید نے مغربی خیالات سے پورا پورا استفادہ کیا اور اس گری ہوئی عمارت کو نئے طرز پر بنانے کی کوشش کی۔

عہدِ وکٹوریہ میں سائنس کے سیلاب نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا تھا اور علم کی روشنی نے تاریک گوشوں کو منور کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں جمہوریت کا شعور بھی پیدا ہوا اور تمام مسلمات پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ ڈارون کے اصولوں نے جبلت اور عقل کے درمیان کشمکش پیدا کر دی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس اور مذہب کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عقلیت پسندی کی رو میں تمام مذہبی عقائد خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے لیکن ہنری ڈرمنڈ اور میتھو آرنلڈ وغیرہ نے مذہب کی حفاظت کا جدید اور سائینٹفک طریقہ نکالا اور مذہب کو سائنس سے ہم آغوش کر دینے کی کوشش کی۔ سرسید بھی ان خیالات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مذہب نیچر اور سائنس کی حدیں ملا دینے کی سعیٔ بلیغ کی لیکن یہ بات اصولاً صحیح نہیں تھی اس لیے کہ سائنس کے نظریات روز بہ روز بدلتے رہتے ہیں۔

اس سیلاب کا زور گھٹنے کے بعد سر آرتھر ایڈنگٹن۔ سر جیمس جینس (Sir James Jeans) اور سر محمد اقبال کی تحریروں نے عشق و عقل کے امتزاج پر زور دیا اور بتلایا کہ اس محفل کی رونق اسی مینائے محبت سے قائم ہے۔ لیکن سرسید کی ان تحریروں سے یہ ضرور فائدہ ہوا کہ ہمارا زاویۂ نگاہ بدل گیا اور گفتگو اور بحث کے ایسے اسلوب نکل آئے جن میں عقلیت پسندی کا بھی اصول کارفرما تھا۔

تقلید سرسید تقلید کے سخت دشمن تھے اور اسے مسلمانوں کے لیے سخت مضر خیال کرتے تھے۔ خطوط میں اس کا جا بہ جا ذکر کیا ہے۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :-

"بھائی جان سنو اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنی مکتوبات ضمیر کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں

کہ اگر لوگ تقلید نہیں چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن اور احادیث صحیح سے حاصل ہوتی ہو نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندستان سے معدوم ہوجائے گا۔" ۵۱ے

پردہ سرسید پردے کے حامی تھے اور اس معاملے میں مولوی عبدالحلیم شرر کے سخت مخالف تھے۔ شرر کہتے تھے کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ساتر اور مہذب لباس کا نام ہو۔ اور گھر کی چہار دیواری میں عورتوں کو بند کردینا پردہ نہیں بلکہ حماقت ہو۔ انھوں نے سنہ ۱۹۰۰ء میں "پردہ عصمت" نام کا ایک رسالہ بھی لکھنؤ سے جاری کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے پردے کی رسم اٹھادی جائے ۵۲ے سراج الدین احمد بیرسٹر ایڈیٹر "چودھویں صدی" اور سرمور گزٹ نے اس باب میں سرسید سے استفسار کیا۔ اس کا جواب ذیل میں درج ہو:-

"مخدومی بے شک میں پردے کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص ہندستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہو نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہو کہ منھ اور ہاتھ پہونچے تک اور پانو ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بہ سبب فسادات زمانہ منھ کو پردے میں داخل کیا ہو۔ مولوی شرر صاحب نے میری نسبت ایک لغو بات لکھ دی ہو میں نے کسی کے سامنے کہا کہ شرعاً منھ اور ہاتھ پردے میں داخل نہیں ہیں۔ ان کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔" ۵۳ے

درایت اسی طرح یہ بات بھی دل چسپ ہو کہ سرسید حدیثوں کے جانچنے اور صحیح قرار دینے میں اصول درایت کے قائل تھے۔ یعنی وہ راوی کے معتبر یا غیر معتبر ہونے سے قطع نظر کرکے نفسِ حدیث پر غور کرنا پسند کرتے تھے کہ وہ فی نفسہ صحیح ہوسکتی ہو یا نہیں ۵۴ے ایسے ہی وہ

۵۱ے "خطوطِ سرسید" ص ۵۵ ۔ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو "اُردو نثر: سرسید کے زیر اثر" (انگریزی) ص ۲۲-۲۳

۵۲ے "ترجمۂ عسکری: تاریخ ادب اُردو" ص ۱۳۵ ۵۳ے "خطوط سرسید" ص ۱۶۱

۵۴ے "خطوطِ سرسید" ص ۲۴۲ ۔

جمع بین الصلواتین کو جائز سمجھتے تھے۔[1]

یورپ کا اثر سرسید کے خیالات پر انگلستان کا بڑا گہرا اثر پڑا وہ نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں۔ اصولِ ایمانیہ اسلامیہ پر جس قدر یقین یورپ کے آنے سے اور یہاں کے حالات اور علوم اور علماء کی رائیں دریافت کرنے سے ہوتا ہو بلا تشبیہ نعوذ باللہ ویسا یقین حج سے نہیں ہوتا۔[2] اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب اور تنزلِ موجودہ اور ذلتِ آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہو اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہو اس میں بھی وہ حماقت اور نالائقی اور گم راہی ہو جو اور تمام کاموں میں ہو۔ پس کوئی کیا کرے۔ بداقبالی و بدنصیبی کا کچھ علاج نہیں۔[3]

اسی خط میں خطبات احمدیہ کے متعلق لکھتے ہیں "اگر میری کتاب تیار ہوگئی جس میں دس باب ہیں تو میں لندن میں آنا دس حج کی برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔[4]

سرسید کا بیان ہو کہ سید محمود پر بھی یورپ کا نہایت عمدہ اثر ہوا۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:-

"آج رات کو اس (سید محمود) نے کہا کہ میں تو لندن میں آکر سچّا اور پکّا اور تصدیقِ قلبی سے مسلمان ہوا ہوں۔[5]

انگلستان کی فضا میں پہنچ کر سرسید کا یہ حال تھا جیسے ایک شخص اندھیرے کمرے سے نکل کر ایک دم بجلی کی روشنی میں پہنچ جائے۔

وہ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"انگریزوں کو ہندستانیوں سے وہ نسبت ہو جو خوب صورت آدمی کو ایک وحشی جانور سے ہو۔[6]

---

[1] "خطوط سرسید" ص ۲۵۱۔ [2] "خطوطِ سرسید" ص ۱۸۔ [3] "خطوطِ سرسید" ص ۴۲۔
[4] " " ص ۴۳۔ [5] " " ص ۸۰۔

س میں اکثر ترقی پسند شاعروں کی نقل بڑی کام یابی سے اُتاری گئی ہو، یہاں بھی اصلی مقصد اصلاح ہو۔
اور یہ اصلاحی طریقہ تنقید سے کہیں زیادہ موثر ہو۔ چناں چہ ان کے "م۔ ن۔ ارشد" صاحب فرماتے ہیں ؎

" آ مری جان، مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ ہم چوم ہی لوں عارضِ گل فام ترا
اور احباب وطن کو یہ اشارہ کردوں
اس طرح لیتا ہو اغیار سے بدلہ شاعر
اور شبِ عیش گزر جانے پہ
پھر جمع درم و دام نکل جاتا ہو "

"غیظ احمد غیظ" کی حقیقی دل کش نظم کی بھی نقل اُتاری گئی ہو۔ یہ نظم نقالی کی مستحق تو نہیں تھی
لیکن اس کا کیا علاج کہ نقل بھی بہت اچھی ہو ؎

" فون پھر آیا، دلِ زار؟ نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، اُترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلّا کے، ہر ایک چوکی دار
گُل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ

ہر انقلابی تحریک کے ساتھ اس کے ادیبوں کی نقلیں بڑی ضروری ہیں۔ انگلستان کی انٹی جیکوبن
شاعری اس کی مثال ہو۔ اس تحریک میں اور صفائی پیدا ہوتی ہو۔ اور نقائص کم ہوتے جاتے ہیں۔
چراغ حسن صاحب حسرت اور دو ایک اور صاحبوں نے بھی ترقی پسند شاعری کے بعض اسلوبوں
کی بڑی اچھی نقلیں اُتاری ہیں۔

۸

ترقّی پسند تنقید

ترقی پسند تنقید میں ابھی ترقی کی بہت گنجایش ہے اور نشوونما کی بڑی ضرورت۔ اختر حسین صاحب رائے پوری کا مضمون "زندگی اور ادب" اس قسم کا پہلا مضمون ہے، اور اسے وہ پوری کام یابی حاصل ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس مضمون میں جزوی خامیاں بھی ہیں، مثلاً اردو شاعری کے ساتھ عموماً اقبال کے ساتھ خصوصاً اس کی نا انصافی۔ اس پر ہم بحث بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ان جزئیات سے قطع نظر یہ مضمون ایک بہت بڑی تعمیری ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔ اختر صاحب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادب اور انقلاب" کے نام سے شائع ہوا ہے، لیکن اُن کا کوئی اور مضمون "ادب اور زندگی" کو نہیں پہنچتا۔

احمد علی صاحب کا ایک مضمون "ادب کا ترقی پسند نظریہ" رسالۂ 'اُردو' میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اعلا ذہنی معیار پر پورا اُترتا ہے، اور شاید اُردو میں اعلا ترقی پسند تنقید نگاری کی بہترین مثال ہے۔ احمد علی صاحب کو مغرب کے ترقی پسند ادب پر بھی اچھا خاصا عبور ہے اور وہ اکثر مغربی ادیبوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اُردو میں وہ ترقی پسند تنقید کی طرف اور زیادہ توجہ کریں۔

پھر کتابوں کے مقدمے ہیں، یا وہ مضامین ہیں جو رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے سجاد ظہیر، شاہد لطیف اور فیض احمد فیض کے مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ کرشن چندر نے اہم مصنف یا شاعر کے کسی نہ کسی مجموعے کا مقدمہ ضرور لکھا ہے، اور اکثر تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو نکالا ہے۔

خواجہ غلام السیدین صاحب کا ایک مضمون اقبال کی ترقی پسندی پر رسالۂ 'اُردو' میں شائع ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا؛ ورنہ شاید مجھے اقبال کی حمایت میں اتنی طول بحث نہ کرنا پڑتی۔

سرسیّد خطوط کے آئینے میں

(بہ قلم جناب خواجہ احمد فاروقی، ایم اے)

اُردو کی فضائے ادب جن روشن اور تابناک ستاروں سے مزیّن ہے اُن میں "فرزانہ علی گڑھ" سرسید احمد خاں کا نام بڑی شہرت اور وقعت رکھتا ہے۔ مولانا حالی نے انھیں "نثرِ اُردو کا مورثِ اعلیٰ" قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے تقریباً تیس برس کے اندر اُردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا اور وہ زبان جو عشق و عاشقی کے جھگڑوں میں پھنسی ہوئی تھی اس میں اب یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ فنی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین کو بہ خوبی ادا کرسکے۔ مولانا شبلی نے صحیح لکھا ہے کہ "سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ اُن کی اصلاح کی بدولت ذرّے سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے"[1]

سرسید مرحوم نے باوجود اس کے کہ وہ امام بخش صہبائی کے جلیس اور ہم صحبت رہے تھے اور ہر وقت ظہوری اور بیدل کا کلمہ پڑھتے تھے، قدیم تصنع نگاری پر ایک ضربِ کاری لگائی اور نثرِ اُردو کا قصر، سلاست اور سادگی پر قائم کیا۔

اِس وقت مُغلیہ حکومت کا عَلَم سرنگوں ہوچکا تھا اور تمام مُلک میں انگریزی تسلّط کی بنیادیں استوار ہوچکی تھیں۔ سیاسی نظام کے بدلنے سے تمام اجتماعی اور معاشرتی نظام متزلزل ہوچکا تھا اِس وقت زندگی کی دوبارہ تنظیم، نظریات میں ضروری تبدیلی اور نئی باتوں سے تطابق اور ہم آہنگی

---

[1] "سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر" شبلی نعمانی

پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ ادب اِن تبدیلیوں سے ہم آغوش نہ ہوتا۔ یہ قدم سرسید نے اُٹھایا جو مدبر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھیں پوری قوم کو مخاطب کرنا تھا —— وہ قوم جو حکومت جانے کے بعد اپنی شامتِ اعمال کے نتائج بُھگت رہی تھی اور جس کے پاس اتحاد و اتفاق، نظم و انتظام، تعلیم و تربیت، ضبط و خود داری، صداقت و حق پرستی، ہمت و بلند نظری میں سے ایک شئ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کثیرالتعداد مجمع کو (جس پر قوم کا اطلاق نہیں ہوتا) سادہ سے سادہ اور آسان سے آسان زبان ہی میں مخاطب کیا جا سکتا تھا۔ اِسی لیے سرسید کی تحریروں میں الفاظ مطالب کے ماتحت ہیں۔ اور مضمون پیرائے سے زیادہ اہم ہے۔ اُن کا مقولہ تھا کہ تحریر میں معانی زیادہ اور تصنع کم ہونا چاہیے۔

خصوصیات

آدمِ نثرِ جدید، بانئ مدرسۃ العلوم، اور حامئ ملک و ملت یعنی سیدِ اعظم کو اگر برافگندِ نقاب دیکھنا ہے تو "خطوطِ سرسید" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہاں انھوں نے اپنا دِل اور دماغ کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ خطوط ان کے اخلاق و عادات، اعتقادات و نظریات، اور عصری معلومات و تحریکات کا خزانہ اور گنجینہ ہیں۔

قوم پرستی سیرت:- سرسید کو اپنی قوم سے بڑی محبت تھی اور ان کا کوئی لمحہ اس کی اصلاح اور درستی کے خیال سے علاحدہ بسر نہیں ہوتا تھا۔ ایک رہنما اور مجتہد کو بہت سی دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سرسید کو بھی کرنا پڑیں۔ سینکڑوں کا بُرا بھلا سُنا، بہت سے مولویوں نے کُفر کے فتوے دیے۔ ہزاروں نے اُن پر طرح طرح کے اتہامات رکھے۔ لیکن اُن کی دِل سوزی اور محبتِ قومی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں:-

"افسوس کہ مسلمان ہندستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں

اور گھر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ ای بھائی مہدی! کچھ نہ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں ہوتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیوں کر آتا ہے۔ اور کس طرح پہ کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا گر مجھ کافر مردود و گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے۔ کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا؟" [سلہ]

نواب عماد الملک کو لکھتے ہیں :

"جناب مجھ کو قوم کی طرف سے اور اس کی بھلائی اور ترقی کی طرف سے بالکل مایوسی ہے لیکن اس خیال سے کہ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے، کیے جاتے ہیں" [سلہ]

مولوی نیاز محمد خاں وکیل نے سید حامد مرحوم کے انتقال پر تعزیت کا تار بھیجا۔ اس کا جواب دیتے ہیں اور اس آزمایش کے وقت بھی قوم کے خیال سے غافل نہیں ہیں :۔

"مخدومی و مکرمی نیاز محمد خاں صاحب آپ کا تار ہمدردی پہنچا جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اس کا میں صرف شکر گزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں بھی اس کو نہایت محبت اور قدر سے دیکھتا ہوں۔ اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف ہو۔ کیوں کہ وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد کرنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے۔ پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کرو" [سلہ]

کم ظرف قومی لیڈروں میں غرور اور تکبر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کی نظروں میں وقعت یا اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ سرسید اس نقص سے بالکل بری ہیں۔ ایک مرتبہ مولوی سید شرف الدین بلخی کو معلوم ہوا کہ سرسید نماز مغرب میں جو مدرسے کی مسجد میں ہوتی ہے شریک نہیں ہوئے۔ انھوں نے شکایت کی اور طرح طرح کے سوالات کیے۔ اس

سلہ خطوط سرسید مطبوعہ نظامی پریس ص ۵۸ — سلہ خطوط سرسید مطبوعہ نظامی پریس ص ۱۴۳

سلہ " " " ص ۲۱۹، ۲۱۸

کے جواب میں سرسید مرحوم نے لکھا :-

"میں صرف ایک گنہگار شرم سار آدمی ہوں - ادنا سے ادنا مسلمان بھی مجھ گنہگار سے ہزار درجہ بہتر ہو"[۱]

اس کے بعد خاتمے پر لکھتے ہیں :

"بہ ہر حال میری اندرونی تفتیش بے جا ہو - نہ میں مقدس ہوں نہ مقدس ہونے کا دعوا ہو - نہ کسی کا ہادی بننا چاہتا ہوں - ایک گنہگار آدمی کے حالات کی تفتیش کیا - البتہ مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہو اس میں کوشش کرتا ہوں -"[۲]

مولوی سید امداد علی سرسید کے سخت مخالف ہیں - ان کو خطاب ملا ہو - اس سلسلے میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :

"بلا تصنع آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد علی صاحب کی نسبت "اسٹار آف انڈیا" تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی - میری آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہو خواہ اس کو کوئی میری ضد سے حاصل کرے خواہ میرے حسد سے - خواہ میرے ذلیل کرنے کو - چشم ما روشن دلِ ماشاد"[۳]

اعتراضات پر تحمّل

ہادی اور مصلح کا کام بڑا سخت ہو - جو صدیوں کے اوہام اور بُری رسوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہو - اُس کی ہر ہر بات کو شک اور شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اِس کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے لوہے کا دِل اور پتھر کا کلیجہ چاہیے - تاکہ لوگ اعتراضات کرتے رہیں لیکن مصلح کے پیر زرا بھی نہ ڈگمگائیں - سرسید میں یہ صبر و تحمل پوری طرح موجود تھا - انھیں کافر و زندیق، کرشان اور دجّال کیا کچھ نہیں کہا گیا - لیکن ان کے پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں ہوئی اور اُنھوں نے ان لعنتوں اور ملامتوں کا بُرا نہیں مانا -

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :-

---

[۱] "خطوطِ سرسید" ص ۲۵۰ [۲] "خطوطِ سرسید" ص ۲۵۱

[۳] " " ص ۴۴

"نجم الاخبار کا مضمون جو سوسائٹی کے اخبار میں مندرج ہوا تھا میں نے دیکھا اور حیران ہوگیا کہ کون شخص میرا خریدار پیدا ہوا۔ مجھ کو تو اپنے ہم وطنوں اور بالتخصیص اپنے ہم مذہبوں سے بجز لعنت کے پھٹ اور جوتی پیزار کے کسی چیز کی توقع نہیں ہے اور میں اس کے سننے اور کھانے میں خوش ہوں۔ نہ میرا دل رنجیدہ ہوتا ہے اور نہ میں ان کو برا جانتا ہوں" [۵۱]

ایک اور خط میں نواب صاحب موصوف کو لکھتے ہیں:

"میں نے جو ایک خط علی گڑھ اخبار میں لکھا۔ میں سنتا ہوں اس سے ناراضی پیدا ہوئی اور لوگ نہایت برا بھلا کہتے ہیں۔ ناچاری ہے۔ میری قسمت میں یہی ہے" [۵۲]

خطبات احمدیہ کی تصنیف میں سرسید نے اپنا تن من دھن سب لگا دیا تھا۔ اس سلسلے میں قوم سے چندہ کرنا چاہا تو مولوی امداد علی نے اس کو "چندہ دست گیری مسافر لندن" کے نام سے تعبیر کیا۔ نواب محسن الملک کو اسی تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں:-

"میرے ہم قوم اس محنت کی جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی ہے قدر نہیں کریں گے۔ بلکہ نہایت الزام دیں گے اور کافر بتلائیں گے کیونکہ میں پابند تقلید نہیں رہا ہوں" [۵۳]

نواب محسن الملک نے مدرسۂ عربی دہلی کے متعلق ایک تقریر نہایت "دل سوز اور رقت خیز و دردانگیز" کی۔ اس میں اہلِ دہلی کو خوب برا بھلا کہا اور ان کی بےحسی پر سخت ماتم کیا۔ اس کے متعلق سرسید نواب صاحب کو لکھتے ہیں۔ "یہ اپنی قسمت ہے ہم ذرا سی بات کہیں تو فضیحت ہو اور تم دشنام کے قریب تک کے الفاظ کہو اور کوئی کچھ نہ کہے" [۵۴]

سرسید کی تقلید دشمنی، انگریز دوستی اور اجتہادِ مذہبی نے دوستوں کے دلوں میں بھی شکوک پیدا کردیے تھے۔ ذبیح اور غیر ذبیح کی بحث نے اتنا طول کھینچا کہ محسن الملک بھی شبہے میں پڑ گئے لندن کے قیام نے مخالفوں کو اور بھڑکایا۔ سرسید نے جب لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا تو

---

[۵۱] خطوطِ سرسید، ص ۵۱
[۵۲] " " ص ۶۶
[۵۳] خطوطِ سرسید، ص ۵۳
[۵۴] " " ص ۵۷

اپنے عزیز دوست محسن الملک کو بڑے رحم طلب انداز میں لکھا ہے:

"امید ہے کہ تم مجھ کو اگر اپنے پاس نہ بیٹھنے دوگے تو اپنی جوتیوں کے پاس بیٹھنے دوگے۔ اگر اپنے ساتھ بٹھلاکر نہ کھانے دوگے تو کتے کی طرح دوسری رکابی میں آگے رکھ دوگے ورنہ اور لوگ تو مجھ کافر کو روٹی پانی دینا بھی کفر سمجھنے لگے ہوں گے۔"[۵ا]

سرسید کی مخالفت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کے دوست اور ہم نوا بھی بُری نظر سے دیکھے جانے لگے تھے۔ نواب صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولوی امداد علی صاحب نے جو کچھ آپ کو لکھا اس سے کیا ہوتا ہے۔ دونوں کی صورت ملاؤ اور پوچھو کہ چاند کا سا مکھڑا کس کا ہے۔ پھر چاند پر کا تھوکا منھ پر آتا ہے۔ مگر مجھ کو اپنی شامت اعمال پر افسوس ہے کہ مجھ روسیاہ کی محبت سے میرے دوست بھی لعنت ملامت سُنتے ہیں۔"[۵۲]

اس مجموعۂ خطوط میں ایک جگہ جامِ صبر چھلک گیا ہے۔ نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں:-

"میں نے مولوی سی۔ رخ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ شاید کوئی شخص جس میں ذرا بھی نفسِ انسانی ہو نہیں کرسکتا۔ لیکن اب مجھ سے نہیں ہوسکتا اگر کسی مجلس میں میں اور وہ جمع ہوجائیں گے تو آپ سُن لیں گے کہ وہ معاملات پیش آئے جو پاجی سے پاجی اور شہدوں سے شہدوں میں بھی نہیں چلے اور کیا عجب ہے کہ دونوں فوج داری کے حوالات میں تشریف لے جاویں۔ میں قبول کرلوں گا کہ تمام نالائقی میری ہے بہتر۔ میں ہی نالائق پاجی جو کچھ کہو سب سہی۔"[۵۳]

اس موقع پر ہم سرسید کے دو ایسے خط درج کرتے ہیں جو "خطوطِ سرسید" مطبوعہ نظامی پریس میں موجود نہیں ہیں اور جن سے سرسید کی سیرت اور اُن کے معاصرین سے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

[۵ا] "خطوطِ سرسید"، صفحہ ۷۴ [۵۲] "خطوطِ سرسید"، صفحہ ۷۶

[۵۳] " " صفحہ ۹۶

اپنی ولایتی خادمہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں "اگر یہ عورت جو نہایت غریب آدمی اور بھیل گیری کی نوکری کی محتاج ہو اور دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہو اگر ہندستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے۔"

اسٹار آف انڈیا کے تمغہ ملنے کی اطلاع نواب محسن الملک کو اس طرح کرتے ہیں :-

"مجھ کو یقین ہو کہ اس امر سے آپ سب سے زیادہ خوش ہوں گے۔ اس لیے کہ باقی حضرات کو عقل ذرا کم ہو۔"

لندن سے جو خطوط لکھے گئے ہیں ان میں عمائدین سے ہاتھ ملانے اور دعوتوں کی شرکت پر جو اظہارِ مسرت ہو اس کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہو لیکن اس سے بحث کرتے ہوئے ہمیں انیسویں صدی کے مخصوص حالات سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے۔

سرسید کا انگلستان جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ مغربی ملکوں کی شایستگی کے عجیب و غریب نمونے اور اس کی ترقی کو بہ چشم خود دیکھیں۔ محسن الملک نے خوب لکھا تھا کہ "اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا۔ رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔" انھوں نے انگلستان کو قہوہ خانوں کی بجائے انجمنوں اور کتب خانوں میں دیکھا اور اپنا تمام وقت علمی تحقیقات اور مشاغل میں صرف کیا۔ علی گڑھ کالج کا نقشہ یہیں تیار ہوا۔ 'تہذیب الاخلاق' کا بلاک بہ قول حالی "یہیں بنوایا گیا۔" کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا ملزم جولیس سیزر ہو اس کی تحقیق یہیں کی اور میور کی کتاب کا دنداں شکن جواب یہیں لکھا۔

سرسید نے انگلستان پہنچ کر ہر چیز کو عبرت اور حیرت کی نظر سے دیکھا۔ کتب خانہ انڈیا آفس کے متعلق لکھتے ہیں۔ "کتب خانہ نہیں کتابوں کا شہر ہو۔" برٹش میوزیم کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ایک بڑا کتابوں کا جنگل ہو۔" لندن کے متعلق لکھتے ہیں "لندن جنت ہو اور حوروں کا ہونا سچ ہو۔"

۲- تاریخی معلومات

خطوطِ سرسید کی دوسری خصوصیت یہ ہو کہ وہ تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ آج جو طریقے تاریخِ ماضی کی تدوین و ترتیب کے اختیار کیے جارہے ہیں۔ ان میں تاریخ کی کتابوں سے کہیں بڑھ کر ان چیزوں کو دخل حاصل ہو جو تاریخ کے طور پر نہیں لکھی گئیں لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس زمانے کے حالات پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اِس سلسلے میں شاہی فرامین، سیاسی تحریرات اور مکتوبات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی لیے پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیاتِ ایران جلد چہارم کی تالیف میں دمنشاۃ فریدوں، کا استعمال فراخ دلی کے ساتھ کیا ہو اور سرکار نے اورنگ زیب کی تاریخ لکھتے وقت مکاتیبِ عالم گیر سے خاص طور پر استفادہ کیا ہو۔

خطوطِ سرسید کے ذریعے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت، تحریکِ علی گڑھ، مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند[۱] ریاست حیدرآباد[۲] تہذیب الاخلاق[۳] کالج کے غبن[۴] معاصرینِ سرسید، اردو ہندی نزاع[۵] اور جدید اُردو شاعری[۶] وغیرہ کے متعلق بہت سی تاریخی معلومات بہم پہنچ سکتی ہیں

اُردو ہندی کا نزاع

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہُوا کہ تمام سرکاری عدالتوں میں اُردو کے بجائے ہندی رائج ہوجائے جب اِس مقصد کی اشاعت، اور حصول کے لیے الہ آباد میں ایک صدر مجلس قائم کی گئی تو سرسید نے ۲۹ اپریل ۱۸۷۰ء کو ایک خط نواب محسن الملک کے نام لندن سے لکھا جس سے ان کے تاثرات کا اندازہ ہوسکتا ہو:-

"ایک اور خبر مجھے ملی ہو جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہو کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عمومًا ہندوؤں کے دِل میں جوش آیا ہو کہ زبانِ اُردو خطِ فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہو (باقی آیندہ)

---

[۱] دخطوطِ سرسید، ص ۶۸۔ [۲] ایضًا ص ۱۰۴۔ [۳] ایضًا، ۴۳۔
[۴] " " ص ۲۳۲ و ۱۲۷۔ [۵] ایضًا ص ۶۶۔ [۶] ایضًا ص ۲۲ و ۱۲۵۔

تبصرے

ادبیات

فنِ داستان گوئی (مولفہ پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب۔ دائرۂ ادب بانکی پور، پٹنہ۔ قیمت دو ٹہر آٹھ آنے)

اس کتاب میں 'طلسم ہوش ربا'، 'بوستانِ خیال'، مختصر داستانیں اور منظوم داستانیں بحث میں آئی ہیں۔ مختصر داستانوں میں 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب' اور 'آرائشِ محفل' اور منظوم داستانوں میں صرف 'مثنوی میرحسن' اور 'گلزارِ نسیم' کا ذکر ہے۔

داستانیں، فسانے، قصّہ کہانیاں ہر زمانے میں مقبول رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ لیکن ہر زمانے کے حالات جدا ہوتے ہیں اسی لحاظ سے داستانوں اور فسانوں کی نوعیت ہوتی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کتابیں اس قسم کی پہلے زمانے میں لکھی گئی تھیں وہ اب قابلِ اعتنا نہیں۔ پروفیسر کلیم نے ہماری بھولی بسری داستانوں کو جو ہمارے ادب میں خاص درجہ رکھتی ہیں اپنی تنقید سے ازسرِنو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی خصوصیتوں اور خوبیوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اور ان کا یہ کہنا سچ معلوم ہوتا ہے کہ "اگر ہم غور سے سوچیں تو شاید یہ حقیقت سمجھ میں آجائے کہ اردو میں افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں داستانوں کا زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ہماری ناسمجھی اور لاعلمی ہے کہ ہم اس قیمتی سرمایے کی قدر و قیمت سے بالکل واقف نہیں۔ اور اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتے۔"

'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، اور آرائشِ محفل کے محاسن و معائب کا مقابلہ بھی خوبی سے کیا ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے 'باغ وبہار' ہماری زبان میں بے مثل کتاب ہو۔ مثنوی اور 'گل زارِ نسیم' پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہو۔ لیکن پروفیسر کلیم کی تنقید بھی پڑھنے کے قابل ہو وہ کہیں کہیں ان مثنویوں کے بیانات کا مقابلہ میرامّن کے قصّے سے کرتے ہیں تو باغ وبہار کی قدرو قیمت اور بڑھ جاتی ہو۔

ہمیں اُن سے کامل اتفاق ہو کہ "اُردو میں اچھے ناول بہت کم ہیں۔ اور شاید بہت اچھے تو کوئی بھی نہیں" وہ آج کل کے جدید افسانوں سے بہت بیزار ہیں اور ان کی بیزاری کچھ بے جا نہیں۔

انتخابِ غالب

(مرتبۂ مولوی امتیاز علی خاں عرشی صاحب ناظم کتب خانۂ ریاست رام پور۔)

نواب کلب علی خاں والیے ریاست رام پور نے فارسی و اُردو کے چیدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب کرنے کے سلسلے میں مرزا غالب سے فرمایش کی کہ وہ جلد اپنے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب کرکے بھیج دیں۔ مرزا صاحب نے اس فرمایش کی تعمیل میں اپنے کلیاتِ اُردو اور فارسی کے انتخابات نواب صاحب کی خدمت میں پیش کردیے۔

یہ ہو اِس انتخاب کی شانِ نزول۔ ۲۵ر اگست ۱۸۶۶ء کو فرمایش ہوئی اور ۱۸ر ستمبر ۱۸۶۶ء کو اُردو کا اور ۲۴ر ستمبر کو فارسی کا انتخاب ارسال کردیا۔ یہ مرزا صاحب کی عُمر کا آخری زمانہ تھا، بہت ضعیف و ناتواں ہوگئے تھے اور اکثر بیمار رہتے تھے، اس پر تعمیل کی جلدی۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اُردو فارسی کلیات پر نشان کرتے گئے اور انتخاب نقل کرواکر بھیج دیے۔ اس وجہ سے متعدد اچھے اشعار انتخاب سے رہ گئے۔ عرشی صاحب نے ایسے کچھ اشعار ضمیمے میں درج کردیے ہیں، ان میں کچھ اور اضافہ بھی ہوسکتا ہو۔ اس انتخاب سے ایک بات اور بھی معلوم ہوتی ہو وہ یہ کہ مرزا صاحب نے نواب صاحب کے خیال سے اس میں کچھ مصلحت سے بھی کام لیا ہو۔

عرشی صاحب نے اسے بڑی خوبی اور سلیقے سے مرتب کیا ہو۔ علاوہ دیباچے کے آخر میں بعض اشعار کی شرح بھی لکھ دی ہو اور اس میں کہیں کہیں بڑے لطیف نکات بیان کیے ہیں۔ شرح کی تائید میں اکثر مرزا صاحب کے بیان ان کے رقعات وغیرہ سے نکال کر دیے ہیں۔ شرح کے بعد

اختلافِ نسخ بڑی محنت سے مرتب کیا ہو اور سب سے آخر میں اشاریہ ہو۔

"اختلافِ نسخ" میں عرشی صاحب نے اس شعر کے متعلق ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن　　خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

یہ لکھا ہو "ہونے تک۔ اسی طرح تمام جدید الطبع نسخوں میں پایا جاتا ہو۔ لیکن یہ جدید محاورہ ہو۔ پُرانا محاورہ وہی ہو جو تمام قدیم قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں لکھا گیا ہو"۔۔۔۔ بے شک "ہوتے تک" صحیح ہو اور ہم نے بعض اُن حضرات سے اس کی تصدیق کی ہو جنھوں نے خود مرزا صاحب کی زبان سے اسی طرح سُنا تھا۔ لیکن عرشی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ پُرانا محاورہ ہو صحیح نہیں۔ ہوتے تک اور ہونے تک میں نازک فرق ہو۔ ہوتے تک میں ایک تسلسل پایا جاتا ہو جو ہونے تک میں نہیں۔ اس کا لطف اہلِ زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یہ انتخاب عرشی صاحب کے سلسلے کی دوسری کتابوں کی طرح نہایت پاکیزہ خطِ نسخ میں چھپا ہو لیکن اس کی صفائی اور نفاست دوسری کتابوں پر سبقت لے گئی ہو۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں اس سے فاضل مرتب کی نفاستِ ذوق کا بھی پتا چلتا ہو۔

نگارستان (مجموعۂ نظم مولانا ظفر علی خاں۔ پبلشرز یونائٹڈ۔ لاہور۔ قیمت چار رُپے آٹھ آنے)

مولانا ظفر علی خاں کا جب کبھی خیال آتا ہو اور جب کبھی میں اُن کی کوئی تحریر یا نظم دیکھتا ہوں تو اس خیال سے دِل دُکھتا ہو کہ وہ کیوں ادبیات کے دائرہ سے نکل کر سیاسیات کے میدان میں جا پہنچے۔ اگر وہ ذوقِ ادب ہی کی پرورش کرتے تو اُردو کی عظیم الشان خدمت انجام دیتے۔ لیکن سیاسیات میں جاکر بھی انھوں نے اپنا ادبی ذوق نہیں چھوڑا۔ اور حقیقت یہ ہو کہ سیاسی شاعری کی بنیاد انھوں نے ڈالی۔ اور اپنے اخبار کے ذریعے سے اس رنگ کو جو کبھی کبھی بہت شوخ ہوجاتا ہو، ملک میں پھیلایا۔ عجلت ان کی فطرت میں ہو۔ وہ جلد بولتے، جلد چلتے، جلد لکھتے، جلد سمجھتے ہیں۔ دل میں کسی خیال کے آتے ہی معاً عمل کر بیٹھتے ہیں۔ یہی حال شعر کہنے کا ہو۔ خیال آیا اور شعر حاضر۔ کوئی موقع ہو نظم تیار۔ ان کا مجموعۂ نظم ایک گل دستہ ہو جس میں طرح

طرح کے پھول ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے اکثر نظمیں وقتی ہیں لیکن وہ وقت کے اقتضا کو بتاتی ہیں۔ کچھ واقعات کے متعلق ہیں اور کچھ اشخاص کے متعلق (جن میں دوست دشمن سب ہیں)، کہیں باہمی چشمکیں ہیں اور کہیں سیاسی آویزشیں۔ اکثر فی البدیہہ ہیں۔ ان کی طبیعت کی شوخی جگہ جگہ نظر آتی ہے اور بعض جگہ بڑا لطف دیتی ہے۔ مولانا کو زبان پر حیرت انگیز قدرت ہے۔ کیسی ہی سخت زمین ہو، کہیں بند نہیں۔ قافیے ایسے نکالتے اور اس طرح نبھاتے ہیں کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ مذہبی جوش اور حمیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ نظم کسی موضوع پر ہو روانی، زورِ بیان اور لطف سے خالی نہیں۔

اس سے قبل ان کا ایک مجموعہ 'بہارستان' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ دوسرا مجموعہ اب 'نگارستان' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دونوں پڑھنے کے قابل ہیں۔

EUROPEAN & INDO-EUROPEAN POETS OF URDU & PERSIAN

اردو اور فارسی کے یورپین اور انڈو یورپین شاعر۔ مصنفہ راے بہادر رام بابو سکسینہ ایم۔اے ایل ایل۔ بی، ایف۔آر۔اے۔ایس۔(لندن) وغیرہ۔

راے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ان کی تالیف "تاریخ ادبِ اردو" انگریزی اور اردو میں بہت مشہور ہو چکی ہے اور ہندستان کی یونی ورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ ادبِ اردو کی تاریخ پر اِس وقت یہی ایک مکمل کتاب ہے۔ اب یہ اُن کی دوسری کتاب شائع ہوئی ہے جو اپنے انوکھے موضوع اور تحقیق و جستجو کے اعتبار سے پہلی تالیف سے بھی سبقت لے گئی ہے

یوں تو اردو ادب اور اس کی تاریخ کے شائقین اس قدر ضرور جانتے تھے کہ کچھ یورپین ایسے بھی تھے جو اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ پورے ایک سو دس

یورپین اور نیم یورپین ایسے ہوئے ہیں جنھیں ہماری زبان کے شعر و سخن سے بڑا شغف تھا اور جن میں سے بعض کے پورے دیوان موجود ہیں۔ یہ سکسینہ صاحب ہی کی ہمت تھی کہ پورے پندرہ سال اس دھن میں لگے رہے اور کہاں کہاں سے اور کس کس طرح اور کیسے کیسے جتن کرکے ان بھولے بسرے یورپین اردو شاعروں کو ڈھونڈھ نکالا ہے۔ سچ پوچھیے تو انھوں نے مُردوں کو زندہ کیا ہے۔ ان میں خالص یورپین اور اینگلو انڈین شاعروں کے علاوہ ارمنی، انڈو برٹش، انڈو پرتگیز، انڈو فرنچ، انڈو جرمن، انڈو اٹالین نیز انڈو یورپین خواتین بھی ہیں جو اردو زبان میں شاعری کرتی تھیں۔

ان تمام حالات کی تحقیق میں فاضل مصنف نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ ان شاعروں کے مطبوعہ دیوان جو کسی زمانے میں طبع ہوئے تھے اور اب نایاب ہیں اور لوگوں کو بہت کم اُن کا علم ہو بہم پہنچائے۔ ان کے علاوہ اُن کے غیر مطبوعہ قلمی دیوان یا نظمیں مسلسل اور مستقل جدوجہد اور جستجو کرکے حاصل کیں۔ تمام تذکرے جن میں ان لوگوں کا کہیں ذکر آیا ہے مطالعہ کیے۔ اُردو کے وہ نئے پُرانے رسالے جن میں کہیں ان کے کام کا حوالہ تھا، نیز انگریزی ادبی اور تاریخی رسالے، قلمی بیاضیں جن میں بعض ایسی کام کی چیزیں ملیں جن کی توقع نہ تھی۔ ان سب کو پڑھا۔ پھر ہندستان اور انگلستان کے کتب خانے، نجی کتاب خانے، دیسی ریاستوں کے کتب خانے اور سرکاری دفاتر چھان مارے۔ گرجاؤں کو بھی نہیں چھوڑا؛ اور اُن کے قبرستانوں میں اپنے مطلب کے کتبے اور ان کے رجسٹروں میں سے اپنے کام کی باتیں ڈھونڈ نکالیں۔ گزیٹیر، سیاحت نامے، سوانح، تاریخیں، لغات، کتب استناد، لا رپوٹیں، نجی کاغذات سب کھنگال ڈالے۔ اور ہزارہا خطوط دریافتِ حالات میں مختلف لوگوں کو جگہ جگہ لکھے اور جہاں کہیں سے کوئی بات ہاتھ آئی قلم بند کرلی۔

فاضل مصنف نے ان شاعروں کے حالات اور خاندانی تذکروں اور شجروں ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس زمانے کی معاشرت اور حالات پر بھی نظر ڈالی ہے جو پُر از معلومات اور دلچسپ ہے۔ کتاب کی تکمیل کے بعد جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ضمیموں میں شامل کردی گئی ہیں۔ یہ تعداد میں گیارہ ہیں۔ اصل کتاب تقریباً سوا تین سو صفحے کی ہے۔ اس کے ساتھ ان شعرا کے کلام کا انتخاب بھی

ہو۔ جو چار سو صفحے پر آیا ہو۔

اس موضوع پر لکھنے کے لیے سامان بہم پہنچانا نہایت دشوار تھا۔ سکسینہ کی ہمت اور شوق تحقیق پر آفریں اور صد آفریں ہو۔ انھوں نے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہو۔ ہم سے زیادہ اینگلو انڈین جماعت کو ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ اُن کے بزرگوں کے اِس کمال کو جسے وہ خود بھلا چکے تھے کیسی محنت اور جستجو سے ایک مدت کے بعد روشن کیا ہو۔ اینگلو انڈین اصحاب کو اپنے بزرگوں کی مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اس سلسلے کو جو وہ ایک عرصے سے منقطع کر چکے ہیں پھر تازہ کرنا چاہیے۔

کلام کا انتخاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ اِن یورپین اور اینگلو انڈین شاعروں نے اُردو زبان کو بڑے شوق سے سیکھا تھا۔ ان کا کلام ہر صنفِ شعر میں پایا جاتا ہو۔ قصیدے، رباعیاں، مثنویاں، غزلیں سبھی کچھ لکھا ہو۔ ان کے اور کسی ہندستانی شاعر کے کلام میں مطلق فرق نہیں معلوم ہوتا۔ وہی تشبیہیں اور استعارے وہی تلمیحات، وہی روزمرہ اور وہی محاورات، وہی اسلوبِ بیان، کہیں کہیں وہی ایہام گوئی۔ آج کل یورپین اور اینگلو انڈین مدارس میں اُردو زبان کے سیکھنے کی طرف زیادہ توجہ کی جارہی ہو۔ یہ صرف امتحان پاس کرنے کے لیے نہیں سیکھنی چاہیے بلکہ اسی شوق اور چاؤ سے سیکھنی چاہیے جیسے اُن کے بزرگوں نے سیکھی تھی۔ انھیں اب ہندستان میں رہنا ہو اور ہندستان میں رہنے اور ہندستانیوں سے میل ملاپ اور تعلقات بڑھانے کے لیے زبان سب سے بڑا ذریعہ ہو۔ اور جو زبان اُنھیں ہندستان میں ہر جگہ اور ہر موقع پر کام دے سکتی ہو وہ اُردو ہو۔

اِس باب میں فاضل مولف کی سنجیدہ رائے کا خلاصہ خود اُن کے الفاظ میں نقل کرنا مناسب ہو۔ کتاب کے پندرھویں باب کے آخر میں لکھتے ہیں: (ترجمہ:-)

"اُن یورپین اور اینگلو انڈین شعرائے کرم کی گراں قدر شاعرانہ بلند پروازیوں سے اُردو ادب کے تنوع اور ہمہ گیری کا پتا چلتا ہو یہ ایک بحرِ زخار ہو جس سے بہ کثرت چشمے نکلتے ہیں، اس شوخ رنگ نمونے میں مختلف خوش نما رنگ جھلکتے ہیں۔ اُردو ادب

کسی ایک ہی قوم کی ملکیت نہیں ہو یہ ایک مشترکہ ترکہ ہو یہ تمام فرقی تنازعات اور سیاسی جھگڑوں سے بالاتر ہو ہنگامی بحثوں اور جماعتی مناقشوں سے اسے کوئی سروکار نہیں ہو باہمی سشکر رنجی میں اسے پھنسانا درست نہیں ہو یہ اتحاد اور باہمی محبت کا نشان ہو اور زبردست متحد کرنے والی قوت ہو اس میں انمول موتیوں کا خزانہ ہو جس کی ہمیں حفاظت اور قدر کرنی چاہئے، ہندو، مسلمانوں، یورپینوں اور انڈو یورپینوں نے اس کی تعمیر میں اپنی اعلا ترین کوششیں صرف کی ہیں ایسے مشترکہ ترکے کو جو ناقابلِ تقسیم ہو ہمیں کسی حال میں ضائع نہ کرنا چاہیے۔"

ذہنی زلزلے | دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ، جدید ملے پلی۔ حیدرآباد (دکن) چھوٹی تقطیع ۱۹۲ صفحات سادہ جلد منقش گردپوش۔ قیمت دو رُپے چار آنے۔ چند افسانوں کا مجموعہ ہو جس کے مصنف جناب نعیم صاحب صدیقی مدیرِ معاون رسالۂ "کوثر" (رسابق "مسلمان") اب دارالاسلام پٹھان کوٹ میں مقیم ہیں۔ کتاب کا "افتتاحیہ" ان الفاظ پر ختم ہوا ہو۔

"اس کتاب کا مصنف موجودہ سماج سے مطمئن نہیں ہو۔ وہ اس کی ساری تعمیر کو بنیاد تک اُکھاڑ پھینکنا چاہتا ہو اور مستقبل کی سوسائٹی کا محل ایک نئے نقشے سے بنانا چاہتا ہو۔ مگر اس کا نقشہ اُن نقشوں سے بالکل مختلف ہو جن کا پروپگنڈا کرنے میں وقت کے اکثر اہلِ قلم مصروف ہیں۔ یہ معروف فکری بغاوت کے اندر ایک نئی فکری بغاوت کا آغازی اقدام ہو۔"

لائق مصنف کا تعلق شاید مولانا مودودی صاحب کی اس جدید جماعت سے ہو جو دینِ اسلام کے محکم اساسی عقائد و اعمال کو جمود و رسمیات کے انبار سے نکالنا چاہتی اور مسلمانوں کو ازسرِنو ایک ولولہ انگیز دینی زندگی کی دعوت دیتی ہو۔ اِس تحریک نے یورپ کی جدید تہذیب، الحاد و مادہ پرستی اور نفسانی بلکہ حیوانی مقاصد پر بھی سخت ضرب لگائی ہو اور ان سب وجوہ سے مسلمانوں میں خاص قدر و منزلت کا استحقاق حاصل کرلیا ہو۔ نوجوان مصنف افسانے کے پیرائے میں اسی تحریک کے علمبردار معلوم ہوتے ہیں اور ہندی مسلمانوں میں جو مذہبی ردِعمل پیدا ہوا ہو اُس کے ادبی دُنیا میں بہت اچھے

نمایندے سمجھے جاسکتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں اُن کے بعض افسانے جیسے "کیمیائی تناسل" "جیکرا "دماغ کی آمبلی" وغیرہ ہر اعتبار سے دل چسپ اور کام یاب فسانے ہیں جن کی ارباب ذوق داد دیے بغیر نہ رہیں گے۔ کتاب کی عبارت میں کہیں کہیں مولویانہ ثقالت اور زبان کی بھی خفیف غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن ہمیں یقین ہو کہ معمولی توجہ اور مشق سے نوجوان مصنف ان کی بہ خوبی اصلاح کرلیں گے۔ ایک عمدہ افسانہ نویس کے لیے اصل ضرورت یہ ہو کہ اعلا درجے کی تخیلہ اور مشاہدے کی توفیق رکھتا ہو۔ قصّے میں ربط و دِل کشی پیدا کردے اور ادائے مطالب میں جدّت و لطفِ بیان پر قادر ہو۔ ہمارے خیال میں صدّیقی صاحب میں یہ سب اوصاف موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ بہت جلد مقبول افسانہ نویسوں کی صفِ اوّل میں شمار نہ ہونے لگیں۔

کتاب میں الحاد و دہریت، فحاشی و بدکاری کی تردید و تذلیل کے ساتھ کہیں کہیں معاصرین پر کھلی ہوئی چوٹیں بھی کی گئی ہیں۔ اس کا جواب دینا نہ دینا صدّیقی صاحب کے حریفوں کا کام ہو۔ البتہ اگر وہ اجازت دیں تو اس قدر ہم ضرور عرض کریں گے۔ کہ گو مذہب کے حقائقِ عالیہ کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن ان کو سمجھنے سمجھانے میں غلطی اور اختلاف کی بڑی گنجایش ہو۔ اصلاحِ عقائد و اخلاق انبیاے معصوم کا منصب رہا ہو۔ خاطی انسانوں کو اپنی اصابتِ رائے اور صحتِ علم پر جو وثوق ہوجاتا ہو اس کا سبب کبھی کبھی قصورِ فہم اور فریبِ نفس ہوا کرتا ہو۔ فتامّل۔

س۔ ۰

تاریخ

ہندستان کی فیصلہ کُن جنگیں بہ قلم جناب محمود خاں صاحب محمود مولف "سلطنتِ خداداد" وغیرہ۔ حجم ۱۹۲ صفحات۔ چھوٹی تقطیع۔ قیمت عہ۔ مبارک علی تاجر کتب بک ڈپو کٹے زئی بازار، لاہور کے پتے سے مل سکے گی۔

انگریزی زبان میں اس قسم کی بہت سی کتابیں مختلف ممالک کی بڑی جنگوں کی نسبت لکھی گئی

ہیں اور ہندستان کی جنگوں پر بھی۔ لیکن یہ اتنا بڑا مُلک ہے کہ اس کی فیصلہ کُن لڑائیاں قرار دینے میں ذاتی پسند و مذاق کے اختلاف کی بڑی گنجایش پائی جاتی ہے۔ ان آٹھ معرکوں میں جن کی تفصیل زیرِ نظر کتاب میں درج ہے، جنگ تالی کوٹہ یا پلاسی اور آخر میں سرنگاپٹم کے معرکے کو پورے ہندستان کی فیصلہ کُن جنگ قرار دینا، تکلف سے خالی نہیں ہے۔ نوجوان مؤلف پُرجوش اور شگفتہ انشاپرداز ہیں اور جنوبی ہند پر ان کی تاریخی کتابیں کافی دل چسپ ہیں لیکن تمام ہندستان کی اور وہ بھی صدہا سال کی تاریخ سے بحث کرنے کے لیے زیادہ وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس کے واسطے انگریزی درسی تاریخیں، رسالۂ ''ہمایوں'' کا مضمون اور ''تاریخ ذکاء اللہ'' پر حصر کرنے سے کام نہیں چل سکتا جن سے مؤلف صاحب نے اپنے ماخذوں کا کام لیا ہے۔ شیرشاہ اور ہمایوں کی جنگ قنوج کے ماخذوں میں تاریخ ''فیروزشاہی'' بھی درج ہے (ص۵۸) حال آں کہ وہ فیروزشاہ تغلق کے زمانے میں مکمل ہوگئی تھی۔ غرض تاریخی اعتبار سے مؤلف صاحب کی یہ کوشش کسی بلند پایۂ تحقیق کا نمونہ نہیں نظر آتی۔ البتہ ادبی لحاظ سے خاصی دل چسپ اور لکھائی چھپائی میں بہ خوبی دیدہ زیب کتاب ہے۔ س۔ ہ

سویٹ روس

مؤلفہ محمد کلیم اللہ، ناشر ماڈرن بک ڈپو، سلطان بازار، حیدرآباد دکن ۳۲۰ صفحے، قیمت ہے،

موجودہ جنگِ عظیم سے پیش تر سویٹ روس کے نظامِ حکومت و معیشت کا ساری دنیا میں مضحکہ اُڑایا جاتا تھا اور کمیونسٹ نظامِ اقتصادیات کے ناقابلِ عمل ہونے اور اس کی ناکامی کی پیش گوئی پر ہر جگہ موشگافیاں کی جاتی تھیں۔ لیکن اس جنگ میں اس کے نظامِ حکومت و معیشت کی کامیابی ثابت ہوگئی کہ اس میں مزید دلیل و حجت کی گنجایش نہ رہی۔ اس عالم گیر انقلاب رائے نے سب کی نگاہیں روس کی طرف متوجہ کردیں اور لوگوں کو اُس نظام کی تفصیلات اور اُن حالات کے معلوم کرنے کی فکر ہونے لگی جن سے اتنی شان دار کامیابی حاصل ہوئی کہ مُلک کا فرسودہ نظامِ معاشرت نئی زندگی کے ساتھ جاگ اُٹھا اور حکومت کے طرزِ عمل نے حاکم و محکوم کو ایک مقصد اور ایک نصب العین پر متحد کردیا۔ چناں چہ یورپین زبانوں میں بہ کثرت کتابیں اس مضمون پر لکھی گئیں اور ترجمہ کی گئیں لیکن

اُردو زبان میں ابھی اِس قسم کے لٹریچر کا ذخیرہ بہت ہی کم ہے اور سارے نظامِ حکومت و معیشت پر یک جا معلومات کی تو شاید کوئی کتاب اُردو زبان میں نہ تھی۔ اِس لحاظ سے مولوی محمد کلیم اللہ کی یہ کوشش مستحقِ تحسین ہے کہ اُنھوں نے اُردو داں پبلک کے لیے مختصر اور جامع طور پر سوویٹ نظام کی تفصیلات جمع کر دیں جن کے پڑھنے سے اُن اسباب کا تعین کیا جاسکتا ہے جو انقلابِ روس کے بعد سے اس پسماندہ اور فلاکت زدہ ملک کو تیزگامی کے ساتھ ترقی کی منازل پر آگے بڑھاتے رہے اور جنھوں نے مختلف قومیت، مختلف زبان، مختلف مذہب اور مختلف تمدن کی ایک وسیع آبادی کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کردیا۔ کتاب شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے اور موجودہ گرانیوں کے زمانے میں اس کی قیمت زیادہ نہیں ہے۔ کاغذ عمدہ اور جلد خوب صورت ہے لیکن کتابت و طباعت اگر اس سے بہتر ہوتی تو اچھا تھا۔ ر - ع - ا

متفرقات

مسائل و قصص افاداتِ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ ۱۳۲ صفحات۔ چھوٹی تقطیع۔ سا جلد مع گرد پوش۔ قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے۔ ادارۂ اشاعتِ اُردو۔ حیدرآباد دکن سے طلب کی جائے۔

اصل میں یہ اُن دو مقالوں کا مجموعہ ہے جن میں سے پہلا رامپور اکاڈمی کے جلسے میں اور دوسرا اسلامیہ کالج پشاور کی ایک خاص مجلس میں پڑھ کر سُنایا گیا تھا۔ اخبار 'صدق'، لکھنؤ میں بہ اقساط دفعا چھپے لیکن اب ضروری ترمیم اور نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔

فاضل مصنف ایک مدت سے قرآنِ مجید کے انگریزی ترجمے کے ضمن میں تفسیر کا مطالعہ کر رہے ہیں اور انھیں خدا کے فضل سے دینی مسائل میں خاص بصیرت اور تبحر حاصل ہوگیا ہے۔ ان کی انشاپردازی ایک مدت سے ملک میں مقبول و مسلّم ہے اور متین شوخی اور سنجیدہ گرم گفتاری کا نادر نمو

[ش] کرتی ہو۔

ان مقالوں میں مولانا نے قرآن مجید کے چند تاریخی مباحث پر روشنی ڈالی ہو اور قوم بنی اسرائیل، [ا]ور بعض بزرگ انبیاؑ کے حالات میں ایسے ایسے عالمانہ نکتے بیان کیے ہیں جو اہلِ ذوق سے داد [ل]یے بغیر نہ رہیں گے۔ کتاب ضخامت میں کم مگر قیمت میں کہیں بڑی ہو۔ ہر مذاق کا آدمی اسے پڑھ کر [م]حظوظ و مستفید ہوسکتا ہو۔

س ۔ ہ

اصولِ تمدن بقلم جناب پروفیسر نواب علی صاحب قریشی۔ صدر شعبۂ تاریخ و تمدن مسلم کالج، کان پور۔ درسی کتب کی تقطیع کے ۲۷۶ صفحات پر خاصی صاف چھپی ہو اور [م]قدمہ اِسٹیشنری مارٹ، چوک، کان پور سے بہ قیمت دو رُپے آٹھ آنے دست یاب ہوسکتی ہو۔

[ف]اضل مصنف نے انگریزی اصطلاح "سِوکس" کا اُردو مرادف "تمدن" پسند کیا ہو جو اب تک "سِوی لزے شن" [ک]ے لیے استعمال ہوتا رہا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "مدنیات" بہتر ہوتا۔ یا کتاب کے دوسرے باب میں [جس] جگہ "شہریات" لکھا گیا ہو، اسی کو اختیار کرلیا جاتا۔ بعض دوسری اصطلاحات کی نسبت بھی گفتگو [کی گ]نجائش ہو لیکن مجموعی طور پر لائق مصنف نے بہت غور و محنت سے ہر انگریزی اصطلاح کا صحیح [تر]جمہ بہم پہنچایا ہو اور ہر جگہ انگریزی حروف میں اصل لفظ بھی تحریر کردیا ہو۔ اگرچہ یہ انگریزی الفاظ [او]ر عبارتیں بہت صاف اور صحیح چھاپی گئی ہیں لیکن لیتھو کی چھپائی میں وہ صفائی کہاں آسکتی ہو جسے [ہم] انگریزی ٹائپ میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ اُردو کتاب میں جابجا یہ اجنبی رسم خط اسے مطبوعہ [انگ]ریزی فارموں سے مشابہ بناتا ہو اور خوش نما نہیں نظر آتا۔ مگر چوں کہ کتاب ایف اے کے طلبہ [کے] واسطے لکھی گئی ہو اِس لیے غالباً یہ اہتمام ضروری سمجھا گیا۔ ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ کتاب [کے] آخر میں ایک فرہنگ کی صورت میں انگریزی الفاظ اور اُن کے اُردو مرادفات دے دیے جاتے [یا ذ]یلی حواشی میں انگریزی اصطلاحات متن سے الگ کرکے لکھ دی جاتیں۔

معنوی اعتبار سے کتاب نہ صرف طلبہ بلکہ عام شائقین کے واسطے بھی نہایت مفید معلوم ہوتی ہو [اس] کے اٹھارہ ابواب میں شہری زندگی کے آغاز اس کے نشو و نما، شہری حقوق و فرائض، مملکت،

حکومت، اس کے آئین و دستور پر کافی وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔ لائق مصنف اپنے مضمون سے اعلا درجے کی واقفیت رکھتے ہیں اور اُن کی کوشش یہ ہے کہ جو کچھ خود سمجھا ہے اسے اچھی طرح ناظرین کو سمجھائیں۔ اس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے، اگرچہ وہ ایک خشک مضمون کو زیادہ دل چسپ اور شگفتہ نہ بنا سکے ہوں۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی مصطلحات اور اُردو تراجم غالباً مصنف کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ انھوں نے "پدرسری" اور "مادرسری" جیسے دو غلے لفظ بھی اختیار کر لیے ہیں لیکن اقتصادیات کی بجائے "معاشیات" کو پسند نہیں کیا جو نسبتۃً جدید اصطلاح ہے ڈموک ریسی کا مرادف "جمہوریت" لکھا ہے جو قدیم سے "ریپبلک" کے واسطے آتا تھا۔ پہلی اصطلاح کا ترجمہ حکومتِ عوام یا عوامیہ شاید لائقِ ترجیح ہوتا۔ دوسرا اصطلاحات پر بھی آیندہ زیادہ تفصیل و تدقیق سے نظرِ ثانی کی جائے اور انھیں صحتِ معانی کے ساتھ عام فہم یا اُردو محاورے سے قریب تر لانے کا خیال رکھا جائے تو کتاب کی افادیت کے ساتھ اس کی ادبیت میں بھی ترقی ممکن ہے۔

بہرحال اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ کتاب مغربی علوم کو اُردو میں خوبی اور خوش اسلوبی سے منتقل کرنے کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اہلِ علم میں وہی قدر و مقبولیت پائے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

س۔ و۔

تاج دار رقاصہ — مؤلفہ مولوی فصیح الدین احمد ایم اے۔ شائع کردہ ادیب بُک ڈپو۔ نیا کتاب گھر اُردو بازار دہلی۔ طبع ثانی قیمت مجلد ع۲

یہ ایک فرانسیسی ناول کا ترجمہ ہے جو مولوی فصیح الدین احمد صاحب نے کیا ہے۔ اصل فرانسیسی ناول کا نام نہیں دیا۔ مگر اس سے کتاب کی دل چسپی میں فرق نہیں آیا جو نہایت سلیس اور صاف زبان میں ہے۔ یہ ایک رقاصہ کا افسانہ ہے جو چکلے کی تاریک اور گندی زندگی سے نکل کر شاہی محل تک پہنچتی ہے اور شہنشاہ جسٹینین کی ملکہ بن کر وسیع سلطنتِ روما پر نہایت مطلق العنانی اور سفاکی سے حکومت کرتی ہے؛ اور اپنی پچھلی ناپاک زندگی کے تاثرات و اثرات مٹانے کے لیے نہایت ہی بے رحمانہ مظالم کی

مرجب ملتی ہو اور بے وقوف جشینین اس کے حسنِ جہاں سوز کا اتنا گرویدہ ہوتا ہو کہ سارا کاروبارِ حکومت اس کے سپرد کردیتا ہو اور امورِ سلطنت اسی کی رائے اور حکم سے انجام پاتے ہیں۔ اس "کامیاب" زندگی کے بعد جب موت عزیز پر آتی ہو تو اس کے کشتہ ہائے مظالم کی روحیں اس کے سامنے آکر اس کی خوف ناک عاقبت کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ اس سفاک ملکہ کے ساتھ ہی اس کا عاشقِ زار جشینین بھی خودکشی کرکے فنا ہوجاتا ہو۔ اور روما کو ایک پُرہول دورِ حکومت سے نجات مل جاتی ہو۔ سارا قصہ دل چسپ اور عبرت انگیز ہو۔

ر۔ ع۔ ا

نئے رسائل اور خاص نمبر

ہم دردِ صحت' دہلی جنگ اور طب

'ہم دردِ صحت' دہلی جو طبی مضامین عام فہم انداز میں شائع کرنے کی شہرت حاصل کرچکا ہو اپنے جدید خاص نمبر میں خود اپنی سابقہ اشاعتوں پر فوقیت لے گیا ہو۔ یہ خاص نمبر جو جنگ اور طب کے نام سے موسوم کیا گیا ہو تقریباً دو سو صفحات کی کتاب ہو جس کی زیبایش و افادیت میں اس گرانی اور مشکلات کے زمانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہو، اور یہ سب آٹھ آنے کی قیمت میں واقعی حیرت انگیز بات سمجھی جائے گی۔ "جنگ اور طب" میں یہ دکھایا گیا ہو کہ اس جنگِ عظیم کے دوران میں جو ۱۹۳۹ء سے جاری ہو اور نہ جانے آیندہ کب تک جاری رہے گی فنِ طب یا تشخیص و علاج کے مختلف شعبوں میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں اور کیا کیا انقلابات رونما ہوے۔ ظاہر بات ہو کہ اس وسیع اور شاخ در شاخ مضمون پر ماہرانہ انداز سے لکھنا کسی ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے کہ اس میں لکھنے والوں کی فہرست خاصی ممتاز و معزز ہو لیکن تحریر کا سب سے زیادہ بوجھ رسالے کے نگراں اور دواخانہ ہم درد کے مالک حکیم حاجی عبدالحمید صاحب نے خود اپنے کاندھوں پر لیا اور رسالے کا حصۂ اوّل جو ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہو اور جس میں علاوہ فنِ جراحت کے تقریباً تمام عنوانات فنِ طب کے آگئے ہیں، تمام و کمال موصوف ہی کا لکھا ہوا ہو۔ علم و فنِ جراحت کا حصہ ڈاکٹر جے گرے ٹرنر کی مشہور کتاب

"موجودہ جنگ کے دوران میں علم و فنِ جراحت کے تغیرات اور اس کی ترقیاں" کا ترجمہ ہی جو ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے کیا ہی۔ اس کے علاوہ بعض دیگر ماہرین کے مضامین اور تراجم بھی ہیں اور آخری حصّے (سوم) میں ادبیاتِ جنگ کے عنوان سے اُن مضامین پر نظر ڈالی گئی ہی جو اہلِ ادب کی دل چسپی کے ہیں اور جس میں ایم ایم اسلم صاحب، کوثر صاحب چاندپوری اور سلطان حیدر صاحب جوشؔ نے اپنا اپنا زورِ قلم دکھایا ہی۔ اور بعض مضامین ادارے کی طرف سے بھی لکھے گئے ہیں۔ غرض کہ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے مفید پُراز معلومات اور دِل چسپ ہی اور ترتیب و طباعت کے لحاظ سے کافی دیدہ زیب بھی ہی۔ اہلِ فن اور عامی دونوں اپنی اپنی حد تک اس سے استفادہ کرسکتے ہیں اور آٹھ آنے کی قیمت میں اتنا لٹریچر بہت ہی ارزاں ہی۔ ہم ادارۂ 'ہم درد صحت' کو ان کی اس کام یابی پر مبارک باد دیتے ہیں اور ہمیں یقین ہی کہ اس خاص نمبر کو خاص مقبولیت حاصل ہوگی۔

ر۔ ع۔ ا

امین للادب | ماہ نامہ، لوہارو۔ مدیر مرزا صلاح الدین صاحب۔ چندہ سالانہ سے ر

ہزہائی نس نواب صاحب بہادر فرماں روائے لوہارو کی زیرِ سرپرستی یہ نیا ماہ نامہ نکلنا شروع ہوا ہی جس کے دو نمبر اس وقت تک شائع ہوچکے ہیں۔ خاندانِ لوہارو نے اردو علم و ادب اور شاعری کی جو خدمات کی ہیں۔ اُن سے دُنیا واقف ہی، حضرت سائلؔ دہلوی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ہم اس رسالے کا خیرمقدم کرتے ہیں اور اس کی کام یابی کے لیے دست بدعا ہیں۔ اور دِل سے چاہتے ہیں کہ یہ رسالہ ادب کی خدمت مقتضیاتِ زمانہ کے مطابق، لیکن اسی بلند معیار پر انجام دے جو خاندانِ لوہارو کی روایات کو تازہ رکھ سکے۔ زیرِ نظر دو اشاعتوں میں خلاف زبان کا کافی جوش و خروش دکھایا گیا ہی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آیندہ مضامین میں بھی زیادہ سنجیدہ تنقید اور اعلا تحقیقات کی صورت میں اس کا عملی ظہور ہوگا۔ ر۔ ع۔ ا۔

مجلۂ طیلسانین | سہ ماہی، حیدرآباد دکن، مدیر محمد غوث صاحب ایم۔اے، ال ال بی رشانہ چندہ سالانہ صہ ر

انجمن طیلسانینِ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا یہ علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ اپنی زندگی کے آٹھ سال گزار چکا ہے اور اس کا تازہ نمبر (جولائی سنہ ۴۴ء) جلد ہشتم کا تیسرا نمبر ہے، جو اپنے اعلا علمی اور ادبی مضامین کے لحاظ سے اُس معیار پر قائم ہے جو ابتدا سے اس کے پیشِ نظر رہا ہے۔ زیرِ نظر اشاعت میں کئی علمی تحقیقی مضامین ہیں، خاص کر خواجہ محمد یوسف الدین کا مضمون قدیم زمانے کے کتب خانوں پر اور پنڈت دتاتری دھر النکار کا مضمون بہ عنوان اکبر الہ آبادی ہندی میں نہایت پُر از معلومات اور دل چسپ ہیں۔ قائدِ ملت مولوی محمد بہادر خاں کی وفات کا غم حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں میں کئی پُر درد نظموں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسلامی معاشی نظریات، ہندستان کے وسائلِ نقل و حمل پر جنگ کے اثرات اور ہندوستان میں صنعتی مزدوروں کی کارکردگی کے مسائل سے سیرِ حاصل بحث کی گئی ہے۔ اُردو زبان میں ایسے رسائل کی ضرورت ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ طیلسانینِ جامعہ عثمانیہ اپنے مقدور بھر اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔

ر - ع - ا

نیا دور دو ماہی، مدیر صمد شاہین، ۱/۲ رانوجی راؤ روڈ، بسون گڑھی، بنگلور سٹی چندہ سالانہ سے، بنگلور کا یہ دو ماہی رسالہ جو ریڈروں کے سائز پر خوب صورت اہتمام و طباعت کے ساتھ شائع ہوتا ہے اپنے نام کی رعایت سے ادبِ جدید کا علم بردار ہے اور ترقی پسند ادب کی حمایت کرتا ہے چناں چہ اس ادب کے ایک پُرجوش حامی فیض احمد فیض کا ایک مضمون ترقی پسند ادب پر اشاعتِ زیرِ نظر (اگست و ستمبر سنہ ۴۴ء) میں شائع ہوا ہے جس میں معترضین کو جواب دے کر ترقی پسند ادب کی زبردست حمایت کی گئی ہے۔ اس مضمون کے علاوہ رسالے میں اور کئی مضامین ہیں محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ نظموں میں جدید و قدیم دونوں طرز کی نمایندگی کی گئی ہے۔ ہندستان کے اس دور افتادہ خطّے سے اس اُردو ادبی رسالے کی اشاعت اُردو زبان کی عمومیت اور ہمہ گیری کی ایک بیّن مثال ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ملک میں مقبول ہوگا۔

ر - ع - ۹

Vol. 24 October 1944 No. 4

THE URDU

The Quarterly Journal
OF
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by
ABDUL HAQ

Published by
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
Delhi.